از نگارش
اہلِ قلم کی ایک جماعت
زیر نظر
اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
تفسیر نمونہ
ترجمہ
حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی
مصباح القرآن ٹرسٹ

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.
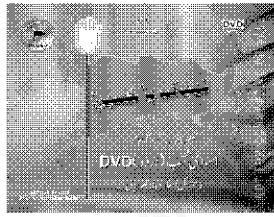
منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

اثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

استاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد ۱۲

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی

مصباح القرآن ٹرسٹ

نام کتاب ________ تفسیر نمونہ

جلد نمبر ________ ۱۲

زیر نظر ________ آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم ________ حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی

نظر ثانی ________ ثاقب اکبر نقوی

ناشر ________ مصباح القرآن ٹرسٹ

ہدیہ ________

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر

۲۴/۱ الفضل مارکیٹ اُردو بازار، لاہور

فون نمبر: ۷۲۳۶۳۳۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

قارئین محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ ـــــ کلام حکیم اور عہدِ حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغاز کار میں موجودہ دور کی شہرہ آفاق تفسیر ـــــ تفسیر نمونہ ـــــ کو فارسی سے اُردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر محسن ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلی اللہ مقامہ، کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونین کی فراخدلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکراً للہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کُتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ، کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اُردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی "پیام قرآن" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور "قرآن کا دائمی منشور" از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل یک جلدی قرآن پاک عہدِ حاضر کے مقبول اُردو تراجم کے ساتھ زیر طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جید عالم دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہٗ کا ترجمہ "انوار القرآن" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری اُمتِ مُسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی

طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہل علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کرکے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جاسکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیب نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سُقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سُورتوں کا کچھ حصہ ایک جلد میں اور بقایا حصہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سُورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سُورت دو حصوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سُورت کی کامل تفسیر پر ختم ہوگئی۔ اس طرح پُوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۲ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں سابقہ جلد ۲۱ میں سے صفحہ ۱۲۵ تا ۴۲۶ اور جلد ۲۲ میں سے صفحہ ۲۷ تا ۴۸۴ شامل کیے گئے ہیں، چنانچہ یہ جلد سورۂ دخان، سُورہ جاثیہ، سُورۂ احقاف، سُورہ محمدؐ، سُورہ فتح، سُورہ حجرات، سُورہ قٓ اور سُورہ ذاریات کی تفسیر پر مشتمل ہے۔

ہم نے زیر نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیّر مرد مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہارِ تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ بحق معصومینؑ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اِھـــداء

"مرکزِ مطالعاتِ اِسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو تمام طبقات میں عموماً — اور

نوجوانوں میں خصوصاً

اِسلام کی حیات بخش تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا

گیا ہے۔

اِس نفیس تالیف کو

ان اہلِ مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو قرآن مجید کے متعلق

بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات

حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

حوزۂ علمیہ۔ قم

یہ تفسیر

حسبِ ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہے

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے داؤد الہامی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے اسد اللہ ایمانی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے عبد الرسول حسنی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللہی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

۱۔ تفسیر مجمع البیان	از	مشہور مفسر علامہ طبرسی
۲۔ تفسیر تبیان	از	دانشمند فقیہِ بزرگ شیخ طوسی
۳۔ تفسیر المیزان	از	علامہ طباطبائی
۴۔ تفسیر صافی	از	علامہ محسن فیض کاشانی
۵۔ تفسیر نور الثقلین	از	مرحوم عبد علی بن جمعۃ الحویزی
۶۔ تفسیر برہان	از	مرحوم سید ہاشم بحرینی
۷۔ تفسیر روح المعانی	از	علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
۸۔ تفسیر المنار	از	محمد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہٗ
۹۔ تفسیر فی ظلال القرآن	از	سید قطب مصری
۱۰۔ تفسیر قرطبی	از	محمد بن احمد انصاری قرطبی
۱۱۔ اسباب النزول	از	واحدی (ابو الحسن علی بن مقویہ نیشاپوری)
۱۲۔ تفسیر مراغی	از	احمد مصطفٰی مراغی
۱۳۔ تفسیر مفاتیح الغیب	از	فخر رازی
۱۴۔ تفسیر روح الجنان	از	ابو الفتوح رازی

گذارش

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اُردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوندِ کریم مولانا مرحوم کو جوارِ معصومینؑ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

تفسیر نمونہ جلد ۱۲

فہرست

سورہ دخان

سورہ جاثیہ

سُورۂ احقاف ۱۴۶

سورہ محمدؐ

سورہ فتح

٭ ٭ ٭

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللهم صل علی محمد و آل محمد وعجل فرجهم

تفسیر نمونہ جلد ۱۲

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں

سورہ دخان : مکی سورت ہے اور اس کی ۵۹ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۵

سورہ جاثیہ : مکی سورت ہے اور اس کی ۳۷ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۵

سورہ احقاف : مکی سورت ہے اور اس کی ۳۵ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۶

سورہ محمدؐ : مدنی سورت ہے اور اس کی ۳۸ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۶

سورہ فتح ، مدنی سورت ہے اور اس کی ۲۹ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۶

سورہ حجرات : مدنی سورت ہے اور اس کی ۱۸ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۶

سورہ ق ، مکی سورت ہے اور اس کی ۴۵ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۶

سورہ ذاریات : مکی سورت ہے اور اس کی ۶۰ آیات ہیں۔

پارہ ۲۶ ــــ ۱ تا ۳۰ پارہ ۲۷ ــــ ۳۱ تا ۶۰

سورۂ "دخان"

- — مکہ میں نازل ہوئی
- — اس کی ۵۹ آیتیں ہیں

تاریخ آغاز

۳، رجب المرجب ۱۴۰۵ھ

سورۂ دخان
کے
مضامین

یہ "حوامیم" کی سات سورتوں میں سے پانچویں سورت ہے، چونکہ یہ مکی سورتوں میں سے ہے لہٰذا انہیں کے مضامین کی حامل بھی ہے، یعنی اس میں زیادہ تر گفتگو مبدأ، معاد اور قرآن پاک کے بارے میں کی گئی ہے۔

اس بارے میں اس کی آیات یوں منظم کی گئی ہیں کہ سوئے ہوئے اور غافل دلوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کر رہی ہیں اور انھیں ایمان، تقوٰی، حق اور عدالت کی دعوت دے رہی ہیں۔

اس سورت کو سات حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

① سورت کی ابتداء حروفِ مقطعات سے ہوتی ہے، پھر عظمتِ قرآن کا تذکرہ ہے اور اسی تذکرے میں پہلی بار بتایا گیا ہے کہ اس کا نزول شبِ قدر میں ہوا ہے۔

② اس کے دوسرے حصے میں خدا کی توحید کا ذکر ہے اور کائنات میں اس کی عظمت کی کچھ نشانیوں کا بیان ہے۔

③ اس کے اچھے خاصے حصے میں کفار کا انجام اور انہیں ملنے والے طرح طرح کے دردناک عذاب کا تذکرہ ہے۔

④ اس کے ایک اور حصے میں ان غافلوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے فرعون اور فرعون کے ساتھیوں اور بنی اسرائیل کے مقابلے میں فرعونیوں کی زبردست شکست اور تباہی و بربادی کے تذکرے ہیں۔

⑤ آیات کے ایک حصے میں قیامت کے مسئلے کو بیان کیا گیا ہے اور اس دن جہنمیوں کے دردناک عذاب اور پرہیزگاروں کے لیے روح پرور جزا کو بیان کیا گیا ہے۔

⑥ متعدد آیات میں تخلیقِ کائنات کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق بے فائدہ نہیں ہے۔

⑦ جس طرح سورت کا آغاز عظمتِ قرآن کے ذکر سے ہوتا ہے، اسی طرح اس کا اختتام بھی قرآن کی عظمت کے تذکرے کے ساتھ ہوتا ہے۔

اس سورت کی دسویں آیت میں "دخانٍ مبین" کا لفظ آیا ہے۔ اس لیے اس کا نام "سورۂ دخان" ہے۔

سورۂ "دخان" کی تلاوت کا ثواب

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے:

"من قرأ سورة الدخان ليلة الجمعة ويوم الجمعة بنى الله له بيتا في الجنة"

"جو شخص شب جمعہ اور جمعہ کے دن سورہ دخان کی تلاوت کرے گا خدا اس کے لیے بہشت میں گھر بنائے گا"۔[1]

آپ ہی سے روایت ہے۔

"من قرأ سورة الدخان في ليلة، اصبح ليستغفر له سبعون الف ملك"

"جو شخص سورۂ دخان کو رات کو پڑھے ایسی حالت میں صبح کرے گا کہ ستر ہزار فرشتے اس کے لیے استغفار کرتے ہوں گے۔"[2]

ایک اور حدیث میں ابوحمزہ ثمالی نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے یوں روایت کی ہے:

"من قرأ سورة الدخان في فرائضه ونوافله بعثه الله من الآمنين يوم القيامة، واظله تحت ظل عرشه، وحاسبه حسابا يسيرا، واعطى كتابه بيمينه"

"جو شخص اپنی فرض و نفل نمازوں میں سورۂ دخان کی تلاوت کرے گا خدا اسے ان لوگوں کے ساتھ محشور کرے گا جو قیامت کے دن امن وامان میں ہوں گے، اسے اپنے عرش کے زیر سایہ رکھے گا، اس کا حساب آسان طریقے سے لے گا اور اس کے نامۂ اعمال کو اس کے دائیں ہاتھ میں دے گا"۔[3]

---

[1] [2] [3] مجمع البیان جلد ۹ سورۂ دخان کا آغاز۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ حٰمٓ ۝۱

۲۔ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝۲

۳۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝

۴۔ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝

۵۔ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ۭ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝

۶۔ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

۷۔ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝

۸۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ حٰم

۲۔ اس واضح کتاب کی قسم۔

۳۔ کہ جسے ہم نے مبارک رات میں نازل کیا، ہم ہمیشہ سے ڈرانے والے تھے۔

۴۔ وہ رات کہ جس میں ہر امر خدا کی حکمت کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔

۵۔ ہماری طرف سے ایک محکم تھا، ہم ہی نے (محمدؐ کو) بھیجا ہے۔

۶۔ یہ سب تمہارے پروردگار کی رحمت کی وجہ سے ہے، بیشک وہ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

۷۔ وہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے، اگر تم اہل یقین ہو۔

اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی جلاتا اور مارتا ہے۔ تمہارا پروردگار اور تمہارے اگلے باپ دادا کا بھی پروردگار ہے۔

تفسیر

مبارک رات میں قرآن کا نزول

اس سُورت کے آغاز میں بھی گزشتہ چار اور آئندہ دو سورتوں کی طرح جو مجموعی طور پر سات سُورتیں بنتی ہیں ہم ایک بار پھر حروفِ مقطعات (حٰمٓ) کی زیارت کر رہے ہیں۔ حروفِ مقطعات کے بارے میں ہم پہلے ہی تفصیل کے ساتھ مکمل تفسیر بیان کر چکے ہیں۔[1]

خصوصی طور پر "حٰمٓ" کے بارے میں "حوامیم" میں سے پہلی سُورت (مومن) اور پھر سُورت "حٰمٓ سجدہ" کے آغاز میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس مقام پر بعض مفسرین نے "حٰمٓ" کی قسم کے معنی سے تفسیر کی ہے۔ یعنی اس جگہ دو قسمیں بیان ہو رہی ہیں، ایک اسی "حٰمٓ" کے ساتھ اور دوسری بعد کی آیت میں "کتاب مبین" کے ساتھ۔ دونوں قسمیں پے درپے اور ایک دوسرے کے ساتھ مُناسبت رکھتی ہیں۔ ایک تو "حٰمٓ" کے حرفوں کے ساتھ قسم اور دوسری اس مقدس کتاب کے ساتھ قسم جس نے ان جیسے حروف سے ہی کتاب کی شکل اختیار کی ہے۔

اس سُورت کی دوسری آیت میں، جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں، "قرآن مجید" کی قسم کھائی گئی ہے کہ "قسم ہے اس کتاب

---

[1] اس بارے میں تفسیر نمونہ جلد اوّل سورۂ بقرہ کے آغاز، تفسیر نمونہ جلد ۲ سورہ آلِ عمران کے آغاز اور جلد ۴ سورۂ اعراف کے آغاز کا مطالعہ فرمائیے۔

کتاب کی : (والکتاب المبین)۔

ایسی کتاب جس کے مندرجات روشن، جس کے معارف آشکار، جس کی تعلیمات زندہ، جس کے احکام تعمیری اور جس کے پروگرام منظم اور نپے تلے ہیں۔ ایسی کتاب جو اپنی حقانیت کی آپ دلیل ہے، "آفتاب آمد دلیل آفتاب"۔ [1]

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ قسم کس لیے کھائی گئی ہے؟ بعد والی آیت اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہتی ہے یقیناً ہم نے قرآن مجید کو (جو پیغمبر اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے) مبارک رات میں نازل کیا ہے۔ (انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ)۔

"مبارک" "برکت" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے، سودمند، نفع بخش اور دائمی۔

یہ کونسی رات ہے جو تمام اچھائیوں کا مبدا اور پائیدار خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ اکثر مفسرین نے اس سے شب قدر مراد لی ہے۔ یہ ایسی بابرکت رات ہے جس میں عالم بشریت اور دنیائے انسانیت کی تقدیر قرآن کے نزول کی وجہ سے نیا رنگ اختیار کر گئی ہے ایسی رات جس میں مخلوق کا انجام اور اس کی تقدیر یکساں طور پر قلم بند کی جاتی ہے۔ جی ہاں قرآن ایسی تقدیر ساز رات میں پیغمبر اکرم کے پاک و پاکیزہ دل پر اترا۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام قرآن شب قدر میں نازل ہوا۔

لیکن اس کے نزول کا اصل مقصد کیا ہے؟ وہی جس کی طرف اسی آیت میں اشارہ ہوا ہے کہ "ہم ہمیشہ سے ڈرانے والے تھے"۔ (انا کنا منذرین)۔

یہ ہمارا دیرینہ طریقہ کار ہے کہ ہم اپنے انبیاء اور رسولوں کو ظالموں اور مشرکوں کے ڈرانے کے لیے مامور کرتے آئے ہیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کتاب دے کر بھیجنا بھی اسی سلسلے کی آخری کڑی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انبیائے کرام "انذار" (ڈرانے) کے لیے آئے ہیں وہ "بشارت" (خوشخبری دینے) کے لئے بھی ہوتے ہیں، لیکن چونکہ ظالم اور مجرم لوگوں کے لیے ان کی دعوت کی اصل بنیاد زیادہ تر انذار اور ڈرانے پر ہی استوار ہوتی ہے لہٰذا انذار پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

قرآن دفعتاً نازل ہوا ہے یا تدریجی طور پر؟

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل امور غور طلب ہیں:۔

① ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید پیغمبر اسلام کی نبوت کے ۲۳ سالہ دور میں نازل ہوتا رہا ہے پھر یہ کہ قرآن مجید کے مضامین ایسے ہیں جن کا تعلق پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کی ۲۳ سالہ زندگی کے مختلف واقعات سے تعلق ہے اگر ان واقعات کو قرآن مجید سے جدا کیا جائے تو وہ بے معنی ہو جائیں۔

اس صراحت کے پیش نظر یہ معلوم کرنا ہے کہ قرآن مجید شب قدر میں مکمل طور پر کس طرح نازل ہوا؟

---

[1] قرآن مجید کی قسموں کے فلسفے اور ان کے اہداف و مقاصد کے بارے میں [illegible] تفسیر میں تفصیل سے بحث کریں گے جس کی بہت سی آیات میں قسموں کا ذکر ہے۔

اس سوال کے جواب میں بعض مفسرین نے قرآن کا یہاں معنی آغاز نزول قرآن کیا ہے۔ لہٰذا یہ بات کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اس کا آغاز تو شب قدر میں ہوا اور ۲۳ سال تک اس کے نزول کا سلسلہ جاری رہا۔

لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں یہ تفسیر زیر نظر آیت اور دوسری آیات کے ظاہری معنی سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے اس بات کی طرف توجہ کرنا ہوگی کہ آیت میں ایک طرف تو یہ ہے کہ "قرآن مبارک رات میں نازل ہوا ہے" جب کہ دوسری طرف سورۂ بقرہ کی ۱۸۵ ویں آیت میں ہے:

"شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن"

"ماہ رمضان میں روزے رکھا کرو، یہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اترا ہے"

جب کہ سورۂ قدر میں ہے:

"انا انزلناه فی لیلة القدر"

"ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا ہے"

مجموعی طور پر ان آیات سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ وہ مبارک رات جو زیر تفسیر آیت میں ذکر ہوتی ہے شب قدر ہے جو ماہ رمضان المبارک میں ہے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر اور بھی کئی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کے تدریجی نزول سے پہلے اس سے آگاہ تھے، جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کی ۱۱۴ ویں آیت میں ہے:

"ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضیٰ الیك وحیه"

"وحی کے نازل ہونے سے پہلے قرآن کے بارے میں جلدی نہ کیجیے"

اسی طرح سورۂ قیامت کی ۱۶ ویں آیت میں ہے:

"لا تحرك به لسانك لتعجل به"

"اپنی زبان کو قرآن کے لیے جلدی جلدی حرکت نہ دیں"

ان تمام آیات کو ملا کر جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کے نزول کے دو طریقے تھے، ایک "دفعتاً نزول" کہ ایک ہی مرتبہ مجموعی صورت میں خدا کی طرف سے پیغمبر کے پاک دل پر ماہ رمضان المبارک کی شب قدر میں نازل ہوا اور دوسرا "تدریجی نزول" جو حالات، واقعات اور ضروریات کے پیش نظر ۲۳ سال تک آنحضرتؐ پر نازل ہوتا رہا۔

اس بات کا ایک اور گواہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیات میں "انزال" اور بعض میں "تنزیل" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ بعض لغات سے معلوم ہوتا ہے کہ "تنزیل" کا اطلاق عام طور پر ایسے مواقع پر ہوتا ہے جہاں پر تدریجی طور پر نازل ہونا مقصود ہوتا ہے لیکن "انزال" کا مفہوم وسیع ہے جو تدریجی اور دفعتاً دونوں طرح کے نزول کا معنی دیتا ہے۔[1]

---

[1] مفردات راغب، مادہ "نزل" کا مطالعہ فرمائیں۔

اور یہ بات بھی بڑی لائق توجہ ہے کہ مندرجہ بالا تمام آیات میں جہاں پر قرآن کے ماہ رمضان اور شب قدر میں نازل ہونے کا ذکر ہے وہاں پر "انزال" کے کلمہ کا استعمال ہوا ہے جو "دفعتاً نزول" کے معنی سے ہم آہنگ ہے اور جہاں پر "تدریجی نزول کی بات ہوئی ہے وہاں پر صرف "تنزیل" کا کلمہ استعمال ہوا ہے۔

لیکن قلب پیغمبر پر "دفعتاً نزول" کس صورت میں ہوا؟ آیا اسی موجودہ قرآن کی صورت میں یا مختلف آیات اور سورتوں کی صورت میں؟ یا ان کے مجموعی مفہوم اور حقائق کی صورت میں؟

اس بارے میں بات پوری طرح واضح نہیں ہے۔ مندرجہ بالا قرینے سے صرف اسی قدر بات سمجھی جاسکتی ہے کہ ایک مرتبہ تو یہ قرآن پاک پیغمبر اسلام کے مقدس قلب پر ایک ہی رات میں نازل ہوا اور دوسری مرتبہ ۲۳ سال کی تدریجی مدت میں۔

(۲) اس بات کا ایک اور شاہد یہ بھی ہے کہ زیر بحث آیت میں قرآن کے لفظ سے مراد تمام قرآن مجید ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ قرآن کا لفظ "کل" اور "جزو" دونوں کے لیے بولا جاسکتا ہے۔ لیکن اس بات سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ جب تک اس لفظ کے ساتھ کوئی اور قرینہ موجود نہ ہو اس وقت تک اس سے مراد تمام قرآن مجید ہے۔

بعض مفسرین نے زیر تفسیر آیت کا مفہوم "نزول قرآن کا آغاز" لیا ہے اور کہا ہے کہ قرآن کی سب سے پہلی آیت ماہ رمضان کی شب قدر میں نازل ہوئی یہ تفسیر آیت کے ظاہری معنی کے بالکل خلاف ہے۔

اور اس سے بھی کمزور تر ان لوگوں کا قول ہے جو یہ کہتے ہیں کہ "چونکہ سورۂ حمد تمام قرآن کا نچوڑ اور خلاصہ ہے اور وہ شب قدر میں نازل ہوئی ہے، لہٰذا اسے "انا انزلناہ فی لیلۃ القدر" کہا گیا ہے"۔

یہ سب کے سب احتمالات قرآن کی آیات کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہیں کیونکہ آیات کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام قرآن شب قدر میں نازل ہوا ہے نہ کہ اس کا کچھ حصہ۔

یہاں پر ایک چیز باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ تفسیر علی بن ابراہیم میں حضرت امام محمد باقر، حضرت امام جعفر صادق اور امام موسیٰ کاظم علیہم السلام سے بہت سی روایات درج کی گئی ہیں جو انھوں نے "انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ" کی تفسیر میں ارشاد فرمائی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے:

"ھی لیلۃ القدر انزل اللہ عزوجل القرآن فیھا الی البیت المعمور جملۃ واحدۃ، ثم نزل من البیت المعمور علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ فی طول عشرین سنۃ"

"اس مبارک رات سے مراد شب قدر ہے، جس میں خدائے بزرگ و برتر نے قرآن کو ایک ہی مرتبہ "بیت المعمور" کی طرف نازل کیا پھر بیس سال کے عرصے میں رسول پاک پر تدریجی طور پر نازل فرماتا رہا"۔

یہاں پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس روایت میں قرآن مجید کے دفعتاً نزول کے بارے میں "انزل" اور تدریجی نزول کے بارے میں "نزل" کے کلمات استعمال ہوئے

ہیں۔ ؎۱

"بیت المعمور" کہاں واقع ہے؟ اس بارے میں متعدد روایات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ آسمانوں میں خانہ کعبہ کے مقابل میں ایک گھر ہے جو فرشتوں کی عبادت گاہ ہے، اور روزانہ ستر ہزار فرشتے اس میں داخل ہوتے ہیں، جو قیامت تک اس کی طرف واپس نہیں پلٹیں گے۔

اس کی تفصیل انشاء اللہ سورۂ طور کی آیت نمبر ۴ میں بیان ہوگی۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "بیت المعمور" کون سے آسمان میں واقع ہے؟ اس بارے میں مختلف روایات میں ہے کہ وہ چوتھے آسمان پر ہے اور بعض روایات میں ہے کہ آسمان اول (آسمان دنیا) میں ہے اور بعض دوسری روایات میں ساتویں آسمان سے متعلق بتایا گیا ہے۔ مرحوم طبرسیؒ نے تفسیر مجمع البیان میں سورۂ طور کی تفسیر میں حضرت علی علیہ السلام سے بیت المعمور کے بارے میں یہ روایت نقل کی ہے:

- ھو بیت فی السماء الرابعۃ بحیال الکعبۃ معمرۃ الملائکۃ بما یکون منھا فیہ من العبادۃ، ویدخلہ کل یوم سبعون الف ملک ثم لا یعودون الیہ ابدا۔

- وہ خانہ کعبہ کے مقابل میں چوتھے آسمان میں واقع ہے روزانہ ستر ہزار ایسے فرشتے اس میں داخل ہوتے ہیں کہ جو پھر تا ابد اس کی طرف نہیں آئیں گے۔ ؎۲

صورت حال خواہ کچھ ہو، قرآن مجید کا شب قدر میں مکمل طور پر بیت المعمور کی طرف نازل ہونا اس بات کے منافی نہیں ہے کہ رسولِ پاکؐ اس سے باخبر تھے، کیونکہ آنحضرتؐ لوح محفوظ جو خدا کا مخفی علم ہے نیز دوسرے تمام عالموں سے آگاہ ہیں۔

بالفاظ دیگر تمام مذکورہ آیات سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم دو مرتبہ آنحضرتؐ پر نازل ہوا۔ ایک مرتبہ "دفعتاً نزول" کی صورت میں اور دوسری مرتبہ "تدریجی نزول" کی صورت میں جو آپؐ پر ۲۳ سال کے عرصے میں نازل ہوتا رہا۔ یہ بات مندرجہ بالا حدیث کے منافی بھی نہیں ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن پاک شب قدر میں بیت المعمور پر نازل ہوا کیونکہ پیغمبرؐ کا قلب مبارک، "بیت المعمور" سے بھی تر آگاہ ہے۔

اس سوال کے جواب سے ایک اور سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن مجید شب قدر میں نازل

؎۱ تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۶۲۳۔ اس حدیث میں قرآن کے تدریجی نزول کی مدت بیس سال بتائی گئی ہے، جبکہ ہم جانتے ہیں کہ نبوت کا دورانیہ کہ جس میں قرآن نازل ہوتا رہا ۲۳ سال ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تعبیر یا تو راوی کی طرف سے غلط فہمی کی وجہ سے ہے یا پھر حدیث کے نسخوں میں غلطی واقع ہوئی ہے۔

؎۲ تفسیر مجمع البیان جلد ۹ ص ۱۶۳۔ مرحوم علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار جلد ۵۵ ص ۵ پر "بیت المعمور" سے متعلق روایات کو جمع کیا ہے۔

ہوا ہے تو پھر آنحضرتؐ کی تاریخ بعثت سے یہ کس طرح مطابقت رکھتا ہے ، جبکہ مشہور روایات کی بنا پر تاریخ بعثت ۲۷ رجب ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کا دفعتاً نزول تو ماہ رمضان المبارک میں ہوا ہے اور ۲۷ رجب المرجب میں اس کا تدریجی نزول شروع ہوا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں کوئی مسئلہ غیر واضح نہیں رہتا۔

بعد کی آیت میں شب قدر کی توصیف اور توضیح ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : شب قدر وہ رات ہے جس میں ہر امر خدا کی حکمت کے مطابق تفصیل کے ساتھ مرتب ہوتا ہے : (فیھا یفرق کل امر حکیم)۔

"یفرق" کے لفظ کے ساتھ اس بات کی طرف ارشاد کیا گیا ہے کہ اس رات میں تمام تقدیر ساز امور اور مسائل مقدر میں بکھر دیئے جاتے ہیں اور "حکیم" کا لفظ اس خدائی تقدیر کے استحکام کے ناقابل تغیر اور اس کے محکم ہونے کو بیان کر رہا ہے۔ البتہ قرآن مجید میں یہ صفت عام طور پر خداوند تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتی ہے اگر کسی اور چیز کو اس سے متصف کریں تو یہ اس کی تاکید کے لیے ہوگا۔[1]

یہ بیان ان بہت سی روایات کے ساتھ ہم آہنگ ہے جن میں کہا گیا ہے کہ شب قدر میں تمام لوگوں کی سال بھر کی تقدیر کر دی جاتی ہے اور رزق اور عمر وغیرہ بھی اسی رات کو مشخص کر دیئے جاتے ہیں۔

شب قدر سے متعلق تمام امور پر سورۂ قدر کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ انسان کا اپنا ارادہ خدا کی تقدیر اور مشیت سے متصادم نہیں ہوتا۔

بعد کی آیت میں اس بات کی ایک بار پھر تاکید کی گئی ہے کہ قرآن مجید خدا کی جانب سے ہی ہے، چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے: شب قدر میں قرآن کا نزول ہماری طرف سے ایک حکم تھا اور ہم ہی نے پیغمبر اسلام کو مبعوث کیا اور بھیجا ہے (امرا من عندنا انا کنا مرسلین)۔[2]

---

[1] تفسیر "المیزان" میں اس بحث کی ایک اور تفسیر بیان ہوئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کائنات کے امور دو مراحل پر مشتمل ہیں۔ ایک اجمال اور ابہام کا مرحلہ جسے "حکیم" سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرا تفصیل اور کثرت کا مرحلہ جسے "یفرق" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (جلد ۱۸ صفحہ ۱۳۱)

[2] "امرا من عندنا..." کا جملہ اعراب کے لحاظ سے کیا واقع ہو رہا ہے اور گزشتہ آیات کی کس بحث سے اس کا تعلق ہے؟ اس بارے میں کئی احتمال ذکر کئے گئے ہیں جن میں سے زیادہ مناسب یہی ہے کہ "امرا من عندنا" "انا انزلناہ" میں موجود مفعول کی ضمیر کا حال واقع ہو رہا ہو۔ جس کا معنی یہ ہوگا کہ "ہم نے قرآن کو نازل کیا جب کہ یہ ہماری طرف سے امر ہے۔" اور اس صورت میں "انا کنا مرسلین" کے جملہ سے مکمل طور پر ہم آہنگ بھی ہے جس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت کا تذکرہ ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ "کل امر حکیم" کی وضاحت ہو اور اس کی نصب اختصاص پر ہے اور ایسی صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا "اعنی بھذا الامر امرا حاصلا من عندنا"۔

پھر نزول قرآن، ارسال پیغمبر اور شب قدر میں تمام چیزوں کی تقدیر کے اصل سبب کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے، یہ سب تمہارے پروردگار کی رحمت کی وجہ سے ہے (رحمۃ من ربک)۔[1]

جی ہاں! اس کی ناپیدا کنار رحمت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ان کے حال پر نہ چھوڑ دے۔ بلکہ ان کے لیے کوئی پروگرام اور رہنما بھیجے تاکہ وہ ان کی ہر ہر موڑ پر ارتقاء اور خدا کی جانب رہنمائی کرے۔ بنیادی طور پر کائنات کی ہر چیز اس کی بے انتہا رحمت سے فیض یاب ہو رہی ہے، لیکن انسان باقی چیزوں سے زیادہ اس رحمت کا مشمول ہے۔

اسی آیت کے آخر میں اور بعد کی دوسری آیات میں خداوند عالم کی سات صفات کا تذکرہ ہے جو سب کی سب اس کے مقام وحدانیت کو بیان کرتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ بے شک بڑا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (انہ ھو السمیع العلیم)۔

وہ اپنے بندوں کی دعاؤں اور درخواستوں کو سنتا ہے اور ان کے رازوں سے آگاہ ہے۔

پھر تیسری صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ ایسا خدا ہے جو آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، سب کا پروردگار ہے۔ اگر تم اہل یقین ہو۔ (رب السماوات والارض وما بینھما ان کنتم موقنین)۔[2]،[3]

چونکہ بہت سے مشرکین کئی خداؤں اور کئی ارباب کے قائل تھے اور ہر نوع کے لیے علیحدہ رب کا عقیدہ رکھتے تھے اور ممکن تھا کہ گزشتہ آیت میں "ربک" (تیرا رب) سے ان کے دل میں یہ توہم پیدا ہو کہ محمد مصطفےٰ کا رب اور ہے اور دوسری چیزوں کا رب اور ہے۔ لہٰذا اس آیت میں "رب السماوات والارض وما بینھما" کہہ کر باقی تمام خداؤں پر خط تنسیخ کھینچ دیا گیا ہے اور واضح کر دیا گیا ہے کہ تمام موجوداتِ عالم کا ایک ہی رب ہے۔

"ان کنتم موقنین" (اگر تم اہل یقین ہو) کا جملہ جو جملۂ شرطیہ کی صورت میں آیا ہے، یہ سوال ذہن میں پیدا کر رہا ہے کہ آیا پروردگار عالم کی ربوبیت ایسی شرط سے مشروط ہے!

لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جملے کے ذکر سے مندرجہ ذیل دو امور میں سے کوئی ایک یا دونوں امور مقصود ہیں۔

ایک تو یہ کہ اگر تم یقین کے طلب گار ہو تو اس کا واحد راستہ یہی ہے۔ واحد راستہ یہی ہے کہ تم پروردگار عالم کی ربوبیت مطلقہ کے بارے میں غور و فکر سے کام لو۔

دوسرا یہ کہ "اگر تم اہل یقین ہو تو بہترین یقین پیدا کرنے کا مقام یہی ہے، اگر تم تمام کائنات میں خدا کی ربوبیت کے آثار

---

[1] "رحمۃ من ربک" یا تو "انا انزلناہ" کا مفعول لہ ہے یا "یفرق کل امر حکیم" کا مفعول لہ ہے یا دونوں کا مفعول لہ ہے۔

[2] اسی آیت میں "رب" کا کلمہ گزشتہ آیت میں مذکور "رب" کا بدل ہے۔

[3] "ان کنتم موقنین" جملہ شرطیہ ہے اور اس کی جزا محذوف ہے جو تقدیری طور پر یوں ہے۔

ان کنتم من اھل الیقین او فی طلب الیقین علمتم ان اللہ رب السماوات والارض وما بینھما

دیکھ رہے ہو اور ہر ذرّے کے دل کو شگافتہ کرکے اس میں اس کی ربوبیت کے نشان پاتے ہو، پھر بھی اس کی ربوبیت پر یقین نہیں رکھتے تو پھر کائنات کی کس چیز پر ایمان اور یقین پیدا کروگے؟

چوتھی، پانچویں اور چھٹی صفت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی جلاتا اور مارتا ہے (لا الٰہ الا ھو یحیی ویمیت)۔[1]

تمہاری زندگی اور موت اُسی کے ہاتھ میں ہے، تمہارا اور تمام کائنات کا پروردگار وہی ہے۔ اسی لیے اس کے بغیر کوئی معبود ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، آیا جس کے پاس نہ تو ربوبیت کا عہدہ ہے اور نہ ہی موت وحیات کا مالک ہے، وہ معبود بن سکتا ہے؟

ساتویں اور آخری صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تمہارا پروردگار اور تمہارے اگلے باپ دادا کا بھی پروردگار ہے (ربکم ورب اٰبائکم الاولین)۔

اگر بُت پرستی کے جواز کے لیے تمہاری دلیل یہ ہے کہ تمہارے باپ دادا ان کی پرستش کیا کرتے تھے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کا پروردگار بھی خدائے وحدہٗ لاشریک ہے، لہٰذا تمہارا اپنے آباواجداد سے یہ تعلق بھی اسی بات کا متقاضی ہے کہ خدائے واحد ویکتا کے علاوہ کسی کے آستان پر سر نہ جھکاؤ اور اگر ان کا بھی اس کے علاوہ کوئی اور راستہ تھا تو وہ بھی یقیناً غلطی پر تھے۔

واضح سی بات ہے کہ موت اور حیات کا تعلق بھی پروردگار عالم کی تدبیر سے ہے۔ اگر اس نے اسے خصوصی طور پر ذکر کیا ہے تو اس کی وجہ اسے خاص طور پر اہمیت دینا ہے اور حتمی طور پر معاد کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یہ پہلی مرتبہ نہیں ہے کہ قرآن مجید نے موت وحیات کا مسئلہ بیان کیا ہے، بلکہ کئی مرتبہ اسے خداوند عالم کے مخصوص افعال میں سے ایک فعل کی صورت میں بیان کیا جا چکا ہے کیونکہ یہ انسانی زندگی کا تقدیر ساز اور کائنات کا ایک پیچیدہ ترین مسئلہ ہے اور قدرت الٰہی کی ایک روشن ترین دلیل ہے۔

قرآن مجید کا شب قدر سے رابطہ

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں اشارے کے طور پر اور سورۂ قدر میں صراحت کے ساتھ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ قرآن مجید شب قدر میں نازل ہوا ہے اور یہ بات کس قدر معنی خیز ہے۔

---

[1] "لا الٰہ الا ھو" کا جملہ ممکن ہے کہ جملۂ استینافیہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہو جس کی تقدیر یہ ہو۔

"ھو لا الٰہ الا ھو"۔

لیکن پہلا امکان زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

یہ ایسی رات ہے جس میں بندوں کی تقدیر اور رزق روزی مقدر کی جاتی ہے، اسی رات کو رسولِ پاکؐ کے مقدس اور پاکیزہ قلب پر قرآن نازل ہوا۔ آیا اس کا یہ معنی تو نہیں کہ تم لوگوں کی تقدیر اور انجام اس آسمانی کتاب کے مندرجات ہی سے مربوط اور متعلق ہے اور ان کا آپس میں نزدیکی رابطہ ہے۔

آیا اس کلام کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ صرف تمہاری معنوی زندگی کا ہی نہیں بلکہ مادی زندگی کا بھی اس سے اٹوٹ رابطہ ہے جو نیز تمہاری آزادی، سرفرازی اور استقلال اور تمہاری بستیوں اور شہروں کی آبادی اسی سے وابستہ ہے۔

جی ہاں! جس رات میں کائنات کی تقدیر متعین ہوتی ہے اسی رات میں یہ نازل ہوا ہے۔

۹۔ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ○

۱۰۔ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ○

۱۱۔ يَّغْشَى النَّاسَ ۭ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

۱۲۔ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ○

۱۳۔ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ○

۱۴۔ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ○

۱۵۔ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ○

۱۶۔ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ○

ترجمہ

۹۔ لیکن یہ لوگ تو شک میں پڑے (حقائق کے ساتھ) کھیل رہے ہیں۔

۱۰۔ اس دن کا انتظار کر کہ جب آسمان سے ظاہر نظاہر دھواں نکلے گا۔

۱۱۔ وہ تمام لوگوں پر چھا جائے گا۔ یہ دردناک عذاب ہے۔

۱۲۔ (وہ کہیں گے) پروردگارا! ہم سے عذاب کو دُور کر دے کہ ہم ایمان لاتے ہیں۔

۱۳۔ وہ کس طرح سے اور کہاں نصیحت حاصل کریں گے جب کہ ان کے پاس (روشن معجزات اور دلائل کے ساتھ) آشکار رسُول آچکا۔

۱۴۔ پھر وہ اس سے روگرداں ہو کر کہنے لگے یہ تو دیوانہ ہے جسے دوسرے لوگ

سکھاتے پڑھاتے ہیں۔

۱۵۔ ہم تھوڑے سے عرصہ کے لیے عذاب کو ٹال دیتے ہیں، لیکن تم اپنے کاموں کی طرف لوٹ جاتے ہو۔

۱۶۔ ہم ان سے پورا بدلہ تو اس دن لیں گے جس دن سخت گرفت کریں گے، یقیناً ہم ان سے بدلہ لے کر رہیں گے۔

تفسیر

جب ہولناک دھواں آسمان پر چھا جائیگا

گزشتہ آیات میں اس باب کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ اگر وہ یقین کے خواہاں ہیں، تو یقین کے حصول کے اسباب بہت ہیں اور فراہم بھی ہیں۔ زیر تفسیر آیات میں سے پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: وہ یقین اور حق کے طلب گار نہیں ہیں، بلکہ وہ تو شک میں پڑے (حقائق کے ساتھ) کھیل رہے ہیں" (بل ھم فی شک یلعبون)۔

اگر وہ اس آسمانی کتاب اور آپ کی نبوت کی حقانیت میں شک کرتے ہیں تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ ہے، بلکہ اس لیے شک کرتے ہیں کہ اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتے، بلکہ ہنسی مذاق میں بات کو ٹال دیتے ہیں کبھی تو اس کا تمسخر اڑاتے ہیں اور کبھی ازخود تجاہل عارفانہ کا اظہار کرتے ہیں اور نت نئے کھیل میں لگے رہتے ہیں۔

"یلعبون" "لعب" کے مادہ سے ہے جس کا معنی "مفردات" میں "راغب" کے بقول وہ "لعاب دہن" (تھوک) ہے جو منہ سے ٹپکتا ہے۔ چونکہ کھیل اور مذاق کے موقع پر انسان کا اپنے کام سے کوئی خاص مقصد پیش نظر نہیں ہوتا، لہذا اسے ایسی تھوک سے تشبیہ دی گئی ہے جو انسان کے منہ سے ٹپکتی ہے۔

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ مسائل پر سنجیدگی سے غور و خوض انسان کو حقائق کی شناخت میں بہت مدد دے سکتا ہے اور غیر سنجیدہ طریقہ کار حقائق کے چہرے پر پردے ڈال دیتا ہے۔

بعد کی آیت میں رسول پاکؐ کو مخاطب کرتے ہوئے ان ہٹ دھرم اور سخت منکرین کو دھمکی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس دن کا انتظار کرو کہ جس دن آسمان سے بظاہر دھواں نکلے گا۔ (فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین)۔

ایسا دھواں — جو تمام لوگوں کو ڈھانک لے گا۔ (یغشی الناس)۔

پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ خدا کا دردناک عذاب ہے: (ھذا عذاب الیم)۔

وحشت اور اضطراب ان کے تمام وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ ان کی آنکھوں سے تمام پردے ہٹا دیئے جائیں گے، اور وہ اپنی عظیم غلطیوں سے واقف ہو جائیں گے۔ بارگاہ ایزدی کی طرف رجوع کرکے کہیں گے: پروردگارا! ہم سے عذاب دور کر دے کہ ہم ایمان لاتے ہیں۔ (ربنا اکشف عنا العذاب انا مؤمنون)۔

لیکن ان نابکاروں کے اس دعوے کی تردید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ کس طرح سے اور کہاں نصیحت حاصل کریں گے جب کہ ان کے پاس روشن معجزات اور دلائل کے ساتھ رسول آچکا (انّٰی لھم الذکرٰی وقد جاءھم رسول مبین)۔

ایسا پیغمبر جو خود بھی ظاہر اور آشکار تھا اور اس کی تعلیمات، پروگرام، دلائل اور معجزات بھی واضح تھے۔

لیکن بجائے اس کے کہ وہ لوگ اس رسولؐ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے، خداوند واحد لاشریک کی ذات پر ایمان لے آتے اور اس کے احکام کو جان و دل سے قبول کرتے، اس سے روگردان ہو کر کہنے لگے یہ تو دیوانہ ہے جسے دوسرے لوگ ایسی باتیں سکھاتے پڑھاتے ہیں۔ (ثم تولوا عنه وقالوا معلم مجنون)۔

کبھی وہ کہتے تھے کہ ایک "رومی غلام" انبیاء کے قصے کہانیاں سن کر انہیں بتاتا ہے اور یہ آیات انہی قصوں کی بنیاد پر گھڑی گئی ہیں۔ خداوند عالم اس بارے میں فرماتا ہے:

• ولقد نعلم انهم يقولون، انما يعلمه بشر لسان الذی يلحدون اليه اعجمی وهٰذا لسان عربی مبين ؕ

• ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ کوئی بشر اسے تعلیم دیتا ہے، حالانکہ جس شخص کی طرف یہ الحادی نسبت دیتے ہیں، اس کی زبان عجمی ہے اور اس کی زبان واضح اور کھُلم کھُلا عربی ہے۔

(نحل - ۱۰۳)

کبھی کہتے تھے کہ ان کے حواس مختل ہیں اور اسی اختلال کے سبب ان سے یہ باتیں سرزد ہو رہی ہیں، یعنی وہ دماغی توازن کھو چکے ہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے: ہم تھوڑے سے عرصے کے لیے تم سے عذاب کو ٹال دیتے ہیں، لیکن تم عبرت حاصل نہیں کرتے اور پھر اپنے کاموں کی طرف لوٹ جاتے ہو (انا کاشفوا العذاب قليلا انکم عائدون)۔

یہاں پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کبھی وہ عذاب کے چنگل میں پھنس جاتے تو اپنے کیے پر اظہار ندامت کرتے اور اپنی کرتوتوں پر نظر ثانی کرنے کی ٹھان لیتے جو عارضی ہوتی تھی، لیکن جونہی طوفان حوادث ختم ہو جاتا تو وہ اپنی سابقہ کرتوتوں میں لگ جاتے۔

زیر تفسیر آیات میں سے آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم ان سے پورا بدلہ تو اس عظیم اور سخت سزا کے دن لیں گے، یقیناً ہم بدلہ لے کر رہیں گے۔ (الیوم نبطش البطشة الکبرٰی انا منتقمون)۔[1]

---

[1] اس جملے کی ترکیب میں بہت سے احتمالات پیش کیے گئے ہیں۔ جس احتمال کو اکثر مفسرین نے قبول کیا ہے اور آیت کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ)

"بطش" (بروزن "نقش") کا معنی کسی چیز کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنا ہے۔ یہاں پر سخت سزا کے لیے گرفت میں لینے کے معنی میں ہے اور "بطشۃ" کو "کبریٰ" سے موصوف کرنا اس سزا کی شدت اور سنگینی کی طرف اشارہ ہے، جو ان لوگوں کے انتظار میں ہے۔

خلاصہ یہ کہ بالفرض اگر ان کی عارضی سزا میں کمی واقع ہو جائے یا عارضی طور پر ختم ہو جائے تو شدید اور سخت ترین سزا ان کے انتظار میں ہے، جس سے راہ فرار اختیار نہیں کی جا سکتی۔

"منتقمون" "انتقام" کے مادہ سے ہے، جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں اس کے معنی سزا دینا ہے۔ اگرچہ یہ کہ آج کل کے روزمرہ کے استعمال میں ایک اور معنی اختیار کر چکا ہے اور وہ ہے غصے کی آگ بجھانے اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے سزا دینا۔ لیکن اس کے لغوی معنی میں یہ چیزیں نہیں پائی جاتیں۔

"دخان مبین" سے کیا مراد ہے؟

ان آیات میں مذکور "دخان" (دھویں) سے کیا مراد ہے، جو عذاب الٰہی کی ایک علامت کے طور پر بیان کیا گیا ہے، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ ان میں سے دو نظریے اہم ہیں:

① اس سزا کی طرف اشارہ ہے، جس میں کفار قریش پیغمبر اکرم کے زمانے میں مبتلا ہوتے تھے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے بارے میں نفرین اور بددعا کی تھی اور کہا تھا:

"اللّٰھم سنین کسنی یوسف"

"خداوندا! انہیں یوسف علیہ السلام کے زمانے کی سی قحط سالی اور خشک سالی میں مبتلا فرما۔"

اس کے بعد قحط سالی مکہ کے اطراف میں ایسی حکم فرما ہوئی کہ مکہ کے لوگ بھوک اور پیاس کی شدت میں مبتلا ہو گئے اور اس ابتلاء کے دور میں جب بھی وہ آسمان کی طرف نگاہ کرتے تو انہیں ہر طرف دھواں ہی دھواں دکھائی دیتا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ مردار اور مردہ جانوروں کی ہڈیاں تک کھانے پر مجبور ہو گئے۔

وہ پیغمبر گرامی قدر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگے۔

> محمدؐ! آپ ہی تو ہمیں صلۂ رحمی کا حکم دیتے ہیں، جب کہ آپ ہی کے رشتہ دار اس صورت حال کی وجہ سے تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔ (اگر یہ عذاب ہم سے برطرف ہو گیا تو ہم یقیناً ایمان

(بقیہ حاشیہ صہ کا) انداز سے بھی مطابقت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ "یوم" کا کلمہ "ننتقم" فعل سے متعلق ہے جو "انا منتقمون" کے جملے سے سمجھا جاتا ہے۔ بنا بریں اس کی تقدیری صورت یہ ہوگی۔

"ننتقم منھم یوم نبطش البطشۃ الکبرٰی انا منتقمون"

لے آئیں گے"!

آنحضرتؐ نے ان کے حق میں دُعا کی، نعمت کی فراوانی انھیں نصیب ہوئی اور عذاب ان سے دُور ہو گیا۔ لیکن انھوں نے اس ماجرے سے بھی عبرت حاصل نہیں کی اور اپنی اصلی حالت (کفر) کی طرف پلٹ گئے۔ ؎۱

اس تفسیر کے مطابق "بطشۃ الکبریٰ" جو سخت اور سنگین سزا ہے، سے مراد جنگ بدر ہے، جس میں مشرکین نے مسلمانوں سے زبردست شکست کھائی۔

اس تفسیر کے مطابق حقیقت میں دھویں کا کوئی وجود نہیں تھا، بلکہ بھوک کے پیاسے لوگوں کی نگاہوں میں آسمان سیاہ اور تاریک ہو گیا تھا۔ اسی لیے اس مقام پر "دخان" مجازی حیثیت رکھتا ہے اور اس سخت اور وحشت ناک حالت کی طرف اشارہ ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ بنیادی طور پر عربی ادبیات میں "دخان" عمومی مصیبت اور بلا کے لیے کنایہ ہے۔ ؎۲

بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ خشک سالی اور بارش کی کمی کی وجہ سے عام طور پر سیاہ اور دبیز گرد و غبار آسمان پر چھا جاتا ہے جسے "دخان" سے تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ بارش ہی گرد و غبار کو فرو کر کے فضا کو صاف و شفاف بناتی ہے۔ ؎۳

مذکورہ تمام اوصاف کے پیش نظر اس تفسیر کے مطابق "دخان" کے کلمہ کا معنی مجازی ہوگا۔

۲۔ "دخان مبین" سے مراد وہ گہرا دھواں ہے جو کائنات کے خاتمے اور قیام قیامت سے پہلے تمام آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور یہی چیز دُنیا کے اختتام اور ظالموں اور مفسدین کے لیے عذاب الیم کے آغاز کی نشانی ہوگی۔

ایسے موقع پر ظالموں کا یہ ٹولہ خواب غفلت سے بیدار ہوگا اور عذاب دُور کرنے اور دُنیا کی معمول کی زندگی کی طرف بازگشت کی درخواست کرے گا، جو قبول نہیں کی جائے گی۔

اس تفسیر کے مطابق "دخان" کا حقیقی معنی مراد ہے اور ان آیات کا مضمون بھی وہی ہے جو دوسری قرآنی آیات کا ہے کہ قیامت کے قریب کے زمانے میں یا خود قیامت کے دن گناہگار اور کافر لوگ عذاب کے برطرف ہونے اور دُنیا میں لوٹ جانے کی درخواست کریں گے لیکن ان کی یہ درخواست مسترد کر دی جائے گی۔ ؎۴

اس تفسیر کے مطابق ایک مشکل باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ یہ تفسیر "انا کاشفوا العذاب قلیلا انکم عائدون" (ہم تھوڑا سا عذاب برطرف کریں گے، لیکن تم لوگ پھر اپنی کارستانیوں کی طرف لوٹ جاؤ گے) کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے، کیونکہ دُنیا کے خاتمے یا قیامت کے دن خدا کا عذاب کم نہیں ہوگا کہ وہ لوگ کفر یا گناہ کی حالت کی طرف پلٹ جائیں۔

لیکن اگر اس جملے کا ایک قضیہ شرطیہ کی صورت میں معنی کریں ہر چند کہ تھوڑا سا ظاہر سے تو مخالف ہوگا۔ لیکن یہ مشکل ضرور برطرف

؎۱ مجمع البیان جلد ۹ ص ۶۱ انہی آیات کے ذیل میں۔

؎۲ فخر رازی کہتے ہیں "ان العرب یسمون الشر الغالب بالدخان" (جلد ۲۷ ص ۲۴۲)

؎۳ تفسیر روح المعانی جلد ۲۵ ص ۱۱۰۔

؎۴ اس بارے میں سورۂ انعام کی آیات ۲۷ تا ۳۰ کی طرف رجوع فرمائیں۔

ہو جائے گی کیونکہ آیت کا مفہوم یوں ہوگا: جب ہم ان سے تھوڑا سا عذاب برطرف کریں گے تو وہ اپنی پہلی راہ و روش کو دوبارہ اختیار کرلیں گے" جو درحقیقت سورۂ انعام کی ۲۸ ویں آیت کے مانند ہو جائے گا، جس میں کہا گیا ہے۔

"ولو ردوا لعادوا لما نھوا عنہ"

"اگر وہ دُنیا کی طرف لوٹا بھی دیئے جائیں تو جن اعمال سے انہیں روکا گیا تھا، ان کا ارتکاب کریں گے"

اس کے علاوہ "البطشة الکبرٰی" (سخت اور شدید سزا) کی جنگِ بدر کے واقعے سے تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے، جبکہ یہ تعبیر قیامت کی سزاؤں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ [1]

دوسری تفسیر کا ایک اور شاہد وہ روایات ہیں جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہیں اور جن میں "دخان" کی تفسیر اس دھوئیں سے کی گئی ہے جو قربِ قیامت کے زمانہ میں تمام دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ مثلاً جناب حذیفہ یمانیؓ پیغمبر اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں:

"چار چیزیں قربِ قیامت کی علامات ہیں۔ پہلی دجال کا ظاہر ہونا، دوسری عیسٰی علیہ السلام کا نازل ہونا، تیسری سرزمین عدن کی گہرائیوں سے آگ کا اٹھنا، اور چوتھی دھواں۔

حذیفہ نے پوچھا یا رسول اللہ! وہ "دخان" (دھواں) کیا ہے؟ تو آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

"فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین"

پھر فرمایا۔

"یملأ ما بین المشرق والمغرب، یمکث اربعین یوماً ولیلة، اما المؤمن فیصیبہ منہ کھیئة الزکمة، واما الکافر بمنزلة السکران یخرج من منخریہ و اذنیہ ودبرہ"

"وہ مشرق اور مغرب کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور چالیس شبانہ روز چھایا رہے گا۔ مومن کی یہ حالت ہوگی جیسے کسی کو زکام ہوتا ہے، اور کافر کی حالت یہ ہوگی جیسے کوئی مدہوش ہوتا ہے۔ دھواں اس کی ناک کے نتھنوں، کانوں اور پیچھے سے باہر نکلتا رہے گا"[2]

ایک اور روایت میں ابو مالک اشعری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

---

[1] راغب اپنی کتاب "مفردات" میں کہتے ہیں۔

"البطش ھو تناول الشیء بصولة"

بطش کا معنی کسی چیز کو پوری طاقت سے پکڑنا ہے۔

جو عام طور پر سزا دینے کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔

[2] تفسیر درمنثور جلد ۶ صـ۲۹

"ان ربکم انذرکم ثلاثا، الدخان یأخذ المؤمن منه کالزکمة، و یأخذ الکافر فینفخ حتی یخرج من کل مسمع منه، والثانیة الدابة والثالثة الدجال."

"تمہارے پروردگار نے تمہیں تین چیزوں سے ڈرایا ہے، ایک تو دخان (دھواں) ہے جس کی وجہ سے مومن کو زکام جیسی تکلیف ہوگی اور کافر کا تمام جسم پھول جائے گا اور دھواں اس کے تمام مشام بدن سے باہر نکلے گا، دوسرے دابۃ الارض ہے اور تیسرے دجال ہے۔"[1]

"دابۃ الارض" کے بارے میں سورۂ نمل کی آیت ۸۲ کے ذیل میں (تفسیر نمونہ جلد ۸ میں) تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

"دخان" کے بارے میں ابو سعید خدریؓ نے آنحضرتؐ سے اسی طرح کی ایک اور روایت بھی بیان کی ہے۔[2]

اہل بیت اطہار علیہم السلام کے ذریعہ سے نقل ہونے والی روایات میں بھی اسی قسم کی تعبیرات ملتی ہیں، بلکہ اس سے زیادہ مفصل جن میں سے ایک وہ روایت بھی ہے جو امیر المومنینؑ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کی ہے آپ فرماتے ہیں۔

"عشر قبل الساعة لابد منها، السفیانی، والدجال، والدخان، والدابة وخروج القائمؑ وطلوع الشمس من مغربها ونزول عیسیٰؑ وخسف بالمشرق، وخسف بجزیرة العرب، ونار تخرج من قعر عدن تسوق الناس الی المحشر."

"قیامت سے قبل دس نشانیاں ہر صورت میں ظاہر ہو کر رہیں گی، سفیانی، دجال، دخان (دھواں)، دابۃ الارض، قیام مہدی، مغرب سے سورج کا طلوع، عیسیٰ کا نزول، مشرق زمین پر ایک زلزلہ جس سے زمین دھنس جائے گی، جزیرۃ العرب میں بھی اسی نوعیت کا زلزلہ اور زمین عدن کی گہرائیوں سے آگ کا نکلنا جو لوگوں کو ہنکا کر عرصہ محشر میں لے آئے گی۔"[3]

مجموعی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ دوسری تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

---

[1] و [2] تفسیر در منثور جلد ۶ صفحہ ۲۹

[3] بحار الانوار جلد ۶ صفحہ ۳۰۹۔

۱۷۔ وَلَقَدۡ فَتَنَّا قَبۡلَهُمۡ قَوۡمَ فِرۡعَوۡنَ وَجَآءَهُمۡ رَسُولٞ كَرِيمٌ ۝

۱۸۔ أَنۡ أَدُّوٓاْ إِلَيَّ عِبَادَ ٱللَّهِۖ إِنِّي لَكُمۡ رَسُولٌ أَمِينٞ ۝

۱۹۔ وَأَن لَّا تَعۡلُواْ عَلَى ٱللَّهِۖ إِنِّيٓ ءَاتِيكُم بِسُلۡطَٰنٖ مُّبِينٖ ۝

۲۰۔ وَإِنِّي عُذۡتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمۡ أَن تَرۡجُمُونِ ۝

۲۱۔ وَإِن لَّمۡ تُؤۡمِنُواْ لِي فَٱعۡتَزِلُونِ ۝

ترجمہ

۱۷۔ اور ان سے پہلے ہم نے قوم فرعون کی آزمائش کی اور ان کے پاس ایک پیغمبر بزرگوار آیا۔

۱۸۔ (اور کہا) اے خدا کے بندو! جس چیز کا تمیں حکم ملا ہے اسے بجا لاؤ اور میرے سامنے سر تسلیم خم کرو کہ میں تمہارے لیے رسولِ امین ہوں۔

۱۹۔ اور خدا کے سامنے تکبر نہ کرو، کیونکہ میں تمہارے پاس ایک واضح اور روشن دلیل لے کر آیا ہوں۔

۲۰۔ اور اس بات سے کہ تم مجھے متہم (یا سنگسار) کرو، میں اپنے اور تمہارے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

۲۱۔ اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو کم از کم مجھ سے کنارہ کشی کر لو (اور دوسروں کو تو ایمان لانے سے نہ روکو)۔

تفسیر

خود ایمان نہیں لاتے تو دوسروں کو تو نہ روکو

گزشتہ آیات میں مشرکین عرب کی سرکشی اور حق کے آگے ان کے نہ جھکنے کا ذکر تھا ان آیات میں گزشتہ امتوں کا ایک نمونہ پیش کیا گیا ہے کہ جنہوں نے اسی راستے کو اختیار کیا جس کے نتیجے میں وہ دردناک عذاب کا شکار اور شکست فاش سے دوچار ہوئے تاکہ جہاں پر یہ بات مؤمنین کے دل کی تسلی کا باعث ہو وہاں ہٹ دھرم منکرین کے لیے تنبیہ اور تہدید بھی بن جائے۔

اور وہ ہے موسیٰ اور فرعون کی داستان، جس کے بارے میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: اور اُن سے پہلے ہم نے قوم فرعون کی آزمائش کی۔ (ولقد فتنا قبلهم قوم فرعون)۔

"فتنا" کا کلمہ "فتنہ" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے کندن بنانے کے لیے سونے کو آگ کی بھٹی میں ڈالنا، بعد ازاں انسان کے خلوص کی ہر گونہ آزمائش و امتحان پر اس کا اطلاق ہونے لگا، ایسی آزمائش جو تمام انسانی زندگی اور انسانی معاشرہ پر محیط ہے۔ با الفاظ دیگر انسان کی زندگی کا تمام دورانیہ انہی آزمائشوں اور امتحان میں گزرتا رہتا ہے، کیونکہ یہ دنیا ہے ہی امتحان کا گھر۔

قوم فرعون ایک طاقت ور حکومت، بے پناہ دولت اور بے اندازہ وسائل کا مالک ہونے کی وجہ سے نہایت شان و شوکت کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اسی شان و شوکت نے اسے مغرور بنا دیا اور وہ مختلف گناہوں اور ظلم و ستم کا ارتکاب کرنے لگی۔

"اور اسی اثنا میں ان کے پاس ایک بزرگوار رسول آیا۔ (وجاءهم رسول كريم)۔

"اخلاق و اوصاف کے لحاظ سے "کریم" بارگاہِ حق میں مقام و مرتبہ کے لحاظ سے "کریم" نسب کے لحاظ سے کریم" اور یہ رسول جناب موسیٰ بن عمرانؑ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا[1]

موسیٰ علیہ السلام نے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں اور سنجیدہ لہجے میں، دل پذیر اور محبت بھرے انداز سے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: میرے آنے کا مقصد یہ ہے کہ اے خدا کے بندو! میرے سامنے سر تسلیم خم کرو اور جس چیز کا تمہیں حکم ملا ہے اسے ادا کرو کہ میں اس کا بھیجا ہوا ہوں۔ (ان ادوا الی عباد الله)۔[2]

---

[1] مفرداتِ راغب کے مطابق لفظ "کریم" جب خدا کی صفت کے لیے استعمال کیا جائے تو اس کا معنیٰ ظاہر بظاہر انعام و احسان ہوتا ہے اور جب کسی انسان کی صفت کے لیے استعمال ہو تو اس کا معنی حسن اخلاق اور اعمال حسنہ ہوتا ہے، جو انسان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ البتہ قرآن مجید میں یہ لفظ دوسری چیزوں کی صفت کے طور پر بھی آیا ہے۔ جیسے کتاب کریم، کل زوج کریم، رزق کریم، مقام کریم، اور اجر کریم وغیرہ۔

[2] "ادوا الی عباد الله" میں لفظ "ان" اس فعل مقدر کی تفسیر ہے جو اس سے ماقبل کلام سے سمجھا جاتا ہے اور وہ تقدیر یوں ہے۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

اس تفسیر کے مطابق "عباد اللہ" مخاطب تھے اور اس سے مراد قوم فرعون ہے۔ اگرچہ قرآنی آیات کی رُو سے یہ تعبیر خدا کے نیک بندوں کے بارے میں استعمال ہوئی ہے، لیکن بہت سے مقامات پر کفار اور گناہگاروں کی دل جوئی اور ان کی حق کی طرف تالیف قلب کے لیے بھی یہ کلمہ استعمال ہوا ہے۔ [1]

بنا بریں "ادّوا" (ادا کرو) سے مراد فرمانِ الٰہی کی اطاعت اور اس کے احکام کی بجا آوری ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی ایک اور تفسیر کی ہے اور کہا ہے کہ "عباد اللہ" سے مراد "بنی اسرائیل" ہیں اور "ادّوا" سے مراد انھیں موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کرنا اور انھیں قید و بند سے آزاد کرنا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے سورۂ شعرا کی ۱۷ ویں آیت میں مذکور ہے۔

"ان ارسل معنا بنی اسرائیل"

"میری تجویز یہ ہے کہ تم بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔"

(یہی بات سورۂ اعراف کی ۱۰۵ ویں اور سورۂ طٰہٰ کی ۴۷ ویں آیت میں بھی بیان ہوئی ہے)۔

لیکن جو چیز اس تفسیر سے ہم آہنگ نہیں وہ لفظ "ادّوا" ہے، جو عام طور پر مال، امانتوں اور فرائض کی ادائیگی کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ کہ افراد سپرد کرنے کے لیے۔

اس کلمہ کے استعمال سے اس کا موضوع بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

بہر حال، آیت کے آخر میں اپنے اوپر لگائے جانے والے الزامات کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "میں تمہارا ایک امانت دار پیغمبر ہوں" (انی لکم رسول امین)۔

یہ تعبیر درحقیقت ان ناجائز الزامات کی پیش بندی کے طور پر ہے جو فرعونیوں نے ان پر لگائے تھے، مثلاً جادوگری، جاہ و منصب اور سرزمین مصر میں اپنی حکومت کا قیام، نیز اس سرزمین کے اصل باشندوں کو باہر نکال دینے کا قصد وغیرہ ان الزامات کے بارے میں مختلف آیاتِ قرآنی میں اشارہ ہوا ہے۔

پھر موسیٰ علیہ السلام انہیں اطاعت خداوندی کی دعوت یا بنی اسرائیل کی رہائی کی پیش کش کے طور پر فرماتے ہیں میں اس بات پر بھی مامور ہوں کہ تمہیں یہ بتاؤں کہ "خدا کے سامنے سرکشی اور تکبر نہ کرو۔ اپنی حدود میں رہو کیونکہ میں تمہارے لیے ایک واضح اور روشن دلیل لے کر آیا ہوں" (و ان لا تعلوا علی اللہ انی اٰتیکم بسلطان مبین)۔

واضح معجزات بھی اور کھلم کھلا منطقی دلائل بھی۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ کا)

"جئتکم ان ادّوا الیّ عباد اللہ"

[1] جیسے سورۂ فرقان آیت ۱۷، سورۂ سبا آیت ۱۳ اور سورۂ فرقان آیت ۵۸ وغیرہ۔

خدا کے سامنے "علو" نہ کرنے سے مراد ہر قسم کا وہ عمل ہے جو بندگی کے اصولوں کے منافی ہے۔ خواہ وہ خدا کی مخالفت اور نافرمانی ہو یا خدا کے رسُول کو ایذا رسانی ہو یا خدائی کا دعویٰ ہو، سب اسی زمرے میں آجاتے ہیں۔

چونکہ دُنیا پرست منکرین جب اپنے ناجائز مفادات پر زد پڑتی دیکھتے ہیں تو کسی قسم کی تہمت، الزام تراشی، ناروا باتوں، حتیٰ کہ قتل اور موت کے گھاٹ اتارنے سے بھی نہیں چوکتے، اسی لیے مُوسیٰ علیہ السلام نے حفظ ماتقدم کے طور پر پہلے ہی سے کہہ دیا کہ اس بات سے کہ تم مجھے متہم یا سنگسار کردو میں اپنے اور تمہارے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں" (وانی عذت بربی وربکم ان ترجمون)۔

ممکن ہے یہ بات اس چیز کی طرف بھی اشارہ ہو کہ مجھے تمہاری دھمکیوں کی پرواہ نہیں ہے اور میں آخر دم تک اپنے موقف پر ڈٹا ہوا ہُوں۔ خدا میرا محافظ اور نگہبان ہے۔

اس قسم کی تعبیر خدائی رہبروں کے عزم اور حوصلے کو تقویت پہنچاتی، دشمنوں کے حوصلوں کو پست کرتی، اور دوستوں کے عزم و استقلال میں اضافے کا موجب بنتی ہے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا قائد اور رہبر آخری سانس تک اپنے موقف پر ڈٹا رہے گا۔

"رجم" (سنگسار) کی بات شاید اس لیے کی گئی ہے کہ مُوسیٰ علیہ السلام سے قبل بہت سے انبیاء کو "رجم" کی دھمکی دی گئی تھی۔ جیسا کہ نوح علیہ السلام کے بارے میں ہے:

"قالوا لئن لم تنتہ یا نوح لتکونن من المرجومین"۔

"وہ کہنے لگے اے نوحؑ! اگر تم اپنے کام سے باز نہ آئے تو تمہیں سنگسار کردیا جائے گا"۔

(شعراء - ۱۱۶)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزر نے سنگسار کرنے کی دھمکی دیتے ہُوئے کہا:

"لئن لم تنتہ لارجمنک"۔

"اگر تو باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کروں گا"۔ (مریم - ۴۶)

جناب شعیب علیہ السلام کو بُت پرستوں نے دھمکی دیتے ہُوئے کہا:

"ولولا رھطک لرجمناک"۔

"اگر تیرے قبیلے کا پاس نہ ہوتا تو تجھے سنگسار کردیتے"۔ (ھود - ۹۱)

موت کی تمام سزاؤں میں سنگساری کی سزا کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ سب سے زیادہ سخت سزا ہوتی ہے۔ بعض ارباب لُغت کے بقول "رجم" کا کلمہ مطلقاً قتل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

بہت سے مفسرین کی طرف سے یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ "رجم" کا معنی کسی کو متہم کرنا، کسی پر الزام لگانا اور کسی کو گالی دینا ہے، کیونکہ یہ لفظ اس معنی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں پر اس کا استعمال درحقیقت ان الزامات کی پیش بندی ہے جو بعد میں مُوسیٰ پر لگائے گئے۔

اس کلمے کا استعمال وسیع صورت میں دونوں معانی کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں حرف آخر کے طور پر جناب موسیٰ انہیں فرماتے ہیں، اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو کم از کم مجھے چھوڑ دو، مجھ سے دُور ہو جاؤ اور دوسرے لوگوں کو ایمان لانے سے نہ روکو۔ (وان لم تؤمنوا لی فاعتزلون)۔

کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پوری طرح مطمئن تھے کہ وہ اپنے واضح اور آشکار معجزات، پختہ دلائل اور خدا کے سچے وعدوں کی وجہ سے مختلف لوگوں میں اپنے مشن کو جاری رکھیں گے اور اپنے انقلاب کو ساحل کامرانی سے ہم کنار کر دیں گے اسی لیے انھوں نے اپنے یقین کی بنا پر ان لوگوں سے کہا کہ میرے لیے سدِ راہ نہ بنو اور میرے رستے میں روڑے نہ اٹکاؤ۔

لیکن کیا یہ بات ممکن ہے کہ مغرور اور سرکش ظالم اور جابر لوگ جو اپنی شیطانی طاقتوں اور ناجائز مفادات کو خطرے میں پڑتا دیکھتے ہیں وہ خاموشی سے بیٹھ جاتے ہیں اور اس قسم کی پیشکش کو فوراً قبول کر لیتے ہیں؟ آئندہ آیات یہی ماجرا بیان کرتی ہیں۔

۲۲۔ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ○

۲۳۔ فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ○

۲۴۔ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ○

۲۵۔ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ○

۲۶۔ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ○

۲۷۔ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ○

۲۸۔ كَذٰلِكَ ۫ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ○

۲۹۔ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ○

ترجمہ

۲۲۔ (موسیٰ نے) اپنے رب کی بارگاہ میں عرض کیا کہ یہ مجرم لوگ ہیں۔

۲۳۔ (موسیٰ کو خدا کا حکم ملا) تو میرے بندوں کو راتوں رات لے کر نکل جا، جبکہ وہ تیرے پیچھے آئیں گے۔

۲۴۔ (جب تو دریا عبور کر لے تو) دریا کو کھلا اور ٹھہرا ہوا رہنے دے کہ وہ غرق ہونے والا لشکر ہیں۔

۲۵۔ وہ لوگ کتنے باغات اور چشمے چھوڑ گئے۔

۲۶۔ اور کھیتیاں اور دلکش و گراں قیمت محلات۔

۲۷۔ اور دوسری بہت سی نعمتیں جن میں وہ عیش کیا کرتے تھے۔

۲۸۔ یہ تھا اُن کا ماجرا اور ہم نے ان تمام چیزوں کا دوسرے لوگوں کو وارث بنایا۔

۲۹۔ نہ تو آسمان نے ان پر گریہ کیا اور نہ ہی زمین نے اور نہ اُنھیں مہلت ہی دی گئی۔

تفسیر

محلات، باغات اور خزانوں کو چھوڑ کر چلے گئے

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان مجرموں کے تاریک دلوں میں اثر پیدا کرنے کے لیے ہدایت کے تمام وسائل بروئے کار لائے لیکن فرعونیوں میں ان کا ذرہ بھر بھی اثر نہ ہوا۔ ہر ایک کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کہیں کچھ شنوائی نہ ہوئی۔

اسی لیے وہ ان سے مایوس ہو گئے اور ان پر نفرین کے علاوہ انھیں اور کوئی رستہ دکھائی نہ دیا۔ کیونکہ جس فاسد قوم کی ہدایت کی کوئی امید باقی نہ رہے، نظام آفرینش میں اسے جینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اس کے لیے صرف ایک ہی راہ ہوتی ہے کہ اس پر عذاب الٰہی نازل ہو کر جو اس کا ستیاناس کر کے اس کے ناپاک وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔

اسی لیے زیر نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: موسیٰ نے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں عرض کیا کہ یہ مجرم اور گناہگار لوگ ہیں۔

(فدعا ربہ ان ھٰؤلاء قوم مجرمون)۔

کیسی عمدہ بددعا ہے؟ موسیٰ یہ نہیں کہتے کہ خدایا ان کے ساتھ یہ کر اور وہ کر، بلکہ صرف یہی کہتے ہیں کہ یہ مجرم لوگ ہیں ان کی ہدایت کی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی۔

خدا نے بھی ان کی دعا قبول فرمائی اور فرعونیوں پر عذاب کے نزول اور بنی اسرائیل کی اس عذاب سے نجات کے مقدمے کے طور پر موسیٰ کو حکم دیا: تو میرے بندوں کو راتوں رات لے کر نکل جا، کیونکہ فرعون اور اس کے لشکر والے تمہارے پیچھے آئیں گے (فاسر بعبادی لیلًا انکم متبعون)۔

لیکن گھبراؤ نہیں! ضروری ہے کہ وہ تمہارا پیچھا کریں تاکہ اس انجام کو دیکھ لیں جس کے وہ منتظر ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ راتوں رات خدا کے مومن بندوں یعنی بنی اسرائیل کو کہ جو ان پر ایمان لا چکے تھے اور کچھ دوسرے مصریوں کو جو ایمان لانے پر آمادہ تھے اور ان کی آواز پر لبیک کہہ چکے تھے اپنے ساتھ لے کر چل پڑیں اور نیل کے ساحل پر پہنچ جائیں اور معجزانہ طریقے پر دریائے نیل کو عبور کر کے اپنی موعود سرزمین یعنی فلسطین پہنچ جائیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور ان کے پیروکاروں نے رات کو یہ سفر اختیار کیا، لیکن یہ بھی مسلّم ہے کہ اتنی بڑی تعداد کا سفر اختیار کرنا زیادہ عرصے تک فرعونیوں کی نگاہوں سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا، شاید اس واقعے کو چند ہی گھنٹے گزرے

ہوں گے کہ فرعون کے جاسوسوں نے اُسے اس عظیم واقعے یا با الفاظ دیگر "غلاموں کے اجتماعی فرار" کی خبر پہنچادی۔ فرعون نے حکم دیا کہ ایک عظیم لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا جائے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ تمام مطالب اور یہ سب کچھ مندرجہ بالا آیت میں ایک نہایت ہی مختصر سے جملے میں بیان کر دیا گیا ہے اور وہ ہے،

" انکم متبعون "

" تمہارا تعاقب کیا جائے گا "

جو کچھ یہاں پر اختصار کے لیے حذف ہوا ہے وہ قرآن کی دوسری آیات میں مختصر عبارتوں کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کی ۷۷ ویں آیت میں ہے۔

" ولقد اوحینا الیٰ موسٰی ان اسر بعبادی فاضرب لھم طریقًا فی البحر یبسًا لا تخاف درکًا ولا تخشٰی "

" ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ ہمارے بندوں کو راتوں رات باہر لے جا اور ان کے لیے دریا میں خشک راستہ کھول، نہ تو تجھے دشمن کے تعاقب کا خوف ہوگا اور نہ ہی غرق ہونے کا خدشہ"

پھر زیر تفسیر آیات میں بیان فرمایا گیا ہے: جب تم سلامتی کے ساتھ دریا کو عبور کر لو تو دریا کو کھلا اور ٹھہرا ہوا رہنے دو۔ (واترک البحر رھوًا)۔

ان آیات میں دریا سے مراد وہی عظیم دریائے نیل ہے۔

مفسرین کرام اور ارباب لغت نے " رھو " (بروزن "سہو") کے دو معانی ذکر کیے ہیں۔ ایک معنی ہے " ٹھہرا ہوا " اور دوسرا " کھلا ہوا "۔ اس مقام پر دونوں معانی کو جمع کر دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

لیکن حضرت موسیٰؑ کو یہ حکم کیوں دیا گیا؟ تو یہ ایک فطری سی بات ہے کہ جناب موسیٰ اور بنی اسرائیل تو یہ چاہتے تھے کہ جب وہ اس دریا سے گزر جائیں تو فوراً دونوں طرف کا پانی آپس میں مل جائے اور یہ خشکی کا راستہ فوراً بھر جائے، تاکہ وہ جلدی اور سلامتی کے ساتھ لشکرِ فرعون سے دُور ہو جائیں اور موعود سرزمین کی طرف چل پڑیں، لیکن انھیں حکم ملتا ہے کہ دریا کو عبور کرتے وقت جلد بازی سے کام نہ لیں اور دریا کو اسی حال پر رہنے دیں تاکہ فرعون اور اس کی فوج کا آخری شخص تک اس میں داخل ہو جائے، کیونکہ نیل کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں کو انکی تباہی اور بربادی کا حکم دیا جا چکا ہے۔

اسی لیے آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے: وہ سب غرق شدہ لشکر ہیں (انھم جند مغرقون)۔

خدا کا یہ حتمی فرمان ان مغرور اور سرکش لوگوں کے بارے میں ہے کہ انھیں نیل کے اس عظیم دریا میں غرق ہونا چاہیئے جو ان کی ثروت اور طاقت کا سرچشمہ ہے اور جو ان کی زندگی اور حیات کا عامل ہے اسے ہی خدا کے ایک فرمان کے ذریعے موت اور تباہی و بربادی کا سبب بننا چاہیئے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، جب فرعون اور اس کے لشکر والے نیل کے ساحل پر پہنچے تو اس وقت تک بنی اسرائیل دوسرے کنارے سے دریا عبور کر چکے تھے۔ چونکہ اس قسم کے راستے کا نیل کے درمیان میں نمودار ہونا ہر ابجد خواں بچے کو خدا کے ایک عظیم معجزہ

ہونے کی جانب متوجہ کرنے کے لیے کافی تھا لیکن غرور اور تکبر نے ان عقل کے اندھوں کو اس کھلم کھلا حقیقت کو سمجھنے کی اجازت نہیں دی کہ وہ اپنی غلطی کو محسوس کرتے اور خدا کی بارگاہ میں سربسجود ہو جاتے۔ شاید انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ نیل میں اس قسم کی تبدیلی بھی فرعون کے حکم سے عمل میں آئی ہے۔ اور شاید فرعون یہی بات اپنے پیروکاروں سے کہہ کر اس دریائی راستے پر چل پڑا اور اس کے پیروکاروں کا آخری فرد بھی اس کے پیچھے آگیا۔ وہ سب دریا کے درمیانی حصے میں پہنچ گئے تو اچانک نیل کی ٹھاٹھیں مارتی موجیں بوسیدہ عمارت کی طرح یک دم ان پر آگریں اور سب کو دریا میں غرق کر دیا۔

ایک نکتہ جو ان آیات میں انسان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرواتا ہے وہ ان آیات کا نہایت ہی اختصار ہے اور وہ اپنے اس اختصار کے باوجود جامع بھی ہیں، کیونکہ ان اضافی جملوں کو حذف کر دیا گیا ہے جو یا تو قرائن کی وجہ سے یا پھر دوسرے جملوں کی وجہ سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ ایک مفصل داستان کو تین آیتوں یا تین مختصر جملوں میں بیان کیا جارہا ہے اور وہ تین جملے صرف یہی کہہ رہے ہیں کہ:

"موسیٰ نے اپنے رب کی بارگاہ میں عرض کی یہ لوگ مجرم ہیں"۔

"اسے کہا گیا کہ میرے بندوں کو راتوں رات یہاں سے نکال لے جا کہ تمھارا تعاقب ہوگا"۔

"دریا کو کھلا اور ٹھہرا ہوا چھوڑ دے کہ وہ غرق شدہ لشکر ہیں"۔

باوجودیکہ وہ ابھی غرق نہیں ہوئے تھے ان کے لیے "غرق شدہ" کی تعبیر خدا کے اس فرمان کے قطعی اور حتمی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ فرعون اور فرعونیوں کے غرق ہونے کے بعد کون کون سے عبرت انگیز واقعات رونما ہوئے۔

قرآن کریم نے بعد کی آیات میں ان کی اس عظیم دولت کو پانچ موضوعات کی صورت میں بیان کیا ہے جو ان کی تمام زندگی کی فہرست بنتی ہے اور وہ بنی اسرائیل کو میراث کی صورت میں ملے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ کتنے باغات اور چشمے چھوڑ کر چلے گئے۔ (کم ترکوا من جنٰت و عیون)۔

باغات اور چشمے اُن کے تمام اموال میں زیادہ قیمتی اور نہایت اہم سرمایہ تھے کیونکہ نیل ہی کی بدولت مصر کی سرزمین زرخیز اور ثمر آور تھی۔ ان چشموں سے مراد ممکن ہے وہ چشمے ہوں جو بعض پہاڑوں سے پھوٹ کر زمینوں کو سیراب کیا کرتے تھے یا پھر وہ چھوٹے بڑے ندی نالے ہوں جو دریائے نیل سے نکالے گئے تھے اور ان کے سرسبز و شاداب اور خرم و آباد باغوں سے گزرتے تھے اور ان ندی نالوں پر "عین" (چشمے) کا اطلاق بعید نہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے: اور کھیتیاں اور دل کش، خوبصورت اور گراں قیمت محلات۔ (و زروع و مقام کریم)۔

یہ دونوں بھی ان کا اہم سرمایہ تھے۔ عظیم زرکھیتی باڑی جس کی نیل کے پانی سے آبپاشی کی جاتی تھی اور پورے مصر کا اس پر دارومدار تھا۔ انواع و اقسام کی اجناس کی پیداوار اور دوسری زرعی چیزیں جن سے خود بھی استفادہ کرتے تھے اور دوسرے ملکوں کو بھی برآمد کیا کرتے تھے اور پورے ملک کا اقتصادی نظام اسی زراعت کا مرہون منت تھا۔

یہی حال اونچے اونچے محلات اور آبادیوں کا ہے، کیونکہ انسانی زندگی میں انھیں بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔

البتہ ان محلات کا "کریم" اور قیمتی ہونا، ظاہری نقطۂ نظر سے ہے اور خود ان کے اپنے نظریئے کا بیان ہے، ورنہ قرآنی منطق کی رُو سے تو اس قسم کے طاغوتی ٹھاٹھ باٹھ اور یادِ خدا سے غافل کرنے والے مکانات اور محلات کسی قسم کی "کریمی" کے حامل نہیں ہیں۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ "مقام کریم" سے مراد جشن و شادمانی کی محفلیں ہیں اور یا وہ منبر ہیں جن پر قصیدہ خواں اور شعراء لوگ بیٹھ کر فرعون کی قصیدہ خوانی کیا کرتے تھے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

چونکہ ان کے پاس مذکورہ چار اہم امور کے علاوہ بڑی مقدار میں حصولِ نعمت کے اور بھی بہت سے وسائل تھے، جن کی طرف ایک مختصر سے جملے میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور دوسری بہت سی نعمتیں جن میں عیش و عشرت کیا کرتے تھے اور ناز و نعمت کے ساتھ زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ (ونعمة كانوا فيها فاكهين)۔ [1] و [2]

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: جی ہاں! ان کے ساتھ ایسا ہی ہوا اور ہم نے فرعون والوں کی تمام دولت و سلطنت اور اموال کا وارث دوسرے لوگوں کو بنا دیا (كذالك و اورثناها قوما اخرين)۔ [3]

"قوما اخرين" سے مراد بنی اسرائیل ہیں کیونکہ سورۂ شعراء کی آیت ۵۹ میں اس بارے میں تصریح ہو چکی ہے اور لفظ "ارث" سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ وہ کسی دُکھ درد اور تکلیف اٹھائے اور خونِ جگر دیئے بغیر ان تمام اموال اور ثروت کے مالک بن گئے جس طرح انسان کو کسی تکلیف کے بغیر وراثت ملتی ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اسی آیت سے اور اس جیسی سورۂ شعراء کی آیت سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ فرعون اور فرعون کے ساتھیوں کے غرق ہو جانے کے بعد بنی اسرائیل سرزمین مصر کی طرف لوٹ آئے اور فراعنہ کی میراث کے وارث بنے اور وہیں پر اپنی حکومت قائم کی اور حالات کا رُخ بھی یہی بتاتا ہے کیونکہ مصری فرعونیوں کے اقتدار اور حکومت کے خاتمے کے بعد موسیٰ علیہ السلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے تھے کہ وہ ملک کسی قسم کے سیاسی خلفشار کا شکار ہو جائے۔

---

[1] "نعمة" (نون پر زبر کے ساتھ) کا معنی حصولِ نعمت ہے۔ اور نون کی زیر کے ساتھ ہو تو معنی نعمت کا بھیجنا ہے۔ یہ تصریح بیشتر مفسرین اور اربابِ لغت کی ہے، جب کہ دوسرے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ دونوں کا ایک ہی معنی ہے اور ہر قسم کا اہم فائدہ اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

[2] "فاكهين" کا معنی کبھی تو "فواكه" یعنی پھلوں سے استفادہ کرنے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی خوش طبعی اور دل لگی کی باتوں کے معنی میں اور کبھی کبھی ہر قسم کی لذت اُٹھانے اور نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ البتہ آخری معنی دوسرے تمام معنوں سے زیادہ جامع ہے۔

[3] "كذالك" مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور اس کی تقدیر یوں ہے: "الامر كذالك" اور اس طرح کے الفاظ تاکید کے لیے استعمال ہوتے ہیں بعض مفسرین نے اس کی ترکیب کے متعلق اور بھی کئی احتمالات کا ذکر کیا ہے۔

لیکن یہ بات قرآن مجید کی ان تصریحات کے منافی نہیں ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل ، فرعون والوں کے چنگل سے آزاد ہو جانے کے بعد فلسطین کی موعود سرزمین کی طرف چل دیئے جس کے واقعات بھی قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں، کیونکہ اس بات کا امکان ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ جن کے قبضے میں مصر کی زمین آچکی تھی ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نمائندوں کی حیثیت سے وہیں پر رہ گئے ہوں اور دوسرے بہت سے لوگ راہی دیار فلسطین ہو گئے ہوں۔

(اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے سورۂ شعراء کی ۵۹ ویں آیت کے ذیل میں تفسیر نمونہ کی ۸ ویں جلد کا مطالعہ فرمائیں۔)

اسی سلسلے کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے ، نہ تو آسمان نے ان پر گریہ کیا اور نہ ہی زمین نے اور نہ ہی انھیں بلاؤں کے نازل ہونے کے وقت کوئی مہلت دی گئی۔ (فما بکت علیھم السماء والارض وما کانوا منظرین)۔

ان پر آسمان وزمین کے گریہ نہ کرنے سے شاید ان کی حقارت ، اور ان کے لیے کسی دوست اور ہمدرد کا نہ ہونا مراد ہے کیونکہ عربوں میں یہ معمول ہے کہ جب کسی پر واقع ہونے والی مصیبت کے موقع پر اس کے مقام کی عظمت اور اہمیت کو جتلانا چاہیں تو کہتے ہیں "اس پر آسمان وزمین روئے اور اس کے فقدان پر سورج اور چاند تاریک ہو گئے"۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے مراد "زمین و آسمان والوں کا گریہ ہے" کیونکہ وہ مومنین اور خدا کے مقربین کے لیے گریہ کرتے ہیں نہ کہ فرعونیوں جیسے جابروں کے لیے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آسمان وزمین کا گریہ حقیقی گریہ ہوتا ہے جو ایک قسم کی تبدیلی اور مخصوص سرخی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے (طلوع وغروب کے موقع پر رونما ہونے والی سرخی کے علاوہ)۔

جیسا کہ ایک روایت میں ہے :

"لما قتل الحسین بن علی بن ابی طالب بکت السماء علیہ و بکاؤھا حمرۃ اطرافھا"

"جب حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب کو شہید کر دیا گیا تو آسمان نے آپ پر گریہ کیا اور یہ رونا ایک خاص سرخی کی صورت میں تھا جو اس کے کناروں پر نمایاں ہوئی۔"

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک روایت میں ہے۔

"بکت السماء علی یحیی بن زکریا و علی الحسین بن علی (علیھما السلام) اربعین صباحا ولم تبک الا علیھما، قلت وما بکاءھا؟ قال کانت تطلع حمراء و تغیب حمراء"

آسمان یحییٰ بن زکریا علیہ السلام (جو اپنے زمانے کے طاغوت کے ہاتھوں نہایت ہی دردناک

۱؎ تفسیر مجمع البیان جلد ۹ ص (اسی آیت کے ذیل میں)

صورت میں شہید کیے گئے، اور حسین بن علی علیہما السلام پر چالیس دن روتا رہا اور ان دونوں کے علاوہ کسی اور پر نہیں رویا۔ راوی نے کہا: میں نے امام سے پوچھا کہ آسمان کا رونا کس قسم کا تھا؟ تو امام نے فرمایا، طلوع اور غروب آفتاب کے وقت ایک خاص سرخی آسمان پر ظاہر ہو جایا کرتی تھی۔[1]

لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ایک اور حدیث میں ہے:

"ما من مؤمن الا ولہ باب یصعد منہ عملہ وباب ینزل منہ رزقہ فاذا مات بکیا علیہ"

"کوئی مومن ایسا نہیں ہے جس کے لیے آسمان میں ایک دروازہ نہ ہو کہ جس سے اس کے اعمال اوپر جاتے ہیں اور ایک دروازہ ایسا ہے جس سے اس کا رزق نازل ہوتا ہے جب وہ مر جاتا ہے تو یہ دونوں دروازے اس پر گریہ کرتے ہیں۔"[2]

ان روایات میں کسی قسم کا باہمی تضاد نہیں ہے کیونکہ حضرت امام حسینؑ اور حضرت یحیٰی بن زکریا کی شہادت کے بارے میں مسئلے کی عمومی حیثیت ہے کہ تمام آسمانوں نے ان پر گریہ کیا، جب کہ آخری روایت ایک خاص اور محدود پہلو کی نشاندہی کرتی ہے۔[3]

بہرصورت ان تفاسیر کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے اور سب آیت کے مفہوم میں جمع ہو سکتی ہیں۔

ہاں البتہ یہ بات یقینی ہے کہ ظالموں اور تباہ کاروں کی موت پر نہ تو چشم فلک کو رونا آیا اور نہ ہی سورج پژمردہ ہوا، کیونکہ وہ ایسے خبیث افراد تھے گویا ان کا کائنات اور عالم بشریت کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔

جب عالم سے یہ بیگانے دھتکار دیئے گئے تو کسی کو بھی ان کی جدائی کا صدمہ نہ ہوا، نہ تو روئے زمین پر اور نہ ہی افلاک کی بلندیوں پر اور نہ ہی انسانی دلوں کی گہرائی میں۔ اسی لیے کسی نے بھی ان کی موت پر ایک آنسو تک نہیں بہایا۔

ہم ان آیات کے بارے میں امیرالمومنین علیہ السلام کی ایک روایت نقل کرکے اپنی بات ختم کرتے ہیں۔ روایت میں ہے کہ جب امیرالمومنین علیہ السلام مدائن سے گزر رہے تھے تو آپ کا گزر کسریٰ (نوشیرواں اور ساسانی بادشاہوں کے آثار سے ہوا۔ آپ نے ان آثار کا مشاہدہ فرمایا جو گرنے کے بالکل قریب تھے تو آپ کے ہم رکاب لوگوں میں سے ایک

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۹ ص۶۴ - (اسی آیت کے ذیل میں۔)

[2] تفسیر مجمع البیان جلد ۹ ص۶۴ -

[3] تفسیر "در منثور" میں ایک حدیث بیان کی گئی ہے، جس میں ان روایات کو جمع کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ (منقول از تفسیر المیزان جلد ۱۸، ص۱۵۱)

شخص نے عبرت کے عنوان سے یہ شعر پڑھا:

جرت الرياح على رسوم ديارهم فكأنهم كانوا على ميعاد

"ہوائیں ان کی سرزمین کے باقی ماندہ آثار پر چلنے لگیں (اور ان کے محلات سے ہوائے ہوا کی سنسناہٹ کے اور کچھ سنائی نہ دیا) گویا ان سب کی ایک وعدہ گاہ تھی جس کی طرف وہ روانہ ہو چکے ہیں۔"

حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا تم نے اس شعر کے بجائے یہ آیت کیوں نہیں تلاوت کی:

"كم تركوا من جنات وعيون وزروع ومقام كريم ونعمة كانوا فيها فاكهين .... فما بكت عليهم السماء والارض وما كانوا منظرين."[1]

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۵۳۱ (مادہ مون)۔

۳۰- وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِينِ ۝

۳۱- مِن فِرْعَوْنَ ۚ إِنَّهُۥ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِينَ ۝

۳۲- وَلَقَدِ اخْتَرْنَٰهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَى الْعَٰلَمِينَ ۝

۳۳- وَءَاتَيْنَٰهُم مِّنَ الْءَايَٰتِ مَا فِيهِ بَلَٰٓؤٌا مُّبِينٌ ۝

ترجمہ

۳۰- اور ہم نے بنی اسرائیل کو رسواکن عذاب سے نجات دلائی۔

۳۱- فرعون سے، کہ وہ ایک متکبر شخص اور حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے تھا۔

۳۲- اور ہم نے اپنے علم کی بنا پر انھیں عالمین میں سے منتخب کیا اور برتری دی۔

۳۳- اور ہم نے انھیں (اپنی قدرت کی) ایسی نشانیاں دیں کہ جن میں انکی صریح آزمائش تھی۔ (لیکن انہوں نے کفران نعمت کیا اور سزا پائی)۔

تفسیر

بنی اسرائیل کی آزمائش

گزشتہ آیات میں فرعونیوں کے غرق اور ہلاک ہونے اور ان کی شان وشوکت اور اقتدار کے خاتمے اور اقتدار اور شان وشوکت کا دوسروں کو منتقل ہونے کا تذکرہ تھا۔ زیر تفسیر آیات میں اس کے دوسرے پہلو یعنی بنی اسرائیل کی نجات کی بات ہورہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے بنی اسرائیل کو رسواکن عذاب سے نجات دلائی (ولقد نجینا بنی اسرائیل من العذاب المھین)۔

سخت اور طاقت فرسا جسمانی اور روحانی اذیتوں سے کہ جو ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکی تھیں۔ یعنی نومولود لڑکوں کو قتل کر دیا جاتا تھا اور خدمت اور ہوس بازی کے لیے لڑکیوں کو زندہ رکھا جاتا تھا، ان سے بے گار لی جاتی تھی اور کس قدر دردناک ہے ایسی قوم کا مقدر جو اس قسم کے خونخوار اور بدسیرت دشمن کے چنگل میں پھنس جائے۔

جی ہاں! خداوندِ عالم نے موسٰی علیہ السلام کے بحکم خدا قیام اور تحریک کی وجہ سے اس مظلوم قوم کو تاریخ کے سفاک ظالموں کے چنگل سے نجات بخشی لہٰذا اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے: "فرعون کے چنگل سے" (من فرعون)۔

کیونکہ وہ ایک متکبر شخص اور حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے تھا۔ (انہ کان عالیا من المسرفین)

یہاں پر "عالی" سے مراد مقام و منزلت کی سربلندی نہیں بلکہ اس کی برتری کی خواہش اور تجاوز اور اسراف میں طبندی ہے، جیسا کہ سورۂ قصص کی چوتھی آیت میں بھی آچکا ہے کہ:

"انّ فرعون علا فی الارض"

"فرعون نے زمین میں برتری چاہی (اور یہ برتری کی خواہش اس حد تک بڑھ گئی کہ اس نے خدائی کا دعویٰ کر ڈالا اور خود کو رب اعلیٰ کہلانے لگا۔)"

"مسرف" "اسراف" کے مادہ سے ہے جو حد سے ہر قسم کے تجاوز کو کہتے ہیں، خواہ وہ اعمال میں ہو یا گفتار میں۔ اسی لیے قرآن مجید کی مختلف آیات میں تباہ کاروں کے بارے میں "مسرف" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو ظلم و فساد میں حد سے بڑھ گئے ہیں نیز مطلقاً گناہوں کو بھی "اسراف" کہا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ زمر کی ۵۳ ویں آیت میں ہے۔

"قل یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللّٰہ"

"کہہ دے، اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے آپ سے زیادتی کی ہے! خدا کی رحمت سے نا امید نہ ہو"

بعد کی آیت میں بنی اسرائیل پر خدا کی ایک اور نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

ہم نے انھیں اپنے علم کی بنا پر اس زمانے کے عالمین پر برتری دی اور انھیں برگزیدہ کیا۔ (ولقد اخترناھم علیٰ علم علی العالمین)۔

لیکن انہوں نے ان نعمتوں کی قدر نہیں جانی، بلکہ کفرانِ نعمت کیا اور اپنے کیے کی سزا پائی۔

اس طرح سے وہ اپنے زمانے کی "برگزیدہ اُمت" تھے، کیونکہ "عالمین" اس دور کے لوگ ہیں نہ کہ تمام زمانوں کے لوگ، کیونکہ قرآن نے صاف طور پر سورۂ آل عمران کی ایک سو دسویں آیت میں اُمتِ اسلامیہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"کنتم خیر امۃ اخرجت للناس ......"

"تم بہترین اُمت تھے، جنہوں نے لوگوں کے مفاد کے لیے عرصۂ وجود میں قدم رکھا"

جس طرح کہ ان سرزمینوں کے بارے میں ہے جن کے بنی اسرائیل وارث ہوئے، چنانچہ سورۂ اعراف کی ۱۳۷ ویں

آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

"واورثنا القوم الذین کانوا یستضعفون مشارق الارض ومغاربها
التی بارکنا فیها"

ہم نے اس مستضعف قوم کو بابرکت زمین کے مشارق ومغارب کا وارث بنایا۔

ظاہری بات ہے کہ بنی اسرائیل اس زمانے میں تمام دُنیا کے وارث نہیں بنے تھے بلکہ اُن کے اپنے علاقہ کے مشرق ومغرب مراد ہیں۔

البتہ بعض مفسرین اس بات کے معتقد ہیں کہ بنی اسرائیل میں بعض ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو تاریخی طور پر صرف انہی کے ساتھ مخصوص ہیں جن میں سے ایک، انبیاء کی کثرت ہے کیونکہ کسی قوم میں سے اس قدر انبیاء مبعوث نہیں ہوئے۔

لیکن یہ بات علاوہ اس کے کہ ان کی مطلق خصوصیت ثابت نہیں کرتی، ان کی کسی قسم کی خصوصیت بھی نہیں بن سکتی کیونکہ ممکن ہے ہم ان میں سے کثیر تعداد میں انبیاء کے قیام کو ان کی نہایت سرکشی اور ڈھٹائی کی دلیل سمجھیں۔ جیسا کہ جناب موسیٰؑ کے قیام کے بعد والے واقعات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنے پیغمبر کے ساتھ کیا کیا کچھ کیا؟

بہر حال ہم نے جو کچھ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں بیان کیا ہے وہ ایسی چیز ہے جسے بہت سے مفسرین نے بنی اسرائیل کی بالنسبتہ لیاقت کے طور پر قبول کیا ہے۔

لیکن اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ یہ ہٹ دھرم قوم بقول قرآن مجید ہمیشہ اپنے انبیاء کو ستاتی رہی، اور پوری ہٹ دھرمی اور خاص تعصب کی بنا پر احکام الٰہی کا مقابلہ کرتی رہی حتیٰ کہ جب وہ تازہ تازہ دریائے نیل سے نجات پاچکی تھی موسیٰ علیہ السلام کو بت سازی کی تجویز پیش کر دی، ممکن ہے یہ بات کہی جائے کہ مندرجہ بالا آیت ان کے کسی خصوصی امتیاز کو بیان نہیں کر رہی، بلکہ ایک اور حقیقت کی نشاندہی کر رہی ہے اور اس آیت کا معنی یُوں ہے۔

"باوجودیکہ ہم جانتے تھے وہ خدا کی نعمتوں سے ناجائز مفاد اٹھائیں گے، پھر بھی ہم نے انھیں سربلندی عطا کی تاکہ ہم انھیں آزمائیں۔"

جیسا کہ بعد کی آیت سے بھی یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انھیں اور بھی نعمتیں عطا کیں تاکہ انھیں آزمائے۔

تو اس طرح سے اللہ کا یہ انتخاب نہ فقط ان کی کسی خصوصیت کی دلیل نہیں بلکہ ضمنی طور پر ان کی مذمت کا حامل بھی ہے کیونکہ انہوں نے اس نعمت کا حق ادا نہیں کیا اور اس امتحان سے عہدہ برآ نہیں ہوئے۔

زیر تفسیر آیات کے سلسلے کی آخری آیت میں ان بعض نعمتوں کا ذکر ہے جو خدا نے انھیں عطا کی تھیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے، اور ہم نے انھیں اپنی عظمت اور قدرت کی ایسی نشانیاں دیں جن میں ان کی صریح آزمائش تھی (واتیناهم من الآیات ما فیه بلاء مبین)۔

کبھی تو سینا کے صحراؤں اور تیہ کی وادیوں میں ان کے سروں پر بادلوں کا سایہ کیا، کبھی ان پر "من وسلویٰ" نازل کیا کبھی سخت پتھروں کے دل سے پانی کا چشمہ ان کے لیے جاری کیا اور کبھی دوسری مادی اور روحانی نعمتیں ان کے نصیب کیں۔

لیکن یہ سب کچھ امتحان اور آزمائش کے لیے تھا، کیونکہ خدا تعالیٰ کچھ لوگوں کو مصیبت کے ذریعے آزماتا ہے، اور کچھ کو نعمت کے ذریعے، جیسا کہ سورۂ اعراف کی ۱۶۸ ویں آیت میں ہے:

"وبلوناھم بالحسنات والسیئات لعلھم یرجعون۔"

"ہم نے بنی اسرائیل کو نعمتوں کے ذریعے آزمایا کہ شاید وہ غلط راستے سے باز آجائیں۔"

بنی اسرائیل کی یہ سرگزشت صدر اسلام کے مسلمانوں کے لیے بیان کرنے کا مقصد شاید یہ ہو کہ وہ دشمنوں کی کثرت اور ان کی طاقت سے نہ گھبرائیں اور مطمئن رہیں کہ جو خدا فرعونوں کی طاقت، اقتدار اور عظمت کو خاک میں ملا سکتا ہے اور بنی اسرائیل کو ان کے ملک اور حکومت کا وارث بنا سکتا ہے وہ مستقبل قریب میں اس قسم کی کامیابی تمہارے نصیب بھی کر سکتا ہے لیکن جیسا کہ نعمتوں کے ذریعے ان کی آزمائش ہوئی ہے، تمہیں بھی اسی طرح امتحان کی بھٹی میں ڈالا جائے گا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اقتدار اور طاقت کے حصول کے بعد تم کیا کرو گے؟

اور یہ زبردست تنبیہ ہے تمام اقوام اور ملتوں کے لیے کہ جب انھیں خدائی مہربانی، کامیابی اور نعمت نصیب ہو جاتی ہے تو اس موقع پر سخت امتحان کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔

۳۴۔ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ۝

۳۵۔ اِنْ هِىَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ۝

۳۶۔ فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

ترجمہ

۳۴۔ یہ (مشرکین) کہتے ہیں۔

۳۵۔ ہمیں تو صرف ایک بار مرنا ہے اور ہرگز زندہ نہیں ہوں گے۔

۳۶۔ اگر تم سچ کہتے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے لے آؤ (تاکہ وہ گواہی دیں)

تفسیر

یہی موت ہے اور بس

گذشتہ آیات میں فرعون اور فرعونیوں کی زندگی کی تصویر کشی کی گئی تھی اور ان کے کفر و انکار کے انجام کا تذکرہ تھا۔ اب ایک بار پھر مشرکین کی باتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے اور معاد کے بارے میں ان کے شکوک کو جو کہ سورت کے آغاز میں مذکور ہو چکے ہیں ایک مرتبہ پھر دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جا رہا ہے، یہ مشرکین یوں کہتے ہیں۔ (ان ھٰؤُلآء لیقولون)۔

ہمیں تو صرف ایک بار مرنا ہے اور ہم ہرگز دوبارہ زندہ نہیں ہوں گے (ان ھی الا موتتنا الاُولٰی وما نحن بمنشرین)[1]۔

---

[1] ضمیر "ھی" کا مرجع کیا ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے مختلف نظریات ہیں۔ بعض مفسرین اسے "موتۃ" کی طرف پلٹاتے ہیں کیونکہ کلام کے سیاق سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ بنابریں آیت کا معنی یہ ہوگا:

"ما الموتۃ الا موتتنا الاُولٰی"

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

معاد، حیات بعد الموت، جزا و سزا اور جنت و جہنم کے بارے میں محمدؐ جو کچھ کہتے ہیں ان میں سے کسی ایک کی بھی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ سرے سے حشر و نشر کا ہی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ مشرکین صرف پہلی موت پر ہی کیوں زیادہ زور دیتے ہیں؟ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس موت کے بعد دوسری موت نہیں ہے، جبکہ ان کی مراد حیات بعد الموت کی نفی ہونا ہے نہ کہ دوسری موت کا انکار۔ دوسرے لفظوں میں انبیاء کرام علیہم السلام نے حیات بعد الموت کی خبر دی ہے نہ کہ دوسری موت کی۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی مُراد بعد از مرگ دوسری حالت کے وجود کا انکار ہے، یعنی ہم فقط ایک بار مریں گے اور یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد نہ تو دوبارہ زندگی ہوگی اور نہ ہی دوبارہ موت۔ جو کچھ ہے صرف یہی ایک موت ہے۔ (غور کیجئے گا)[1]

درحقیقت اس آیت کا مفہوم سورہ انعام کی ۲۹ ویں آیت سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے، جس میں کہا گیا ہے:

"وقالوا ان ھی الا حیاتنا الدنیا وما نحن بمبعوثین"

"انھوں نے کہا، زندگی تو صرف یہی دُنیا کی زندگی ہے اور ہم ہرگز دوبارہ نہیں اُٹھائے جائیں گے"۔

اس کے بعد ان کی گفتار کو نقل کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے بے بنیاد دعوے کے لیے پورے دلائل پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں، اگر تم سچ کہتے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے ہمارے پاس لے آؤ تاکہ وہ تمہاری سچائی کی گواہی دیں (فأتوا بآبائنا ان کنتم صادقین)۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ باتیں کہنے والا ابوجہل تھا، جس نے رسُول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف مُنہ کر کے کہا:

"اگر تو سچ کہتا ہے تو اپنے جد "قصی بن کلاب" کو زندہ کر کیونکہ وہ ایک سچا انسان تھا اور ہم اس سے موت کے بعد کے حالات دریافت کریں گے"۔[2]

(بقیہ حاشیہ سابقہ صفحہ کا) ملاحظہ ہو تفسیر تبیان، تفسیر مجمع البیان اور تفسیر کشاف۔

جبکہ بعض دوسرے مفسرین ضمیر کا مرجع "عاقبۃ" اور "نھایۃ" کو جانتے ہیں، تو ایسی صُورت میں آیت کا معنی یوں ہوگا۔

"ما عاقبۃ امرنا الا الموتۃ الاولیٰ"۔

(دیکھئے تفسیر رُوح المعانی اور تفسیر المیزان)

البتہ نتیجے کے لحاظ سے ان میں چنداں فرق نہیں ہے۔

[1] مفسرین نے اس جُملے کی تفسیر میں کئی اور احتمالات کو بھی ذکر کیا ہے جو سارے کے سارے بعید معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے "موتۃ اولیٰ" کو "اس دُنیا میں موت قبل از حیات" کے معنی میں لیا ہے، تو اس قول کی بنا پر اس جُملے کا مفہوم یُوں ہوگا کہ وہ موت جو اس حیات کے بعد ہے فقط وہی موت ہے جو ہم اختیار کر چکے ہیں اور ہم سب مٹی تھے لیکن ہماری دوسری موت کے بعد پھر زندگی کا وجود ہرگز نہیں ہے۔

[2] دیکھئے تفسیر مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۶۶ اور بعض دوسری تفسیریں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب ان کے حیلے بہانے تھے۔ اگرچہ خداوند عالم کا طریقۂ کار نہیں ہے کہ مردوں کو اس دُنیا میں زندہ کرے تاکہ وہ اُس جہان کی خبریں اِس دُنیا میں لوگوں کو بتائیں، لیکن اگر بالفرض ایسا کام آنحضرتؐ سے انجام پا بھی جاتا تو پھر یہ لوگ کوئی اور راگ الاپنا شروع کر دیتے اور اسے جادُو یا کسی اور چیز کا نام دے دیتے جس طرح انہوں نے بارہا آنحضرتؐ سے معجزے طلب کیے اور آپ نے وہ معجزے انہیں دکھائے بھی لیکن وہ ان کا انکار کر دیتے۔

معاد کے بارے میں مشرکین کا عقیدہ

مشرکین، خاص کر مشرکین عرب کا اعتقادی مسائل میں ایک مدرک نہیں تھا، وہ عقیدۂ شرک میں مشترک ہونے کے باوجود اعتقادی خصوصیات میں ایک دوسرے سے زبردست اختلاف رکھتے تھے۔

کچھ لوگ گروہ تھے جو نہ تو خدا کو مانتے تھے اور نہ ہی معاد کو، یہ وہ لوگ تھے جن کی باتوں کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

" ماھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما یھلکنا الا الدھر "

" اس دنیاوی زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں، کچھ لوگ مرجاتے ہیں تو کچھ لوگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور ہمیں تو صرف طبیعت ہی موت دیتی ہے۔ (جاثیہ۔ ۲۴)

کچھ لوگ ایسے تھے جو خدا کو مانتے تھے اور بتوں کو اس کی بارگاہ کے لیے شفیع سمجھتے تھے، لیکن معاد کے منکر تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کہا کرتے تھے:

" من یحی العظام وھی رمیم "

" ان گلی سڑی ہڈیوں کو کون دوبارہ زندہ کرے گا؟ " (یٰسٓ۔ ۷۸)

یہ لوگ بتوں کے لیے حج بھی بجا لاتے تھے اور قربانی بھی کیا کرتے تھے، حلال و حرام کے قائل بھی تھے۔ اور اکثر مشرکین عرب اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

بہت سے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک طرح سے بقائے رُوح کے قائل بھی تھے، خواہ تناسخ اور تازہ ابدان میں ارواح کے انتقال کی صُورت میں یا کسی اور طرح سے۔[1]

خاص کر "ھامۃ" نامی ایک پرندے کے متعلق ان کا عقیدہ مشہور ہے۔ عربوں کی داستانوں میں مذکور ہے کہ ان میں کچھ لوگ ایسے تھے جن کا یہ عقیدہ تھا کہ انسانی رُوح ایک پرندہ ہے جو اس کے جسم میں پھیلا ہوا ہے۔ جب انسان مرجاتا ہے یا قتل ہو جاتا ہے تو وہ اس کے جسم سے باہر آکر اس کے جسم کا وحشت ناک صُورت میں چکر لگانا شروع کر دیتا ہے اور اس کی قبر کے ارد گرد دنا بیٹھا رہتا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ پرندہ پہلے پہل تو چھوٹا ہوتا ہے، لیکن بعد میں بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُلو جتنا ہو جاتا

---

[1] نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد اوّل ص۱۱۔

ہے اور وہ ہمیشہ تنہائیوں میں رہتا ہے اور اس کا اکثر ٹھکانا پرانے کھنڈرات، خالی گھر، قبریں اور قتل گاہیں ہوتی ہیں۔

ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ اگر کسی کو قتل کر دیا جاتا تو "ھامۃ" اس کی قبر پر بیٹھ کر یہ فریاد کرتا رہتا ہے:

"اسقونی فانی صدیۃ"

"مجھے پانی پلاؤ کیونکہ میں بہت پیاسا ہوں"۔[1]

اسلام نے ان تمام خرافاتی عقائد پر خط تنسیخ کھینچ دیا، لہٰذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک مشہور حدیث منقول ہے کہ:

"لا ھامۃ"

"ہامہ کا عقیدہ جھوٹ ہے"۔[2]

بہر حال اگرچہ وہ معاد اور انسان کی بعد از موت زندگی کی طرف واپسی کے معتقد نہیں تھے، لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک طرح کے تناسخ اور بقائے روح کے قائل ضرور تھے۔

لیکن جسمانی معاد کے متعلق قرآن نے جو تصریحات پیش کی ہیں ان سب کے منکر تھے۔ مثلاً انسان کی مٹی دوبارہ اکٹھی کی جائے گی اور وہ نئی زندگی کا آغاز کرے گا اور روح اور جسم مشترکہ طور پر معاد کے حامل ہوں گے، وغیرہ، وہ ان عقائد کا انکار ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ ان سے خائف بھی تھے۔ قرآن مجید نے مختلف بیانات کے ذریعہ ان عقائد کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان کا ثبوت پیش کیا ہے۔

---

[1] و [2] بلوغ الارب جلد ۲ صفحہ ۳۱۱۔

۳۷۔ اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ اَهْلَكْنٰهُمْ ۡ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ○

۳۸۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○

۳۹۔ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۳۷۔ آیا وہ بہتر ہیں یا قوم تبع اور وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے ؟ ہم نے ان سب کو ہلاک کر ڈالا کیونکہ وہ مجرم لوگ تھے۔

۳۸۔ ہم نے آسمانوں کو اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔

۳۹۔ ہم نے ان دونوں کو صرف حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

تفسیر

آیا وہ بہتر ہیں یا قوم تبع؟

سرزمین یمن جزیرۃ العرب میں واقع ہے اور اس کا شمار دُنیا کی ایسی آباد اور بابرکت زمینوں میں ہوتا ہے، جو ماضی میں

درخشندہ تمدن کی حامل تھیں اس سرزمین پر ایسے بادشاہ حکومت کیا کرتے تھے جن کا نام "تبع" اس کی جمع "تبابعہ" ہے انھا چونکہ لوگ ان کی "اتباع" کیا کرتے تھے، اس لیے ان کو "تبع" کہتے تھے یا پھر اس لیے کہ وہ کئی پشتوں تک پیچھے بعد دیگرے برسر اقتدار آتے رہے۔

بہرحال تبع کی قوم ایسے افراد پر مشتمل تھی جن کے پاس بے پناہ طاقت تھی اور جو وسیع و عریض مملکت کی مالک تھی۔

مشرکین مکہ اور ان کے معاد و قیامت کے انکار کے تذکرے کے بعد "قوم تبع" کی داستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھیں تنبیہ کی جا رہی ہے کہ خدا کا عذاب قیامت ہی میں ان کا منتظر نہیں ہے بلکہ اس دنیا میں بھی "قوم تبع" جیسی کا فراور بگاڑ قوم جیسے انجام سے بھی دوچار ہوں گے۔

چنانچہ فرماتا ہے "آیا وہ بہتر ہیں یا قوم تبع اور وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے؟ ہم نے ان سب کو ہلاک کر ڈالا کیونکہ وہ مجرم لوگ تھے۔ (اھم خیر ام قوم تبع والذین من قبلھم اھلکناھم انھم کانوا مجرمین)۔

ظاہر ہے کہ حجاز کے باشندے جو "قوم تبع" کے پڑوس میں رہتے تھے کم و بیش ان کی سرگزشت سے بھی آگاہ تھے۔ اسی لیے آیت میں اس داستان کو تفصیل سے بیان نہیں کیا گیا۔ بس اتنا کہا گیا کہ اس بات سے ڈرو کہ کہیں تمہارا انجام بھی تبع کی قوم یا اس جیسی دوسری قوموں کا سا نہ ہو جو تمہارے اردگرد شام و مصر کے رستوں میں تمہارے نزدیک رہتی تھی۔

بالفرض اگر تم قیامت کے منکر ہو بھی جاؤ تو کیا اس عذاب کا انکار کر سکتے ہو جو ان مجرم اور سرکش قوموں پر نازل ہوا!

"الذین من قبلھم" سے مراد قوم نوح، عاد اور ثمود جیسی قومیں ہیں۔

اور "قوم تبع" کے بارے میں انشاء اللہ تفصیلی گفتگو بعد میں آئے گی۔

گفتگو کا رخ ایک بار پھر مسئلہ معاد کی جانب موڑ دیا گیا ہے اور لطیف پیرائے میں اس حقیقت کو استدلال کے ساتھ ثابت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، غرض سب کو بے فائدہ اور بے مقصد پیدا نہیں کیا (وما خلقنا السماوات والارض وما بینھما لاعبین)۔[1]

یقیناً اس عظیم اور وسیع تخلیق کا کوئی مقصد ضرور ہے، اگر تمہارے بقول موت، زندگی کے خاتمے کا نام ہے اور چند روز تک کھانے پینے، سونے، لذتیں اٹھانے اور حیوانی خواہشات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بعد یہ دنیا و زندگی فنا ہو جائے گی اور تمام چیزوں کا خاتمہ ہو جائے گا، پھر تو یہ آفرینش بے کار بیہودہ اور بے فائدہ ہوگی۔

لیکن یہ ماننے والی بات نہیں ہے کہ صاحب قدرت و حکمت خدا نے اس قدر عظیم کائنات کو صرف اس چند روزہ اور

---

[1] "لاعب" "لعب" کے مادہ سے ہے اور راغب کے بقول اس عمل کو کہتے ہیں جو کسی صحیح ارادہ کے بغیر انجام پائے اور ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر ہے کہ "ما بینھما" میں تثنیہ کی ضمیر آسمان اور زمین کی وجہ سے ہے۔

زودگزر زندگی کے لیے بے مقصد اور طرح طرح کے رنج وغم اور دکھ درد کے ہمراہ تخلیق کیا ہو۔ یہ بات خدا کی حکمت کے شایانِ شان نہیں۔

بنا بریں اس کائنات کا وضعی مشاہدہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ کائنات ایک اور عظیم تر اور ابدی و دائمی کائنات کے لیے ایک دالان کی حیثیت رکھتی ہے۔ تم اس بارے میں غور وفکر سے کام کیوں نہیں لیتے۔

اسی حقیقت کو قرآن مجید نے کئی مقامات پر بیان کیا ہے۔ مثلاً سورۂ انبیاء آیت ۱۶ میں فرمایا گیا ہے:

"وما خلقنا السماء والارض وما بينهما لاعبين"

سورۂ واقعہ کی آیت ۶۲ میں ہے:

"ولقد علمتم النشأة الاولىٰ فلولا تذكرون۔"

"تم اپنی پہلی نشأۃ کو دیکھ چکے ہو پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے؟"

بہرحال اس دُنیا کی تخلیق اس وقت با مقصد ہو گی جب ایک اور کائنات اس کے بعد ہو، اس لیے تو الحادی مکتبِ فکر کے پیروکار اور معاد کے منکرین اس کائنات کی تخلیق کو بے مقصد اور بے فائدہ سمجھتے ہیں۔

پھر اس بات کی تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: ہم نے ان دونوں کو صرف حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ (ما خلقنا هما الا بالحق)۔

اس کائنات کا برحق ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کا کوئی معقول ہدف اور مقصد ہو اور یہ مقصد اس وقت پورا ہوتا ہے جب ایک اور جہان کے وجود کو تسلیم کیا جائے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ اس کا حق ہونا اس بات کا خواہاں ہے کہ نیک اور بدکار افراد یکساں نہ ہوں۔

چونکہ ہم کو اس دُنیا میں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے کہ نیکوکاروں کو جزا اور بدکاروں کو سزا صحیح معنی میں ملتی ہو، اسی لیے حق کا تقاضا یہی ہے کہ ایک اور جہان میں حساب وکتاب اور سزا و جزا ہو تاکہ ہر شخص اپنے کیے کا پھل پالے۔

خلاصہ یہ کہ اس آیت میں "حق" ایک تو تخلیق کائنات کے بامقصد ہونے کی طرف اشارہ ہے، دوسرے انسانوں کی آزمائش کی طرف، تیسرے قانون ارتقاء کی طرف اور چوتھے اصول عدالت کے اجراء کی طرف۔

"لیکن ان میں سے اکثر لوگ ان حقائق کو نہیں جانتے۔ (ولكن اكثرهم لا يعلمون)۔

کیونکہ وہ اپنی سُوجھ بُوجھ اور سوچ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ اگر وہ ایسا کرنے لگ جائیں تو مبداء و معاد کے دلائل واضح اور آشکار صورت میں موجود ہیں۔

قوم تبّع کون تھی؟

قرآن مجید میں صرف دو مقامات پر "تبّع" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ایک تو انہی آیات میں اور دوسرے سورۂ "ق" کی

۱۴ ویں آیت میں جہاں پر ارشاد ہوتا ہے:

"واصحٰب الایکۃ وقوم تبع کل کذب الرسل فحق وعید"

"گھنے درختوں کی سرزمین والی قوم شعیب اور قوم تبع، ہر ایک نے خدا کے رسولوں کو جھٹلایا تو خدا کی تہدید بھی ان کے بارے میں سچ ثابت ہو گئی۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ "تبّع" یمن کے بادشاہوں کا ایک عمومی لقب تھا، جس طرح ایران کے بادشاہوں کو کسریٰ ترک سلاطین کو خاقان، مصر کے بادشاہوں کو فرعون اور روم کے شہنشاہوں کو قیصر کہا جاتا تھا۔

یمن کے بادشاہوں کو "تبّع" یا تو اس لیے کہا جاتا تھا کہ یہ لوگوں کو اپنی پیروی کی دعوت دیا کرتے تھے، یا پھر اس کے لیے کہ وہ یکے بعد دیگرے سریر آرائے مملکت ہوا کرتے تھے۔

بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے یمن کے تمام بادشاہوں کی بات نہیں کی، بلکہ کسی خاص بادشاہ کا ذکر کیا ہے (جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے معاصر خاص فرعون کی بات کی ہے)۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس کا نام "اسعد ابو کرب" تھا۔

بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ وہ بذات خود حق طلب اور صاحب ایمان شخص تھا، انہوں نے قرآن مجید کی دونوں آیات سے استدلال کیا ہے، کیونکہ قرآن پاک کی مذکورہ دونوں آیات میں اس کی ذات کی مذمت نہیں کی گئی بلکہ اس کی قوم کی مذمت کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی جانے والی روایت بھی اسی بات کی شاہد ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

"لا تسبوا تبعا فانہ قد اسلم"

"تبع کو برا بھلا مت کہو کیونکہ وہ ایمان لا چکا تھا" [1]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"ان تبعا قال للاوس والخزرج کونوا ھاھنا حتی یخرج ھٰذا النبی، اما انا لو ادرکتہ لخدمتہ وخرجت معہ"

"تبع نے اوس اور خزرج سے کہا: تم یہیں پر رہ جاؤ! یہاں تک کہ اس پیغمبر کا ظہور ہو جائے، اگر مجھے ان کا زمانہ نصیب ہو جاتا تو میں ان کی پوری پوری خدمت کرتا، اور

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۶۷ اسی آیت کے ذیل میں۔ اسی سے ملتا جلتا مفہوم تفسیر در منثور نے بھی نقل کیا ہے۔ اسی طرح تفسیر روح المعانی جلد ۲۵ صفحہ ۱۲۸ میں بھی بیان ہوا ہے۔

ان کے ساتھ قیام کرتا۔ [1]

ایک اور روایت میں ہے کہ جب "تبع" اپنے کشور کشائی کے ایک سفر میں مدینہ کے قریب پہنچا تو وہاں کے ساکن یہودی علماء کو پیغام بھیجا کہ اس سرزمین کو ویران کرنا چاہتا ہوں تاکہ کوئی بھی یہودی اس جگہ نہ رہنے پائے، اور عرب قانون حکم فرما ہو۔

یہودیوں کا سب سے بڑا عالم شامُول تھا۔ اس نے کہا! اے بادشاہ! یہ وہ شہر ہے جو حضرت اسماعیل کی نسل سے پیدا ہونے والے ایک پیغمبر کی ہجرت گاہ بنے گا۔ پھر اس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چند صفات گنوائیں۔ تُبّع جس کے ذہن میں گویا اس بارے میں کچھ معلومات تھیں، نے کہا: تو پھر اس شہر کو ویران نہیں کروں گا۔ [2]

حتیٰ کہ ایک اور روایت میں اس داستان کے ذیل میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ اس نے "اوس" اور "خزرج" کے بعض قبائل کو جو اس کے ہمراہ تھے، حکم دیا کہ وہ اسی شہر میں رہ جائیں اور جب پیغمبر موعود ظہور کریں تو وہ ان کی امداد کریں اور اپنی اولاد کو بھی وہ اسی بات کی وصیت کرتا رہا۔ حتیٰ کہ اس نے ایک خط بھی تحریر کر کے ان کے سپرد کر دیا، جس میں پیغمبر اسلامؐ پر ایمان لانے کا اظہار کیا گیا تھا۔ [3]

صاحب اعلام قرآن رقمطراز ہیں:

> "تبع" یمن کے عالمگیر بادشاہوں میں سے ایک تھا کہ جس نے ہندوستان تک فوج کشی کی اور اس علاقے کی تمام حکومتوں کو اپنے زیرنگیں کر لیا۔ اپنی فوج کشی کی ایک مہم کے دوران میں وہ مکہ معظمہ پہنچا اور اس نے خانۂ کعبہ کے منہدم کرنے کا ارادہ کر لیا، لیکن وہ ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہو گیا کہ طبیب اس کے معالجے سے عاجز آ گئے۔
>
> اس کے ہمرکابوں میں کچھ اہلِ علم بھی موجود تھے، جن کا سرپرست شامُول نامی ایک حکیم تھا، اس نے کہا: آپ کی بیماری کا اصل سبب خانۂ کعبہ کے بارے میں بُری نیّت ہے۔
>
> "تبع" اپنے مقصد سے باز آ گیا اور نذر مانی کہ وہ خانہ کعبہ کا احترام کرے گا اور صحت یاب ہونے کے بعد خانۂ کعبہ پر یمانی چادر کا غلاف چڑھائے گا۔

دوسری تاریخوں میں بھی خانۂ کعبہ پر غلاف چڑھانے کی داستان منقول ہے جو تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ یہ

---

[1] تفسیر مجمع البیان، انہی آیات کے ذیل میں۔

[2] تفسیر رُوح المعانی جلد ۲۵ ص۱۱۔

[3] تفسیر رُوح المعانی جلد ۲۵ ص۱۱۔

فوج کشی اور کعبہ پر غلاف چڑھانے کا مسئلہ سنہ عیسوی میں وقوع پذیر ہوا۔ اب بھی شہر مکہ میں ایک جگہ موجود ہے جس کا نام "دارالتبابعہ" ہے۔ [1]

بہر حال یمن کے بادشاہوں (تبابعہ یمن) کی داستان کا ایک بہت بڑا حصہ تاریخی لحاظ سے ابہام سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی تعداد اور انکی حکومت کے عرصہ کے بارے میں زیادہ معلومات مہیا نہیں ہیں۔ اس بارے میں بعض متضاد روایتیں بھی ملتی ہیں۔ جو کچھ اسلامی روایات میں ہے وہ تفسیری مواد ہو یا تاریخی اور حدیثی، صرف اسی بادشاہ کے بارے میں ہے، جس کا قرآن میں دو مرتبہ ذکر ہوا ہے۔

---

[1] اعلام القرآن ص ۱۵۱ تا ص ۱۵۲ (تھوڑے سے اختصار کے ساتھ)

۴۰۔ اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ مِیْقَاتُهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۙ

۴۱۔ یَوْمَ لَا یُغْنِیْ مَوْلًی عَنْ مَّوْلًی شَیْـًٔا وَّ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ۙ

۴۲۔ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۠

ترجمہ

۴۰۔ (باطل سے حق کی) جدائی کا دن ان سب کے لیے مقرر گھڑی ہے۔

۴۱۔ جس دن کوئی دوست اپنے دوست کی ذرہ بھر امداد نہیں کر سکے گا اور کسی طرف سے انہیں کمک نہ پہنچ سکے گی۔

۴۲۔ مگر جس پر خدا اپنی رحمت کرے، کیونکہ وہی عزیز ورحیم ہے۔

تفسیر

جدائی کا دن یا یوم الفصل

زیر نظر آیات درحقیقت معاد کے بارے میں گزشتہ آیات کا نتیجہ ہیں کہ جن میں اس کائنات کی تخلیق کی حکمت کے حوالے سے قیامت کے وجود پر استدلال کیا گیا تھا۔

سب سے پہلی آیت میں اس استدلال سے یہ نتیجہ حاصل کیا جا رہا ہے کہ "یوم الفصل" یا جدائی کا دن ان سب کے لیے مقرر گھڑی ہے (انّ یوم الفصل میقاتھم اجمعین)۔

قیامت کے دن کو "یوم الفصل" سے تعبیر کرنا کس قدر دلچسپ ہے کہ جس روز حق کو باطل سے جدا کر دیا جائے گا اور نیک لوگوں کی صفیں بدکاروں سے علیحدہ ہو جائیں گی، اور انسان اپنے نزدیک ترین دوستوں تک سے جدا ہو جائے گا۔ جی ہاں وہی دن تمام مجرمین کیلیے

مقرر شدہ ہے۔[1]

پھر اس جدائی کے دن کی کچھ تشریح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس دن کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی فریاد کو نہیں پہنچے گا اور کوئی دوست اپنے دوست کی ذرہ بھر امداد نہیں کر سکے گا اور کہیں سے انہیں کمک نہیں پہنچے گی۔ (یوم لا یغنی مولیٰ عن مولیٰ شیئًا ولا ھم ینصرون)۔

یقیناً! وہی دن فصل اور جدائی کا دن ہوگا کہ جب انسان اپنے عمل کے سوا باقی تمام چیزوں سے جدا ہو جائے گا۔ "مولیٰ" جس معنی میں بھی ہو یعنی دوست ہو یا سرپرست ، ولی نعمت ہو یا قریبی رشتہ دار، ہمسایہ ہو یا مددگار وغیرہ قیامت کی مشکلات میں ایک معمولی سی مشکل بھی حل کرنے سے عاجز ہوگا۔

"مولیٰ" "ولاء" کے مادہ سے ہے جس کا معنی دو چیزوں کا ایسا باہمی رابطہ ہے جن کے درمیان کوئی اجنبی نہ ہو۔ اس معنی کے کئی مصداق ہیں، جو لغت کی کتابوں میں اس لفظ کے مختلف معانی کے طور پر ذکر ہوئے ہیں، کیونکہ ان سب کی بنیاد اور اصل معانی مشترک ہیں۔[2]

وہاں پر نہ صرف دوست ایک دوسرے کی فریاد کو نہیں پہنچ سکیں گے اور رشتہ دار ایک دوسرے کی گرہ کشائی نہیں کر سکیں گے بلکہ تمام منصوبے نقش بر آب ثابت ہوں گے، تمام تدبیریں الٹی ہو جائیں گی اور تمام تیر نشانے سے چوک جائیں گے جیسا کہ سورۂ طور کی آیت ۴۶ میں ہے۔

"یوم لا یغنی عنھم کیدھم شیئًا ولا ھم ینصرون"

"وہ دن ایسا ہوگا کہ جس میں ان کی تمام تدبیریں کسی مشکل کو حل نہیں کر پائیں گی اور ان کی کسی قسم کی مدد نہیں کی جا سکے گی"۔

"لا یغنی" اور "ولا ھم ینصرون" میں کیا فرق ہے؟ اس بارے میں بہترین قول یہ ہے کہ پہلا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی شخص اکیلا اور بذات خود اس دن کسی کی کوئی مشکل حل نہیں کر سکے گا اور دوسرا جملہ اس بات کی

---

[1] "میقاتھم" کی ضمیر کا مرجع کیا ہے، اس بارے میں مفسرین نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں۔ بعض مفسرین اسے تمام انسانوں کی طرف پلٹاتے ہیں۔ بعض مفسرین بالخصوص ان اقوام کی طرف جن کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہو چکا ہے۔ یعنی تبع کی قوم اور اس سے پہلے کی ظالم اقوام، لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

[2] لغت کی کتابوں میں "مولیٰ" کے بہت سے معانی ذکر ہوئے ہیں، حتیٰ کہ بعض ارباب لغت نے اس کے ستائیس ۲۷ سے زیادہ معانی لکھے ہیں ۱۔ رب، ۲۔ چچا، ۳۔ چچا زاد بھائی ۴۔ بیٹا، ۵۔ بھانجا، ۶۔ آزاد کرنے والا، ۷۔ آزاد ہونے والا، ۸۔ بندہ، ۹۔ مالک، ۱۰۔ تابع، ۱۱۔ جس کو نعمت مل چکی ہو، ۱۲۔ شریک، ۱۳۔ ہم پیمان، ۱۴۔ دوست، ۱۵۔ ہمسایہ، ۱۶۔ مہمان، ۱۷۔ داماد، ۱۸۔ قریبی رشتہ دار، ۱۹۔ نعمت عطا کرنے والا، ۲۰۔ منائع ہونے والا، ۲۱۔ سرپرست، ۲۲۔ زیادہ مناسب، ۲۳۔ آقا، ۲۴۔ دوست رکھنے والا، ۲۵۔ مددگار، ۲۶۔ اولیٰ بالتصرف، ۲۷۔ متولی۔ (الغدیر جلد ۱ ص ۳۶۲)

طرف اشارہ ہے کہ سب مل کر بھی ایک دوسرے کی مشکلات حل نہیں کر سکیں گے، کیونکہ نصرت کا اطلاق ایسے مقام پر ہوتا ہے جہاں کوئی شخص کسی دوسرے کی امداد کو پہنچے اور اس کی مدد کرے تاکہ دونوں مل کر مشکلات پر قابو پا لیں۔

وہاں پر صرف ایک گروہ مستثنیٰ ہوگا، جیسا کہ بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: مگر وہ کہ جس پر خدا نے رحمت کی ہو، کیونکہ خدا صاحبِ غلبہ اور رحیم ہے (الا من رحم اللہ انہ ھو العزیز الرحیم)۔

اس میں شک نہیں ہے کہ خدا کی یہ رحمت بلاشرط نہیں ہے، بلکہ صرف ان مومنین کے شاملِ حال ہوگی جو عمل صالح انجام دے چکے ہیں اور اگر ان سے کوئی لغزش سرزد ہوئی بھی ہوگی تو بھی اس حد تک نہیں کہ ان کے خدا کے ساتھ رابطے کو منقطع کر دے۔ ایسے ہی لوگ لطفِ الٰہی کے دامان سے وابستہ ہوں گے۔ اس کے دریائے جود و کرم سے بہرہ ور، اس کے چشمۂ رحمت سے سیراب اور اس کے اولیاء کی شفاعت کے حق دار ہوں گے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس دن ہر قسم کے دوست، ولی اور یاور کی نفی مسئلہ شفاعت کے منافی نہیں ہے، کیونکہ شفاعت بھی اذن و فرمان رب العزت کے بغیر حاصل نہیں ہوگی۔

یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ خدا کے "عزیز" اور "رحیم" ہونے کی صفات ایک دوسرے کے ساتھ ذکر ہوئی ہیں جن میں سے پہلی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا بے انتہا قدرت کا مالک اور ناقابلِ شکست ہے اور دوسری اس کی بے پایاں رحمت کی طرف اشارہ ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ قدرت رکھنے کے باوجود رحمت کا مالک ہے۔

اہل بیتؑ اطہار سے منقول بعض روایات میں ہے کہ "الا من رحم اللہ" سے مراد وصیِ رسول امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اور ان کے پیروکار ہیں۔ [1]

ظاہر ہے کہ ایسی روایات کا مقصد آیت کا ایک واضح مصداق بیان کرنا ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۶۲۹

۴۳۔ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝
۴۴۔ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۝
۴۵۔ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ۝
۴۶۔ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ۝
۴۷۔ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۝
۴۸۔ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ۝
۴۹۔ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۝
۵۰۔ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ۝

ترجمہ

۴۳۔ تھوہر کا درخت ....
۴۴۔ گناہگاروں کی سزا ہے۔
۴۵۔ پگھلی ہوئی دھات کی طرح، پیٹ میں ابال کھائے گا۔
۴۶۔ جیسے کھولتا ہوا پانی۔
۴۷۔ اس مجرم کافر کو پکڑلو اور دوزخ کے بیچ میں پھینک دو۔
۴۸۔ پھر اس کے سر پر کھولتا ہوا عذاب ڈالو۔

۴۹۔ (اس سے کہا جائے گا) مزا چکھ، کیونکہ تو (اپنے خیال کے مطابق) زبردست طاقت ور اور قابلِ احترام تھا۔

۵۰۔ یہ وہی چیز ہے جس میں تم لوگ ہمیشہ شک کیا کرتے تھے۔

تفسیر

تھوہر کا درخت

گذشتہ آیات میں "یوم الفصل" یا جدائی کے دن کی بابت بات ہو رہی تھی، لیکن ان آیات میں دوزخیوں کے وحشت ناک اور لرزا دینے والے عذاب کی ایک جھلک پیش کی جارہی ہے جو درحقیقت گذشتہ آیات کا تتمہ ہے۔

ارشاد ہوتا ہے، تھوہر کا درخت۔ (ان شجرت الزقوم)۔

گناہگاروں کی سزا ہے۔ (طعام الاثیم)۔

یہی لوگ ہوں گے جو اس کڑوے بدمزہ بدبودار اور مہلک درخت کو کھائیں گے۔

جیسا کہ ہم سورۂ صافات کی آیت ۶۲ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ مفسرین اور ارباب لغت کے بقول "زقوم" ایک ایسے پودے کا نام ہے جو کڑوا، بدمزہ اور بدبودار ہوتا ہے، جس کے پتے چھوٹے ہوتے ہیں اور جزیرۃ العرب کی سرزمین "تہامہ" میں پیدا ہوتا ہے اور جس سے مشرکین بھی آشنا تھے۔ یہ ایک ایسا پودا ہے جس کا شیرہ کڑوا ہوتا ہے۔ اگر یہ شیرہ بدن کو لگ جائے تو بدن سُوج جاتا ہے۔[1]

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ "زقوم" کا اصلی معنی "نگلنا" ہے۔[2]

جبکہ بعض دوسرے لوگوں نے اسے جہنمیوں کی ہر قسم کی نفرت انگیز غذا کے معنی میں لیا ہے۔[3]

ایک روایت میں ہے کہ جب یہ لفظ قرآن مجید میں نازل ہوا تو کفار قریش کہنے لگے، اس قسم کا پودا ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتا، تم میں سے کس شخص کو "زقوم" کے معنی کا علم ہے؟ تو وہاں پر ایک افریقی شخص بھی موجود تھا۔ اس نے

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر روح البیان اور تفسیر روح المعانی۔

[2] لسان العرب مادہ "زقم"۔

[3] مفردات راغب مادہ "زقم"۔

کہا" ہماری زبان میں "زقوم" کا معنی "کھجور اور مکھن ہے" (شاید اس کا مقصد بھی مذاق اڑانا تھا) جب ابوجہل نے یہ بات سنی تو اس نے استہزاء کے طور پر اپنی کنیز کو بلا کر کہا: "تھوڑا سا مکھن اور خرما لے آؤ تاکہ اس سے زقوم بنائیں" چنانچہ "زقوم" تیار کیا گیا اور وہ کھاتے بھی جاتے تھے اور مذاق بھی اڑاتے جاتے تھے اور کہتے تھے: "محمد ہمیں اسی چیز سے ڈراتا ہے"۔[1]

ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ لغت عرب اور قرآنی استعمال میں "شجرہ" کا لفظ کہیں پر تو "درخت" کے معنی میں آیا ہے اور کہیں پر مطلق "پودے" کے معنی میں۔

"اثیم" "اثم" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ایسا شخص جو ہمیشہ گناہوں میں غرق رہتا ہے؛ یہاں پر بہٹ دھرم، حد سے تجاوز کرنے والے اور گناہوں میں غرق کفار مراد ہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے: پگھلی ہوئی دھات کی طرح وہ گنا ہگاروں کے پیٹ میں ابال کھائے گا۔ (کالمھل یغلی فی البطون)۔

جیسے کھولتا ہوا پانی۔ (کغلی الحمیم)۔

بہت سے مفسرین اور ارباب لغت کے بقول "مھل" کے معنی پگھلی ہوئی دھات ہے اور مفردات میں راغب نے اور بعض دوسرے صاحبان لغت نے اس کا معنی "گھی یا تیل کی تلچھٹ" بتایا ہے، جو نہایت ہی ناپسندیدہ چیز ہوتی ہے لیکن اس کا پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"حمیم" کے معنی "کھولتا ہوا گرم پانی" ہے اور کبھی اس کا اطلاق گہرے اور پکے دوست پر بھی ہوتا ہے، لیکن یہاں پر پہلا معنی مراد ہے۔

بہرحال جب تھوہر ان کے جسم میں پہنچے گا تو انتہائی زیادہ حرارت پیدا کرکے کھولتے ہوئے پانی کے مانند پیٹ میں ابال پیدا کر دے گا، یہ غذا قوت اور طاقت کا ذریعہ بننے کے بجائے مصیبت، عذاب اور دکھ درد کا سبب بن جائے گی۔

پھر فرمایا گیا ہے کہ دوزخ پر مامور فرشتوں کو خطاب ہوگا: گناہوں میں غرق ان مجرموں کو پکڑلو اور انہیں جہنم میں پھینک دو۔ (خذوہ فاعتلوہ الی سواء الجحیم)۔

"فاعتلوہ" "عتل" (بروزن "قتل") کے مادہ سے ہے، جس کا معنی پکڑنا، گھسیٹنا اور پھینکنا ہے۔ جیسا کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے سرکش مجرمین کے ساتھ سرکاری کارندے کرتے ہیں۔

"سواء" کا معنی "درمیان" ہے، کیونکہ اس کا فاصلہ ہر طرف سے مساوی ہوتا ہے۔ ایسے افراد کو جہنم کے درمیان میں لے جانے کا مقصد یہ ہوگا کہ وہاں کی حرارت نسبتاً زیادہ شدید ہوگی اور آگ کے شعلے اسے ہر طرف سے گھیرے ہوں گے۔

پھر ان کی ایک اور المناک سزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے؛ پھر دوزخ پر مامور فرشتوں کو حکم دیا

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۵۲۹ (سورۂ صافات کی ۶۲ ویں آیت کے ذیل میں)

بائے گا۔ اس کے سر پر کھولتا ہوا عذاب ڈالو (ثم صبوا فوق رأسه من عذاب الحميم)۔[1]

اس طرح سے ایک تو وہ اندر سے جلیں گے اور دوسرے باہر سے جہنم کی آگ ان کے تمام وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور آگ کے درمیان میں بھی ان پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔

اسی سے ملتی جلتی ایک اور آیت سورۂ حج میں بھی بیان ہوئی ہے، ارشاد ہوتا ہے :

" يصب من فوق رؤسهم الحميم " (حج : ۱۹)

ان تمام دردناک جسمانی عذابوں کے بعد انہیں جانکاہ روحانی سزاؤں سے بھی دو چار ہونا پڑے گا۔ ارشاد ہوتا ہے، کہ اس گنا ہگار سرکش اور بے ایمان مجرم سے کہا جائے گا : مزہ چکھ! کیونکہ تو وہی شخص تو ہے جو بزعم خویش سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ قابلِ احترام تھا۔ (ذق انك انت العزيز الكريم)۔

تو ہی تو تھا جس نے بے چارے مظلوموں کو زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا ان پر ظلم و ستم کیا کرتا تھا - اپنی ناقابلِ تسخیر طاقت کا لوہا منوانے کے درپے تھا اور لوگوں سے اپنا بہت زیادہ احترام کرواتا تھا۔

جی ہاں! یہ تو ہی تھا کہ اس تمام غرور کے ساتھ ہر قسم کے جرم کا ارتکاب کیا کرتا تھا۔ اب تو اپنے تمام اعمال کا مزہ چکھ کہ سب کچھ تیری آنکھوں کے سامنے مجسم ہو چکا ہے۔ جس طرح تو دنیا میں لوگوں کے جسم و روح کو جلایا کرتا تھا اب تو خود اندر اور باہر سے خدا کے قہر کی آگ اور کھولتے ہوئے گرم پانی میں جل رہا ہے۔

روایت میں ہے کہ ایک دن رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوجہل کا ہاتھ پکڑ کر کہا :

" اولی لك فاولی "

" ابوجہل! انتظار کرو، انتظار "

یہ سن کر ابوجہل ناراض ہوگیا اور اپنا ہاتھ چھڑا کر کہنے لگا :

" بای شیء تهددنی؟ ما تستطيع انت وصاحبك ان تفعلا بی شيئاً!

انی لمن اعز هذا الوادی واكرمه "

" مجھے کس بات کی دھمکی دے رہے ہو؟ نہ تو تم میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو اور نہ ہی تمہارا صاحب (خدا) میرا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ میں مکہ کی تمام دھرتی میں سب سے زیادہ طاقت ور اور صاحب احترام شخصیت ہوں "

مندرجہ بالا آیت اسی چیز کو بیان کر رہی ہے۔ آیت کہتی ہے کہ جب اسے آتش جہنم میں ڈالا جائے گا تو اسے کہا جائے گا : اے طاقت ور سرزمین مکہ کے معزز انسان! اس عذاب کا مزہ چکھ۔[2]

---

[1] "عذاب الحميم" اضافت بیانیہ ہے یعنی یہ کھولتا ہوا گرم پانی ایک عذاب ہے جو ان پر ڈالا جائے گا۔

[2] تفسیر مراغی جلد ۲۵ ص ۱۳۵ اسی آیت کے ذیل، تفسیر روح المعانی اور تفسیر کبیر فخرالدین رازی۔

اس سلسلے کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: انہیں خطاب ہوگا، یہ وہی چیز ہے، جس کے بارے میں تم لوگ ہمیشہ شک وشبہ کیا کرتے تھے۔ (انّ ھذا ما کنتم بہ تمترون)۔

قرآن کی کس قدر آیات میں مختلف دلائل کے ذریعے اس دن کی حقانیت تمہارے گوش گزار کی گئی؟ آیا ہم نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ تم قیامت کا ثبوت عالم نباتات میں دیکھو کیونکہ "کذالک الخروج" قیامت کے دن تم بھی اسی طرح زندہ کیے جاؤ گے۔ (ق-۱۱)

آیا تمہیں نہیں کہا تھا کہ جس طرح بارش مردہ زمینوں کو زندہ کرتی ہے تمہارا حشر ونشر بھی اسی طرح آسان ہے "کذالک النشور"۔ (فاطر-۹)

کیا تمہیں نہیں بتایا گیا تھا کہ مُردوں کو زندہ کرنا خدا کے لیے بہت آسان ہے" وذالک علی اللہ یسیر"۔ (تغابن-۷)

کیا تمہیں نہیں کہا گیا تھا کہ آیا پہلی تخلیق ہمارے لیے مُشکل تھی کہ تم قیامت کے بارے میں شک کرتے ہو؟" افعیینا بالخلق الاوّل"۔ (ق-۱۵)

خلاصہ کلام مختلف طریقوں سے حقیقت تم سے بیان کر دی گئی تھی، لیکن افسوس کہ تمہارے پاس سننے والے کان نہیں تھے۔

جسمانی اور رُوحانی سزائیں

ہم جانتے ہیں کہ قرآنی تصریحات کے مطابق معاد دو پہلوؤں کی حامل ہے، ایک جسمانی اور دوسرے روحانی۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ سزا اور جزا بھی دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہو، لہٰذا آیات وروایات میں ان دونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ عوام الناس کی زیادہ توجہ جسمانی پہلو کی طرف ہوتی ہے لہٰذا زیادہ تر وضاحت اور تشریح بھی جسمانی سزا و جزا کی گئی ہے۔ لیکن روحانی سزا اور جزا کی طرف بھی کم اشارات نہیں ہیں۔

اسی بات کا ایک واضح نمونہ ہم نے مندرجہ بالا آیات میں دیکھ لیا ہے کہ جن میں کچھ دردناک جسمانی سزاؤں کو بیان کرنے کے بعد مستکبر اور سرکش ظالموں کو رُوحانی سزاؤں کی طرف معنی خیز اشارے ملتے ہیں۔

قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی رُوحانی جزاؤں کے بارے میں اشارے ملتے ہیں۔ سُورہ توبہ کی آیت ۷۲ میں فرمایا گیا ہے:

"ورضوان من اللہ اکبر"۔

"خدا کی خوشنودی اور رضامندی تمام جزاؤں سے برتر ہے۔

سُورہ یٰسین آیت ۵۸ میں فرمایا گیا ہے:

"سلام قولا من رب رحیم"۔

"ان کے لیے سلام و مبارک بادی ہے رحیم اور مہربان خدا کی جانب سے"۔

سورۂ حجر کی ۴۷ ویں آیت میں ہے:

"ونزعنا ما فی صدورھم من غلّ اخوانا علی سرر متقابلین"۔

"ہم ان کے دلوں سے ہر قسم کا حسد، کینہ اور دشمنی نکال دیں گے، سب بھائی بھائی ہوں گے اور تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے براجمان ہوں گے"۔

صاف ظاہر ہے کہ وہاں کی روحانی لذتیں بھی وسیع اور بے انتہا ہوں گی کہ جن کی تعریف و توصیف نہیں کی جا سکتی۔ اسی لیے قرآنی آیات میں بھی عام طور پر صرف اشاروں سے کام لیا گیا ہے لیکن روحانی سزاؤں کو حقارت ڈانٹ ڈپٹ، سرزنش، افسوس اور رنج و غم کی صورت میں منعکس کیا گیا ہے کہ جن کا ایک نمونہ مندرجہ بالا آیات میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

۵۱۔ اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ مَقَامٍ اَمِیۡنٍ ۙ

۵۲۔ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ۚۙ

۵۳۔ یَّلۡبَسُوۡنَ مِنۡ سُنۡدُسٍ وَّ اِسۡتَبۡرَقٍ مُّتَقٰبِلِیۡنَ ۚۙ

۵۴۔ کَذٰلِکَ ۟ وَ زَوَّجۡنٰہُمۡ بِحُوۡرٍ عِیۡنٍ ؕ

۵۵۔ یَدۡعُوۡنَ فِیۡہَا بِکُلِّ فَاکِہَۃٍ اٰمِنِیۡنَ ۙ

۵۶۔ لَا یَذُوۡقُوۡنَ فِیۡہَا الۡمَوۡتَ اِلَّا الۡمَوۡتَۃَ الۡاُوۡلٰی ۚ وَ وَقٰہُمۡ عَذَابَ الۡجَحِیۡمِ ۙ

۵۷۔ فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّکَ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ۝

ترجمہ

۵۱۔ پرہیزگار لوگ امن و امان کی جگہ میں ہوں گے۔

۵۲۔ باغوں اور چشموں میں۔

۵۳۔ ریشم کی نازک اور دبیز پوشاکیں پہنیں گے۔ اور ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

۵۴۔ اسی طرح ہیں بہشت والے، اور ہم ان کی حورالعین کے ساتھ تزویج کریں گے۔

۵۵۔ وہ جس قسم کے پھل چاہیں گے انھیں دیئے جائیں گے، وہاں پر نہایت اطمینان

سے رہیں گے۔

۵۶۔ وہاں پہلی دفعہ کی موت کے سوا (جس کی دنیا میں تلخی چکھ چکے ہیں) ان کو موت کی تلخی چکھنی نہ پڑے گی، اور خدا انھیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھے گا۔

۵۷۔ یہ تمھارے پروردگار کا فضل اور اس کی بخشش ہے، یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے۔

تفسیر

پرہیزگار لوگ اور بہشت کی گوناگوں نعمتیں

چونکہ گزشتہ آیات میں جہنمیوں کے دردناک عذاب کا تذکرہ تھا، لہٰذا ان آیات میں اہل بہشت کی نعمتوں اور جزاء کو شمار کر کے ان ہر دو کی اہمیت کو زیادہ آشکار کیا گیا ہے۔

اہل بہشت کی جزاء کو سات قسموں میں خلاصہ کیا گیا ہے:

پہلی یہ کہ "پرہیزگار لوگ امن وامان کی جگہ میں ہوں گے" (انّ المتقین فی مقام امین)[1]

اسی لیے انھیں کسی تکلیف اور بے چینی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ آفات و بلیات، رنج وغم اور شیطانوں اور طاغوتوں سے بالکل محفوظ ہوں گے۔

پھر دوسری نعمت کو بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وہ باغوں اور چشموں میں رہیں گے اور ان کی قیام گاہوں کو ہر طرف سے چشموں اور باغوں نے اپنے گھیرے میں لیا ہوگا۔ (فی جنات وعیون)۔

"جنات" (گھنے باغات) کی تعبیر شاید باغوں کی مختلف تعداد کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ بہشت کے سب باغات یکساں نہیں ہیں، بلکہ بہشتیوں کے مختلف درجات کی وجہ سے باغات بھی مختلف ہوں گے۔

تیسرے مرحلے پر ان کے زیبا اور خوبصورت لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ نرم ونازک اور ضخیم

---

[1] یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ "امین" کو مقام اور جگہ کی صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، گویا بہشت والوں کا خود مقام امین ہوگا اور ان سے کسی قسم کی خیانت کا اظہار نہیں کرے گا۔ اس قسم کی تعبیرات عام طور پر تاکید اور مبالغے کے لیے آتی ہیں۔

دبیز ریشمی لباس زیب تن کریں گے اور تختوں پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ (یلبسون من سندس واستبرق متقابلین)۔

"سندس" ریشم کے نرم ونازک اور لطیف کپڑے کو کہتے ہیں۔ بعض نے اس کے ساتھ زربافت کی قید بھی لگائی ہے۔ یعنی زربافت نرم ونازک ریشمی کپڑا۔

"استبرق" ریشم کے ضخیم اور دبیز کپڑے کو کہتے ہیں۔ بعض اہلِ لغت اسے "استبر" یا "ستبر" (بمعنی ضخیم) فارسی کلمہ کا معرب سمجھتے ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اسے عربی کا کلمہ "برق" (چمک دمک) سے لیا گیا ہو بوجہ اس خاص چمک دمک کے جو اس قسم کے کپڑوں میں ہوتی ہے۔

البتہ بہشت میں نہ تو سخت سردی ہوگی اور نہ ہی سخت گرمی کہ جسے اس قسم کے لباس کے ذریعے روکا جائے، بلکہ یہ بہشت والوں کے گوناگوں اور طرح طرح لباسوں کی طرف اشارہ ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ہمارے الفاظ وکلمات جو دنیا میں ہماری روزمرہ کی حاجات پورا کرنے کے لیے وضع کیے گئے ہیں اس عظیم اور مکمل جہان کے مسائل بیان کرنے پر قادر نہیں ہیں بلکہ صرف ان کی طرف ایک اشارہ ہو سکتے ہیں۔

بعض علماء نے لباس کے مختلف ہونے کو اہلِ بہشت کے مقام قرب کے تفاوت کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ بہشت والوں کا ایک دوسرے کے روبرو بیٹھنا اور ان کے درمیان ہر قسم کے امتیاز اور برتری کی نفی اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی باہمی نشستوں میں انس ومحبت اور اخوت اور بھائی چارے کی روح حکم فرما ہوگی اور اس فضا میں صدق وصفا اور روحانیت کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

چوتھے مرحلے میں ان کی ازواج کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جی ہاں! اسی طرح ہیں اہل بہشت اور ہم انکی حورالعین سے کے ساتھ تزویج کردیں گے۔ (کذالک وزوجنا ھم بحور عین)۔

"حور" جمع ہے "حوراء" اور "احور" کی جس کا معنی ہے، اس کی آنکھوں کی سیاہی مکمل طور پر سیاہ اور سفیدی مکمل طور پر شفاف ہے۔

"عین" (بروزن "چین") "اعین" اور "عیناء" کی جمع ہے، جس کا معنیٰ ہے موٹی آنکھ۔ چونکہ انسان کی خوبصورتی سب سے زیادہ اس کی آنکھوں میں ہوتی ہے، اسی لیے یہاں پر حورالعین کی خوبصورت آنکھوں کی تعریف کی گئی ہے۔ البتہ قرآن کی دوسری آیات میں اس کی دوسری خوبصورتیوں کو بھی خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد اہلِ بہشت کی پانچویں نعمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، وہ جس قسم کے پھل چاہیں گے انھیں دیئے جائیں گے اور وہ وہاں پر نہایت ہی اطمینان سے رہیں گے۔ (یدعون فیھا بکل فاکھۃ اٰمنین)۔

حتیٰ کہ دنیا میں پھلوں سے استفادہ کرنے کے لیے جو مشکلات درپیش ہوتی ہیں ان کے لیے وہ بھی نہیں ہوگی۔ تمام پھل ان کے نزدیک اور ان کی دسترس میں ہوں گے۔ لہٰذا اونچے اونچے درختوں سے پھل چننے کی زحمت بھی انھیں گوارا نہیں کرنا پڑے گی، کیونکہ "قطوفھا دانیۃ" (حاقۃ۔ ۲۳)

جو پھل وہ چاہیں گے ان کا انتخاب بھی خود کریں گے۔" وفاکھۃ مما یتخیرون (واقعہ۔۲۰)

وہ بیماری اور تکلیف جو بعض اوقات دُنیا میں پھل کھانے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے، وہاں پر نہیں ہوگی اور نہ ہی ان میووں کے خراب ہونے، کمیاب ہونے اور ختم ہونے کا خطرہ ہوگا۔ غرض ہر لحاظ سے وہ مطمئن ہوں گے۔

بہرحال اگر جہنمیوں کی غذا "زقوم" ہوگی جو ان کے پیٹ میں کھولتے ہُوئے پانی کی طرح اُبال پیدا کر دے گی تو بہشتیوں کی غذا لذیذ پھل ہوں گے جو ہر قسم کی تکلیف سے مُبّرا ہوں گے۔

بہشت اور بہشتی نعمتوں کا دوام اور ہمیشگی، متقین کے لیے خدا کی چھٹی نعمت ہوگی کیونکہ "وصال" کے وقت جو چیز انسان کو بے چین کر دیتی ہے وہ "فراق" کا اندیشہ ہے۔ اسی لیے خدا تعالیٰ فرماتا ہے، وہاں پہلی دفعہ کی موت کے سوا جس کی تلخی وہ دُنیا میں چکھ چکے ہوں گے انہیں موت کی تلخی نہیں چکھنی پڑے (لا یذوقون فیھا الموت الّا الموتۃ الاولیٰ)۔

یہ بات بڑی دل چسپ ہے کہ قرآن مجید نے بہشت کی نعمتوں کے جاودانی ہونے کو مختلف تعبیرات کے ساتھ بیان کیا ہے، کہیں پر فرماتا ہے:

"خالدین فیھا"

"وہ بہشت کے باغوں میں ہمیشہ رہیں گے۔"[1]

کبھی فرماتا ہے:

"عطاءً غیر مجذوذ"

"یہ ایسی عطا ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی۔" (ھود، ۱۰۸)

یہاں پر "الموتۃ الاولیٰ" (پہلی موت) کیوں کہا گیا ہے؟ اس بارے میں ایک تفصیلی گفتگو ہے، جو بعد میں بیان ہوگی۔

آخر میں اس سلسلے کی ساتویں اور آخری نعمت کو بیان کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے: اور خدا انھیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھے گا۔ (ووقاھم عذاب الجحیم)۔

ان نعمتوں کی تکمیل اس بات سے ہو رہی ہے کہ عذاب کا احتمال اور سزا کا خوف بہشت والوں کو پریشان نہیں کرے گا۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر پرہیزگاروں میں کسی قسم کی لغزش بھی ہوگی تو خداوند عالم اپنے لطف و کرم سے انہیں معاف کر دے گا اور انھیں اطمینان دلائے گا کہ وہ اس لحاظ سے پریشان نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر معصومین کے علاوہ سب لوگ کسی نہ کسی لغزش کے مرتکب ضرور ہوتے ہیں۔ اگر خدا کی رحمت اور مغفرت ان کے شامل حال نہ ہو تو انھیں ہمیشہ

---

[1] اس قسم کی تعبیرات قرآن مجید کی بہت سی آیات میں آئی ہے، منجملہ ان کے سورۂ آل عمران کی آیات ۱۵ اور ۱۳۶، سورہ نساء کی آیت ۱۳ اور ۱۲۲ اور سورۂ مائدہ کی آیت ۸۵ وغیرہ بھی ہیں۔

یہ خطرہ لاحق رہتا۔ لہٰذا یہ آیت انہیں اطمینان دلا رہی ہے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ بعض مومنین اپنے گناہوں کی وجہ سے ایک عرصے تک جہنم میں رہیں گے، پھر وہ پاک ہو کر داخل بہشت ہوں گے، تو کیا مندرجہ بالا آیت کا اطلاق ان پر بھی ہوگا؟

جواباً گزارش ہے کہ مندرجہ بالا آیت بلند پایہ پرہیزگاروں کی بات کر رہی ہے جو ابتداء ہی میں بہشت میں داخل ہونگے اور دوسرے افراد کے بارے میں یہ آیت خاموش ہے۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ایسے لوگ بھی بہشت میں داخل ہونے کے بعد جہنم کی طرف واپس جانے کے خوف سے بے نیاز ہو جائیں گے اور بالکل امن و سکون سے زندگی بسر کریں گے۔ یعنی مذکورہ آیت ان کی بہشت میں داخل ہونے کے بعد کی تصویر کشی ہی کر رہی ہے۔

اس سلسلے کی آخری آیت میں مذکورہ ساتوں صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نتیجہ کے طور پر فرمایا گیا ہے، یہ سب تمہارے پروردگار کا فضل اور اس کی بخشش ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے، جو پرہیزگاروں کے شامل حال ہے۔

(فضلاً من ربك ذالك هو الفوز العظيم)۔ [1]

یہ ٹھیک ہے کہ پرہیزگاروں نے دنیا میں بہت زیادہ نیکیاں اور کار خیر انجام دیئے ہوں گے، لیکن ان ناچیز اعمال کی جزا اس قدر بے انتہا اور جاودانی نعمتیں نہیں ہیں۔ یہ تو خدا کا فضل و کرم ہے جس کی وجہ سے انہیں یہ عظیم نعمتیں میسر آئیں گی۔

اس کے علاوہ اگر دنیا میں خدا کا فضل و کرم ان کے شامل حال نہ ہوتا تو وہ اس حد تک نیک اعمال انجام نہ دے سکتے۔ خدا نے انہیں عقل و دانش عطا کی، انبیاء اور آسمانی کتابیں بھیجیں اور ہدایت اور عمل کی توفیق ان کے شامل حال کی۔

جی ہاں! خداوند عالم کی اس قدر عظیم توفیقات سے بہرہ مند ہونا اور اس حد تک جزائے الٰہی تک پہنچنا ان توفیقات کے پرتو میں ہی "فوز عظیم" اور بہت بڑی کامیابی ہے، جو اس کے لطف و کرم کے سایہ ہی میں حاصل ہوتی ہے۔

"پہلی موت" کیا ہے؟

ہم نے مندرجہ بالا آیات میں پڑھا ہے کہ بہشتی لوگ پہلی موت کے علاوہ کسی اور موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے۔ اس سلسلے میں تین سوال پیدا ہوتے ہیں۔

پہلا یہ کہ "موتۃ اولیٰ" یا پہلی موت سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے مراد وہ موت ہے جو زندگی کے خاتمہ کا سبب

---

[1] "فضلاً" کے اعراب کے بارے میں کئی احتمال ہیں۔ ایک تو یہ کہ فعل محذوف تفضل فضلاً کا مفعول مطلق ہے۔ دوسرے یہ کہ مفعول لہٗ واقع ہو رہا ہے اور تیسرے حال واقع ہو رہا ہے۔

بنتی ہے تو پھر یہ کیوں کہتا ہے کہ "اہل بہشت پہلی موت کے علاوہ کسی اور موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے" جبکہ وہ تو اس سے پہلے یہ ذائقہ چکھ چکے ہیں۔ (یہاں پر فعل ماضی استعمال ہونا چاہیئے تھا نہ کہ فعل مضارع)۔

تو اس سوال کے جواب میں بعض مفسرین نے "الّا الموتۃ الاولیٰ" میں "الّا" کو "بعد" کے معنی میں لیا ہے۔ ان کے بقول آیت کا معنی یوں ہوگا "اس پہلی موت کے بعد کسی اور موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں پر ایک جملہ مقدر ہے جو یہ ہے :

"الّا الموتۃ الاولی التی ذاقوھا"

"سوائے پہلی موت کے جو پہلے سے چکھ چکے ہیں" [1]

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہاں پر صرف پہلی موت کا تذکرہ کیوں ہوا ہے حالانکہ ہم سب کو معلوم ہے کہ ہر انسان نے دو موتوں کا مزہ چکھنا ہوتا ہے، ایک موت دنیاوی زندگی کے خاتمے پر اور دوسری برزخ کی زندگی کے اختتام پر۔

اس سوال کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں، جن میں سے کوئی بھی قابل قبول نہیں ہے، لہٰذا ہم بھی انہیں یہاں پر لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ بہتر یہی ہے کہ یہ کہا جائے کہ برزخ کی زندگی اور موت معمول کی زندگی اور موت سے کسی بھی طرح مشابہ نہیں ہے بلکہ معاد جسمانی کے بموجب قیامت کی زندگی دنیاوی زندگی کے ساتھ کئی جہات سے مماثلت رکھتی ہے البتہ بلند اور بالا سطح پر۔ اسی لیے اہل بہشت سے کہا جائے گا کہ جو موت تم دنیا میں پا چکے ہو، وہی کافی ہے۔ اب تمہیں موت نہیں آئے گی اور چونکہ برزخ کی موت اور زندگی اس کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتی لہٰذا اس کا ذکر ہی نہیں ہوا۔ [2]

تیسرا سوال یہ ہے کہ قیامت میں موت کا نہ ہونا صرف بہشت والوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ اہل دوزخ کو بھی تو موت نہیں آئے گی، تو پھر اس بارے میں خاص طور پر اہل بہشت کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟

مرحوم طبرسی نے "مجمع البیان" میں اس کا نہایت ہی خوبصورت جواب دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ اس لیے ہے تاکہ اہل بہشت کے لیے خوشخبری ہو کہ ان کے لیے خوشگوار حیات جاوید ہے، رہ گئے جہنمی تو چونکہ ان کی زندگی کا ہر لحہ موت ہوگا گویا وہ ہمیشہ مرتے اور زندہ ہوتے رہیں گے، لہٰذا انہیں ایسی بات باور کروانے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔

بہرحال یہاں پر "لا یذوقون" (نہیں چکھیں گے) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہل بہشت کے لیے موت کی کمترین علامت بھی ظاہر نہیں ہوگی۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں کہ،

---

[1] بنابریں مندرجہ بالا استثنا بھی "استثنائے منقطع" ہے۔ کیونکہ ایسی موت کا ذائقہ بہشتی لوگ نہیں چکھیں گے بلکہ اس سے پہلے وہ چکھ چکے ہوں گے۔ (غور کیجئے گا)

[2] برزخ کی موت و حیات کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد ۱۱ سورۂ مومن کی گیارہویں آیت کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

خدا بروز قیامت کچھ بہشتیوں کے بارے میں کہے گا۔

"وعزتی وجلالی وعلوی وارتفاع مکانی، لانحلن لہ الیوم خمسة اشیاء ...... الا انھم شباب لا یھرمون، واصحاء لا یسقمون، و اغنیاء لا یفتقرون، وفرحون لا یحزنون، واحیاء لا یموتون، ثم تلا ھذہ الآیة: لا یذوقون فیھا الموت الا الموتة الاولیٰ"

"مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم اور بلندی وعلوِ مقام کی قسم، میں انہیں پانچ چیزیں عطا کروں گا... وہ ہمیشہ جوان رہیں گے، کبھی بوڑھے نہیں ہوں گے، تندرست رہیں گے، بیمار نہیں ہوں گے تونگر رہیں گے غریب نہیں ہوں گے، مسرور رہیں گے، غمگین نہیں ہوں گے، زندہ رہیں گے مریں گے نہیں"

پھر آپ نے قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

"لا یذوقون فیھا الموت الا الموتة الاولیٰ" [1]

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۶۲۳ بحوالہ اصول کافی۔

۵۸۔ فَاِنَّمَا يَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ○
۵۹۔ فَارۡتَقِبۡ اِنَّهُمۡ مُّرۡتَقِبُوۡنَ ○ ع

ترجمہ

۵۸۔ ہم نے یہ (قرآن) تیری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔
۵۹۔ (لیکن اگر وہ نصیحت قبول نہ کریں) تو تو بھی منتظر رہ اور وہ بھی منتظر ہیں (تو خدا کی طرف سے کامیابی کا اور وہ عذاب اور شکست کا انتظار کریں)

تفسیر

آپ بھی منتظر رہیں اور وہ بھی منتظر ہیں

• ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ سورۂ دخان کا آغاز قرآنی آیات کی عظمت، گہرائی اور گیرائی کے ذکر کے ساتھ ہوا ہے اور یہ مندرجہ بالا آیات پر اختتام پذیر ہو رہی ہے جو قرآنی آیات کی گہری تاثیر بیان کر رہی ہیں تاکہ سورت کا آغاز اور انجام ہم آہنگ ہو جائے اور اس ابتدا اور انتہا کے درمیان کا حصہ بھی قرآنی نصائح اور مواعظ کی تاکید کا مظہر ہے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے: ہم نے اس قرآن کو تیری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں (فانما یسرناه بلسانك لعلهم یتذکرون)۔

اس کے مندرجات نہایت عمیق اور گہرے ہیں، اس کے تمام پہلو بہت وسیع اور ہمہ گیر ہیں اس کے مطالب ایسے سادہ اور رواں ہیں کہ ہر شخص کے لیے قابل فہم اور ہر طبقے کے لیے قابل استفادہ ہیں، اس کی مثالیں زیبا ہیں، اس کی تشبیہیں فطری اور زود رس ہیں، اس کی داستانیں حقیقی اور سبق آموز ہیں، اس کے دلائل روشن اور پختہ، اس کا بیان سادہ مختصر اور پُر مغز ہے، ساتھ ہی اس حد تک شیریں اور پرکشش ہے کہ انسانی قلوب تک جا پہنچے، بے خبروں کو آگاہ اور آمادہ دلوں کو متوجہ کرتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی ایک اور تفسیر بیان کی ہے، جس کے مطابق اس سے یہ مراد ہے کہ باوجودیکہ تو نے کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تاہم آسانی اور سہولت کے ساتھ ان پُرمغز آیات کی تلاوت کر سکتا ہے جو خدا کے اعجاز اور وحی کی حامل ہیں۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ آیت سورۂ قمر کی اس آیت سے ملتی جلتی ہے جس کا بار بار تکرار کیا گیا ہے یعنی:

• ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر۔

"ہم نے قرآن کو نصیحت کے حصول کے لیے آسان بنا دیا ہے، آیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟"

لیکن چونکہ ان اوصاف کے باوجود کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کلام حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے ہیں لہٰذا آخری آیت میں انھیں سخت الفاظ میں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اگر وہ اس کے باوجود نصیحت قبول نہیں کرتے، تو تو بھی منتظر رہ اور وہ بھی منتظر ہیں (فارتقب انھم مرتقبون)۔

آپ تو کفار پر کامیابی کے سلسلے میں وعدہ الٰہی کی تکمیل کے منتظر رہیں اور وہ شکست کے۔ آپ اس ظالم اور ہٹ دھرم قوم کے بارے میں خدا کے دردناک عذاب کے منتظر رہیں اور وہ بزعم خویش آپ کی شکست اور ناکامی کے منتظر ہیں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان دو میں سے کس کا انتظار صحیح ہے۔

بنا بریں اس آیت سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ خداوند عالم اپنے پیغمبر کو حکم دے رہا ہے کہ تبلیغ سے ہاتھ اُٹھا لیں اور اپنی تمام سعی و کوشش کو متوقف کر کے صرف انتظار پر ہی اکتفا کریں، بلکہ یہ ایک قسم کی تہدید اور تنبیہ ہے جو ہٹ دھرم قوم کو بیدار کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

چند نکات

۱۔ "ارتقب" دراصل "رقبۃ" (بروزن طلبہ) کے مادہ سے لیا گیا ہے، جس کا معنی "گردن" ہے۔ اور چونکہ انتظار کرنے والے لوگ ہمیشہ گردن اُٹھا اُٹھا کر اس کا انتظار کرتے ہیں، لہٰذا یہ کسی چیز کے انتظار کے معنی میں آتا ہے۔

۲۔ مندرجہ آیات اس بات کی بخوبی نشاندہی کر رہی ہیں کہ قرآن مجید کا کسی خاص طبقے یا گروہ سے تعلق نہیں ہے۔ بلکہ عمومی طور پر فہم و ادراک، متوجہ کرنے اور پند و نصیحت کے لیے ہے۔ لہٰذا جو لوگ قرآن مجید کو مبہم مفہوم اور نامعلوم مسائل کے پیچ و خم میں اُلجھا دیتے ہیں کہ اس کے ادراک کا تعلق صرف ایک طبقے اور گروہ سے مخصوص ہے اور وہ خاص گروہ یا طبقات بھی اس سے کچھ نہیں پاتے، وہ درحقیقت قرآن مجید کی اصل روح سے غافل ہیں۔

قرآن مجید کو ہر شعبۂ زندگی میں موجود ہونا چاہیئے، خواہ شہر ہو یا دیہات، انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، پرائمری اسکول ہو یا یونیورسٹی، مسجد ہو یا میدان جنگ، غرض ہر جگہ پر اس کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ خدا نے اسے سہل، سادہ، آسان اور رواں

بنادیا ہے تاکہ سب لوگ اس کو سمجھ سکیں۔

اسی طرح اس آیت نے ان لوگوں کے انکار پر بھی خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے کہ جنہوں نے قرآن مجید کو تلاوت اور تجوید کے قواعد کے پیچ وخم میں منحصر کردیا ہے، جن کے پیشِ نظر صرف الفاظ کی مخارج سے ادائگی اور وقف و وصل کے اصولوں کو مدِ نظر رکھنا ہوتا ہے، جبکہ قرآن کہتا ہے کہ یہ کتاب ساری کی ساری نصیحت پر مبنی ہے ایسی نصیحت جو تحرک اور تعمیر کا حامل ہوتی ہے۔ ظاہری الفاظ کے اصولوں کو ملحوظ رکھنا اپنی جگہ پر بجا، لیکن اس کا منتہائے مقصود معانی ہیں، الفاظ نہیں۔

۴- ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے،

"لولا تیسیرہ لما قدر احد من خلقہ ان یتلفظ بحرف من القرآن، وانی لھم ذالک وھو کلام من لم یزل ولا یزال"

"اگر خدا نے قرآن کو زبانوں پر آسان نہ کر دیا ہوتا تو کوئی شخص بھی اس کا ایک حرف زبان پر نہ لاسکتا اور یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا، کیونکہ یہ خداوندِ ازلی وابدی کا کلام ہے (اور اس قسم کے کلام کی عظمت وشوکت اس قدر ہوتی ہے کہ اس کے فضل وکرم کے بغیر کوئی انسان اسے ادا نہیں کرسکتا)"[1]

خداوندا! ہمیں ان لوگوں میں سے قرار دے جو تیرے اس عظیم وبے نظیر کلام یعنی قرآن پاک سے نصیحت حاصل کرتے ہیں اور تمام جہات میں اپنی زندگی کو اس کے ہم آہنگ کرتے ہیں!

خداوندا! جو سکون واطمینان تو پرہیزگاروں کو عنایت کرتا ہے اور طوفانِ حوادث میں ان کے دل کی ڈھارس بندھاتا ہے ہمیں بھی عنایت فرما۔

بارِ الٰہا! تیری نعمتیں بے شمار، تیری رحمت بے حساب اور تیری سزا دردناک ہے۔ ہمارے اعمال ایسے نہیں ہیں جو ہمیں تیری رحمت سے ہم کنار اور سزا سے دور کرسکیں۔ اپنا وہ فضل ہمارے شاملِ حال فرما، جس کا تو نے متقین سے وعدہ کیا ہے، ورنہ ہم کسی قیمت پر بھی تیری جاودانی بہشت کی آغوش کے لائق نہیں۔

تفسیر سورہ دخان ختم ہوئی

منگل ۲۵ رجب المرجب ۱۴۰۵ھ

[1] تفسیر روح البیان، جلد ۸، ص ۴۲۳۔

⊙ — مکہ میں نازل ہوئی

⊙ — اس کی ۳۷ آیات ہیں

سورۂ جاثیہ کے مضامین

"حوامیم" سورتوں میں سے یہ چھٹی سورت ہے اور اس کا شمار مکی سورتوں میں ہوتا ہے۔ یہ اس زمانے میں نازل ہوئی جب مکہ کی اجتماعی فضاء مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان انتہائی کشیدہ تھی۔ اسی بناء پر اس سورت میں زیادہ تر توحید، شرک کے ساتھ نبرد آزمائی، قیامت کے عدل و انصاف سے ظالموں کو تنبیہ، اعمال کا لکھا جانا اور اسی طرح گزشتہ سرکش اقوام کے انجام جیسے مسائل کو زیادہ تر بیان کیا گیا ہے۔ اس سورت کے مندرجات کو سات حصوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے

① ــــ قرآن مجید کی عظمت اور اس کی اہمیت۔

② ــــ مشرکین کے سامنے توحید کے کچھ دلائل کا بیان۔

③ ــــ نیچریوں کے کچھ دعوے اور ان کے منہ توڑ جوابات۔

④ ــــ بنی اسرائیل جیسی بعض اقوام کے انجام کی طرف کچھ اشارہ جو سورت کے مباحث پر شاہد ہے۔

⑤ ــــ ان گمراہ لوگوں کو زبردست تنبیہ جو اپنے گمراہ کن عقاید پر سختی سے ڈٹے ہوئے ہیں۔

⑥ ــــ حق کی راہ سے سرمو انحراف کیے بغیر عفو و درگزشت سے کام لینے کی دعوت۔

⑦ ــــ قیامت کے لرزا دینے والے واقعات کی طرف اشارے، خاص کر نامۂ اعمال کا تذکرہ جو انسان کے تمام اعمال کو بے کم و کاست بیان کرے گا۔

یہ سورت خداوندِ عالم کے "عزیز" و "رحیم" جیسے بزرگ ناموں سے شروع ہوتی ہے اور انہی ناموں پر ختم ہوتی ہے۔

اس سورت کا نام "جاثیہ" اس لیے ہے ــــ اس کی ۲۸ ویں آیت سے یہ لفظ لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "گھٹنے ٹیکنے والا"۔ قیامت کے دن عدلِ الٰہی کی دادگاہ میں بہت سے لوگوں کی یہی کیفیت ہوگی۔

مرحوم طبرسیؒ نے "مجمع البیان" میں اس کا ایک اور نام بھی تحریر کیا ہے جو زیادہ مشہور نہیں ہے اور وہ ہے "شریعت" جو اسی سورت کی ۱۸ ویں آیت کی مناسبت سے ہے۔

سورت جاثیہ کی تلاوت کا ثواب

پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں ہے:

"من قرأ حا میم الجاثیة ستر اللہ عورتہ وسکن روعتہ عند الحساب"

"جو شخص سورۂ جاثیہ کی تلاوت کرے گا (البتہ اس کے مطالب میں غور و فکر کرے گا، اور اپنی زندگی کو ان مطالب کے مطابق ڈھالے گا) خدا بروز قیامت اس کے تمام عیوب کی پردہ پوشی کرے گا اور اس کے خوف کو اطمینان میں بدل دے گا۔"[1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث مروی ہے، آپ فرماتے ہیں:

"من قرأ سورة الجاثیة کان ثوابها ان لا یری النار ابدا، ولا یسمع زفیر جهنم ولا شهیقها، وهو مع محمد(ص)"

جو شخص سورۂ جاثیہ کی غور و فکر کے ساتھ جو عمل کا مقدمہ ہے، تلاوت کرے گا اُس کا ثواب یہ ہے کہ وہ آتش جہنم کو ہرگز نہیں دیکھ پائے گا اور دوزخ کی آواز نہیں سن پائے گا اور اسے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہم نشینی کا شرف حاصل ہوگا۔[2]

---

[1] تفسیر مجمع البیان، سورۂ جاثیہ کے آغاز میں۔

[2] تفسیر برہان سورۂ جاثیہ کے آغاز میں، جلد ۴ ص۱۶۵۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ حٰمٓ ۝

۲۔ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ۝

۳۔ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝

۴۔ وَفِیْ خَلْقِکُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۝

۵۔ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

۶۔ تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۢ بَعْدَ اللّٰہِ وَاٰیٰتِہٖ یُؤْمِنُوْنَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ حٰمٓ۔

۲۔ یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو غالب و دانا ہے۔

۳۔ بے شک آسمان اور زمین میں ایمان والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

۴۔ اور اسی طرح تمہاری اور زمین میں پھیلے ہُوئے چلنے پھرنے والوں کی خلقت میں نشانیاں ہیں، اُن کے لیے جو اہلِ یقین ہیں۔

۵۔ اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور اس رزق میں جو خدا نے آسمان سے نازل فرمایا ___ اور اس کے ذریعے زمین کو مرنے کے بعد زندہ کیا ہے۔ اس میں بھی اور ہواؤں کے چلنے میں بھی عقل سے کام لینے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

۶۔ یہ خدا کی آیات ہیں جن کو ہم حق کے مطابق تیرے سامنے پڑھتے ہیں، تو خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کونسی بات ہوگی، جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟

تفسیر

ہرجگہ اس کی نشانیاں موجود ہیں

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ چھٹی سُورت ہے جس کا آغاز حروفِ مقطعہ (حٰم) سے ہو رہا ہے۔ بعد کی سُورت (احقاف) سے مل کر یہ پُوری سات سورتیں ہو جاتی ہیں۔ حروفِ مقطعات کے بارے میں ہم سُورۂ بقرہ، سُورہ آلِ عمران، سُورۂ اعراف اور اسی طرح "حٰم" سورتوں کے آغاز میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔

مشہور مفسر طبرسی اس آیت کے آغاز میں فرماتے ہیں:

"بہترین قول یہ ہے کہ یہ کہا جائے "حٰم" اس سُورت کا نام ہے، (پھر بعض مفسرین سے نقل کرتے ہُوئے لکھتے ہیں) اسے "حٰم" کے نام سے موسوم کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ قرآن جو سراپا اعجاز ہے، حرفِ تہجی سے تشکیل یافتہ ہے۔"

جی ہاں! یہ کتاب جو نور و ہدایت، راہنما اور رہبر ہے اور پیغمبرِ اسلام کا زندۂ جاوید معجزہ ہے انہی سادہ سے حروف کی ترکیب سے وجُود میں آئی ہے۔ یہ اس کی نہایت عظمت کی دلیل ہے کہ اس قدر اہم کتاب اس قدر سادہ سے حروف سے تشکیل پائی ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ فوراً قرآن کی عظمت کا تذکرہ کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے: یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے

جو غالب و دانا ہے۔ (تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم)[1]

"عزیز" کا معنی صاحب قدرت اور ناقابل شکست ہے اور "حکیم" کا معنی ایسی ذات ہے جو تمام چیزوں کے اسرار سے آگاہ ہے اور جس کے تمام افعال نپے تلے اور حکمت پر مبنی ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب نازل کرنے کے لیے ایسی ہی بے انتہا حکمت اور غیر محدود قدرت ضروری ہوتی ہے جو خدا کے علاوہ کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ آیت بعینہ قرآن مجید کی چار سورتوں کی ابتداء میں آئی ہے، جن میں سے تین حوامیم سورتیں ہیں (مؤمن، جاثیہ اور احقاف) اور ایک سورۂ زمر ہے، جو حوامیم کے علاوہ ہے۔ یہ تکرار اور تاکید اس لیے ہے کہ تمام لوگوں کی توجہ قرآنی اسرار کی گہرائی اور گیرائی اور اس کے مطالب کی عظمت کی طرف مبذول کروائی جائے تاکہ وہ اس کی کسی تعبیر کو معمولی نہ سمجھیں، کسی کلمہ کو بے حساب و کتاب نہ سمجھیں اور نہ ہی فہم و ادراک کی کسی حد پر قانع ہو جائیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "عزیز" کے لفظ کے ساتھ بعض مقامات پر خود قرآن مجید کی بھی توصیف کی گئی ہے، جیسے "وانہ لکتاب عزیز" یعنی قرآن مجید وہ کتاب ہے جو طاقت ور اور ناقابل شکست ہے (حٰم سجدہ ۔ ۴۱) یا دہ گو لوگوں کی اس تک دسترس نہیں ہو سکتی۔ مرور زمانہ کے ساتھ اس کی قدر و قیمت میں کمی نہیں آسکتی۔ اس کے حقائق کبھی بوسیدہ نہیں ہو سکتے۔ تحریف کرنے والوں کو رسوا کرتے ہوئے روز بروز آگے بڑھتا جائے گا۔

بعض مقامات پر خود قرآن نازل کرنے والے کی توصیف کی گئی ہے، جیسے زیر تفسیر آیت میں ہے اور دونوں جگہ اس کا استعمال صحیح ہے۔

پھر آفاق و انفس میں عظمت خداوندی کی آیات اور نشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: بے شک آسمانوں اور زمین میں ایمان والوں اور حق کے طلب گاروں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں (ان فی السماوات والارض لاٰیات للمؤمنین)۔

آسمانوں کی عظمت ایک طرف اور اس کا محیر العقول نظام کہ جس پر کروڑوں سال گزرنے کے باوجود اس میں سرمو انحراف نہ آنا دوسری طرف اور زمین کی ساخت اور اس کے عجائبات تیسری طرف سب مل جل کر خدا کی نشانیوں میں سے ہیں۔

زمین، جو بعض دانش وروں کے بقول ۱۴ قسم کی حرکت کی حامل ہے اور بہت تیزی کے ساتھ اپنے محور کے گرد گھوم رہی ہے اور بڑی سرعت کے ساتھ سورج کے گرد گھوم رہی ہے اور پھر منظومہ شمسی کے ہمراہ ایک اور حرکت بھی

---

[1] "تنزیل الکتاب" ایک محذوف کی خبر ہے، جس کی تقدیر "ھذا تنزیل الکتاب" تا ساتھ ہی یہ بتلاتے چلیں کہ "تنزیل" مصدر ہے اور یہاں پر اسم مفعول کے معنی میں ہے اور موصوف صفت کی طرف مضاف ہے، جو تقدیری طور پر "ھذا الکتاب منزل ....." ہے۔

ہے جو کہکشاں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس طرح سے وہ اپنی بے انتہا مسافرت میں سرگرم عمل ہے۔ لیکن ان تمام حرکات کے باوجود اس قدر پُر سکون ہے کہ انسانی آسائش و آرام کا گہوارہ اور تمام موجودات کے لیے باعث سکون و اطمینان ہے اور کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ اس میں ذرّہ بھر بھی حرکت ہے۔

نہ تو اس قدر سخت اور ٹھوس ہے کہ اس میں زراعت نہ کی جا سکے اور گھر نہ بنائے جا سکیں۔ اور نہ ہی اس قدر نرم اور ملائم ہے کہ اس میں رہائش اختیار نہ کی جا سکے اور بقا کے تسلسل کو آگے نہ بڑھایا جا سکے۔

گذشتہ، موجودہ اور آئندہ اربوں کھربوں انسانوں کے لیے ذخائر، معدنیات اور وسائل زندگی اس میں فراہم کر دیئے گئے ہیں اور پھر اس قدر جاذب نظر اور زیبا ہے کہ انسان کو اپنا مسحور بنا لیتی ہے۔ اس میں موجود پہاڑ ہوں یا دریا اور فضا غرض ہر چیز خدا کی اسرار آمیز آیت اور نشانی ہے، لیکن توحید اور عظمت خالق کی نشانیوں کو صرف صاحبان ایمان یعنی راہِ خدا پر گامزن اور حق کے طلبگار سمجھتے ہیں اور بے خبر دل کے اندھے اور مغرور لوگ ان کے ادراک سے محروم ہیں۔

پھر ان "آفاقی" آیات کے بعد "انفسی" آیات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور تمہاری تخلیق میں بھی اور زمین میں پھیلے ہوئے جانوروں کی خلقت میں بھی یقین کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں (وفی خلقکم وما یبث من دابۃ اٰیات لقوم یوقنون)۔

امیر المومنین علیہ السلام کی طرف منسوب ایک مشہور عبارت میں یہ جملہ ملتا ہے۔

" یہ انسان ایک چھوٹا سا جرم (جسم) ہے جس میں ایک بہت بڑا عالم سمایا ہوا ہے۔"

یعنی درحقیقت جو کچھ ایک عالم کبیر میں موجود ہے، اس کا ایک نمونہ انسان ہی کے جسم و جان میں موجود ہے۔

اس کے خصائل و صفات تمام ذی رُوح اور متحرک مخلوق کی صفات و خصائل کا مرکب ہیں اور اس کی تخلیق پر مبنی تخلیق اس عظیم کائنات کے مجموعی امور کا نچوڑ ہے۔

اس کے ایک خلیئے کی ساخت ایک اسرار آمیز عظیم صنعتی شہر جیسی ہے۔ اس کے ایک بال کی تخلیق اپنی مختلف خصوصیات کے ساتھ کہ جو علم و دانش اور سائنس کے ذریعے دریافت ہوئی ہیں، آیات الٰہی میں سے خود ایک عظیم آیت ہے۔

اس کے بدن میں ہزاروں کلومیٹر چھوٹی بڑی نہایت باریک، نازک اور لطیف رگیں ہیں اور ہزار کلومیٹر سلسلہ اعصاب کی کیمونکیل اور اطلاعاتی تاریں ہیں اور ان کا دماغ کی کمانڈ کے مرکز کے ساتھ طاقتور، اسرار آمیز اور پیچیدہ رابطہ موجود ہے بدن کی ہر ایک داخلی مشینری کا طریقۂ کار اور ناگہانی واقعات کے موقع پر ان کی عجیب و غریب ہم آہنگی اور خارجی عوامل کی یورش کے وقت بدن کی محافظ طاقتوں کا زبردست دفاع، ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مقام پر خدا کی قدرت کاملہ کی ایک نشانی ہیں۔

پھر انسان کے علاوہ زمین پر چلنے والے حیوانوں کی لاکھوں قسمیں ہیں، خواہ وہ خوردبین سے دیکھی جانے والی ہوں یا قوی ہیکل، ہر ایک خدا کی ایک آیت ہیں۔ ان کی اپنی خصوصیات اور ساخت ہوتی ہے، جو بالکل متنوع اور ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، حتیٰ کہ بعض قسمیں ایسی بھی ہیں۔ جن میں سے کسی ایک قسم کے مطالعہ پر سائنس دانوں اور دانش وروں کی ایک

جماعت اپنی تمام عمریں صرف کردے یا ان کے تخلیقی اسرار پر ہزاروں کتابیں لکھ ڈالے پھر بھی ان کے بارے میں ہماری معلومات کا دائرہ مجہولات کی نسبت بہت کم ہوگا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مقام پر مبدائے آفرینش کی حکمت اور اس کے بے پایاں علم کی ایک آیت اور نشانی ہے۔

تو پھر کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ بیسیوں سال ان آیات میں اپنی زندگی گزار دیتے ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی ذرہ برابر معلومات حاصل نہیں کرسکتے؟ تو اس کی وجہ صرف وہی ہے، جس کی قرآن مجید نے ان الفاظ میں نشاندہی کردی ہے کہ "یہ آیات ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہیں، جو صاحبان ایمان ولیقین ہیں اور غور وفکر کے مالک ہیں۔" ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو اپنے دل کے دریچے باز کرتے ہیں اور اپنے تمام وجود کے ساتھ علم ودانش اور یقین کے طلب گار رہتے ہیں حتیٰ کہ کسی تھوڑی سے تھوڑی حرکت اور چھوٹے سے چھوٹے موجود کو بھی نظر انداز نہیں کرتے بلکہ کئی کئی گھنٹے اس کے بارے میں سوچنے پر صرف کردیتے ہیں۔" ذات خدا تک رسائی کے لیے اس سے زینے کا کام لیتے ہیں اور معرفت کردگار کے لیے اسے ذریعہ بناتے ہیں۔ پھر اس سے راز ونیاز کرتے ہیں اور اپنے جام دل کو اس کے بادۂ عشق سے لبریز کرتے ہیں۔

اگلی آیت میں تین عظیم نعمتوں کا تذکرہ ہے جو انسان اور دوسری مخلوقات کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور ہر ایک آیاتِ خداوندی میں سے ایک آیت ہے، اور وہ نعمتیں ہیں نور، پانی، اور ہوا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: رات اور دن کے آنے جانے میں اور اس نے آسمان سے جو رزق نازل فرمایا ہے اور اس کے ذریعے زمین کو مرنے کے بعد زندہ کیا ہے اس میں بھی اور ہواؤں کے چلنے میں بھی عقل سے کام لینے والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں (واختلاف اللیل و النهار وما انزل الله من السماء من رزق فاحیا به الارض بعد موتها وتصریف الریاح اٰیات لقوم یعقلون)۔

"نور وظلمت" اور رات دن کے آنے جانے کا مسئلہ جو ایک خاص نظم کے ساتھ ایک دوسرے کے خلیفہ اور جانشین ہوتے رہتے ہیں، حساب شدہ اور تعجب آور ہے۔ اگر ہمیشہ دن رہتا یا بے انتہا لمبا ہوتا تو اس کا درجہ حرارت اس قدر اُوپر چلا جاتا کہ تمام زندہ مخلوق جل کر راکھ ہوجاتی اور اگر رات ہمیشہ رہتی یا حد سے زیادہ طولانی ہوتی تو سردی کی شدت سے ہر چیز منجمد ہوجاتی۔

آیت کی تفسیر میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اختلاف کا معنی ایک دوسرے کی جانشینی نہ ہو بلکہ اس فرق کی طرف اشارہ ہو جو سال بھر کے مختلف موسموں میں رات اور دن کے درمیان پیدا ہوتا رہتا ہے، جس کے نتیجے میں انسان کو مختلف فوائد یعنی مختلف فصلیں، حرارت، پھل، برف وباراں کا نزول اور دوسری برکتیں حاصل ہوتی ہیں۔

یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ سائنسدان کہتے ہیں رُوئے زمین کے مختلف خطوں میں شب وروز کی لمبائی میں جو فرق ہوتا ہے اگر سال بھر کے تمام دنوں کا حساب کیا جائے اور اسی حساب سے سُورج کی روشنی کو تقسیم کیا جائے تو بالکل ٹھیک ٹھیک صُورت میں ہر ایک خطہ دوسرے خطّے کے برابر اس روشنی سے استفادہ کرتا ہے۔ [1]

---

[1] "رات اور دن کے اختلاف" کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اوّل سورۂ بقرہ کی آیت ۱۶۴ کے ذیل میں، جلد ۲ سورۂ آلِ عمران (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۲ پر)

دوسرے مرحلے میں زندگی عطا کرنے والے آسمانی رزق یعنی بارش کا تذکرہ ہے کہ نہ تو جس کی لطافت طبع میں کوئی حرف ہے اور نہ ہی اس کی زندگی عطا کرنے والی قدرت میں کوئی کلام۔ ہر جگہ زندگی، ترو تازگی اور رعنائی کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔

ایسا کیوں نہ ہو؟ جب کہ انسانوں اور بہت سے دوسرے جانوروں اور نباتات کے بدن کا اصل حصہ اسی پانی سے تشکیل پاتا ہے۔

تیسرے مرحلے پر ہواؤں کے چلنے کی بات ہو رہی ہے۔ ایسی ہوائیں جو آکسیجن ایک سے دوسری جگہ پہنچاتی رہتی اور جانداروں کی ضرورت پوری کرتی رہتی ہیں۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ سے آلودہ ہواؤں کو صاف کرنے کے لیے دشت و جنگل اور صحراؤں کی طرف بھیجتی رہتی ہیں اور صاف ہونے کے بعد انھیں دوبارہ شہروں اور آبادیوں کی طرف لے آتی ہیں۔ عجیب بات ہے کہ زندہ موجود کے یہ دونوں گروہ یعنی "حیوانات" اور "نباتات" بالکل ایک دوسرے کے برعکس عمل کرتے ہیں، حیوانات آکسیجن گیس حاصل کرتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں جبکہ نباتات کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرتے ہیں اور آکسیجن خارج کرتے ہیں تاکہ نظام زندگی میں توازن برقرار رہے اور مرور ایام کے ساتھ زمین پر موجود مفید ہواؤں کے ذخائر ختم نہ ہونے پائیں۔

اس کے علاوہ یہی ہوائیں ہوتی ہیں جو نباتات میں نسل کشی کا کام دیتی ہیں، انہیں ثمر آور بناتی ہیں، مختلف زمینوں میں مختلف قسم کی تخم پاشی کرتی ہیں۔ قدرتی چراگاہوں اور جنگلوں کو پروان چڑھاتی ہیں۔ سمندروں کے دل میں موجیں ابھارتی ہیں، جن سے سمندروں کی حیات اور حرکت کا پتہ چلتا ہے، پانی کو بدبودار اور خراب ہونے سے بچاتی ہیں اور یہی ہوائیں ہیں جو سفینوں کو سمندروں کے سینوں پر رواں دواں رکھے ہوئے ہیں۔[1]

یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں پہلے تو آسمانوں اور زمین کے آیات ہونے کی بات ہوئی ہے اور آخر میں فرمایا گیا ہے کہ اس میں "اہل الیقین" کے لیے نشانیاں ہیں پھر دوسری زندہ مخلوق کی تخلیق کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اس میں "اہل یقین" کے لیے نشانیاں ہیں اور نور و ظلمت اور باد و باراں کے نظام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اس میں "عقل سے کام لینے والوں" کے لیے نشانیاں ہیں۔

تعبیرات کے اس اختلاف کی وجہ شاید یہ ہو کہ انسان "معرفۃ اللہ" کی راہوں کو تین مراحل میں طے کرتا ہے پھر کہیں جاکر منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ پہلا مرحلہ "فکر" کا ہے دوسرا "یقین و علم" کا اور تیسرا مرحلہ "ایمان" کا ہے، جسے اصطلاح میں قلبی عقیدہ کہتے ہیں۔

اگرچہ مرتبے کے لحاظ سے ایمان پہلے مرحلہ پر، یقین دوسرے مرحلے پر اور فکر تیسرے مرحلے پر ہوتے ہیں اور آیات مذکورہ میں بھی اسی ترتیب سے ذکر کیے گئے ہیں لیکن خارجی وجود کے اعتبار سے فکر پہلے مرحلے پر، یقین دوسرے اور ایمان تیسرے مرحلے پر ہیں۔ بالفاظ دیگر جو اہل ایمان ہوتے ہیں وہ آیات الٰہی کے مشاہدے ہی سے اس اعلیٰ ترین مرحلے تک پہنچتے ہیں اور جو اہل ایمان نہیں ہیں وہ کم از کم یقین یا فکر کے مرحلے تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲ کا) کی آیت ۱۰ کے ذیل میں، جلد ۵، سورۂ یونس کی آیت ۶ کے ذیل میں اور جلد ۹، سورۂ قصص کی آیت ۷۱ کے ذیل تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔

[1] "باد و باراں" کے آثار کے سلسلے میں تفسیر نمونہ کی جلد ۹ میں سورۂ روم کی آیات ۴۶ تا ۵۰ کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

مفسرین نے اس بارے میں اور بھی وجوہات کو ذکر کیا ہے لیکن جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ زیادہ مناسب ہے۔ اسی سلسلے کی آخری آیت میں گزشتہ آیات کا مجموعی طور پر نتیجہ نکالتے ہوئے قرآنی آیات کی عظمت و اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

یہ خدا کی آیات ہیں، جن کو ہم ٹھیک ٹھیک تمہارے سامنے پڑھتے ہیں (تلك ایات الله نتلوها علیك بالحق)۔

آیا "تلك" کا کلمہ قرآنی آیات کی طرف اشارہ ہے یا آفاق و انفس میں خدا کی آیات کی طرف جو گزشتہ آیات میں مذکور ہو چکی ہیں؟ اس بارے میں مفسرین نے دونوں قسم کی آیات کا احتمال ذکر ہے۔ لیکن "نتلو" کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قرآنی آیات مراد ہیں، البتہ یہی قرآنی آیات ساری کائنات میں خدا کی نشانیوں کو بیان کر رہی ہیں تو اس طرح سے دونوں قسم کی تعبیریں یکجا ہونے کے قابل ہیں۔ (غور کیجئے گا)

بہر حال "تلاوت" "تلو" (بروزن فکر) کے مادہ سے ہے، جس کا معنی بات کو مسلسل بیان کرنا ہے۔ اسی لیے قرآنی آیات کی تلاوت کا معنی ان کا مسلسل اور پے در پے پڑھنا ہے۔

"حق" کی تعبیر ان آیات کے مضامین و مندرجات کی طرف بھی اشارہ ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت نیز خدا کی وحی کی حقانیت کی طرف بھی بالفاظ دیگر "یہ آیات اس حد تک واضح و آشکار اور استدلال پر مبنی ہیں کہ بذات خود اپنی اور اپنے بھیجنے والے کی حقانیت کی دلیل بھی انہی میں مضمر ہے۔

سچ مچ اگر یہ لوگ ان آیات پر ایمان نہیں لائیں گے تو پھر کس چیز پر ایمان لائیں گے؟ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، تو خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کونسی بات ہو گی جس پر یہ کافر لوگ ایمان لائیں گے۔ (فبای حدیث بعد الله وایاته یؤمنون)[1]۔

مرحوم طبرسی "مجمع البیان" میں فرماتے ہیں کہ کلمہ "حدیث" سے گذشتہ اقوام اور ان کی عبرت آموز داستانوں کی طرف اشارہ ہے، جبکہ "آیات" ان دلائل کو کہا جاتا ہے جو صحیح کو باطل سے جدا کرتی ہیں اور قرآن مجید کی آیات دونوں چیزوں کو بیان کر رہی ہیں۔

سچ مچ قرآن مجید توحید کے استدلال اور برہان و وعظ و نصیحت کے لحاظ سے اس قدر مضامین کا حامل ہے کہ جس دل میں ذرہ بھر بھی آمادگی اور جس سر میں تھوڑی سی حق کی قبولیت کی آمادگی موجود ہے اسے خدا، طہارت اور تقویٰ کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر یہ آیات بینات کسی پر اثر انداز نہیں ہوتیں تو ان کی ہدایت کی امید بھی نہیں رکھنی چاہیئے۔

---

[1] "بعد الله" کی تعبیر میں ایک محذوف پایا جاتا ہے جس کی تقدیر یوں ہے:

"فبای حدیث بعد حدیث الله"

۷۔ وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۙ

۸۔ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○

۹۔ وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْئَا ا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۭ

۱۰۔ مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۭ

ترجمہ

۷۔ جھوٹے گناہ گار کے لیے افسوس ہے۔

۸۔ کہ اس پر خدا کی آیات مسلسل پڑھی جاتی ہیں اور انھیں سنتا رہتا ہے پھر بھی غرور سے مخالفت پر اڑا رہتا ہے۔ گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں، تو ایسے شخص کو دردناک عذاب کی خوش خبری دے دے۔

۹۔ اور جب اسے ہماری آیتوں میں سے کسی آیت سے آگاہ کیا جاتا ہے تو اس کی ہنسی اڑاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب ہے۔

۱۰۔ اور جہنم ان کے پیچھے ہی پیچھے ہے اور جو کچھ وہ کما چکے ہیں وہ انھیں نجات

نہیں دلائے گا اور نہ ہی وہ کہ جن کو انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے سرپرست بنایا تھا اور ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے۔

تفسیر

گناھگار جھوٹے پر پھٹکار

گزشتہ آیات سے معلوم ہوتا تھا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو خدا کے کلام کو مختلف توحیدی دلائل اور وعظ و نصیحت کے ساتھ سنتے تو ہیں لیکن ان کے دل پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

زیر تفسیر آیات میں ایسے لوگوں سے متعلق اور ان کے انجام کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہو رہی ہے۔ سب سے پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہر جھوٹے گناہگار پر افسوس ہے۔ (ویل لکل افاك اثیم)۔

"افاك" مبالغے کا صیغہ ہے اور ایسے شخص کے معنی میں ہے جو بہت جھوٹ بولتا ہے اور کبھی بڑے جھوٹ کے معنی میں بھی آتا ہے ہر چند کہ زیادہ نہ ہو۔

"اثیم" "اثم" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے مجرم اور گناہگار۔ یہ لفظ بھی مبالغے کا معنی دیتا ہے۔

ان آیات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ آیاتِ الٰہی کے مقابلے میں معاندانہ ردِ عمل ان لوگوں کا کام ہوتا ہے جو سر سے پاؤں تک گناہوں میں غرق اور جھوٹ سے آلودہ ہوتے ہیں نہ کہ پاک طینت اور نیک سیرت لوگوں کا۔

پھر ان کی معاندانہ روش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اس پر خدا کی آیات مسلسل پڑھی جاتی ہیں اور وہ انھیں سنتا رہتا ہے پھر وہ غرور کے باعث مخالفت پر اصرار رہتا ہے گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں (یسمع اٰیات اللہ تتلیٰ علیہ ثم یصر مستکبرًا کان لم یسمعھا)[1]

اس طرح سے گناہ، جھوٹ، تکبر اور خود پسندی اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ وہ ان آیات کو ان سُنا کر دے اور خود کو بہرا بنا دے۔ جیسا کہ سورۂ لقمان کی آیت ۷ میں بھی بیان ہوا ہے۔ کہ:

"واذا تتلیٰ علیہ اٰیاتنا ولّٰی مستکبرًا کان لم یسمعھا کان فی اذنیہ وقرًا"

"جب اسے ہماری آیات سنائی جاتی ہیں مستکبر بن کر ان سے روگردانی کر لیتا ہے گویا اس نے

---

[1] "یسمع اٰیات اللہ" ممکن ہے کہ "جملہ مستانفہ" ہو یا پھر "کل" کی دوسری صفت ہو۔

کچھ نہیں سنا، گویا اس کے کان بالکل بہرے ہیں "۔

زیر تفسیر آیت کے آخر میں انھیں زبردست تہدید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ایسے شخص کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دے (فبشرہ بعذاب الیم)۔

جس طرح اس نے رسول اللہؐ اور مومنین کے دلوں کو دکھایا ہے اسی طرح ہم بھی اسے دردناک عذاب میں مبتلا کریں گے، کیونکہ قیامت کا عذاب دنیا میں انسان کے اعمال کا تجسم ہے، یعنی دنیا میں انجام دیئے ہوئے اعمال آخرت میں مجسم ہو کر سامنے آ جائیں گے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے اس آیت اور اس کے بعد کی آیت کی شان نزول ذکر کرتے ہوتے انھیں ابوجہل یا نضر بن حارث کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو عجمیوں کے افسانوں اور داستانوں کو اکٹھا کر کے لوگوں کو سنایا کرتے تھے تاکہ اس طرح سے وہ انھیں ایسے ہی قصے کہانیوں کے ساتھ بہلاتے پھسلاتے رہیں اور آئین حق سے منحرف کیے رکھیں، لیکن ظاہری بات ہے کہ یہ صرف انہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہر دور کے تمام جھوٹے مجرمین اور مستکبرین کے بارے میں ہے۔ وہ لوگ جو آیات الٰہی، خدائی انبیاء اور عظیم پیشواؤں سے سنی ہوئی باتوں کو ان سنی کر دیتے ہیں کیونکہ ایسی باتیں انکی نفسانی خواہشات اور میلانات سے میل نہیں کھاتیں اور ان کے شیطانی افکار ان کی تائید نہیں کرتے، ان کی غلط رسوم وعادات اور اندھی تقلید کے موافق نہیں ہیں۔ جی ہاں! ایسے سب لوگوں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیئے۔

اگرچہ "عذاب" کی "بشارت" (خوشخبری) سے مناسبت نہیں ہے، لیکن یہ تعبیر ایسے لوگوں کی توہین، تحقیر اور تمسخر کیلئے استعمال ہوتی ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: جب یہ ہٹ دھرم مستکبر ہماری آیات میں سے کسی آیت سے واقف ہو جاتا ہے اور اسے جان لیتا ہے تو اس کی ہنسی اڑاتا ہے (واذا علم من اٰیاتنا شیئا اتخذھا ھزوا)[1]

درحقیقت ان خود غرض جاہلوں کی دو حالتیں ہوا کرتی ہیں، پہلی تو یہ کہ وہ زیادہ خدا کی آیات کو سنتے ہیں لیکن سنی ان سنی کر دیتے ہیں، بڑی بے پرواہی سے گزر جاتے ہیں گویا انھوں نے کچھ سنا ہی نہیں، دوسری یہ کہ اگر سنتے بھی ہیں اور ان کی طرف توجہ بھی دیتے ہیں اور اس پر اپنے ردعمل کا اظہار بھی کرتے ہیں تو یہی کہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور مسخرہ بازی سے کام لیتے ہیں۔ وہ سب لوگ ان دونوں کاموں میں شریک ہیں۔ کبھی وہ اور کبھی یہ۔ (اسی لیے اس آیت میں اور اس سے پہلی آیت میں کسی قسم کا تضاد نہیں پایا جاتا)۔

پھر اہم بات یہ ہے کہ پہلے تو فرمایا گیا ہے کہ "اگر ہماری آیات میں سے کسی سے واقف ہو جاتا ہے" لیکن بعد میں یہ نہیں فرمایا کہ جسے جان چکا ہے اس کا استہزاء کرتا ہے، بلکہ فرمایا گیا ہے کہ ہماری سب آیات کا (خواہ انہیں جان چکا ہے یا نہیں) مذاق اڑاتا ہے۔

---

[1] توجہ رہے کہ "اتخذھا" میں موجود ضمیر "شیئا" کی طرف نہیں بلکہ "اٰیاتنا" کی طرف لوٹ رہی ہے۔

جبکہ یہ جہالت اور بے علمی کی انتہا ہے کہ انسان کسی ایسی چیز کا انکار کرے، یا اس کا مذاق اڑائے جسے وہ سرے سے نہیں سمجھتا اور یہ ان کی ہٹ دھرمی اور عناد کی بہت بڑی دلیل ہے۔

آیت کے آخر میں ایسے لوگوں کی سزا کو ان لفظوں میں بیان فرمایا گیا ہے: ان کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب ہے (اولٰئک لھم عذاب مھین)۔

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ وہ آیاتِ الٰہی کا مذاق اڑا کر اپنی شخصیت اور مقام و منزلت بنانا چاہتے ہیں، لیکن خدا تعالیٰ انھیں اس کام کی سزا دے کر انھیں ذلیل و خوار اور پست و بے قیمت کر دے گا۔ انہیں ایسے رسوا کُن اور تحقیر آمیز طریقے پر عذابِ قیامت میں گرفتار کرے گا کہ انھیں مُنہ کے بل زمین پر گھسیٹا جائے گا اور عذاب کے فرشتے طوق و زنجیر پہنا کر اور ملامت و سرزنش کرتے ہُوئے جہنم میں لے جائیں گے۔

یہیں پر یہ بات بھی اچھی طرح سے واضح ہو جاتی ہے کہ گزشتہ آیت میں عذاب کی صفت "الیم" اور اس آیت میں "مھین" اور بعد کی آیت میں "عظیم" کیوں بیان کی گئی ہے؟ درحقیقت ان میں سے ہر صفت ان کے گناہوں کی کیفیت سے مناسبت رکھتی ہے۔

بعد کی آیت اس "عذاب مھین" کی یوں تشریح کرتی ہے: اور جہنم ان کے پیچھے ہی پیچھے ہے (من ورائھم جھنم)۔

"پیچھے ہی پیچھے" کی تعبیر کیوں اختیار کی گئی ہے حالانکہ جہنم تو ان کے آگے آگے ہوگی اور وہ آگے جا کر ہی وہاں پہنچیں گے؟ ممکن ہے یہ اس لحاظ سے ہو کہ وہ دُنیا کی طرف مُنہ کر کے آخرت اور خدا کے عذاب کو پسِ پشت ڈال چکے ہیں سا ایسے موقع پر اس قسم کی تعبیر عام طور پر استعمال ہُوا کرتی ہے۔ جب انسان کسی چیز سے بے اعتنائی کرتا ہے تو کہتے ہیں وہ اسے پسِ پشت ڈال چکا ہے، قرآن مجید بھی سورۂ دھر کی آیت ۲۷ میں فرماتا ہے:

"ان ھٰؤلاء یحبون العاجلۃ ویذرون وراءھم یومًا ثقیلًا"

"وہ لوگ دُنیا کی زود گزر زندگی کو پسند کرتے ہیں اور اس سنگین دن کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں"

کچھ مفسرین کہتے ہیں کہ "وراء" کا کلمہ "مواراۃ" سے لیا گیا ہے اور "مواراۃ" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان سے پوشیدہ ہو۔ پس پشت کو بھی "وراء" کہا جاتا ہے اور سامنے کی چیز کو بھی جو دور اور پوشیدہ ہو۔ اس طرح سے کلمہ "وراء" کا ایک جامع مفہوم ہے جو دو متضاد مصداقوں پر بولا جاتا ہے۔[1]

یہ تفسیر بھی بعید معلوم نہیں ہوتی کہ ہم کہیں کہ "وراء" کی تعبیر سے "علت و معلول" کے مسئلہ کی طرف اشارہ ہے، مثلاً ہم کہتے ہیں کہ "اگر تم نے یہ مضر غذا استعمال کی تو اس کے پیچھے پیچھے بیماری ہے" یعنی مضر غذا کھانا اس بیماری کی علت ہے

---

[1] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اگر "وراء" کو فاعل کی طرف مضاف کیا جائے تو اس کا معنی پسِ پُشت ہوتا ہے اور اگر مفعول کی طرف مضاف ہو تو سامنے کے معنی دیتا ہے۔ (دیکھو تفسیر روح البیان جلد ۸ ص ۴۲۹) لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں ملی۔

اور بیماری اس کی معلول۔ اسی طرح یہاں پر بھی ان کے اعمال بھی دوزخ کے رسواکن عذاب کا سبب اور عامل ہیں۔

بہر صورت، آیت کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اگر ان کا یہ گمان ہو کہ بے پناہ مال و دولت، ثروت اور معنوی خدا انھیں عذاب سے نجات دلائیں گے تو یہ ان کی بھول ہے، کیونکہ جو کچھ وہ کما چکے ہیں، نہیں عذاب سے نجات نہیں دلائے گا اور نہ ہی وہ کہ جنہیں انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنا سرپرست بنایا تھا (ولا یغنی منھم ما کسبوا شیئا ولا ما اتخذوا من دون الله اولیاء)۔

چونکہ فرار اور نجات کی کوئی راہ نہیں ہوگی لہٰذا انھیں خدا کے قہر و غضب کی آگ میں ہمیشہ جلنا ہوگا اور ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے۔ (ولھم عذاب عظیم)۔

ان لوگوں نے دُنیا میں خدائی آیات کو معمولی سمجھا لہٰذا خدا نے ان کے عذاب کو بڑا کر دیا۔ وہ بڑائی کا اظہار کرتے تھے لہٰذا خدا بھی ان کو عذاب عظیم دے گا۔

ایسا عذاب ہر لحاظ سے عظیم بھی ہوگا اور جاودانی بھی، شدید بھی ہوگا اور رسوا کُن بھی اور گنا ہگاروں کے دل کی گہرائیوں اور ہڈیوں کے جوڑوں تک جا پہنچے گا۔ جی ہاں! خداوندِ عظیم کے سامنے گناہ عظیم کی سزا بھی عذاب عظیم ہوگی۔

۱۱۔ هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝

۱۲۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

۱۳۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

۱۴۔ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

۱۵۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَاۗءَ فَعَلَيْهَا ۡ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۱۔ یہ (قرآن) سبب ہدایت ہے اور جن لوگوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں کا انکار کیا، ان کے لیے سخت اور دردناک عذاب ہے۔

۱۲۔ خدا ہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے مسخر کر دیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ اس کے فضل سے اپنا حصّہ حاصل کرو اور شاید کہ اس کی نعمتوں کا

شکر بجالاؤ۔

۱۲۔ اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنی طرف سے تمہارا مسخر کیا ہے اس میں اہل فکر کے لیے اہم نشانیاں ہیں۔

۱۴۔ مؤمنین سے کہہ دیجئے، جو لوگ خدا کے دنوں (روزِ قیامت) کی توقع نہیں رکھتے ان سے درگزر کریں تاکہ خدا اس دن ہر قوم کو اس کے ان اعمال کی جزا دے جو وہ انجام دیتی رہی ہے۔

۱۵۔ جو شخص نیک کام کرتا ہے اپنے لیے ہی انجام دیتا ہے اور جو بُرا کام کرے گا، اس کا وبال اسی پر ہوگا۔ پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

تفسیر

سب تیرے لیے سرگرداں اور تیرے زیرِ فرمان ہیں

گزشتہ آیات میں آیاتِ الٰہی کی عظمت کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ زیرِ تفسیر آیات بھی اس موضوع پر گفتگو کر رہی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ قرآن مجید سببِ ہدایت ہے۔ (ھٰذا ھدًی)۔

حق کو باطل سے جدا کرتا ہے، انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اُجاگر کرتا ہے۔ راہِ حق کے راہیوں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے، لیکن جن لوگوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں کا انکار کیا ہے، ان کے لیے سخت اور دردناک عذاب ہے (والذین کفروا بآیات ربھم لھم عذابٌ من رجزٍ الیم)۔

کتاب مفردات میں راغب کے بقول "رجز" (بروزن "مرض") کا اصلی معنی اضطراب، لرزہ اور بدنظمی ہے، خاص کر جب اُونٹ بیمار ہوتا ہے تو زبردست کمزوری کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے اور غیر منظم قدم اٹھاتا ہے، ایسی حالت کو عرب اپنی زبان میں "رجز" کہتے ہیں۔

طاعون کی بیماری سخت مصیبت یا زبردست برف باری اور ژالہ باری کو "رجز" کہتے ہیں۔ اسی طرح شیطانی وسوسوں وغیرہ پر بھی اس کلمہ کا اطلاق ہوتا ہے، کیونکہ یہ سب اضطراب و بے چینی، تزلزل اور بدنظمی کا باعث ہوتے ہیں اور اگر جنگی اشعار کو

"رجز" (بروزن "عرض") کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اشعار کے مقطع چھوٹے اور قریب ہوتے ہیں اور یا پھر دشمن کے پیکر میں تزلزل اور اضطراب پیدا ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں۔)

پھر سلسلۂ گفتگو کو توحید کی بحث کی جانب موڑ دیا گیا ہے۔ اس سورت کی ابتدائی آیات میں بھی اس ضمن میں گفتگو موجود ہے مشرکین کو توحید اور خدا شناسی کے موثر درس دیئے گئے ہیں۔

کبھی قرآن ان کے احساسات کو جھنجوڑتے ہوتے کہتا ہے: خدا ہی تو ہے، جس نے دریا کو تمہارے لیے مسخر کر دیا تا کہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور اس کے فضل سے تم اپنا حصہ حاصل کرو، شاید کہ اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ (الله الذی سخر لکم البحر لتجری الفلك فیه بامره ولتبتغوا من فضله ولعلکم تشکرون)۔

کس ذات نے بحری جہازوں اور کشتیوں میں یہ خاصیت خلق فرمائی ہے کہ وہ پانی میں ڈوبتی نہیں ہیں اور کس نے ان کی حرکت کے لیے پانی کو ایسا نرم بنایا ہے کہ وہ آرام سے اس پر چلتی رہتی ہیں اور کس نے ہواؤں کو حکم دیا ہے کہ وہ منظم صورت میں سمندروں کی سطح پر چلتی رہیں اور کشتیوں کو اس پر رواں دواں رکھیں (یا کس نے بخارات کی طاقت کو ہواؤں کا جانشین بنایا ہے تاکہ وہ ان عظیم جہازوں کو بڑی تیزی کے ساتھ جاری وساری رکھیں ؟

ہم جانتے ہیں کہ گزشتہ اور موجودہ دور میں انسان کے وسائل کی حمل ونقل کا عظیم ترین اور اہم ترین ذریعہ چھوٹی بڑی اور غول پیکر کشتیاں اور بحری جہاز ہیں۔ جو سال بھر لاکھوں انسانوں اور ان سے زیادہ تجارتی مال کو دنیا کے دور دراز ترین علاقوں سے دوسری جگہ منتقل کرتے رہتے ہیں، بلکہ بعض بحری جہاز تو ایسے بھی ہیں جو ایک چھوٹے سے شہر جتنی وسعت اور آبادی کے حامل ہوتے ہیں اور تمام قسم کے وسائل اور ہر قسم کی چیزیں اُن میں موجود ہوتی ہیں۔

یقیناً اگر یہ تینوں طاقتیں موجود نہ ہوتیں تو انسان اپنی دوسری معمول کی سواریوں کے ذریعے حمل ونقل کی مشکلات کو کس طرح حل کر سکتا؟ ہر چند کہ دوسرے ذرائع آمدورفت بھی اس کی نعمت ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر مفید ہیں۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سورۂ ابراہیمؑ کی بتیسویں آیت میں فرمایا گیا ہے:

"وسخر لکم الفلك لتجری فی البحر بامره"

"کشتیوں کو تمہارے تابع فرمان کر دیا ہے تاکہ اس کے حکم کے مطابق دریا میں چلتی رہیں۔"

لیکن یہاں پر فرمایا گیا ہے: "دریا کو تمہارے تابع فرمان بنا دیا ہے تاکہ اس میں کشتیاں چلتی رہیں"۔ کیونکہ وہاں پر زیادہ نظر تسخیر پر ہے۔ لہٰذا اس کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے:

"وسخر لکم الانهار"

"اور اس نے نہروں کو بھی تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے"۔

لیکن یہاں پر کشتیوں کی تسخیر پیش نظر ہے۔ صورت حال خواہ کچھ ہو دونوں چیزیں حکم خدا کے مطابق انسان کے لیے مسخر اور اس کے تابع ہیں اور اس کی خدمت کے لیے کمربستہ ہیں۔

اس تسخیر کا مقصد یہ ہے کہ تم فضلِ خداوندی سے اپنا حصہ پاؤ" کیونکہ اس قسم کی تعبیر عام طور پر تجارت اور اقتصادی سرگرمیوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ البتہ مسافرین کی نقل و حرکت اور انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کی تعبیر بھی اس میں پائی جاتی ہے اور خداوند تعالیٰ کے فضل سے بہرہ برداری کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کے احساسِ شکر گزاری کو متحرک کیا جا سکے اور اس کے تمام احساسات کو ایک جگہ مرکز کیا جا سکے تاکہ اس طرح سے انسان "معرفۃ اللہ" کی راہوں کو طے کر سکے۔

لفظ "فلک" (کشتی) جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں مفرد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

دریاؤں، کشتیوں اور ان کے فائدوں اور برکتوں کی بیشتر وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۶ میں سورۂ نحل کی ۱۴ ویں آیت کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

کشتیاں اور بحری جہاز ایسی نعمت ہیں جو انسان کی روزمرہ کی زندگی سے زیادہ قریب کا تعلق رکھتی ہے۔ اس کے ذکر کے بعد تمام مخلوق کی تسخیر کو کلی طور پر بیان فرماتے ہوئے کہتا ہے، اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے سب کو اپنی طرف سے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ (وسخر لکم ما فی السماوات وما فی الارض جمیعا منہ)۔

اس نے تمہیں اس قدر حیثیت، قدر و قیمت اور عظمت عطا فرمائی ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں تمہارے لیے مسخر کر دی ہیں اور وہ تمہارے مفادات کی نگرانی کر رہی ہیں۔ آفتاب اور ماہتاب باد اور باران، پہاڑ اور دریا، جنگل اور صحرا، درخت اور حیوان، معدنیات اور زیرِ زمین ذخائر غرض اس کائنات کی تمام چیزوں کو اس نے تمہاری خدمت کے لیے وقف کر رکھا ہے اور ہر چیز کو تمہارے زیرِ فرمان کر دیا ہے تاکہ تم اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ اور غفلت کا شکار نہ ہو جاؤ۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ وہ فرماتا ہے: "جمیعا منہ" یہ تمام چیزیں اپنی خصوصیات اور اختلاف کے باوجود اسی ذات کی پیدا کردہ ہیں اور اسی کے زیرِ فرمان تمہاری خدمت کے لیے حاضر ہیں۔

جب تمام نعمتیں اس کی جانب سے ہیں اور ساری کائنات کی خالق، مدبر اور پروردگار اسی کی ذات پاک ہے تو پھر انسان دوسروں کے پیچھے کیوں جائے اور اپنا سر ضعیف مخلوق کے آستانے پر کیوں جھکائے اور منعم حقیقی کی معرفت سے کیوں غافل ہو؟

اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اس میں اہلِ فکر کے لیے اہم نشانیاں ہیں (ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون)۔

پہلی آیت میں انسانی احساسات سے استفادہ کیا گیا ہے اور اس آیت میں ان کے عقول و افکار سے کام لیا گیا ہے۔

---

[1] "جمیعا منہ" کے اعراب اور اس کی ترکیب میں متعدد احتمال ملتے ہیں۔ زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں دو احتمال ذکر کیے ہیں، پہلا یہ کہ "جمیعا منہ" "ما فی السماوات وما فی الارض" کا حال واقع ہو رہا ہے۔ یعنی یہ سب کچھ تمہارے لیے مسخر ہے، حالانکہ اُسی کی طرف سے ہے۔ دوسرا یہ کہ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو تقدیری صورت میں یوں ہے: "ھی منہ جمیعا"۔

بعض مفسرین نے ایک اور احتمال بھی ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ جملہ "ما فی السماوات وما فی الارض" کی تاکید ہے۔

کیونکہ خداوند مہربان ہر ممکنہ زبان کے ذریعے اپنے بندوں کے ساتھ باتیں کرتا ہے، کبھی تو دل کی زبان کے ساتھ اور کبھی عقل و فکر کی زبان کے ساتھ۔ ان سب میں سوائے ایک ہدف کے اور کچھ بھی مطلوب و مقصود نہیں اور وہ ہے غافل انسانوں کی بیداری اورانہیں خدائی راستے پر گامزن کرنا۔

کائنات کی مختلف موجودات کی تسخیر کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۶ میں سورۂ ابراہیم کی آیات ۳۱ تا ۳۴ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔

پھر کفار کے ساتھ میل جول کے موقع پر مومنین کو ایک اخلاقی سبق دیا جارہا ہے تاکہ سابق منطقی محمل کو اس کے ذریعے سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ اسی سلسلے روئے سخن پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، مومنین سے کہہ دے کہ جو لوگ خدا کے دنوں (روزِ قیامت) کی توقع نہیں رکھتے، ان سے درگزر کریں اور سخت گیری سے کام نہ لیں۔

(قل للذین امنوا یغفروا للذین لا یرجون ایام اللہ)۔

ممکن ہے کہ وہ ایمان اور خدائی تربیت کی سہولیات سے دُور ہونے کی وجہ سے سخت اور نامناسب روش اپنائے ہوئے ہوں اس لیے غلط الفاظ استعمال کرتے ہوں، لہٰذا تمہارا فرض بنتا ہے کہ تم اپنی طرف سے عظمت کا ثبوت دو اور کھلے دل کے ساتھ ایسے لوگوں سے ملاپ رکھو، مبادا ان کی ہٹ دھرمی میں اضافہ ہو اور حق سے ان کا فاصلہ بڑھتا جائے۔ تمہاری طرف سے حسن خلق اور کھلے دل کے ساتھ میل ملاپ کا مظاہرہ ایک تو ان کے دباؤ میں کمی کر دے گا اور دوسرے ممکن ہے کہ ان کی ایمان کی طرف کشش کا موجب بن جائے۔

اس طرح کا حکم قرآن مجید میں کئی مرتبہ آیا ہے۔ مثلاً سورۂ زخرف آیت ۸۹ میں ہے۔

"فاصفح عنھم وقل سلام فسوف یعلمون"

ان سے چشم پوشی کیجیے اور کہہ دیجیے "سلام ہو تم پر، لیکن بہت جلد وہ اپنا انجام جان لیں گے۔"

اصولی طور پر بے سمجھ لوگوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ اور سزا پر اصرار، عام طور پر کسی خاطر خواہ نتیجے کا باعث نہیں بن سکتا اور ان سے بے پرواہی اور عظمت کا مظاہرہ ہی انہیں بیدار کرنے کا ذریعہ اور ہدایت کا عامل بنتا ہے۔

البتہ یہ کوئی کلیہ قاعدہ نہیں ہے، کیونکہ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کچھ مقام ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں پر سختی اور سزا کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہوتا، لیکن ایسا اتفاق کم ہوتا ہے۔

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ویسے تو تمام دن خدا کے دن ہوتے ہیں لیکن "ایام اللہ" کا اطلاق خاص دنوں پر ہوتا ہے، کیونکہ یہ ان کی اہمیت اور عظمت کی علامت ہے۔

اس قسم کی تعبیر قرآن مجید میں دو مقام پر آئی ہے، ایک تو اسی آیت میں اور دوسرے سورۂ ابراہیم میں، جہاں اس کے وسیع معانی ہیں۔

احادیث میں "ایام اللہ" کی تفسیر میں مختلف دنوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان میں سے علی بن ابراہیم کی تفسیر میں مذکور ہے کہ "ایام اللہ" سے تین روز مراد ہیں۔

حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کا دن، موت کا دن اور قیامت کا دن۔ [1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

"ایام اللہ نعمائہ وبلائہ ببلائہ سبحانہ"

"ایام اللہ خدا کی نعمتوں کے دن ہیں اور اس کی طرف سے آزمائش تبلاؤں کے ذریعے ہوتی ہے"[2]

بہرحال یہ تعبیر روزِ قیامت کی اہمیت کی علامت ہے، خداوند عالم کی آشکار اور واضح صورت میں ہر چیز اور ہر شخص پر حاکمیت کا دن، عظیم عدل وانصاف کا دن۔

تاکہ اس قسم کے لوگ اس عظمت اور عفو ودرگزر سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں، اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: تاکہ خداوند عالم اس دن ہر قوم کو اس کے ان اعمال کی جزا دے جو وہ انجام دیتی رہی ہے۔ (لیجزی قوما بما کانوا یکسبون)۔

کچھ مفسرین نے اس جملے کو کفار اور مجرمین کے لیے ایک قسم کی دھمکی مراد لیا ہے جبکہ بعض نے اسے مومنین کے عفو ودرگزر کی جزا کے معنوں میں لیا ہے۔

لیکن اس بات سے کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ یہ کفار کے لیے دھمکی اور مومنین کے لیے خوشخبری ہو، جیسا کہ بعد کی آیت میں بھی اسی چیز کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے: جو شخص نیک کام کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے کرتا ہے اور برا کام کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر ہوگا، پھر تم سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور اپنے اعمال کا نتیجہ پالو گے۔ (من عمل صالحا فلنفسہ ومن اساء فعلیھا ثم الی ربکم ترجعون)۔

یہ تعبیر جو قرآنی آیات میں کئی بار ذکر ہوئی ہے اور مختلف عبارتوں کے ساتھ بیان ہوئی ہے اُن لوگوں کا جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہماری اطاعت یا نافرمانی خدا کو کیا نفع یا نقصان پہنچا سکتی ہے اور اس کی اطاعت یا معصیت سے نہی پر اصرار کے کیا معنی ہیں؟

یہ آیت کہتی ہے کہ یہ سب نفع یا نقصان تمہارے ہی لیے ہے اور تم ہی اپنے اعمال صالحہ کے پرتو میں ارتقائی مراحل طے کرو گے اور قرب الٰہی کے آسمان تک پرواز کرو گے یا جرم وگناہ کے نتیجے میں پستی میں جا گرو گے اور غضب الٰہی کے گڑھوں اور رحمت خداوندی کے بعد اس کی ابدی لعنت کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرو گے۔

اوامر فرض کے تمام پروگرام انبیاء کی بعثت اور کتابوں کا نزول بھی اسی لیے ہے۔ اسی لیے قرآن مجید ایک جگہ پر فرماتا ہے۔

"ومن یشکر فانما یشکر لنفسہ ومن کفر فان اللہ غنی حمید"

"جو شخص شکر بجالاتا ہے اپنے فائدہ ہی کے لیے شکر گزاری کرتا ہے اور جو شخص کفر کرتا ہے تو خدا

---

[1]، [2] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۵۱۹۔

غنی و حمید ہے۔ (لقمان/۱۲)

ایک اور جگہ پر فرمایا گیا ہے:

• فمن اھتدٰی فلنفسہ ومن ضل فانما یضل علیھا؛

• "جو شخص ہدایت حاصل کرتا ہے اپنے ہی فائدہ کے لیے کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے، اس کا نقصان بھی اسے ہی ہوگا۔" (زمر/۴۱)

ایک اور مقام پر ہے:

• ومن تزکّٰی فانما یتزکّٰی لنفسہ والی اللہ المصیر؛

• جو شخص پاکیزگی اپناتا ہے اپنے ہی فائدے کے لیے اپناتا ہے اور سب لوگوں کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے۔ (فاطر/۱۸)

خلاصہ یہ کہ اس قسم کی تعبیریں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ "خدا کی طرف بلانے والے افراد" کی دعوت، ہر پہلو سے انسانیت کی ایک عظیم خدمت ہے نہ کہ خدا کی، جو ہر چیز سے بے نیاز ہے اور نہ ہی خود انبیاء کی خدمت ہوتی ہے، کیونکہ ان کا اجر تو صرف خدا کے پاس ہے۔

اس حقیقت کی طرف توجہ، اطاعت الٰہی کی طرف اقدام اور گناہوں سے پرہیز کا ایک نہایت مؤثر عامل ہے۔

۱۶۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝

۱۷۔ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِىْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

۱۸۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

۱۹۔ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِىُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

۲۰۔ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۶۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو آسمانی کتاب، حکومت اور نبوّت عطا کی اور انہیں پاکیزہ رزق دیا اور انھیں (اپنے زمانے کے) تمام لوگوں پر فضیلت عطا کی۔

۱۷۔ اور ان کو نبوت و شریعت کے روشن دلائل عطا کیے، تو ان لوگوں نے علم آچکنے کے بعد بس ظلم اور برتری کی خواہش کی بنا پر ایک دوسرے سے اختلاف کیا۔ لیکن یہ

لوگ جن باتوں میں اختلاف کر رہے ہیں، قیامت کے دن تیرا پروردگار ان میں فیصلہ کر دے گا۔

۱۸۔ پھر ہم نے تجھے برحق شریعت اور دین پر برقرار رکھا پس اسی کی پیروی کرتا رہ اور نادان سرکشوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا۔

۱۹۔ یہ لوگ خدا کے مقابلے میں ہرگز تجھے بے نیاز نہیں کر سکتے اور نہ ہی عذاب سے بچا سکتے ہیں، اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہیں، جبکہ خداوندِ عالم پرہیزگاروں کا مددگار ہے۔

۲۰۔ یہ (قرآن اور آسمانی شریعت) ان لوگوں کے لیے بینائی کے وسائل اور ہدایت و رحمت کے ذرائع ہیں جو ان پر یقین رکھتے ہیں۔

تفسیر

بنی اسرائیل کی ناشکری

گذشتہ آیات میں خداوندِ عالم کی مختلف نعمتوں، شکرگزاری اور اعمالِ صالحہ سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ ان آیات میں ان بعض گذشتہ اقوام کا تذکرہ ہے جن کو خدا کی نعمتیں ملیں، لیکن انہوں نے ان کی قدردانی نہیں کی۔

ارشاد ہوتا ہے، ہم نے بنی اسرائیل کو آسمانی کتاب، حکومت اور نبوت عطا کی اور انہیں پاکیزہ رزق دیا اور انہیں (اپنے) زمانے کے تمام لوگوں پر فضیلت عطا کی (ولقد اٰتینا بنی اسرائیل الکتاب والحکم والنبوة ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علی العالمین)۔

اس آیت میں ان پانچ نعمتوں کا تذکرہ ہے جو خداوندِ عالم نے بنی اسرائیل کو عطا کی تھیں۔ بعد میں ذکر ہونے والی نعمت کو ملا کر یہ چھ عظیم نعمتیں بن جاتی ہیں۔

سب سے پہلی نعمت تو آسمانی کتاب یعنی تورات ہے جو دینی معارف، حلال و حرام اور ہدایت و سعادت کی راہیں

بیان کرتی تھی۔

دوسری نعمت حکومت اور منصب ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں بنی اسرائیل ایک طویل عرصے تک نہایت ہی طاقتور اور وسیع و عریض حکومت کے مالک رہے ہیں، نہ صرف حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام منصب حکومت پر فائز رہے ہیں، بلکہ بنی اسرائیل کے دوسرے بہت سے افراد بھی اپنے دور کے طاقت ور حکمران رہے ہیں۔

قرآنی تعبیر میں "حکم" عام طور پر فیصلہ کرنے کو کہتے ہیں، لیکن چونکہ عدل و انصاف کا محکمہ ہمیشہ حکومت ہی کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے اور حکومت کی امداد اور طاقت کے بغیر "قاضی" کے فیصلوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی لہٰذا التزامی دلالت کے طور پر اس کا اطلاق حکمرانی پر بھی ہوتا ہے۔

تورات کے بارے میں سورۂ مائدہ کی ۴۴ ویں آیت میں ہے کہ:

• یحکم بها النبیون الذین اسلموا

"جو انبیاء حکم خدا کے سامنے سر جھکا چکے تھے وہ تورات ہی کے ذریعے لوگوں کے درمیان فیصلے کرتے تھے۔"

ان پر خدا کی طرف سے تیسری نعمت "نبوت" کی تھی، کیونکہ خداوند عالم نے بنی اسرائیل میں سے بہت انبیاء منتخب کئے تھے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے:

بنی اسرائیل میں سے برگزیدہ انبیاء کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔ [1]

ایک اور روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل کے انبیاء کی تعداد چار ہزار افراد تھی۔ [2]

یہ سب ان پر خدا کی نعمتیں تھیں۔

چوتھے مرحلے پر مادی نعمتوں کا تذکرہ ہوتا ہے، نہایت ہی جامع اور مانع تذکرہ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے انہیں پاک و پاکیزہ روزی عطا فرمائی (ورزقناهم من الطیبات)

پانچویں نعمت بلا شرکت غیرے فضیلت و برتری اور قدرت و طاقت تھی، جیسا کہ اسی آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے: اور انھیں اپنے زمانے کے تمام لوگوں پر فضیلت عطا کی (وفضلناهم علی العالمین)

اس میں شک نہیں ہے کہ یہاں پر "عالمین" سے مراد اس زمانے ہی کے لوگ ہیں، کیونکہ سورۂ آل عمران کی ۱۱۰ ویں آیت کہتی ہے:

• کنتم خیر امة اخرجت للناس

"تم مسلمان ایک بہترین امت تھے، جنہوں نے انسانوں کے فائدہ کے لیے عالم وجود میں قدم رکھا۔"

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۔

[2] بحار الانوار طبع جدید جلد ۱ صفحہ ۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت رسالت مآب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم افضل الانبیاء ہیں اسی طرح آپ کی اُمت بھی افضل ترین امت ہوگی، جیسا کہ سورۂ نحل کی ۸۹ ویں آیت میں ہے:۔

"ویوم نبعث فی کل امۃ شھیدًا علیھم من انفسھم وجئنا بک شھیدًا علی ھٰؤلاء"

"اس دن کا سوچیئے جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ خود انہی میں سے مبعوث کریں گے اور آپ کو ان سب پر گواہ ٹھہرائیں گے"۔

بعد کی آیت میں خداوند عالم اس چھٹی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے فرماتا ہے جو اس قدر ناشناس قوم کو عطا کی گئی، فرماتا ہے: اور ہم نے ان کو نبوت اور شریعت کے روشن دلائل عطا کیئے (و اٰتیناھم بینات من الامر)۔

ممکن ہے "بینات" سے ان روشن معجزات کی طرف اشارہ ہو جو خداوند عالم نے جناب مُوسیٰ بن عمران اور بنی اسرائیل کے دوسرے انبیاء کو عطا فرمائے، یا پھر منطقی اور آشکار دلائل و براہین، قوانین اور حکم اور پختہ احکام کی طرف اشارہ ہو۔

بعض مفسرین کا احتمال ہے کہ یہ تعبیر ان روشن علامات و آیات کی طرف اشارہ ہے جو خداوندعالم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں انہیں عطا کی تھیں کہ جن کے ذریعے وہ پیغمبر خاتم الانبیاءؐ کو اپنی اولاد کی طرح پہچان سکتے تھے، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

"الذین اٰتیناھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم"

"جنہیں ہم نے کتاب عطا کی وہ اُسے (رسُول اسلام کو) یوں پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں" (بقرہ - ۱۴۶)

لیکن اگر یہ تمام معانی آیت میں جمع کر لیے جائیں تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

بہر حال ان تمام عظیم نعمتوں اور روشن دلیلوں کے ہوتے ہُوئے اختلاف کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی، لیکن ان ناشکروں نے بہت جلد آپس میں اختلاف کھڑے کر دیئے، جیسا کہ اسی آیت کے ضمن میں قرآن فرماتا ہے: انہوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اپنے پاس علم و معرفت کے آجانے کے بعد اور اس اختلاف کا منشاء رہی جاہ طلبی اور بالادستی کی خواہش تھی (فما اختلفوا الا من بعد ما جاءھم العلم بغیًا بینھم)۔

جی ہاں! انہوں نے سرکشی کے جھنڈے بلند کر دیئے اور ایک گروہ دوسرے کی جان کے درپے ہوگیا، یہاں تک کہ اتحاد و اتفاق کے ذرائع کو اختلاف اور تفرقہ بازی کے اسباب بنالیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی طاقت کمزوری میں بدل گئی، ان کی عظمت کے ستارے ڈوب گئے، ان کی حکومت دگرگوں ہوگئی اور خود دربدر کی ٹھوکریں کھانے لگے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد وہ اختلاف ہیں جو انھوں نے پیغمبر اسلام کی صفات جاننے کے بعد اُن کے بارے میں ظاہر کیے۔

قرآن مجید اسی آیت کے آخر میں انہیں خبردار کرتے ہُوئے کہتا ہے: لیکن یہ لوگ جن باتوں میں اختلاف کر رہے ہیں، قیامت

کے دن تمہارا پروردگار ان کے بارے میں فیصلہ کرے گا۔ (انّ ربّک یقضی بینھم یوم القیامۃ فیما کانوا فیہ یختلفون)۔

تو گویا آپس میں اختلاف کرکے ایک تو انہوں نے دنیا میں اپنی عظمت اور طاقت کو کھو دیا اور دوسرے اپنے لیے آخرت کا عذاب مول لے لیا۔

خداوندِ عالم نے بنی اسرائیل کو جو نعمتیں عطا کی تھیں اور انہوں نے کفرانِ نعمت کیا، اس کے ذکر کے بعد اس عظیم نعمت کا بیان ہے جو خالق کائنات نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے مسلمانوں کو عطا فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، پھر ہم نے تجھے برحق شریعت اور دین پر برقرار رکھا (ثمّ جعلناک علیٰ شریعۃ من الامر)۔

"شریعت" کا معنی ایسا راستہ ہے جو پانی تک پہنچنے کے لیے دریا وغیرہ کے کنارے پر بنایا جاتا ہے کہ جہاں پر پانی کی سطح دریا کے ساحل سے نیچے ہوتی ہے۔ بعد ازاں اس کا اطلاق ہر اس راستے پر ہونے لگا جو انسان کو منزل مقصود تک پہنچاتا ہے اور دینِ حق کے بارے میں اس کے استعمال کی وجہ یہ ہے کہ وہ دینِ حق، انسان کو وحی کے سرچشمہ اور خدا کی رضا اور سعادت ابدی تک پہنچاتا ہے جو آبِ حیات کے مانند ہے یہ لفظ قرآن مجید میں صرف ایک بار استعمال ہوا ہے اور وہ بھی صرف اسلام کے بارے میں۔

یہاں پر "الامر" سے مراد دین حق ہی ہے جس کی طرف گزشتہ آیت میں ارشاد ہو چکا ہے، جہاں پر کہا گیا ہے:

"بینات من الامر"

چونکہ یہ راستہ، نجات اور کامیابی کا ضامن ہوتا ہے، لہٰذا اس کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے۔ "اے میرے رسُول! بس تو اس کی پیروی کرتا رہ (فاتبعھا)۔

اور چونکہ اس کے برعکس جاہلوں کی خواہشات کی پیروی ہی ہوتی ہے لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اور نادان سرکشوں کی خواہشات نفسانی کی پیروی نہ کرنا۔ (ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون)۔

حقیقت یہ ہے کہ دو راستوں کے علاوہ تیسرا راستہ نہیں ہے ایک تو انبیاء اور وحی کا راستہ اور دوسرے جاہلوں کی خواہشات نفسانی کا راستہ۔ اگر کوئی شخص پہلے راستے سے منہ موڑ لے گا تو دوسرے راستے پر چل پڑے گا اور اگر جاہلوں کے راستے سے روگردانی کرے گا تو انبیاء کی راہوں پر چل نکلے گا۔ اسی لیے تو قرآن مجید نے ہدایت کے ہر اس طرزِ عمل پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے جو سرچشمہ وحی سے مدد حاصل نہیں کرتا۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ رؤسائے قریش پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آکر عرض کرنے لگے، آیئے! آپ اپنے بزرگوں کے دین کی طرف پلٹ آیئے، کیونکہ وہ ایک تو آپ سے افضل تھے اور دوسرے سخت مند۔

اس زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی مکہ ہی میں تھے کہ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی[1] اس میں ان قریشیوں کو جواب دیا گیا ہے کہ حق تک پہنچنے کا راستہ آسمانی وحی ہے جو تجھ پر نازل ہوئی ہے، نہ کہ جن خواہشات کا

---

[1] تفسیر کبیر فخر الدین رازی جلد ۲۷ صفحہ ۲۶۵۔

یہ قریشی جاہل تقاضا کرتے ہیں۔

ہمیشہ سے دینی رہبروں نے جب بھی کوئی تازہ اور پاک دین پیش کیا، انہیں جہلاء کے ایسے ہی وسوسوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ کہتے کہ کیا تم بہتر سمجھتے ہو یا تمہارے وہ بزرگ اور آباؤ اجداد جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں؟ ان کا اصرار ہوتا کہ وہ اسی خرافاتی روش کو اپنائیں جس پر وہ لوگ خود گامزن ہیں۔ اگر ان کی اس قسم کی تجویز پر عمل درآمد کیا جاتا تو انسان ارتقار کی طرف ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتا۔

بعد کی آیت در حقیقت مشرکین کے آگے جھکنے کی نہی کی ایک دلیل اور علت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ لوگ خدا کے مقابلے میں تو تجھے بے نیاز کر سکتے ہیں اور نہ عذاب سے بچا سکتے ہیں (انہم لن یغنوا عنك من الله شیئًا)۔

اگر کوئی شخص ان کے باطل دین کی پیروی کرے گا اور عذاب الٰہی اس کے دامن گیر ہوگا تو یہ لوگ ہرگز ہرگز اس کی امداد نہیں کر سکیں گے اور اگر خداوند عالم کوئی نعمت اس سے سلب کر لے تو وہ لوگ اس کی تلافی نہیں کر سکتے۔ اس آیت میں اگرچہ روئے سخن پیغمبر اسلامؐ کی ذات کی طرف ہے، لیکن مراد تمام مومنین ہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے: ظالم لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہیں (وان الظالمین بعضهم اولیاء بعض)۔

یہ سب ایک قماش کے لوگ ہیں اور ایک ہی راستے کے راہی ہیں، سب کمزور و ناتواں ہیں۔

لیکن یہ یاد رہے آپ ہرگز نہ کریں کہ آپ اور دوسرے با ایمان افراد اس وقت اگر اقلیت میں ہیں تو آپ لوگوں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہے، کیونکہ "اللہ پرہیزگاروں کا مددگار ہے" (والله ولی المتقین)۔۔

یہ ٹھیک ہے کہ بظاہر وہ لوگ بہت بڑی تعداد میں ہیں اور بڑی طاقت و دولت کے مالک بھی ہیں، لیکن حق کی بے انتہا قدرت کے سامنے تو وہ ایک ناچیز ذرے سے زیادہ قیمت نہیں رکھتے۔

زیر تفسیر سلسلے کی آخری آیت میں گزشتہ مضامین اور دین الٰہی کی پیروی کی طرف انبیاء کی دعوت پر تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ قرآن اور شریعت ان لوگوں کے لیے بینائی کے وسائل اور ہدایت و رحمت کے ذرائع ہیں جو ان پر یقین رکھتے ہیں۔

(هٰذا بصائر للناس وهدًى ورحمة لقوم یوقنون)۔

"بصائر" جمع ہے "بصیرت" کی جس کے معنی ہیں بینائی۔ ہر چند کہ یہ لفظ زیادہ تر عقلی اور فکری بینش کے بارے میں بولا جاتا ہے، لیکن کبھی ان سب امور پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو مطلب کے ادراک اور فہم کا سبب بنتے ہیں۔

پھر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ "یہ قرآن اور شریعت بینائیاں ہیں" یعنی یہ خود عین بینائی ہیں۔ وہ بھی نہ صرف ایک بینائی بلکہ کئی بینائیاں جو صرف ایک پہلو کے لحاظ سے بلکہ تمام پہلوؤں کی رو سے زندگی میں انسان کو صحیح بینش عطا کرتی ہیں۔

اس قسم کی تعبیرات قرآن مجید کی کئی اور آیات میں بھی ہیں، جن میں سے ایک سورہ انعام کی آیت ۱۰۴ بھی ہے، جس میں ارشاد ہوتا ہے:

"قد جاءكم بصائر من ربكم"

"تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بینائیاں آچکی ہیں"

یہاں پر آیت میں تین موضوع بیان ہوئے ہیں، ایک "بصائر" دوسرے "ہدایت" اور تیسرے "رحمت" کہ بالترتیب

تینوں ایک دوسرے کے علت و معلول بن رہے ہیں۔ روشنی عطا کرنے والی آیات اور بینائی عطا کرنے والی شریعت انسان کو ہدایت کی طرف لے جاتی ہیں اور ہدایت بھی رحمت الٰہی کا ذریعہ ہے۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ "بصائر" کو عامۃ الناس کے لیے بیان کیا گیا ہے، لیکن "ہدایت" اور "رحمت" کو ان لوگوں سے مخصوص کیا گیا ہے جو صاحبان یقین ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیئے کیونکہ قرآنی آیات کسی قوم اور قبیلے سے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ جو لوگ بھی "الناس" کے مفہوم میں آتے ہیں، اس میں شریک ہیں۔ اس میں زمان و مکان کی کوئی قید نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک فطری امر ہے کہ ہدایت یقین کی ایک شاخ ہے اور رحمت خداوندی بھی اسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر ایک کے شامل حال نہیں ہو سکتی۔

بہر حال یہ جو فرمایا گیا ہے کہ قرآن میں عین بصیرت اور عین ہدایت و رحمت ہے، یہ ایک نہایت ہی خوبصورت تعبیر ہے، جو اس آسمانی کتاب کی عظمت و تاثیر اور گہرائی و گیرائی پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن ان لوگوں کے لیے جو رہروِ منزل اور متلاشی حق ہیں۔

۲۱۔ اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ۠

۲۲۔ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝

۲۳۔ اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۱۔ جو لوگ برے کاموں کے مرتکب ہوئے ہیں، کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر کر دیں گے جو ایمان لائے اور اچھے اچھے کام بھی کرتے رہے کہ ان سب کا جینا مرنا یکساں ہوگا؟ یہ لوگ کیا برا فیصلہ کرتے ہیں؟

۲۲۔ اور خدا نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے تاکہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

۲۳۔ کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟ اور خدا نے سمجھ بوجھ کر اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے (کیونکہ وہ ہدایت کے لائق ہی نہیں) اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے، تو پھر

ایسی حالت میں خدا کے سوا اسے اور کون ہدایت کر سکتا ہے؟ کیا تم غور نہیں کرتے ہو؟

تفسیر

ان لوگوں کا مرنا جینا ایک سا نہیں ہے

گزشتہ آیات میں دو مختلف اور متضاد گروہوں کا ذکر تھا، ایک مؤمنین کا گروہ اور دوسرا کافروں کا یا ایک پرہیزگاروں کا اور دوسرا مجرمین کا۔ اس کے بعد زیر نظر آیات میں ان دونوں گروہوں کو آمنے سامنے رکھ کر ان کا باہمی تقابل کیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے، جو لوگ بُرے کاموں کے مرتکب ہوئے ہیں کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں ان لوگوں کے برابر کر دیں گے جو ایمان لائے اور اچھے اچھے کام بھی کرتے رہے کہ ان کا مرنا جینا یکساں ہوگا (ام حسب الذین اجترحوا السیئات ان نجعلھم کالذین اٰمنوا وعملوا الصالحات سواء محیاھم ومماتھم)۔

یہ لوگ کیا بُرا فیصلہ کرتے ہیں (ساء ما یحکمون)۔

کیا یہ بات ممکن ہے کہ نور اور ظلمت، علم اور جہل، نیک اور بد اور ایمان اور کفر یکساں ہوں؟ آیا یہ بات ممکن ہے کہ نا برابر امور کا نتیجہ اور پھل مساوی ہو؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ نیک عمل مؤمنین، بے ایمان مجرمین سے ہر جگہ علیحدہ ہیں۔ ایمان ہو یا کفر، نیک اعمال ہوں یا بُرے، ان میں سے ہر ایک کو ان کی زندگی اور موت دونوں حالتوں میں اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔

یہ آیت سورۂ ص کی ۲۸ ویں آیت کے مانند ہے، جس میں فرمایا گیا ہے:

"ام نجعل الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار؟"

"کیا جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل انجام دیئے ہم ان کو "مفسدین فی الارض" جیسا بنا دیں؟ یا پرہیزگاروں کو فاجروں کے مانند؟"

سورۂ قلم کی ۳۵ و ۳۶ ویں آیت میں بھی فرمایا گیا ہے۔

"افنجعل المسلمین کالمجرمین مالکم کیف تحکمون؟"

آیا ہم مسلمانوں کو گناہگاروں جیسا بنا دیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیسے فیصلے کرتے ہو؟

"اجترحوا" "جرح" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی وہ زخم یا اثر ہے جو بیماری یا کسی اور تکلیف کی وجہ سے انسان کے بدن پر ہوتا ہے۔ چونکہ گناہ کا ارتکاب بھی گویا انسانی روح کو مجروح کر دیتا ہے اسی لیے "اجتراح" کا مادہ گناہوں کی انجام دہی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات اس سے بھی وسیع تر معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے، یعنی ہر قسم کا اکتساب اور ارتکاب

نیز انسانی اعضاء کو اس لئے "جوارح" کہتے ہیں کہ ان کے ذریعے انسان اپنے مقاصد انجام دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے حاصل کرتا ہے اور کماتا ہے۔

بہرحال یہ آیت کہتی ہے کہ یہ ایک غلط سوچ ہے کہ کوئی شخص یہ تصور کرے کہ ایمان یا گناہ اور کفر کا انسانی زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ ایسا بالکل نہیں ہے، ان دونوں قسم کے لوگوں کی زندگی اور موت مکمل طور پر مختلف ہے۔

مومنین کرام ایمان اور عمل صالح کے پرتو میں ایک مخصوص قسم کے اطمینان کے حامل ہوتے ہیں، حتیٰ کہ حوادثات زمانہ کے سخت سے سخت ادوار بھی ان کی رُوح پر ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ جب کہ بے ایمان اور گناہوں میں ستھڑے ہوئے لوگ ہمیشہ مضطرب، بے چین اور پریشان خیالی کا شکار رہتے ہیں اگرچہ وہ نعمتوں میں سرمست ہوں، پھر بھی انہیں ہمیشہ ان کے زوال کا خطرہ رہتا ہے اور اگر مصیبت اور تکالیف میں مبتلا ہوں، تو بھی ان کے مقابلے کی تاب نہیں رکھتے، جیسا کہ سورۂ انعام کی ۸۲ ویں آیت میں ہے۔

• الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولٰئک لھم الامن و ھم مھتدون ؛

• جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا ان کے لیے اطمینان خاطر ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں"

صاحب ایمان افراد خدا کے وعدوں پر مطمئن ہیں اور اس کی خاص عنایتوں کے زیر سایہ ہیں، جیسا کہ سورۂ مومن کی ۵۱ ویں آیت میں ہے۔

• انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا و یوم یقوم الاشھاد؛

"ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لے آئے ہیں، دُنیاوی زندگی میں بھی یقیناً مدد کرتے ہیں اور جس دن گواہ کھڑے ہوں گے، اس دن (روز قیامت) بھی۔

نورِ ہدایت، پہلے گروہ کے لوگوں کے دل کو منور کرتا ہے اور وہ اپنی مقدس منزل مقصود کی جانب استوار اور مضبوط قدموں کے ساتھ رواں دواں ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے،

• اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمات الی النور،

اللہ ایمان داروں کا ولی ہے، انہیں ظلمت سے نور کی طرف ہدایت کرتا ہے ؛

(بقرہ / ۲۵۷)

لیکن دوسرا گروہ جس کی زندگی کا نہ تو کوئی واضح مقصد ہوتا ہے اور نہ ہی واضح پروگرام ہوتا ہے وہ ظلمات کی لہروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

• والذین کفروا اولیاؤھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی

الظلمات۔"

"جو لوگ کافر ہوگئے ہیں ان کے ولی طاغوت اور شیطان ہوتے ہیں کہ جو انہیں نور سے نکال کر ظلمت کی طرف لے جاتے ہیں۔" (بقرہ/۲۵۷)

مؤمنین کی یہ حالت تو اس جہان کی دُنیاوی زندگی کی ہے، لیکن بوقت وفات جو ان کے لیے عالم بقا کی جانب ایک دریچہ اور آخرت کے لیے ایک دروازہ ہوتا ہے، قرآن کی زبان میں ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ:

"الذین تتوفاھم الملائکۃ طیبین یقولون سلام علیکم ادخلوا الجنۃ بما کنتم تعملون۔"

"پرہیزگاروں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب فرشتے ان کی رُوح کو قبض کرتے ہیں تو وہ پاک و پاکیزہ ہوتے ہیں۔ فرشتے انہیں کہتے ہیں تم پر سلام، بہشت میں داخل ہو جاؤ، یہ ان اعمال کا نتیجہ ہے جو تم انجام دیتے رہے ہو۔" (نحل/۳۲)

جب کہ بے ایمان مجرمین کے ساتھ دوسرے لفظوں میں بات کرتا ہے، جیسا کہ اسی سُورت (نحل) کی ۲۸ویں اور ۲۹ ویں آیات میں ہے کہ:

"الذین تتوفاھم الملائکۃ ظالمی انفسھم فالقوا السلم ما کنا نعمل من سوء بلی ان اللہ علیم بما کنتم تعملون۔ فادخلوا ابواب جھنم خالدین فیھا فلبئس مثوی المتکبرین۔"

"ظالم کافروں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب فرشتے ان کی رُوح قبض کرتے ہیں تو وہ بے بسی کی حالت میں سر جھکا کر یہی کہتے ہیں کہ ہم بُرے کام نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ جو کچھ تم کیا کرتے تھے خدا اس سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ اب تم دوزخ کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ اور اس میں ہمیشہ رہو۔ یہ متکبرین کے لیے کیسا بُرا ٹھکانا ہے۔"

خلاصۂ کلام یہ کہ ان دونوں گروہوں کے درمیان دنیاوی زندگی کے تمام شعبوں، بوقت مرگ، عالم برزخ اور قیامت میں واضح فرق موجود ہے۔[1]

---

[1] مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں مفسرین نے کئی اور احتمالات بھی ذکر کیے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "سواء محیاھم ومماتھم" کے جملے سے مراد یہ ہے کہ بے ایمان مجرمین کی زندگی اور موت برابر ہیں۔ نہ تو زندگی میں ان سے خیر و برکت اور اطاعت الٰہی کی امید ہوتی ہے اور نہ ہی مرنے کے بعد۔ وہ زندہ تو ہیں، لیکن مردوں کے مانند تو ایسی صورت میں دونوں ضمیریں مجرمین کی لوٹ رہی ہیں۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ حیات سے مراد قیامت کے دن کی زندگی ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ مومنین اور بے ایمان لوگوں کو موت کے وقت اور قیامت کے دن زندہ ہونے کے موقع پر ایک جیسا انجام ہو، لیکن آیت کا ظاہری اعتبار سے معنی صحیح ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

بعد کی آیت درحقیقت گزشتہ آیت کی تفسیر اور توجیہ ہے پروردگار فرماتا ہے: اور خداوند عالم نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے (وخلق الله السماوات والارض بالحق)۔

تاکہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (ولتجزیٰ کل نفس بما کسبت وھم لا یظلمون)۔

ساری کائنات اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ اس کائنات کے پیدا کرنے والے نے اسے محورِ حق پر ٹھہرایا ہے اور ہر مقام پر حق و عدالت حکم فرما ہے۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ وہ صالح العمل مومنین اور بے ایمان مجرمین کو ایک جیسا قرار دے اور یہ بات قانونِ خلقت میں ایک استثنائی صورت حال اختیار کرے؟

فطری بات ہے کہ جو لوگ حق و عدالت کے اس قانون کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں وہ کائنات کی برکتوں اور خدا کی مہربانیوں سے بھی بہرہ مند ہوتے ہیں اور جو لوگ اس کے برخلاف قدم اٹھاتے ہیں انھیں غضب الٰہی کی آگ کا ایندھن ہی بننا چاہیئے اور عدالت کا بھی یہی تقاضا ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ "عدالت" کا معنیٰ "مساوات" یا "برابری" نہیں بلکہ عدالت اس بات کا نام ہے کہ ہر شخص اپنی لیاقت اور اہلیت کی بنا پر لطفِ الٰہی سے بہرہ مند ہو۔

زیرِ تفسیر آیات میں سے آخری آیت کافروں اور مومنوں کی عدم مساوات پر ایک اور دلیل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: بھلا تو نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے (افرءیت من اتخذ الٰھہ ھواہ)۔

اور چونکہ خدا جانتا تھا کہ وہ ہدایت کے لائق ہی نہیں، لہٰذا اُس نے اسے گمراہی میں ہی چھوڑ دیا ہے (واضلہ الله علیٰ علم)۔

"اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے" تاکہ وہ گمراہی کی وادی میں بھٹکتا پھرے (وختم علیٰ سمعہ وقلبہ وجعل علیٰ بصرہ غشاوۃ)۔

تو پھر ایسی حالت میں خدا کے سوا اسے کون ہدایت کر سکتا ہے (فمن یھدیہ من بعد الله)۔

"تو کیا اب بھی تم لوگ غور و فکر نہیں کرتے ہو؟" اور ایسے شخص کے اور اس شخص کے درمیان فرق نہیں سمجھتے ہو جو راہ حق کو پا چکا ہے۔ (افلا تذکرون)۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنا لے؟

تو یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جب انسان خدائی فرمان کو پس پشت ڈال دے اور اپنے دل اور ہوائے نفس کا مطیع و فرمانبردار بن جائے اور ہوائے نفس کی اطاعت کو حق کی اطاعت پر مقدم کرے تو یہی ہوائے نفس کی پرستش ہے، کیونکہ عبادت اور پرستش کا ایک معنی اطاعت بھی تو ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں بارہا شیطان یا علماء اور احبار یہود کے

بارے میں آیا ہے:

کہ کچھ لوگ شیطان کی عبادت کرتے ہیں۔" (یٰس / ۶۰)

اور یہود کے متعلق ہے کہ:

"انہوں نے اپنے علماء کو اپنا رب اور پروردگار بنا لیا ہے۔ (توبہ / ۳۱)

اور حدیث میں ہے کہ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام فرماتے ہیں کہ:

اما واللہ ماصاموا لھم ولا صلوا، ولکنھم احلوا لھم حراماً وحرموا علیھم حلالاً، فاتبعوھم وعبدوھم من حیث لا یشعرون۔

"خدا کی قسم ان لوگوں (یہود و نصاریٰ) نے اپنے پیشواؤں کے لیے نماز اور روزے بجا نہیں لائے، لیکن ان کے پیشواؤں نے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے دیا اور انہوں نے اس کو تسلیم کر لیا اور ان کی پیروی کی اور بغیر توجہ کیے، ان کی عبادت اور پرستش شروع کر دی۔[1]

لیکن بعض مفسرین نے اس تعبیر کو قریش کے بت پرستوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جس چیز کے متعلق ان کا جی چاہتا تھا اس کا بت بنا دیتے تھے اور اس کی عبادت کرنا شروع کر دیتے تھے، اور جب کسی دوسری جاذب نظر چیز کو دیکھتے تو پہلے بت کو چھوڑ کر اس کا بت بنا کر اس کی عبادت میں لگ جاتے تھے۔ اس طرح سے ان کا معبود وہ چیز ہوتی جسے ان کی نفسانی خواہشات پسند کرتیں۔[2]

لیکن "من اتخذ الٰھہ ھواہ" (جس شخص نے اپنا معبود اپنی خواہشات نفسانی کو بنا لیا ہے) کی تعبیر پہلی تفسیر سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

• اضلہ اللہ علی علم، کے بارے میں مشہور تفسیر تو وہی ہے جو سطور بالا میں بیان ہو چکی ہے اور جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے اپنے ہی ہاتھوں سے چراغ ہدایت گل کر دیا ہے اور نجات کے دروازے اپنے اوپر بند کر لیے ہیں اور واپسی کے راستے برباد کر چکے ہیں تو ایسی صورت میں اللہ نے اپنے لطف و کرم اور رحمت و مہربانی کو ان سے سلب کر لیا ہے، نیک و بد کی پہچان کی صلاحیت ان سے واپس لے لی ہے، گویا ان کے دل اور کانوں کو محفوظ مقام پر بند کر دیا ہے اور اس پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر دبیز پردے ڈال دیئے ہیں۔

در حقیقت یہ سب کچھ اس چیز کے آثار ہیں جو انہوں نے اپنے لیے منتخب کی ہے اور ایسے بدبخت معبود کا نتیجہ ہے جسے انہوں نے اپنے لیے منتخب کیا ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۶۴۹۔

[2] تفسیر در منثور جلد ۶ صفحہ ۳۵

یہی نفس پرستی کس قدر خطرناک بُت ہے جو رحمت اور نجات کے تمام دروازوں کو انسان پر بند کر دیتا ہے اور اس بارے میں رسُول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث کس قدر ناطق اور واضح ہے کہ :

" ما عبد تحت السماء اله ابغض الی الله من الهوی "

" آسمان کے زیر سایہ ہر گز کسی معبُود کی عبادت نفس پرستی جیسی عبادت سے زیادہ ناپسندیدہ نہیں ہے "[1]

لیکن بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ جُملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ نفس پرست اور خود سر ہٹ دھرم افراد جان بوجھ کر ہدایت کی راہوں سے ہٹ کر گمراہیوں کا اختیار کرتے ہیں، کیونکہ نہ تو علم و دانش ہمیشہ ہدایت کے ہمراہ ہوتے ہیں اور نہ ہی گمراہی ہمیشہ جہالت کے ہم رکاب ہوتی ہے۔

علم اس وقت سبب ہدایت بنتا ہے جب انسان اس کے لوازمات کو اپنائے اور اس کے ساتھ ساتھ قدم اُٹھائے تب کہیں جاکر منزل مقصود تک پہنچاتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید کچھ ہٹ دھرم کافروں کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے۔

" وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم "

" انہوں نے خدا کی آیات کا انکار کردیا، حالانکہ ان کے دل اس کی حقانیت پر یقین رکھتے تھے "[2]

(نمل ر ۱۴)

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آیت میں موجود ضمیروں کا مرجع خدا تعالیٰ ہے پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے، کیونکہ قرآن فرماتا ہے کہ خدا نے اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے۔

ہمارے اس بیان سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ آیت میں عقیدۂ جبری کے بارے میں کوئی علامت نہیں ملتی، بلکہ اختیار کے اصول اور انسان کے اپنے ہاتھوں سے اپنی تقدیر سنوارنے پر تاکید کی گئی ہے۔

خداوند عالم کے انسان کے دل اور کانوں پر مہر لگانے اور آنکھوں پر پردہ ڈالنے کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اوّل میں سورۂ بقرہ کی ساتویں آیت کی تفسیر میں ہم تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ **خواہشات نفسانی سب سے زیادہ خطرناک بُت ہے :** ہم ابھی حدیث میں پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب بتوں سے ناپسندیدہ ترین بُت کہ جس کی عبادت کی جاتی ہے نفس پرستی کا بت ہے۔

اس بات میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں ہے۔ کیونکہ عام قسم کے بُت ایسی چیزیں ہیں جن کی اپنی کوئی خاصیت اور خصوصیت نہیں

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۵۹۹۸، تفسیر روح البیان اور تفسیر مراغی اسی آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر المیزان جلد ۱۸ ص ۱۸۱۔

ہوتی، لیکن خواہشات نفسانی کا بُت گمراہ کُن ہے اور مختلف گناہوں اور گمراہیوں اور بے راہروی کی جانب لے جاتا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس بُت میں وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جنہوں نے اسے سب سے زیادہ قابل نفرت بُت کے نام کا مستحق بنا دیا ہے۔

یہ بُت برائیوں کو انسان کی نگاہ میں اتنا مزین کر دیتا ہے کہ وہ اپنے بُرے کارناموں پر فخر کرتا دکھائی دیتا ہے اور،

"وھم یحسبون انھم یحسنون صنعًا" (کہف/۱۰۴)

کے مصداق انسان اسے صالح العمل سمجھ کر فخر کرتا ہے۔

۲۔ **شیطان کے لیے موثر ترین راستہ:** شیطان کے عمل دخل کا مؤثر ترین راستہ خواہشات کی اطاعت ہے، کیونکہ جب تک انسان کے اندرونی وجود میں شیطان کا ٹھکانا نہ ہو اس وقت تک وہ دلوں میں وسوسے پیدا نہیں کر سکتا اور وہ ٹھکانا نفس پرستی کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہی چیز کہ خود شیطان جس کی وجہ سے اپنے مقام سے گر گیا اور فرشتوں کی صف اور قرب الٰہی سے راندہ گیا۔

۳۔ **نفس پرستی ہدایت سے محرومی کا سبب:** نفس پرستی حقائق کے صحیح ادراک جیسے ہدایت کے اہم ترین ذریعے کو انسان سے سلب کر لیتی ہے اور انسان کی آنکھوں اور عقل پر پردے ڈال دیتی ہے۔ جیسا کہ زیر تفسیر آیات میں نفس پرستی کے مسئلے کو بیان کرنے کے بعد صاف طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور قرآن کی بہت سی دوسری آیات بھی اس حقیقت کی گواہ ہیں۔

۴۔ **خدا کے مقابل:** نفس پرستی انسان کو نعوذ باللہ، خدا سے مقابلے کے مرحلے تک لے جاتی ہے۔ جیسا کہ خواہش پرستوں کا پیشوا یعنی شیطان اس منحوس انجام سے دوچار ہوا اور آدمؑ کو سجدہ کرنے کے مسئلے پر اس نے حکمت خداوندی پر اعتراض کیا، اور اسے غیر حکیمانہ سمجھا۔

۵۔ **ہوس پرستی کا انجام:** اس حد تک منحوس اور دردناک اور خطرناک ہوتا ہے کہ کبھی ایک لمحہ کی نفس پرستی انسان کو زندگی بھر کی پشیمانی اور ندامت سے دوچار کر دیتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک لمحے کی نفس پرستی انسان کی ساری زندگی کے نتائج اور اس کے اعمال صالحہ کو تباہ و برباد اور ملیامیٹ کر دیتی ہے اسی لیے قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں اس بات کو زور دے کر بیان کیا گیا ہے اور اس سے خبردار کیا گیا ہے، جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث میں آیا ہے:

"ان اخوف ما اخاف علی امتی الھوٰی وطول الامل اما الھوٰی فانہ یصد عن الحق، واما طول الامل فینسی الاٰخرۃ"

"دو چیزیں ایسی خطرناک ہیں، جن سے مجھے اپنی اُمت کے بارے میں خوف آتا ہے ایک تو خواہشات نفسانی کی پیروی اور دوسری لمبی چوڑی امیدیں کیونکہ نفس پرستی انسان کو حق سے باز رکھتی ہے اور لمبی چوڑی آرزوئیں آخرت کو بھلا دیتی ہیں"[1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۰، صفحہ ۸۸۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ

"ای سلطان اغلب واقوی؟"

"کون سی طاقت زیادہ غالب اور طاقت ور ہے؟"

تو آپ نے فرمایا:

"الھوٰی"

"خواہشاتِ نفسانی" [1]

ایک اور روایت میں ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

"وعزتی وعظمتی وجلالی وبھائی وعلوی وارتفاع مکانی، لا یؤثر عبد هوای علی هواه الا جعلت همه فی آخرته، وغناه فی قلبه، وکففت عنه ضیعته، وضمنت السماوات والارض رزقه، واتته الدنیا وهی راغمة"

"مجھے اپنی عزت، عظمت، جلال، نورانیت اور بلند مقام اور مرتبے کی قسم کوئی بندہ بھی میری خواہشات کو اپنی خواہشات پر مقدم نہیں کرتا مگر یہ کہ میں اس کی تمام تر توجہات کو آخرت کی طرف مبذول کر دیتا ہوں، مخلوق سے بے نیازی کو اس کے دل میں جاگزیں کر دیتا ہوں، معاشی مسائل کو اس کے لیے آسان کر دیتا ہوں، آسمان اور زمین کو اس کی روزی کا ضامن بنا دیتا ہوں اور دنیا کی نعمتیں سر جھکائے اس کے حضور پہنچ جاتی ہیں" [2]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"احذروا اھواءکم کما تحذرون اعداءکم، فلیس شیء اعدی للرجال من اتباع اھوائھم وحصائد السنتھم"

"خواہشات نفسانی سے ویسے بچو جیسے اپنے دشمنوں سے بچتے ہو، کیونکہ انسان کے لیے خواہشات نفسانی کی پیروی اور زبان پر جاری ہونے والے کلمات سے بڑھ کر اس کا کوئی اور دشمن نہیں ہے۔" [3]

آخر میں ایک اور حدیث جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے، پیش خدمت ہے:

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۰ صفحہ ۷۷۔

[2] بحار الانوار جلد ۷۰ صفحہ ۷۷۔

[3] اصول کافی جلد ۲ باب اتباع الھوٰی حدیث ۱۔

"انی لارجوا النجاۃ لھذہ الامۃ لمن عرف حقنا منھم الا لاحد ثلاثۃ صاحب سلطان جائر، وصاحب ھوی والفاسق المعلن"

"اس امت سے جن لوگوں نے ہمارے حق کو پہچانا ہے میں ان کی نجات کی امید رکھتا ہوں سوائے تین قسم کے لوگوں کے۔ ایک ظالم بادشاہوں کے ساتھی، دوسرے نفس پرست اور تیسرے جو کھلم کھلا گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں (اور کسی قسم کا خوف محسوس نہیں کرتے)"۔[1]

اس بارے میں بہت سی آیات اور روایات موجود ہیں۔

ہم اپنی اس گفتگو کو ایک بامعنی جملے کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں، جو شانِ نزول کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اور ہمارے مدعا پر زندہ گواہ ہے۔ ایک مفسر کہتے ہیں۔

ایک رات کا واقعہ ہے کہ ابوجہل ولید بن مغیرہ کے ہمراہ خانہ کعبہ کے طواف میں مشغول تھا۔ طواف کے دوران اس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بات شروع کر دی۔ ابوجہل نے کہا: واللہ انی لاعلم انہ صادق (خدا کی قسم میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ سچا ہے)۔

"ولید نے کہا: چپ رہو تم کہاں سے جانتے ہو کہ وہ سچا ہے؟"

ابوجہل نے کہا: ہم اسے بچپن اور لڑکپن میں "صادق اور امین" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اب جبکہ اس کی عقل کامل ہو چکی ہے اور وہ شعور کے درجہ کمال تک پہنچ چکا ہے تو پھر اسے ہم کذاب اور خائن کیونکر کہہ سکتے ہیں؟ میں ایک بار پھر کہتا کہ "وہ سچ کہتا ہے"۔

ولید نے کہا: تو پھر تم اس کی تصدیق کیوں نہیں کرتے اور اس پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟

ابوجہل نے کہا: تم چاہتے ہو کہ قریشی عورتیں آپس میں بیٹھ کر یہ کہیں کہ شکست کے خوف سے ابوطالب کے بھتیجے کے سامنے جھک گیا ہوں۔ لات و عزیٰ کی قسم میں ہرگز اس کی اتباع نہیں کروں گا اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ وختم علی سمعہ وقلبہ۔[2]

---

[1] بحارالانوار جلد ، صفحہ ۔

[2] تفسیر مراغی جلد ۲۵ صفحہ ۱۴۰ ۔

۲۴- وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ○

۲۵- وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ مَا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا ائْتُوا بِآبَائِنَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○

ترجمہ

۲۴- اوران لوگوں نے کہا کہ ہماری زندگی تو بس دنیا ہی کی ہے۔ کچھ لوگ ہم میں سے مرتے ہیں اور کچھ لوگ ان کی جگہ لے لیتے ہیں اور ہم کو بس فطرت اور زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے اور وہ اپنی ان باتوں پر یقین بھی نہیں رکھتے، بلکہ بے بنیاد گمان ہی کرتے ہیں۔

۲۵- اور جب ان کے سامنے ہماری کھلی اور روشن آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کے مقابلے میں ان کے پاس کوئی دلیل تو ہوتی نہیں، سوائے اس کے کہ وہ کہیں اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے لے آؤ (تاکہ وہ گواہی دیں)۔

تفسیر

دھریوں کے عقائد

ان آیات میں منکرین توحید کے بارے میں ایک اور بحث کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ البتہ یہاں پر منکرین کے ایک

خاص گروہ یعنی "دہریوں" کا نام لیا گیا ہے جو عالم ہستی اور اس کائنات میں صانع حکیم کے وجود کا مطلقاً انکار کرتے تھے، جبکہ اکثر و بیشتر مشرکین عام طور پر ظاہر میں خدا پر ایمان رکھتے تھے اور بتوں کو اس کی بارگاہ تک رسائی کے لیے اپنا شفیع سمجھتے تھے، خداوند عالم فرماتا ہے: انہوں نے کہا ہماری زندگی تو بس دُنیا ہی کی ہے، ہم میں سے کچھ لوگ مرتے ہیں اور کچھ پیدا ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ اور اس طرح سے انسانی نسل کا سلسلہ جاری ہے۔ (وقالوا ما ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا)۔

اور ہمیں تو زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے (وما یھلکنا الا الدھر)۔

اس طرح وہ ایک تو "معاد" کا انکار کرتے تھے اور دوسرے "مبداء" کا۔ پہلا جملہ ان کے معاد کے انکار کی غمازی کرتا ہے، جبکہ دوسرا جملہ مبداء کے انکار کی۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس جیسی آیات قرآن مجید کے دو اور مقامات پر بھی موجود ہیں۔ ایک سورۂ انعام کی ۲۹ ویں آیت ہے، جس میں ہے:

• وقالوا ان ھی الا حیاتنا الدنیا وما نحن بمبعوثین۔

"اور انہوں نے کہا کہ ہماری زندگی فقط اسی دُنیا کی ہے اور ہم پھر نہیں اُٹھائے جائیں گے۔"

اور دوسری سورۂ مؤمنون کی ۳۷ ویں آیت ہے، جس میں ہے:

" ان ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما نحن بمبعوثین۔"

• ہماری زندگی اسی دُنیا کی ہے۔ یہیں مرتے جیتے ہیں اور ہم پھر نہیں اُٹھائے جائیں گے۔"

لیکن ان دونوں آیتوں میں صرف معاد کے انکار کی جھلک ملتی ہے، جبکہ زیرِ تفسیر آیت میں مبداء اور معاد دونوں کا انکار کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان کا زیادہ زور معاد کے انکار پر تھا، اس لیے کہ وہ اس سے زیادہ خائف اور وحشت زدہ تھے اس کے اقرار سے ان کی زندگی میں جو تبدیلی ممکن تھی وہ اس سے بھی پریشان تھے۔

"نموت ونحیا" (ہم مرتے اور زندہ ہوتے ہیں) کی مفسرین نے کئی تفسیریں بیان کی ہیں۔ پہلی تفسیر تو وہی ہے جو ہم سطور بالا میں بیان کر چکے ہیں، یعنی بڑے اور عمر رسیدہ لوگ چلے جاتے ہیں اور نومولود عرصۂ زندگی میں قدم رکھتے اور ان کی جگہ لیتے ہیں۔

دوسری یہ ہے کہ یہاں پر یہ جملہ تقدیم و تاخیر کی صورت میں ہے، جس کا اصل معنی یہ ہے کہ ہم زندہ ہوتے اور مرتے رہتے ہیں اور اس زندگی اور موت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

تیسری یہ کہ بعض لوگ مر جاتے ہیں اور بعض زندہ رہ جاتے ہیں (ہر چند کہ انجام سب کا موت ہی ہے)

چوتھی یہ کہ ہم ابتداء میں مُردہ اور بے جان تھے، پھر ہمیں حیات و زندگی کا لباس پہنایا گیا۔ لیکن سب سے مناسب وہی پہلی تفسیر ہے۔

بہرحال یہ عقیدہ کہ اس کائنات کا فاعل حوادث دہر اور زمانہ ہے یا کچھ دوسرے لوگوں کی تعبیر کے مطابق افلاک کی گردش

اور ستاروں کی کیفیت ہے۔ گزشتہ زمانے میں یہ کچھ مادہ پرستوں کا عقیدہ تھا۔ وہ واقعات روزگار کے سلسلے کی کڑی کو افلاک تک جا ملاتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ کائنات میں جو کچھ رونما ہوتا ہے وہ سب انہی کی بدولت ہے۔[1]

حتیٰ کہ دہریئے فلسفی وغیرہ بھی افلاک کے لیے عقل کے قائل تھے اور اس کائنات کے نظم و نسق کا ذمہ دار انہیں جانتے تھے۔

اس قسم کے خرافاتی عقائد مرورِ ایام کے ساتھ آہستہ آہستہ ختم ہوتے گئے۔ خاص کر "علم ہیئت" کی ترقی سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ "افلاک" (بطریق پیاز کے تہ بہ تہ چھلکے کے مانند) نام کی کسی چیز کا خارجی اور ظاہری وجود بالکل نہیں ہے عالم بالا کے ستاروں کی بھی کرۂ زمین جیسی ساخت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے کچھ بجھے ہوئے ہیں اور دوسرے کرّوں سے نور حاصل کرتے ہیں اور کچھ جل رہے ہیں اور نور افشانی کر رہے ہیں۔

دہریئے جب کبھی تلخ اور ناخوشگوار حوادث کا شکار ہو جاتے تو زمانے کو برا بھلا کہتے تھے، اور تعجب کی بات ہے کہ اس قسم کے عقائد کے آثار آج کی ادبیات میں بھی پائے جاتے ہیں کہ جن میں خدا پرست شعرانے "دھوکے باز زمانے" اور "فلک کج رفتار" کو بُرا بھلا کہا ہے اور زمانے پر تعریض کی ہے کہ اس نے ان کے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے؟ ایک مشہور شعر ہے،

فلک بمردم نادان دہد زمام مراد   تو اہل دانش و فضلی ہمیں گناہت بس

"فلک تو نادان اور ان پڑھ لوگوں کی مرادیں بر لاتا ہے، تم چونکہ اہل علم و فضل ہو یہی تمہارا بہت بڑا گناہ ہے"

ایک اور شاعر کہتا ہے،

روزگار است اینکہ گہ عزت دہد گہ خار دارد   چرخ بازیگر از این بازیچہ ہا بسیار دارد

(یہ زمانہ ہے کبھی عزت عطا کرتا ہے اور کبھی ذلیل و خوار کرتا ہے، بازیگر فلک اس قسم کے کھیل روزانہ کھیلتا رہتا ہے)۔

"دھر" (زمانہ) کے بارے میں بھی شعراء کا کلام ملتا ہے۔

دہر چون نیرنگ دارد چرخ چون دستان کند   مغز را آشفتہ سازد عقل را حیران کند

(زمانے کی نیرنگیاں اور فلک کی کج رفتاریاں ہی ذہن کو پریشان اور عقل کو حیران کر دیتی ہیں۔

لیکن احادیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے منقول ہے کہ،

"لا تسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر"

---

[1] بعض مفسرین نے ایک پانچواں احتمال بھی ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ یہ تناسخ (آواگون) کے عقیدہ کی طرف اشارہ ہے جس کے کئی بت پرست معتقد تھے۔ اور وہ کہتے تھے کہ ہم ہمیشہ رہتے ہیں اور اسی دنیا میں دوسرے ڈھانچوں اور جسموں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں اور یہیں پر زندہ رہتے ہیں۔ لیکن یہ تفسیر "وما یھلکنا الا الدھر" سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ کیونکہ اس جملے میں صرف ہلاکت کی بات ہو رہی ہے۔ (غور کیجئے گا)

"زمانے کو گالیاں نہ دو کیونکہ خدا ہی زمانہ ہے ۔ "[1]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زمانہ تو صرف ایک لفظ ہے، لیکن اس جہان اور عالم کا مدبر اور اس کا نظم ونسق چلانے والا تو خداوند تعالیٰ ہی ہے ۔ اگر تم نے اس کائنات اور عالم کے مدبر کو برا بھلا کہا تو بے سوچے سمجھے خداوند قادر متعال کو برا بھلا کہو گے۔

اس بات پر شاہد ناطق ایک اور حدیث ہے ، جسے حدیث قدسی کے طور پر نقل کیا گیا ہے ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

یؤذینی ابن آدم یسب الدهر، وانا الدهر، بیدی الامر اقلب اللیل والنهار ۔

" فرزند آدم جب زمانے کو گالیاں دیتا ہے تو اس کی یہ بات مجھے تکلیف پہنچاتی ہے کیونکہ زمانہ میں خود ہوں، ساری چیزیں میرے ہاتھ میں ہیں اور شب و روز کو میں ہی اُلٹ پھیر کرتا ہوں"[2]

البتہ بعض جگہ "دہر" کا معنی "زمانے والے" اور "افراد زمانہ" کیا گیا ہے جن کی بے وفائی کا شکوہ بزرگوں نے بھی کیا ہے۔ جیسے وہ مشہور شعر ہے جو حضرت امام حسین علیہ السلام سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے شب عاشور فرمایا۔

یا دهر اف لك من خلیل   کم لك بالاشراق والاصیل

من صاحب وطالب قتیل   والدهر لا یقنع بالبدیل !

" اے زمانے ! تجھ پر افسوس ہے کہ تو اچھا دوست ثابت نہیں ہوا، کتنی صبحیں اور شامیں یوں گزرتی رہیں کہ تو نے ہمارے دوستوں اور چاہنے والوں کو قتل کیا اور زمانہ بدلہ لے کر بھی راضی نہیں ہوتا"

اس طرح سے "دہر" کے گویا دو معنی ہوتے ۔ ایک تو "زمانہ اور افلاک" جو ہمیشہ دہریوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور وہ اسے آفاقی اور انسانی زندگی پر حکمران سمجھتے تھے ، اور دوسرے " اہل زمانہ اور ابنائے روزگار"

یقینی بات ہے کہ پہلے معنی کے لحاظ سے "دہر" صرف ایک خیالی چیز ہی ہے اور اگر کوئی چیز ہے بھی تو پھر اس کی تعبیر میں غلطی کی جاتی ہے اور تمام عالم وجود پر خداوند عالم کی حکمرانی ہے ۔ اسی لیے اسے "دھر" کا نام دیتے ہیں ، لیکن دوسرے معنی کے لحاظ سے " دہر" وہ چیز ہے ، جس کی دینی پیشواؤں اور بزرگوں نے بھی مذمت کی ہے ۔

بہرحال قرآن مجید نے ان لوگوں کی فضول باتوں کا جواب ایک مختصر لیکن جامع جملے میں دے دیا ہے ، اور قرآن مجید کے اور بھی بہت سے مقامات پر یہی جواب ملتا ہے ۔

ارشاد ہوتا ہے : وہ جو یہ کہتے ہیں کہ کوئی معاد نہیں ہے اور جہان کا مبدا بھی زمانہ ہی ہے انہی ان باتوں پر یقین

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۹ ص ۷۸
[2] تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۵۹۹۱

نہیں رکھتے، بلکہ بے بنیاد گمان ہی کرتے ہیں۔ (وما لهم بذالك من علم ان هم الا يظنون)۔

اس سے ملتی جلتی گفتگو سورۂ نجم کی ۲۸ ویں آیت میں ان لوگوں کے بارے میں ہے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے، ارشاد ہوتا ہے:

"وما لهم به من علم ان يتبعون الا الظن وان الظن لا يغني من الحق شيئا"

"وہ جو یہ بات کہتے ہیں اس پر انہیں خود کو یقین نہیں ہے وہ تو صرف بے بنیاد گمان کی پیروی کرتے ہیں اور گمان تو حق سے کبھی بھی بے نیاز نہیں کرتا۔"

یہی تعبیر حضرت عیسٰیؑ کے قتل کی نسبت کے بارے میں (نساء/ ۱۵۷) اور مشرکین عرب کے بتوں کے بارے میں عقیدے سے متعلق (یونس/۶۶) بھی بیان کی گئی ہے۔

یہ آسان ترین دلیل ہے جو اس قسم کے لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے کہ تمہارے پاس اپنے دعا کے ثبوت میں کوئی منطقی دلیل اور ناطق گواہ موجود نہیں ہے، صرف اٹکل پچو باتوں اور تخمینوں سے کام چلاتے رہتے ہو۔

بعد کی آیت میں معاد کے بارے میں ان لوگوں کے عقیدے کے سلسلے میں بہانہ تراشیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، اور جب ان کے سامنے ہماری کھلی اور روشن آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کے مقابلے میں ان کے پاس کوئی دلیل تو ہوتی نہیں، سوائے اس کے کہ وہ کہیں کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے لے آؤ تاکہ وہ تمہاری صداقت کی گواہی دیں۔ (واذا تتلى عليهم اياتنا بينات ما كان حجتهم الا ان قالوا ائتوا بابائنا ان كنتم صادقين)۔ [1]

وہ اس بات کے مدعی تھے کہ اگر مردوں کو زندہ کرنا حق ہے تو نمونے کے طور پر ہمارے بزرگوں اور آباؤ اجداد کو زندہ کر دو تاکہ ہم اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھیں اور یقین کریں اور ان سے پوچھیں کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ دیکھتے ہیں، کہ کیا وہ تمہاری تصدیق کرتے ہیں۔

جی ہاں! ان کی صرف یہی دلیل تھی اور کس قدر بودی اور بے بنیاد دلیل۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ نے تو مردوں کے زندہ کرنے پر اپنی قدرت کی مختلف دلیلیں پیش کی ہیں۔ مثلاً سب سے پہلے انسان کی مٹی سے پیدائش، رحم میں نطفہ کی مختلف تبدیلیاں وسیع و عریض زمین و آسمان کی آفرینش، نزولِ باراں کے بعد زمینوں کا زندہ ہونا جو کہ قرآنی آیات میں قیامت کے قیام پر منہ بولتی دلیل ہے اب ان دلائل کے باوجود پھر کس بات کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

---

[1] مندرجہ بالا آیت میں "حجتهم" "کان" کی خبر ہے اور "ان قالوا ..." "کان" کا اسم ہے۔

اس کے علاوہ وہ عملی طور پر ثابت کر چکے تھے کہ بہانہ تراشی کے علاوہ ان کا کوئی اور مقصد ہے ہی نہیں اور بالفرض اگر یہ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے مجسم ہو بھی جاتا تو وہ فوراً کہہ اٹھتے کہ یہ تو جادو ہے۔ جیسا کہ اس قسم کے مواقع پر انہوں نے ایسا کہا بھی ہے۔

ان کی بے بنیاد گفتگو کو "حجت" سے تعبیر کرنا درحقیقت اس بات سے کنایہ ہے کہ ان کے پاس کٹ حجتی کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں ہے۔

۲۶۔ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

۲۷۔ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ۝

۲۸۔ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۣ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

۲۹۔ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

۳۰۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝

۳۱۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۣ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝

ترجمہ

۲۶۔ کہہ دیجئے کہ خدا تم کو زندہ کرتا ہے، پھر وہی تمھیں مارتا ہے، پھر قیامت کے دن کہ جس میں کسی طرح کا شک نہیں تمھیں جمع کرے گا، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۲۷۔ اور آسمانوں اور زمین کی مالکیّت اور حاکمیت خاص خدا ہی کی ہے اور جس دن

قیامت برپا ہوگی اُس دن اہل باطل خسارے میں ہوں گے۔

۲۸۔ اُس دن تم ہر اُمت کو دیکھو گے کہ (خوف اور وحشت کی شدت سے) گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوگی، اور ہر امت اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلائی جائے گی (اور اس سے کہا جائے گا)، جو کچھ تم لوگ کیا کرتے تھے، آج اُس کا تم کو بدلہ دیا جائے گا۔

۲۹۔ یہ ہماری کتاب ہے جو تم سے حق بات کہہ رہی ہے (اور تمھیں تمھارے اعمال بتارہی ہے)، جو کچھ تم انجام دیتے تھے، ہم لکھتے جاتے تھے۔

۳۰۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے، اُنھیں ان کا پروردگار اپنی رحمت میں داخل کرے گا، یہ بہت واضح کامیابی ہے۔

۳۱۔ لیکن جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان سے کہا جائے گا تو کیا تمھارے سامنے ہماری آیتیں نہیں پڑھی جاتی تھیں؟ تم نے تو تکبر کیا اور تم لوگ تو تھے ہی مجرم۔

تفسیر

سب گھٹنے ٹیک دیں گے

یہ آیتیں درحقیقت ان دہریوں کا ایک اور جواب ہیں جو مبدا اور معاد کے منکر تھے اور گزشتہ آیات میں ان کی باتوں کی طرف اشارہ بھی ہو چکا ہے۔

چنانچہ ان آیات میں سب سے پہلے فرمایا گیا ہے، کہہ دے کہ خدا ہی تم کو زندہ کرتا ہے، پھر وہی تمھیں مارتا ہے پھر تمھیں قیامت کے دن حساب و کتاب کے لیے جمع کرے گا، وہی دن کہ جس کے بارے میں کسی قسم کے شک شبہ کی گنجائش نہیں۔ (قل اللہ یحییکم ثم یمیتکم ثم یجمعکم الی یوم القیامة

لاریب فیہ)۔

وہ نہ تو خدا کو مانتے تھے اور نہ ہی روزِ جزا کو اور اس آیت کے مضامین درحقیقت ان دونوں قسموں کے لیے استدلال ہیں، کیونکہ پہلے تو "حیات" کے مسئلے پر زور دیا گیا ہے، بالفاظ دیگر وہ پہلی زندگی کے وجود اور بے جان چیزوں سے زندہ چیزوں کی پیدائش کا انکار نہیں کرسکتے تھے اور یہ بات بذاتِ خود اس امر کی دلیل ہے کہ کوئی علم کل اور عقلِ کل موجود ہے۔ کیا یہ بات ممکن ہے کہ زندگی کا محیر العقول نظام کائنات کے پیچیدہ اسرار اور گوناگوں صورتیں کہ جس کے بارے میں تمام دانشوروں کی عقلیں مات، مبہوت اور حیران و سرگرداں ہیں، صاحب قدرت اور صاحب علم خدا کے وجود کے بغیر منصۂ شہود پر آسکتے ہیں؟

اسی لیے تو قرآن مجید کی مختلف آیات میں حیات کے مسئلے کو توحید کی ایک علامت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جو ذات پہلی مرتبہ زندگی عطا کرنے پر قادر ہے وہ دوبارہ زندگی عطا کرنے پر کیونکر قدرت نہیں رکھتی؟

"لاریب فیہ" (اس میں کسی قسم کا شک نہیں)، یہ عبارت جو قیامت کے بارے میں ہے اور اس کے "واقع" ہونے کی خبر دے رہی ہے نہ کہ اس کے "امکان" کی، ممکن ہے کہ پروردگارِ عالم کے "قانونِ عدالت" کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ یہ بات تو یقینی ہے کہ اس دنیا میں تمام حق داروں کو صحیح معنوں میں ان کا حق نہیں مل پاتا اور نہ ہی تمام ظالموں کو ان کے کیے کی صحیح معنوں میں سزا ملتی ہے اور اگر قیامت کی عدالت بھی نہ ہو تو پھر پروردگار کی عدالت اپنا مفہوم کھو دے گی۔

نیز چونکہ بہت سے لوگ ان آیات میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (ولکن اکثر الناس لا یعلمون)۔

قیامت کا ایک نام کہ جس کی طرف مندرجہ بالا آیت میں اشارہ ہوا ہے "یوم الجمع" بھی ہے، کیونکہ تمام اوّلین و آخرین اور انسانوں کی تمام قسمیں اس روز ایک جگہ پر جمع ہوں گی۔ یہ تعبیر قرآن کی چند دیگر آیات میں بھی بیان ہوئی ہے، جن میں سے سورۂ شوریٰ کی آیت ، اور سورۂ تغابن کی آیت ۹ بھی ہے)۔

بعد کی آیت معاد کے مسئلے پر ایک اور دلیل ہے اور اس طرح کی گفتگو ہم قرآن کی اور بھی آیات میں پڑھ چکے ہیں ارشاد فرمایا گیا ہے اور سارے آسمانوں اور زمین کی مالکیت اور حاکمیت خاص خدا کے لیے ہے۔ (وللہ ملک السماوات والارض)۔

جو ذات تمام کائنات کی مالک اور حاکم ہے وہ یقیناً مُردوں کو زندہ کرنے پر بھی قدرت رکھتی ہے اور ایسا کام اس کی قدرت کے لیے قطعاً مشکل نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دُنیا کو آخرت کی کھیتی اور مرنے کے بعد کے جہان کے لیے نفع بخش تجارت کا مرکز قرار دیا ہے۔ لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: جس دن قیامت برپا ہو گی، اس دن اہل باطل خسارے میں رہیں گے (ویوم تقوم الساعۃ یومئذ یخسر المبطلون)۔

کیونکہ وہ زندگی کا سرمایہ کھو بیٹھے ہوں گے اور اس سے کوئی تجارت بھی نہیں کی ہوگی اور انہوں نے حسرت و غم کے سوا کوئی مال نہیں خریدا ہوگا۔

اس تجارتی منڈی میں حیات، عقل و ہوش اور دنیاوی نعمتیں انسان کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ باطل پرست افراد اسے یہیں پر جلد ختم ہو جانے والے مال کے بدلے میں بیچ ڈالتے ہیں جب کہ روز قیامت صرف قلب سلیم، ایمان اور عمل صالح ہی کام آئیں گے۔ لیکن وہ لوگ اپنے خسارے کو اپنی ہی آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے۔

"یخسر" "خسران" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے "سرمائے کو ضائع کر دینا" اور مفردات میں راغب کے بقول کبھی تو اس کی نسبت خود انسان کی طرف دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے "خسر فلان" یعنی فلاں شخص نے نقصان اٹھایا اور کبھی تجارت کی طرف دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے "خسرت تجارتہ" یعنی اس کی تجارت نے نقصان اٹھایا۔ اگرچہ دنیا پرست لوگ اس تعبیر کو مال، مقام، منصب اور مادی نعمتوں کے بارے میں استعمال کرتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مادی خسارے سے زیادہ اہم نقصان عقل و ایمان کے سرمائے اور ثواب کو کھو دینا ہوتا ہے۔

"مبطل" "ابطال" کے مادہ سے ہے، جس کے لغت میں بہت سے معانی ہیں، مثلاً کسی چیز کو باطل کر دینا، جھوٹ بولنا، ہنسی مذاق کرنا اور باطل چیز پیش کرنا وغیرہ۔ مذکورہ تمام معانی کا اطلاق مندرجہ بالا آیت پر ہو سکتا ہے۔

جن لوگوں نے حق کو باطل کر دیا، جنہوں نے باطل عقائد کا پرچار کیا، جنہوں نے انبیائے کرام علیہم السلام کے سامنے جھوٹ بولا اور ان کی باتوں کا تمسخر اڑایا غرض سب اس دن اپنا نقصان اور خسارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

بعد کی آیت قیامت کے منظر کی نہایت واضح الفاظ میں تصویر کشی کر رہی ہے اور کہتی ہے: اس دن تم ہر امت کو دیکھو گے کہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوگی (وتری کل امۃ جاثیۃ)۔

بعض عظیم مفسرین کے اقوال سے استفادہ ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانے میں مدعی اور مدعیٰ علیہ قاضیوں اور حکام کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھا کرتے تھے تاکہ اس طرح سے وہ دوسروں سے الگ نظر آئیں۔ قیامت کے دن بھی وہ خدا کی عظیم عدالت میں اسی طرح گھٹنے ٹیک کر بیٹھیں گے تاکہ ان پر مقدمہ چلایا جائے نیز یہ بات بھی ممکن ہے کہ یہ تعبیر ان کی خدا کے ہر قسم کے احکام و فرمان کی بجا آوری کے لیے مکمل آمادگی کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ جو لوگ بالکل تیاری کی حالت میں ہوتے ہیں وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا کرتے ہیں۔

یا پھر ہو سکتا ہے ان کی کمزوری، ناتوانی، خوف و ہراس کی طرف اشارہ ہو جو انہیں لاحق ہوگا (یہ تمام معانی آیت کے مفہوم میں جمع ہو سکتے ہیں)۔

"جاثیہ" کے کئی اور معانی بھی ہیں جن میں سے "لوگوں کا جم غفیر" اور "ٹولے ٹولے" ہونا بھی ہے۔ جو اس بات کی طرف اشارہ ہو سکتے ہیں کہ اللہ کی عدالت میں لوگوں کا جم غفیر ہوگا یا ہر امت اور ہر ٹولہ علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مشہور اور مناسب ہے۔

پھر قیامت کے ایک اور منظر کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اور ہر امت اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلائی جائے گی اور اس سے کہا جائے گا جو کچھ تم لوگ کیا کرتے تھے آج اس کا تم کو بدلہ دیا جائے گا۔ (کل امۃ تدعیٰ الیٰ کتابھا

الیوم تجزون ما کنتم تعملون)۔

"یہ کتاب" نامۂ اعمال ہی ہے کہ جس میں انسان کی تمام نیکی، برائی، رفتار، گفتار اور کردار درج ہوں گے اور قرآنی الفاظ میں "لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا" یعنی کوئی بھی چھوٹا اور بڑا کام ایسا نہیں ہوگا جو اس میں درج نہ ہو۔ (کہف، ۴۹)

• "کل امۃ تدعیٰ الیٰ کتابھا" کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کے انفرادی اعمال نامے کے علاوہ ہر اُمت اور گروہ کے اجتماعی اعمال نامے بھی ان کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ انسان کے دو قسم کے اعمال نامے ہوں گے اگر اس معنی پر توجہ کی جائے تو بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر غور سے کام لیا جائے تو دو طرح کے اعمال ناموں کا ہونا ایک فطری بات ہے۔[1]

"تدعیٰ" کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنا نامۂ اعمال پڑھنے کی دعوت دی جائے گی۔ یہ معاملہ بعینہٖ سُورۂ بنی اسرائیل کی چودھویں آیت سے ملتا جلتا ہے، جس میں کہا گیا ہے:

"اقرأ کتابک کفیٰ بنفسک الیوم علیک حسیبًا"

"اپنے نامۂ اعمال کو پڑھو، آج یہ بات کافی ہے کہ تم اپنا حساب خود ہی کرو"

ایک بار پھر انہیں خدا کی طرف سے خطاب ہوگا اور تاکید کے طور پر ان سے کہا جائے گا:

یہ ہماری کتاب ہے جو تم سے حق کہہ رہی ہے اور تمہیں تمہارے اعمال بتا رہی ہے (ھٰذا کتابنا ینطق علیکم بالحق)۔

اس دن تم جو چاہتے تھے انجام دیتے تھے اور اس بات کا ہرگز گمان تک نہیں کرتے تھے کہ تمہارے اعمال کہیں درج بھی ہو رہے ہیں۔ لیکن ہم نے حکم دے دیا تھا کہ جو کچھ بھی تم انجام دو گے لکھتے رہیں: (انا کنا نستنسخ ما کنتم تعملون)۔

"نستنسخ" "استنساخ" کے مادہ سے ہے۔ یہ دراصل "نسخ" سے لیا گیا ہے اس کا معنی کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ذریعے زائل کرنا ہے، مثلاً کہا جاتا ہے:

• "نسخت الشمس الظل"

• "سورج نے سائے کو زائل کر دیا"

بعد ازاں اس کا استعمال ایک کتاب سے دیکھ کر دوسری کتاب پر اس طرح سے لکھنے کے لیے بھی ہوا ہے کہ اصل اور پہلی کتاب بھی محفوظ رہے۔

---

[1] بعض مفسرین کا احتمال ہے کہ مذکورہ آیت میں "کتاب" سے مراد "آسمانی کتاب" ہے، جو اس امت پر نازل ہوئی ہے لیکن بظاہر آیت کا اپنا معنی اور بعد کی آیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے، کتاب کا معنی نامۂ اعمال ہے اور اکثر مفسرین اسی کے قائل ہیں۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر خدا نے حکم دیا ہے کہ انسان کے اعمال کو "استنساخ" کریں تو اس سے پہلے کوئی کتاب ہونی چاہیئے جس سے دیکھ کر اس کے نامۂ اعمال لکھے جائیں۔ اسی لیے تو بعض مفسرین اس بات کے معتقد ہیں کہ تمام لوگوں کے اعمال پہلے سے ہی "لوح محفوظ" میں لکھے جا چکے ہیں اور اور انسانی اعمال کے محافظ فرشتے انہیں لوح محفوظ سے نقل کر کے نامۂ اعمال میں لکھتے رہتے ہیں۔

لیکن یہ معنی زیر تفسیر آیت سے چنداں مناسب نہیں ہے، جو معنی مناسب معلوم ہوتا ہے وہ ان دونوں معانی میں سے ایک ہے، پہلا یہ کہ یہاں پر "استنساخ" سے مراد خود "لکھنا" ہے۔ (جیسا کہ بعض مفسرین کہتے ہیں) اور دوسرا یہ کہ انسان کے اپنے اعمال بذات خود ایک تکوینی کتاب کے مانند ہیں جسے دیکھ کر فرشتے نسخۂ کتاب تیار کرتے ہیں اور اس کی کاپی تیار کرتے ہیں، اسی لیے قرآن کی دوسری آیات میں اس لفظ کے بجائے "کتابت" کا کلمہ استعمال ہوا ہے، جیسا کہ سورۂ یٰس کی بارہویں آیت میں ہے۔

"انا نحن نحی الموتی ونکتب ما قدموا واٰثارھم"

"ہم مُردوں کو زندہ کریں گے اور جو کچھ وہ پہلے بھیج چکے ہیں اسے اور ان کے باقی ماندہ آثار کو لکھتے رہتے ہیں [1]

اعمال کے اندراج کے بارے میں کتابوں کا ذکر سورۂ یٰس کی آیت ۱۲ کے تحت تفسیر نمونہ کی جلد ۲ میں تفصیل سے کیا گیا ہے، جس میں انسان کے ذاتی نامۂ اعمال، امتوں کے نامۂ اعمال اور تمام انسانوں کی جامع اور عمومی کتاب کے بارے میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

بعد کی آیت میں قیامت کی عدالت کے آخری مرحلے کا ذکر کیا گیا ہے، جب کہ ہر گروہ اپنے اعمال کا نتیجہ پائے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: لیکن جو لوگ ایمان لائے اور وہ اچھے اعمال بجا لائے، تو ان کو ان کا پروردگار اپنی رحمت میں داخل کرے گا (فاما الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات فیدخلھم ربھم فی رحمتہ)۔

یہاں پر "فاء تفریع" کا آنا اس بات کی دلیل ہے کہ اعمال کی حفاظت اور عدالت الٰہی کا نتیجہ بھی ہے کہ مومنین

---

[1] امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں ہے:

"ان للہ ملائکۃ ینزلون فی کل یوم یکتبون فیہ اعمال بنی آدم"

"خدا کی طرف سے کچھ فرشتے ہیں جو روزانہ آسمان سے نازل ہوتے ہیں اور بنی آدم کے اعمال لکھتے رہتے ہیں"

شیخ طوسیؒ تفسیر تبیان میں مذکورہ آیت کے ذیل میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"نستنسخ" سے مراد یہ ہے کہ ہم انسانی اعمال کے محافظ فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ جو اعمال ثواب یا عذاب کا موجب ہوتے ہیں وہ اس گروہ سے لے کر درج کریں اور بقیہ اعمال پر خط تنسیخ کھینچ دیں، کیونکہ پہلا گروہ انسان کے تمام اعمال کو لکھ دیتا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر تبیان جلد ۹ صفحہ ۲۶۱)

رحمت الٰہی میں داخل ہوں گے ۔

اس آیت کی رُو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صرف ایمان کافی نہیں ہے ، بلکہ عمل صالح کی بجا آوری بھی اس کے ساتھ شرط ہے ۔

" ربھم " (ان کا پروردگار) کی تعبیر خداوند کریم کے خاص لطف و کرم کی غمازی کر رہی ہے اور " بہشت " کے بجائے " رحمت " کی تعبیر اس لطف و کرم کے کمال کو ظاہر کر رہی ہے ۔

آیت کے آخری جملے میں فرمایا گیا ہے ، یہ بہت واضح کامیابی ہے (ذالک ھو الفوز المبین) یہ جملہ اس لطف و کرم کو اوج کمال پر پہنچا رہا ہے ۔

" رحمت الٰہی " کا وسیع مفہوم ہے جو دُنیا اور آخرت دونوں پر محیط ہے ۔ قرآنی آیات میں بہت سے معانی پر اس کا اطلاق ہوا ہے ۔ کبھی ہدایت پر ، کبھی دشمن کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کرنے پر ، کبھی بابرکت بارش پر اور کبھی نور و ظلمت جیسی دوسری نعمتوں پر اور بہت سے مقامات پر بہشت اور قیامت میں خدا کی نعمتوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے ۔

" ذالک الفوز المبین " کا جملہ ایک مرتبہ سورۂ انعام کی آیت ۱۶ میں بھی آیا ہے ، لیکن وہاں پر " فوز مبین " (واضح کامیابی) کا ان لوگوں کے بارے میں ذکر ہوا ہے جو عذاب الٰہی سے بچ جائیں گے ۔ ارشاد ہوتا ہے ۔

« من یصرف عنہ یومئذ فقد رحمہ و ذالک الفوز المبین »

لیکن یہاں پر ان لوگوں کے بارے میں ہے جو بہشت اور رحمت خداوندی میں داخل ہوں گے اور حقیقت میں یہ دونوں بڑی کامیابیاں ہیں ، عذاب الٰہی سے نجات اور رحمت حق کے سایے میں داخلہ ۔

یہاں پر ممکن ہے یہ سوال پیش ہو کہ جو مومنین عمل صالح سے عاری ہیں آیا وہ بہشت میں نہیں جائیں گے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ضرور جائیں گے ، لیکن قبل ازیں وہ جہنم میں اپنی بداعمالیوں کی سزا پائیں گے اور پاک صاف ہو کر داخل جنت ہوں گے ۔ حساب و کتاب کے بعد یہ لوگ براہ راست رحمتِ الٰہی میں داخلہ حاصل کر سکیں گے جو ایمان کے علاوہ عمل صالح کے سرمائے کے بھی حامل ہوں گے ۔

" فوز " کا لفظ جس طرح کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے اس " کامیابی " کے معنی میں ہے جس کے ساتھ صحت و سلامتی بھی ہو ۔ یہ کلمہ قرآنی آیات میں ۱۹ مرتبہ استعمال ہوا ہے ۔ کہیں پر تو اس کی " مبین " کے لفظ کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے اور کہیں پر " کبیر " کے لفظ کے ساتھ ، لیکن اکثر آیات میں " عظیم " کے لفظ کے ساتھ اس کی توصیف کی گئی ہے اور عام طور پر بہشت ہی کے سلسلے میں ہے لیکن بعض مقامات پر اطاعت الٰہی اور گناہوں کی بخشش وغیرہ کے بارے میں بھی استعمال ہوا ہے ۔

بعد کی آیت میں ایک اور ٹولے کے انجام کا ذکر ہے ، جو ٹھیک اس گروہ کا مدمقابل ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے ، لیکن جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان سے کہا جائے گا ، کیا تمہارے سامنے ہماری آیتیں نہیں پڑھی جاتی تھیں ؟ تم نے تکبر کیا اور حق کے سامنے سر نہیں جھکایا اور تم لوگ گناہگار تھے (واما الذین کفروا افلم تکن اٰیاتی تتلیٰ علیکم فاستکبرتم

وکنتم قوماً مجرمین)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ یہ آیت صرف کفر کے متعلق گفتگو کر رہی ہے۔ لیکن اس میں بُرے اعمال کا تذکرہ نہیں ہے جو عذابِ الٰہی میں داخل ہونے کا سبب ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ مسئلہ کفر ہی بذاتِ خود عذاب کا موجب ہوتا ہے، یا پھر اس لیے کہ آیت کے ذیل میں "مجرمین" کی تعبیر ہی اس معنی کو ذکر کرنے کے لیے کافی ہے۔

ایک اور نکتہ یہ بھی ہے کہ یہاں پر دوزخ کی سزاؤں کا ذکر نہیں ہوا۔ دراصل پروردگارِ عالم کی سرزنش کا ذکر ہی بہت بڑی سزا محسوب ہوتی ہے، جس کے مقابلہ میں دوزخ کی اہمیت بہت کم ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انبیاء کی بعثت، رسولوں کے بھیجنے اور آیاتِ الٰہی کے نزول (جسے اصطلاح میں احکامِ عقل کی احکامِ شریعت کے ساتھ تاکید کا نام دیا جاتا ہے) کے بغیر خداوندِ رحمان کی جانب سے سزا نہیں ملے گی اور یہ اس کا انتہائی لطف و کرم ہے۔

آخری نکتہ یہ ہے کہ اس ٹولے کے لیے سب سے بڑی مصیبت ایک تو آیاتِ الٰہی کے مقابلے میں "استکبار" کا مظاہرہ ہے اور دوسری "جرم و گناہ کا دوام" ہے۔ جو "کنتم قوماً مجرمین" کے جملے سے بھی جاتی ہے۔

۳۲۔ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ○

۳۳۔ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○

۳۴۔ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ○

۳۵۔ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ○

۳۶۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

۳۷۔ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۠ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

ترجمہ

۳۲۔ اور جب کہا جاتا تھا کہ خدا کا وعدہ حق ہے اور قیامت میں کچھ شک نہیں ہے تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا چیز ہے؟ ہم تو اس بارے میں صرف گمان رکھتے ہیں اور اس پر یقین ہرگز نہیں رکھتے۔

۳۳۔ اور ان کے کرتوتوں کی برائیاں ان پر ظاہر ہو جائیں گی اور جس کی یہ ہنسی اڑایا کرتے تھے ان پر واقع ہو کر رہے گا۔

۳۴۔ اور ان سے کہا جائے گا، آج ہم بھی تمہیں اس طرح بھلا دیں گے، جس طرح تم نے آج کے دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور تمہارا ٹھکانا جہنم ہے اور کوئی تمہارا مددگار نہیں۔

۳۵۔ یہ اس لیے ہے کہ تم لوگوں نے خدا کی آیتوں کو ہنسی مذاق بنا رکھا تھا اور دنیاوی زندگی نے تمہیں غرور میں مبتلا کر رکھا تھا۔ آج کے دن یہ لوگ نہ تو دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ہی ان سے کوئی عذر قبول کیا جائے گا۔

۳۶۔ بنابریں حمد و ستائش خدا ہی کے لیے سزاوار ہے جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار اور سارے جہانوں کا مالک ہے۔

۳۷۔ اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے عظمت اور بڑائی ہے اور وہی غالب حکمت والا ہے۔

تفسیر

جس دن انسان کے برے اعمال ظاہر ہو جائیں گے

زیر تفسیر آیات میں سب سے پہلی آیت درحقیقت ان امور کی وضاحت ہے جو گزشتہ آیات میں اجمالی صورت میں بیان ہوئے ہیں اور خدا کی آیات اور انبیاء کی دعوت کے مقابلے میں کفار کے استکبار کی تشریح ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب کہا جاتا تھا کہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کچھ شک نہیں ہے تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا چیز ہے، ہم تو اس بارے میں صرف گمان رکھتے ہیں اور اس پر ہرگز یقین نہیں رکھتے (واذا قیل ان وعد اللہ حق و

الساعة لاریب فیھا قلتم ماندری ما الساعة ان نظن الا ظنا وما نحن بمستیقنین)۔

"ماندری ما الساعة": ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے کی تعبیر کیوں بیان کی گئی ہے؟ جب کہ قیامت کا مفہوم ان کے لیے کوئی پیچیدہ بات نہیں تھی اور اگر انہیں کوئی شک تھا بھی تو صرف اس کے وجود کے بارے میں تھا۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ تکبر کا شکار تھے اور بالکل بے اعتنائی سے کام لیتے تھے۔ اگر ان میں حق طلبی کی تڑپ ہوتی تو روز قیامت کی حقیقت بھی ان کے لیے روز روشن کی طرح ظاہر تھی اور اس کے وجود کے دلائل بھی بہت تھے۔

یہیں سے اس سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اگر وہ قیامت کے بارے میں واقعاً شک و شبہ میں پڑے ہوئے تھے تو اس بارے میں نہ تو ان پر کسی قسم کا گناہ تھا اور نہ ہی ان پر کوئی ذمہ داری بنتی تھی، کیونکہ ان کا یہ شک و شبہ تو حق کے واضح نہ ہونے کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ تکبر، غرور، ہٹ دھرمی اور معاندانہ رویئے کی وجہ سے تھا۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ان کی اس تضاد بیانی کا مقصد مذاق اور تمسخر اڑانا تھا۔

بعد والی آیت ان کی سزا اور عذاب کی بات کر رہی ہے۔ یہ سزا ہماری دنیاوی مقرر کردہ سزاؤں جیسی نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وہاں پر ان کے کرتوتوں کی برائیاں ظاہر ہو جائیں گی۔ (وبدا لھم سیئات ما عملوا)۔

تمام برائیاں مجسم ہو کر سامنے آجائیں گی اور ان کے رُو برُو واضح اور آشکار صورت میں پیش ہوں گی، ان کی ہم دم اور ہم نشین ہو کر انہیں ہمیشہ دکھ پہنچاتی رہیں گی۔

آخرکار جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہ ان پر واقع ہو کر رہے گی (وحاق بھم ما کانوا بہ یستھزءون)[1]

سب سے دردناک بات یہ ہے کہ خداوند رحمان و رحیم کی جانب سے انہیں خطاب ہوگا۔ "اور کہا جائے گا آج ہم بھی تمہیں اسی طرح بھلا دیں گے، جس طرح تم آج کے دن کی ملاقات کو بھلا چکے تھے۔" وقیل الیوم ننساکم کما نسیتم لقاء یومکم ھذا)۔

یہ ایک ایسی تعبیر ہے جو مختلف صورتوں میں قرآن پاک میں کئی مرتبہ آئی ہے، جیسا کہ سورۂ اعراف کی ۵۱ ویں آیت میں ہے۔

"فالیوم ننساھم کما نسوا لقاء یومھم ھذا"

"آج ہم بھی انہیں بھلا دیں گے، جس طرح کہ انھوں نے آج کے دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا تھا"

یہی چیز سورہ ۱۰ "السجدہ" کی ۱۴ ویں آیت میں ایک اور انداز میں ذکر کی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خداوند عالم کی ذات پاک کے لیے فراموشی ایک بے معنی سی بات ہے، کیونکہ اس کا علم تو تمام کائنات

---

[1] "حاق" "حوق" کے مادہ سے ہے جس کا معنی داخل ہونا، نازل ہونا، جا لگنا، پہنچنا اور گھیر لینا ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک یہ کلمہ دراصل "حق" ہے (جس کا معنی ثابت ہونا ہے) پہلی قاف کو واؤ میں تبدیل کر کے پھر اسے الف میں بدل دیا گیا ہے۔

پر حاوی ہے۔ دراصل یہ ایک لطیف کنایہ ہے ایک مجرم اور گناہگار انسان سے بے پروائی اور بے نیازی کے لیے۔ حتیٰ کہ ہمارے روزمرہ میں بھی یہی بات دیکھنے میں آتی ہے کہ ہم کہتے ہیں۔ "تم فلاں سے وفا دوست کو ہمیشہ کے لیے بھلا دو" یعنی ایک بھولے بسرے انسان کے مانند اس سے سلوک کرو۔ اس کے ساتھ مہر و محبت، دیدار و ملاقات، دل جوئی اور حال احوال پوچھنا ترک کردو اور کبھی اس کا نام تک نہ لو۔

ضمنی طور پر یہ تعبیر "اعمال کے مجسم ہونے" اور "جرم و سزا کی مناسبت" کے مسئلے پر ایک اور تاکید ہے، کیونکہ ان کا قیامت کو فراموش کر دینا اس بات کا سبب بن جائے گا کہ خداوند تعالیٰ بھی انہیں فراموشی کے خانے میں ڈال دے اور کس قدر جانکاہ اور دردناک ہو گی یہ عظیم مصیبت کہ خداوند رحیم اور مہربان کسی شخص کو گوشۂ فراموشی میں ڈال کر اسے ہر قسم کے لطف و کرم سے محروم کر دے۔

مفسرین نے یہاں پر "نسیان" کی مختلف تفسیریں بیان کی ہیں، جن سب کی رُوح تقریباً وہی مذکورہ بالا جامع معنی بن جاتی ہے، لہٰذا ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی بتاتے چلیں کہ روز قیامت کی فراموشی سے مراد اس روز واقع ہونے والے تمام واقعات کی فراموشی ہے، خواہ وہ حساب کتاب ہو یا کوئی اور معاملہ کہ قیامت کے انکار کے ضمن میں وہ ان سب کا انکار کر جاتے تھے۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس سے مراد قیامت کے دن لقاء الٰہی (خدا کی ملاقات) کی فراموشی ہے۔ کیونکہ قیامت کے دن کو قرآن مجید میں "یوم لقاء اللہ" (خدا کی ملاقات کا دن) کہا گیا ہے۔ البتہ یہ ملاقات اور مشاہدہ ظاہری اعضاء اور آنکھوں سے نہیں، بلکہ باطنی اعضاء اور دل کی آنکھوں سے ہوگا۔

آیت کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ان سے کہا جائے گا "تمہارا ٹھکانا جہنم ہے": (وماْوٰکم النار)۔

اور اگر تمہارا یہ گمان ہو کہ کوئی شخص تمہاری مدد کو پہنچے گا تو یہ بھی دو ٹوک الفاظ میں سُن لو کہ: تمہارا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ (ومالکم من ناصرین)۔

لیکن تم کیوں اور کس لیے اس مصیبت میں گرفتار ہوتے ہو؟ تو سن لو کہ "یہ اس لیے ہے کہ تم لوگوں نے خدا کی آیتوں کو ہنسی مذاق بنا رکھا تھا اور دُنیاوی زندگی نے تمہیں غرور میں مبتلا کر رکھا تھا" (ذالکم بانکم اتخذتم اٰیات اللہ ھزوًا وغرتکم الحیٰوۃ الدنیا)۔

اصولی طور پر یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں، ایک "غرور" اور دوسرے "استہزاء"۔ مغرور اور خود پسند افراد دوسروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور عام طور پر ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کے غرور کا اصل سبب بھی دنیاوی زندگی کا مال و متاع، قدرت و طاقت، مال و دولت اور عارضی کامیابی ہوتی ہے جو کم ظرف لوگوں کو اس قدر غافل کر دیتی ہے کہ وہ انبیائے الٰہی کی دعوت تک کو ذرہ بھر اہمیت نہیں دیتے، بلکہ اپنے آپ کو ان کی دعوت کے مطالعے تک کی زحمت دینا گوارا نہیں کرتے۔

آیت کے آخر میں ایک مرتبہ پھر اسی چیز کو دوسرے لفظوں میں دہرایا گیا ہے اور اس کی تاکید کی گئی ہے جو گزشتہ آیت میں بیان ہو چکی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، آج کے دن وہ نہ تو دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ہی ان سے کوئی عذر قبول کیا جائے گا (فالیوم لا یخرجون منہا ولا ھم یستعتبون)۔ [1]

وہاں پر ان کے ٹھکانے اور مستقل جگہ کی بات ہو رہی تھی اور یہاں پر ان کے دوزخ سے نہ نکلنے کی گفتگو ہو رہی ہے۔ وہاں پر بتایا گیا تھا کہ ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا اور یہاں پر فرمایا گیا ہے کہ ان کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہوگا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے لیے کوئی راہِ نجات نہیں ہے۔

اس سورت کے آخر میں توحید اور معاد کی بحث کو تکمیل کے لیے دو آیتوں میں ربوبیت کی وحدت اور خداوند عالم کی عظمت، قدرت اور حکمت کو بیان کیا جا رہا ہے اور اس حصے میں خداوند عالم کی پانچ صفات کو منعکس کیا جا رہا ہے اور یہی اس سورت کا اہم ترین حصہ ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: بنا بریں تمام حمد و ستائش خدا ہی کے سزاوار ہے۔ (فللّٰہ الحمد)۔

کیونکہ وہی ہے "جو سارے آسمانوں کا پروردگار، زمین کا رب اور سارے جہانوں کا مالک ہے" (رب السماوات ورب الارض رب العالمین)۔

"رب" کا معنی مالک، مدبر، حاکم اور اصلاح کرنے والا ہے۔ اسی لیے جو بھی خیر اور برکت ہے، اسی کی ذات پاک کی جانب سے ہے۔ اسی لیے تمام تعریفیں اسی کی ذات کی طرف لوٹ جاتی ہیں، حتیٰ کہ پھول کی تعریف، چمن کی لطافت، نسیم سحر کی دلربائی اور ستاروں کی زیبائی کا ذکر اسی پاک ذات کی ستائش ہے، کیونکہ ان کا سب کچھ ذاتِ کردگار کی جانب سے اور اسی کے لطف و کرم سے ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ایک مرتبہ فرماتا ہے کہ سارے آسمانوں کا پروردگار، پھر کہتا ہے زمین کا رب اور آخر میں فرماتا ہے کہ تمام کائنات اور کائنات والوں کا مالک، یہ سب کچھ اس لیے ہے تاکہ ارباب الانواع اور مختلف خداؤں کے عقیدے کی نفی کی جائے جس کے بہت سے لوگ معتقد تھے اور ان سب کو ربوبیت کی توحید کی جانب متوجہ کیا جائے۔

ذاتِ کردگار کی "حمد" و "ربوبیت" کے ساتھ توصیف کرنے کے بعد تیسری صفت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: سارے آسمانوں اور زمین میں اس کے لیے بڑائی، عظمت، سربلندی اور بلند و بالا مرتبہ ہے (ولہ الکبریاء فی السماوات والارض)۔

کیونکہ اس کی عظمت کے آثار آسمانوں کی وسعتوں اور زمین کی پہنائیوں، بلکہ سراسر کائنات میں پائے جاتے ہیں۔

اس سے پہلی آیت میں اس کی ربوبیت یعنی کائنات کی مالکیت اور تدبیر کی بات ہو رہی تھی اور یہاں پر اس کی

---

[1] "یستعتبون" کے معنی اور اس کے اصل مادہ کے بارے میں تفسیر نمونہ کی جلد ۹ میں سورۂ روم کی ۵۰ ویں آیت کی تفسیر میں ضروری وضاحت کی جا چکی ہے۔

عظمت کا تذکرہ ہے کہ ہم جس قدر زمین و آسمان کی آفرینش کے بارے میں غور و فکر کرتے جائیں اسی قدر اس سے زیادہ آشنا اور آگاہ ہوتے جائیں گے۔

آخر میں چوتھی اور پانچویں صفت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، وہی غالب اور ناقابل تسخیر قادر اور مطلق صورت میں حکمت والا ہے (وھو العزیز الحکیم)۔

اس طرح سے "علم" "قدرت" "عظمت" "ربوبیت" اور "معبودیت" کی مجموعی صورت مکمل ہو جاتی ہے اور یہ اس کی اہم ترین صفات اور اسماء حسنیٰ کا مجموعہ ہے۔

اور گویا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ:

"لہ الحمد فاحمدوہ، وھو الرب فاشکروہ، ولہ الکبریاء فکبروہ، وھو العزیز الحکیم فاطیعوہ"

"حمد اسی کی ذات کے لیے مخصوص ہے، لہٰذا اسی کی حمد بجالاؤ، وہی پروردگار ہے۔ لہٰذا اسی کا شکر ادا کرو، عظمت اسی کی ذات کو زیبا ہے، لہٰذا اس کی تکبیر بجالاؤ اور وہ عزیز و حکیم ہے لہٰذا اسی کی اطاعت کرو۔"

اس طرح سے سورۂ "جاثیہ" جو خداوند عالم کی "عزیز و حکیم" صفات کے ساتھ شروع ہوئی تھی، انہی اوصاف کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچتی ہے، اس سورت کے سارے مندرجات بھی اس کی بے انتہا عزت و حکمت کے گواہ ہیں۔

پروردگارا! تجھے اپنی عظمت وکبریائی کی قسم، تجھے اپنے مقام ربوبیت، عزت وحکمت کی سوگند، ہمیں اپنے فرمان کی بجا آوری کے رستوں پر ثابت قدم رکھ!

خداوندا! ہر قسم کی حمد وستائش تیری ذات کے لیے مخصوص ہے اور ہر قسم کی توفیق کہ جو ہمارے نصیب میں ہے، تیرے بے پناہ الطاف واکرام کی وجہ سے ہے، ان نعمتوں کو ہمارے لیے قائم ودائم اور روزافزوں فرما!

بارالٰہا! ہم سب تیرے احسانوں میں مستغرق ہیں، تو ہمیں اپنے شکر کی بجا آوری کی توفیق عنایت فرما۔!

آمین یارب العالمین

تفسیر سورۂ جاثیہ تمام ہوئی

۱۴ شعبان ۱۴۰۵ھ

سورۂ احقاف

مکہ میں نازل ہوئی

اس کی ۳۵ آیات ہیں

تاریخ آغاز

۱۴ شعبان ۱۴۰۵ھ

سورۂ احقاف
کے
مضامین

یہ سورت مکی سورتوں میں سے ہے۔ البتہ کچھ مفسرین کی رائے میں اس کی چند آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔ اس کی تشریح ہم انہی آیات کے ضمن میں کریں گے۔ زمان و مکان کے پیش نظر اس کا نزول اس زمانے میں ہوا جب شرک کے خلاف جدوجہد جاری تھی، توحید، معاد اور اسلام کے بنیادی مسائل کی طرف دعوت دی جا رہی تھی، لہٰذا یہ سورت بھی اسی تناظر میں گفتگو کر رہی ہے۔ مجموعی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس سورت کے پیش نظر مندرجہ ذیل امور ہیں۔

① — قرآن کی عظمت کا بیان۔

② — ہر طرح کے شرک اور بت پرستی کے خلاف دو ٹوک موقف۔

③ — لوگوں کو معاد اور پروردگار کی عدالت کے مفہوم کی فہمائش۔

④ — ضمنی طور پر مشرکین اور مجرمین کے لیے تنبیہ کے طور پر قوم عاد کی داستان کا ایک حصّہ بھی بیان کیا گیا ہے جو سرزمینِ احقاف میں سکونت پذیر تھی (سورت کا نام بھی یہیں سے لیا گیا ہے)۔

⑤ — پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے عمومی اور وسیع ہونے کا تذکرہ اس حوالے سے کہ یہ انسانوں کے علاوہ جنات کے لیے بھی ہے۔

⑥ — مومنین کے لیے تشویق اور کفار کے لیے انذار بھی اس سورت میں موجود ہے اور امید و خوف کے مبادی بھی اس میں موجود ہیں۔

⑦ — پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین کی گئی ہے اور گزشتہ عظیم پیغمبروں کے نقش قدم پر زیادہ سے زیادہ چلنے کی دعوت دی گئی ہے۔

اس سورت کے فضائل

ایک حدیث کہ جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے، اس میں اس سورت کی فضیلت یوں وارد ہوئی ہے۔

"من قرأ سورة الاحقاف اعطی من الاجر بعدد کل رمل فی الدنیا عشر حسنات، ومحی عنه عشر سیئات ورفع له عشر درجات۔"

"جو شخص سورہ احقاف کی تلاوت کرے گا اسے دنیا میں موجود ریت کے ہر ذرّے کے بدلے دس نیکیاں دی جائیں گی اور دس برائیاں مٹائی جائیں گی اور دس درجے بلند کیے جائیں گے[1]

"احقاف" جمع ہے "حقف" (بروزن رزق) کی، جس کا معنی ایسی چلنے والی ریت ہے جو جنگل اور بیابان میں ہوا کے چلنے سے مستطیل اور ٹیڑھی ٹیڑھی شکل میں ایک دوسرے پر جمع ہوتی رہتی ہے۔ قوم عاد کی سرزمین کو بھی اسی وجہ سے "احقاف" کہتے تھے کہ وہ اس زمانے کا ایک ریگستان تھی۔ مندرجہ حدیث کی تعبیر بھی اسی چیز کی طرف اشارہ ہے۔

ظاہری بات ہے کہ اس قسم کے حسنات اور درجات صرف الفاظ کی تلاوت سے حاصل نہیں ہو جاتے، بلکہ ایسی تلاوت مراد ہے جو تعمیری، بیدار کرنے والی اور ایمان وتقویٰ کے راہ پر چلانے والی ہو اور سچ ہی سورۂ احقاف کے مضامین اپنے اندر ایسا اثر رکھتے بھی ہیں، بشرطیکہ انسان طالب حقیقت اور آمادۂ عمل ہو۔

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"من قرأ کل لیلة او کل جمعة سورة الاحقاف لم یصبه الله عزوجل بروعة فی الحیٰوة الدنیا، وآمنه من فزع یوم القیامة ان شاء الله۔"

"جو شخص ہر رات یا ہر جمعہ کو سورۂ احقاف کی تلاوت کرتا ہے، خداوند بزرگ و برتر اس سے دنیا کی وحشت اور خوف اٹھا لیتا ہے اور قیامت کے دن کی وحشت سے بھی وہ اس کی امان میں آجاتا ہے[2]

---

[1] تفسیر مجمع البیان، سورہ احقاف کا آغاز۔

[2] تفسیر مجمع البیان اور تفسیر نور الثقلین سورہ احقاف کا آغاز۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ حٰمٓ ○

۲۔ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ○

۳۔ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ حٰم۔

۲۔ یہ کتاب عزیز اور حکیم خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

۳۔ ہم نے سارے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اُسے صرف حق کے ساتھ ایک خاص معین وقت تک کے لیے پیدا کیا ہے، لیکن کافروں کو جن چیزوں سے ڈرایا جاتا ہے وہ ان سے مُنہ پھیر لیتے ہیں۔

تفسیر

اس کائنات کی تخلیق حق کی بنیاد پر ہے

یہ سورہ "حوامیم" کے خاندان کی سات سورتوں میں سے ایک ہے، جن کے اوائل میں "حٰم" کا کلمہ مذکور ہے

حروفِ مقطعات کی تفسیر میں عموماً اور "حٰـمٓ" کی تفسیر میں خصوصاً سُورۂ بقرہ، آلِ عمران، اعراف اور گزشتہ "حٰـمٓ" سورتوں کے آغاز میں بہت سے مطالب بیان ہو چکے ہیں، یہاں پر ان کے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اسی حد تک اکتفا کرتے ہیں کہ یہ جھنجھوڑ کر رکھ دینے والی، تحرک انگیز اور معانی ومطالب سے معمُور قرآنی آیات "حا" اور "میم" وغیرہ، جیسے سادہ حروف تہجی سے مرکب ہیں۔ خدا کی عظمت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ اس قدر عظیم چیز کو اس حد تک سادہ حرفوں سے وجُود میں لایا ہے کہ اگر لوگ قیامت تک بھی اس کے اسرار ورموز میں غور وفکر سے کام لیتے رہیں تو بھی نت نئے مطالب حاصل کرتے رہیں گے۔

شاید اسی لیے فوراً ہی فرمایا گیا ہے: "یہ کتاب خداوندِ عزیز وحکیم (قادر وتوانا) کی طرف سے نازل ہوئی ہے":
(تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم)۔

یہ وہی تعبیر ہے جو ان تین سُورتوں کے آغاز میں بیان ہو چکی ہے، جن کے اوّل میں "حٰـمٓ" ہے (سُورہ مومن جاثیہ اور احقاف)۔

یقینی بات ہے کہ ایک ناقابلِ تسخیر قدرت اور بے کراں حکمت ضروری ہے کہ جو اس قسم کی کتاب نازل کرے۔

"تدوینی کتاب" کے بعد "تکوینی کتاب" کا ذکر فرمایا گیا ہے اور آسمانوں اور زمین کی عظمت اور حقانیت کی بات کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے تو سارے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کو صرف حق کی اساس پر پیدا کیا ہے (ما خلقنا السّماوات والارض وما بینھما الا بالحق)۔

نہ تو اس کی آسمانی کتاب میں کوئی خلافِ حق کلمہ موجود ہے اور نہ ہی اس کی کائنات میں غیر موزوں اور حق کے مخالف کوئی چیز موجُود ہے، سب کچھ موزوں، نپا تلا اور حق کے ہم گام اور ہم آہنگ ہے۔

لیکن جس طرح اس تخلیق کا آغاز ہے اسی طرح اس کا انجام بھی ہے۔ لہٰذا آیت کے اگلے حصّے میں فرمایا گیا ہے: ہم نے اس کے لیے ایک خاص وقت معین کر دیا ہے (واجل مسمّٰی)۔

جس کے پہنچتے ہی دُنیا فنا ہو جائے گی۔ چونکہ یہ کائنات حق پر استوار ہے اور کسی مقصد کے تحت تخلیق ہوئی ہے لہٰذا فطری طور پر اس کے بعد ایک اور جہان ہونا چاہیئے، جس میں اعمال کے نتائج کی چھان پھٹک کی جائے۔ بنا بریں اس کائنات کی حقانیت ہی بذاتِ خود معاد کے وجُود پر ایک دلیل ہے، ورنہ یہ کائنات کھوکھلی، بے بنیاد اور بے انداز ظلم کی حامل ہوتی۔

باوجودیکہ قرآن حق ہے اور تخلیق کائنات بھی برحق، ہٹ دھرم کفار جن چیزوں سے ڈرائے جاتے ہیں، ان سے مُنہ پھیر لیتے ہیں" (والذین کفروا عما انذروا معرضون)۔

ایک طرف تو قرآنی آیات پے درپے انہیں اس بات کا خوف دلا رہی ہیں کہ تمھیں ایک عظیم عدالت کا سامنا

کرتا ہے۔ دوسری طرف اپنے خاص نظام کے تحت تخلیق کائنات بذات خود متنبہ کر رہی ہے کہ حساب و کتاب ہوگا، لیکن یہ بے پرواہ غافل نہ تو اس پر توجہ کرتے ہیں اور نہ ہی اُس پر۔

"معرضون" "اعراض" کے مادہ سے ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر وہ تکوینی اور تدوینی آیات کا سامنا کریں تو حقائق کا ادراک کرلیں گے، لیکن وہ تو اپنا منہ ہی پھیرے ہوئے حق سے گریز پا ہیں تاکہ ان کی تقلیدی تخیلات پر مبنی اور خواہشات نفسانی کے تحت عمل میں آنے والی رفتار میں کوئی تبدیلی نہ آجائے۔

۴۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۭ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

۵۔ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَاۗىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ○

۶۔ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَاۗءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ○

ترجمہ

۴۔ ان سے کہہ دیجیے کہ مجھے بتاؤ کہ خدا کو چھوڑ کر جن کی تم عبادت کرتے ہو، کیا تم نے ان کو دیکھا ہے کہ انہوں نے زمین میں کچھ پیدا کیا ہو یا آسمانوں کے بنانے میں ان کی کچھ شرکت ہو؟ اگر تم سچ کہتے ہو تو اس سے پہلے کوئی آسمانی کتاب یا گذشتہ لوگوں کے علم کے آثار میں سے کچھ ہو تو میرے سامنے پیش کرو (تاکہ تمہاری بات کی سچائی کی دلیل بن سکے)۔

۵۔ اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے جو خدا کے بجائے ایسے کو پکارے جو اسے قیامت تک جواب ہی نہ دے، بلکہ بالکل ان کی آواز ہی نہیں سنتے۔

۶۔ اور جب لوگ عرصۂ قیامت میں جمع کیے جائیں گے، تو وہ معبود ان کے دشمن ہو

جائیں گے، حتیٰ کہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے۔

تفسیر

گمراہ ترین لوگ

گذشتہ آیات میں زمین و آسمان کی تخلیق کی بات ہو رہی تھی کہ یہ سب کچھ خداوند عزیز و حکیم کی طرف سے ہے۔ اس بات کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کائنات میں اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے، کیونکہ وہی ذات عبادت کے لائق ہے جو کائنات کی خالق اور مدبر ہے اور یہ دونوں صفات اس کی ذات پاک میں موجود ہیں۔

اس بحث کی تکمیل کے لیے زیر تفسیر آیات میں روئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کر کے فرمایا گیا ہے: ان مشرکین سے کہہ دے کہ مجھے بتاؤ کہ خدا کو چھوڑ کر جن کی تم عبادت کرتے ہو کیا تم نے دیکھا ہے انہوں نے زمین میں کیا چیز پیدا کی ہے؟ (قل ارء یتم ما تدعون من دون اللہ اروني ماذا خلقوا من الارض)۔

• یا آسمانوں کی تخلیق، مالکیت اور ان کے چلانے میں ان کی کچھ شرکت ہے؟ (ام لھم شرک فی السماوات)۔

جب تمھیں یہ بات تسلیم ہے کہ بتوں کا نہ تو ارضی موجودات کی تخلیق میں کوئی عمل دخل ہے اور نہ ہی آفتاب، ماہتاب، ستاروں اور عالم بالا کی مخلوق کی آفرینش میں اور تم خود علی الاعلان اس بات کا اعتراف کرتے ہو کہ ان سب کا خالق اللہ ہے[1] تو پھر اپنی مشکلات کے حل اور برکتوں کے حصول کے لیے بے خاصیت اور عقل و شعور سے عاری مخلوق یعنی بتوں کے دامن سے کیوں وابستہ ہو؟

مگر فرض کیجیے تم یہ کہتے ہو کہ تخلیق و آفرینش کے معاملے میں ان کی شرکت ہے تو پھر اگر تم سچ کہتے ہو تو اس سے پہلے کوئی آسمانی کتاب جو تمھاری باتوں کی تصدیق کرے یا گزشتہ لوگوں کے علم کے آثار جو اس بات کی گواہی دیں میرے سامنے پیش کرو (ائتوني بکتاب من قبل ھٰذا او اثارۃ من علم ان کنتم صادقین)۔

قصہ مختصر یہ کہ دلیل یا تو نقلی پہلو کی حامل ہو گی اور آسمانی وحی کے ذریعے پیش ہو گی یا عقلی اور منطقی ہو گی یا پھر دانش وروں کی گواہی کے ذریعے ہو گی، جب کہ تم لوگ بتوں کے متعلق دعووں کے سلسلے میں نہ تو وحی الٰہی اور آسمانی کتاب سے ثبوت پیش

---

[1] یہ معنی قرآن مجید کی چند آیتوں میں ذکر ہوا ہے اور اس بارے میں تفسیر نمونہ کی اسی جلد میں سورۂ زخرف کی ۸۷ ویں آیت میں مزید تفصیل کا مطالعہ فرمائیں۔

کر سکتے ہو اور نہ ہی زمین و آسمان کی تخلیق کے بارے میں ان کی شرکت کو ثابت کر سکتے ہو تاکہ اس عقلی دلیل کے ذریعے تم ان کی خدائی کو [illegible] سکو اور نہ ہی گزشتہ لوگوں کے علوم کے آثار تمہاری باتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا دین اور مسلک [illegible] زبات اور جھوٹے توہمات اور خیالات کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

اسی لیے "اروني ماذا خلقوا من الارض" کا جملہ عقلی دلیل کی طرف اشارہ ہے اور "ایتونی بکتاب من قبل ھذا" آسمانی وحی کی طرف اشارہ ہے اور "اثارۃ من علم" کی تعبیر گزشتہ انبیاء اور ان کے اوصیاء کی سنت یا سابقہ دانشوروں کے آثار ہیں۔[1]

"اثارۃ" (بروزن "حلاوۃ") کے بارے میں علمائے لغت اور ارباب تفسیر نے چند ایک معانی ذکر کیے ہیں۔ "کسی چیز سے باقی رہ جانے والا حصہ" "روایت" اور "علامت" لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ سب معانی ایک ہی مطلب کی طرف لوٹ رہے ہیں اور وہ کسی چیز کا اثر ہوتا ہے جو باقی رہ جاتا ہے اور اس کے وجود کی دلیل ہوتا ہے۔

اس سے ملتی جلتی گفتگو اور بت پرستوں کے مقدمے اور ان کے مواخذے کے بارے میں سورہ فاطر کی چالیسویں آیت میں یوں بیان ہوا ہے۔

"قل ارءیتم شرکاءکم الذین تدعون من دون الله اروني ماذا خلقوا من الارض ام لھم شرک فی السماوات ام اٰتیناھم کتابا فھم علی بینت منه بل ان یعد الظالمون بعضھم بعضا الا غرورا"

یہ بات قابل توجہ ہے کہ زمین کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

"ماذا خلقوا من الارض"

"زمین میں سے کیا چیز خلق کی ہے؟"

اور آسمانوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

"ام لھم شرک فی السماوات"

"یا آسمانوں کی تخلیق میں ان کی کوئی شرکت ہے"؟

یعنی دونوں جگہوں پر شرکت کی بات ہو رہی ہے کیونکہ شرک در عبادت کا اصل سرچشمہ خالقیت اور تدبیر میں شرک ہی ہوتا ہے یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مشرکین عام طور پر خلقت کے معاملے کو ذاتِ خدا ہی سے مخصوص سمجھتے تھے تو پھر ان تین دلائل میں سے کسی ایک کا مطالبہ کس لیے کیا گیا ہے؟

جواباً گزارش ہے کہ اس قسم کا مطالبہ مشرکین میں سے مختصر تعداد کے لوگوں سے ہے جو بت پرستوں میں موجود تھے اور بتوں کو تخلیقی امور میں حصہ دار سمجھتے تھے۔ یا پھر یہ مسئلہ فرض کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے، یعنی بالفرض اگر تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ کائنات

---

[1] اصول کافی میں ایک روایت میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے جو آپ نے اس جملے کی تفسیر میں ارشاد فرمائی ہے کہ "انما عنی بذالک علم اوصیاء الانبیاء" یعنی گزشتہ انبیاءؑ کے اوصیاء کا باقیماندہ علم مراد ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص[illegible]۔

کی تخلیق میں بُت بھی شریک ہیں تو تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ تمہارے پاس اس دعوی کی نہ تو کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ ہی نقلی اور نہ عقلاء کی کوئی گواہی تمہارے پاس موجود ہے۔

اس سے اگلی آیت میں ان مشرکین کی گمراہی کی گہرائیوں کو بیان کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے: اس سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہوسکتا ہے جو خدا کو چھوڑ کر کسی ایسی چیز کی پرستش کرے جو اس کی پکار کا قیامت تک جواب ہی نہ دے سکے (ومن اضل ممن یدعوا من دون الله من لا یستجیب له الی یوم القیامة)۔

نہ صرف ان کے بلاوے کا جواب نہیں دیتے بلکہ ان کی باتوں کو بھی بالکل نہیں سُن پاتے " اور وہ ان کی دُعا اور ندا سے بھی بالکل غافل ہیں" (وھم عن دعائھم غافلون)۔

بعض مفسرین نے اس آیت میں ضمیر کا مرجع بے جان بتوں کو جانا ہے اس نسبت سے کہ مشرکین عرب کے اکثر و بیشتر معبُود بھی بُت تھے اور بعض نے ان فرشتوں اور انسانوں کو ضمیر کا مرجع جانا ہے جو معبُود بنائے گئے تھے، کیونکہ جنات اور فرشتوں کے عبادت گزار بھی عربوں میں کم نہیں تھے۔ اس آیت کی تمام تعبیریں چونکہ ذوی العقول سے مناسبت رکھتی ہیں لہٰذا اسی معنی کی زیادہ تائید کرتی ہیں۔

لیکن اس بات سے بھی کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ہم آیت کے مفہوم کی وسیع معنوں میں تفسیر کریں اور اس طرح کے تمام معبُود آیت میں جمع ہوں خواہ جاندار ہوں یا بے جان، صاحبان عقل ہوں یا بے عقل چیزیں، البتہ ذوی العقول سے مناسبت رکھنے والی تعبیریں اصطلاحی طور پر" غلبہ" کے باب سے ہوں۔

اگر آیت یہ کہتی ہے کہ وہ معبُود انہیں تا قیامت جواب نہیں دیں گے تو اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ قیامت کے دن انہیں جواب دیں گے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، بلکہ یہ ایک مروجہ تعبیر ہے کہ جو ابدی اور ہمیشہ کی نفی کے لیے استعمال ہوتی ہے، جس طرح ہم عام طور پر کہتے ہیں کہ اگر تم اس سے قیامت تک بھی مانگتے رہو تو وہ تمہیں ہرگز قرضہ نہیں دے گا۔ یعنی وہ یہ کام بالکل نہیں کرے گا نہ یہ کہ قیامت کے دن تمہاری درخواست قبول کرے گا۔

یہ بھی معلوم ہے کہ ہر قسم کی سعی و کوشش جستجو اور دعاؤں کی قبولیت صرف اسی دُنیا میں سُود مند ہے، جب یہ دُنیا ختم ہو جائے گی تو یہ ساری باتیں بھی از خود ختم ہو جائیں گی۔

اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہوگی کہ جب مشرک لوگ قیامت کے دن جمع کیے جائیں گے تو وہ معبُود ان کے دشمن ہو جائیں گے، حتیٰ کہ ان کی عبادت کا بھی انکار کریں گے: (واذا حشر الناس کانوا لھم اعداء وکانوا بعبادتھم کافرین)۔

جو معبُود صاحبانِ عقل ہیں وہ تو باقاعدہ طور پر ان سے دشمنی کریں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے عبادت گزاروں سے برأت کا اظہار کریں گے اور فرشتے بھی اسی طرح کریں گے، حتیٰ کہ شیاطین اور جنات بھی ان سے نفرت اور بیزاری کا اظہار کریں گے۔ اور جو بے عقل چیزیں ہیں خدا تعالیٰ انہیں بھی زندگی اور عقل عطا فرمائے گا تاکہ وہ لب کشائی کر کے اپنے عابدوں سے دشمنی اور نفرت کا اظہار کریں۔

اس سے ملتا جلتا معنی قرآن مجید کی دیگر آیات میں بھی ذکر ہوا ہے، جن میں سے ایک سورہ فاطر کی چودھویں آیت ہے اس میں مشرکین سے خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

"ان تدعوهم لا یسمعوا دعاءکم ولو سمعوا ما استجابوا لکم ویوم القیامة یکفرون بشرککم ولا ینبئک مثل خبیر"

"اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو نہیں سنتے، اگر سن بھی لیں تو اس کو قبول نہیں کر سکتے اور قیامت کے دن بھی تمہارے شرک اور عبادت کا انکار کر دیں گے اور خدا جیسی آگاہ ذات کے مانند تمہیں اور کوئی مطلع نہیں کر سکتا۔"

اس آیت میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو زیر تفسیر آیت میں ہیں۔ البتہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ، لیکن معبود اپنے عابدین کی عبادت سے کیسے انکار کریں گے، جب کہ وہاں پر تو انکار کی جگہ بھی نہیں ہوگی؟

ممکن ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ درحقیقت اپنی خواہشات نفسانی کی عبادت کیا کرتے تھے نہ کہ معبودوں کی کیونکہ بت پرستی کا اصل سرچشمہ خواہش پرستی ہی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قیامت کے دن معبودین کی اپنے عبادت گزاروں سے عداوت اور دشمنی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا ذکر صرف یہیں پر کیا گیا ہو بلکہ انسانیت کے بطل جلیل حضرت ابراہیمؑ بت شکن کا ایک قول سورۂ عنکبوت کی پچیسویں آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"وقال انما اتخذتم من دون الله اوثانا مودة بینکم فی الحیوٰة الدنیا ثم یوم القیامة یکفر بعضکم ببعض ویلعن بعضکم بعضا"

"ابراہیمؑ نے کہا تم نے تو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے لیے خدا بنا لیا ہے، جو اس دنیاوی زندگی میں ہی تمہاری دوستی کا ذریعہ ہیں، لیکن قیامت کے دن ایک دوسرے سے کافر ہو جاؤ گے اور ایک دوسرے کو لعنت کرو گے۔"

سورۂ مریم کی ۸۲ ویں آیت میں ہے:

"کلا سیکفرون بعبادتهم ویکونون علیهم ضدا"

"وہ بہت جلد عبادت کرنے والوں کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کی مخالفت کریں گے۔"

۷۔ وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَہُمۡ ۙ ہٰذَا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ؕ○

۸۔ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ قُلۡ اِنِ افۡتَرَیۡتُہٗ فَلَا تَمۡلِکُوۡنَ لِیۡ مِنَ اللّٰہِ شَیۡئًا ؕ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَا تُفِیۡضُوۡنَ فِیۡہِ ؕ کَفٰی بِہٖ شَہِیۡدًۢا بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکُمۡ ؕ وَ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ○

۹۔ قُلۡ مَا کُنۡتُ بِدۡعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَ مَاۤ اَدۡرِیۡ مَا یُفۡعَلُ بِیۡ وَ لَا بِکُمۡ ؕ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ وَ مَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ○

۱۰۔ قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ وَ کَفَرۡتُمۡ بِہٖ وَ شَہِدَ شَاہِدٌ مِّنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ عَلٰی مِثۡلِہٖ فَاٰمَنَ وَ اسۡتَکۡبَرۡتُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ○

ترجمہ

۷۔ جب ہماری واضح آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو کفار اس حق کے بارے میں جو ان کے لیے آچکا ہے، کہتے ہیں یہ تو کھلم کھلا جادو ہے۔

۸۔ بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے ان آیات کی خدا کی طرف جھوٹ نسبت دی ہے، تو کہہ دے کہ اگر میں نے ان کی خدا کی طرف جھوٹ نسبت دی ہے تو اضروری

ہے کہ وہ مجھے ذلیل وخوار کرے اور) تم خدا کے سامنے میرا دفاع نہیں کر سکو گے۔
وہ ان کاموں کو بہتر جانتا ہے جن میں تم داخل ہوتے ہو، یہی بات کافی ہے کہ اللہ
میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور وہی بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔
۹۔ کہہ دے کہ میں نیا رسول نہیں ہوں، اور میں نہیں جانتا کہ خدا میرے ساتھ اور تمہارے
ساتھ کیا کرے گا؟ میں تو صرف اسی بات کی پیروی کروں گا جو مجھ پر وحی ہوتی ہے،
اور میں تو بس علانیہ طور پر ڈرانے والا ہوں۔
۱۰۔ یہ بھی کہہ دے کہ مجھے یہ بتاؤ کہ اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے ہو اور تم اس کا انکار کر
بیٹھو، حالانکہ بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ اس کی گواہی بھی دے دے اور ایمان
بھی لے آئے اور تم تکبر کر بیٹھے (تو تم سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا؟) خداوند عالم ظالم قوم کو
ہدایت نہیں کرتا۔

تفسیر

کہہ دیجئے میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں

یہ آیات بھی حسب سابق مشرکین کی کیفیت بیان کر رہی ہیں اور آیاتِ خداوندی کے ساتھ ان کے برتاؤ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے، جب ہماری واضح آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو کفار اس حق کے بارے میں جو ان کے لیے آچکا ہے، کہتے ہیں یہ تو کھلم کھلا جادو ہے (واذا تتلی علیھم اٰیاتنا بینات قال الذین کفروا للحق لما جاءھم ھٰذا سحر مبین)۔

وہ ایک طرف تو قرآن مجید کی دلوں میں زبردست اور عجیب گہری تاثیر کا انکار بھی نہیں کر سکتے تھے اور دوسری طرف قرآن مجید کی حقانیت اور عظمت کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کے لیے تیار بھی نہیں تھے، لہٰذا قرآن پاک کی اس تاثیر کو گمراہ کن تفسیر کے ساتھ کھلم کھلا جادو کا نام دیتے تھے، جو بذاتِ خود ان کا در پردہ ایک قسم کا یہ اعتراف تھا کہ قرآن انسانی فکر

میں انتہائی زیادہ تاثیر رکھتا ہے۔

بنابریں مندرجہ بالا آیت میں لفظ "حق" انہی قرآنی آیات کی طرف اشارہ ہے، اگرچہ بعض مفسرین نے اس کا معنی "نبوت" یا "اسلام" یا "پیغمبرِ اسلام" کے دوسرے معجزات" کیا ہے، لیکن آیت کے آغاز کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

لیکن انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ گئے اور کھلے بندوں" کہتے ہیں، اس نے ان آیات کو خدا کی طرف جھوٹی نسبت دی ہے " (ام یقولون افتراہ)۔

اس موقع پر خداوندِ عالم اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کا منہ توڑ جواب دیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ان سے کہہ دے اگر ایسا ہی ہے، جیسے تم سمجھتے ہو اور میں نے اس قرآن کو خدا کی طرف جھوٹ منسوب کر دیا ہے، تو لازم ہے کہ وہ مجھے رسوا کرے اور تم لوگ خدا کے سامنے میرا دفاع نہیں کر سکو گے۔ (قل ان افتریتہ فلا تملکون لی من اللہ شیئاً)۔ [1]

یہ بات کیسے ہو سکتی ہے کہ خداوندِ عالم ان "آیات بینات" اور اس جاودانی معجزے کو کسی جھوٹے شخص کے ہاتھوں پر ظاہر کرے؟ یہ بات خدا کی حکمت اور اس کے لطف سے بعید ہے۔

جیسا کہ سورۂ حاقہ کی آیا ۴۴ تا ۴۷ میں ہے:

"ولو تقول علینا بعض الاقاویل، لاخذنا منہ بالیمین، ثم لقطعنا منہ الوتین، فما منکم من احد عنہ حاجزین"۔

"وہ (پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہماری طرف ناروا باتوں کی نسبت دیتا ہے، تو ہم اسے اپنی طاقت کے ذریعے پکڑیں گے اور اس کے دل کی رگ کو کاٹ ڈالیں گے۔ اور تم میں سے ایک شخص بھی ہمیں اس کا سے نہیں روک سکتا اور نہ ہی اس کا دفاع کر سکتا ہے۔

اس لیے یہ بات کیسے ممکن ہے کہ میں تمہاری خاطر اس خطرناک کام میں ہاتھ ڈالوں اور تم کیونکر باور کر سکتے ہو کہ میں اس قسم کا جھوٹ بولنے لگوں اور خدا بھی مجھے ایسے ہی چھوڑ دے، بلکہ بڑے بڑے معجزات میرے اختیار میں دے دے؟

پھر ان کی تنبیہ کے طور پر فرمایا گیا ہے: لیکن خدا ان کاموں کو دوسرے لوگوں سے بہتر جانتا ہے جن میں تم داخل ہوتے ہو اور وقت آنے پر تمہیں سخت سے سخت سزا دے گا (ھو اعلم بما تفیضون فیہ)۔ [2]

---

[1] "ان افتریتہ" کا جملہ جملۂ شرطیہ ہے کہ جس کی جزاء محذوف ہے اور تقدیری طور پر یوں ہے۔

"ان افتریتہ اخذنی وعاجلنی بالعقوبۃ۔

[2] "ما تفیضون فیہ" میں "ما" کا کلمہ ممکن ہے کہ موصولہ ہو اور ناروا تہمتوں کے معنی میں ہو جو پیغمبر پر لگائی جاتی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جی ہاں! وہ ان سب بہتوں کو جانتا ہے جو تم مجھ پر لگاتے ہو، اس کے بھیجے ہوئے کے مقابلے میں کھڑے ہو چکے ہو، اسے بھی جانتا ہے اور زہریلے پروپیگنڈے کے ذریعے لوگوں کو راہِ حق سے منحرف کر رہے ہو، اس سے بھی باخبر ہے۔

بعد کے جملے میں اس بات کو مزید زور دے کر بیان کیا جا رہا ہے، لیکن کچھ اور لہجے میں یہی بات کافی ہے کہ خدا میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے (کفیٰ بہ شھیداً بینی وبینکم)۔

وہ رسالت کی دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں میرے صدق و صفا، میری سعی و کوشش اور میری تگ و دو کو بھی جانتا ہے اور تمہارے کذب و افتراء، تمہاری ریشہ دوانیوں اور دسیسہ کاریوں کو بھی دیکھ رہا ہے اور یہی چیز میرے اور تمہارے لیے کافی ہے۔

البتہ انہیں توبہ اور راہِ راست پر آجانے کی رہنمائی کے طور پر فرمایا گیا ہے: "وہ غفور بھی ہے اور رحیم بھی" بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے (وھو الغفور الرحیم)۔

وہ توبہ کرنے والوں کو بخش دیتا ہے اور انہیں اپنی رحمت واسعہ میں شامل فرما لیتا ہے۔

اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: "کہہ دے کہ میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں جو دوسرے رسولوں سے مختلف ہوں" (قل ما کنت بدعاً من الرسل)۔

اور کیا میں نہیں جانتا کہ خدا میرے ساتھ کیا کرے گا اور تمہارے ساتھ کیا کرے گا؟ (وما ادری ما یفعل بی ولا بکم)۔

میں تو صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں، جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے (ان اتبع الا ما یوحیٰ الیّ)۔

"اور میں تو بس اعلانیہ طور پر ڈرانے والا ہوں" (وما انا الا نذیر مبین)۔

یہ مختصر لیکن جامع اور معنی خیز جملے مشرکین کے بہت سے اعتراضات کے جواب ہیں۔ کبھی تو وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت پر تعجب کرتے تھے کہ ایک بشر کیونکر خدا سے تعلق پیدا کر سکتا ہے؟

کبھی کہتے کہ کھانا کیوں کھاتا ہے اور بازار میں کیوں چلتا پھرتا ہے؟

کبھی وہ عجیب و غریب معجزات کا تقاضا کرتے اور ہر ایک کی اپنی اپنی تمنا ہوتی۔

کبھی انھیں یہ توقع ہوتی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیب کا دروازہ کھولا ہوا ہے اور انھیں آئندہ کے تمام واقعات سے مطلع فرما دیں گے۔

اور کبھی تو وہ توحید کی دعوت اور معبود کے وحدہٗ لاشریک ہونے پر بھی تعجب کرتے رہتے۔

(باقی حاشیہ صفحہ نمبر سے) تھیں۔ اس لحاظ سے "فیہ" کی ضمیر اسی کی طرف لوٹ رہی ہے اور اگر یہ "ما" مصدریہ ہو تو "فیہ" کی ضمیر یا "قرآن" کی طرف لوٹے گی یا پھر "حق" کی طرف۔ تو ایسی صورت میں "تفیضون" کا معنی کسی کلام میں فساد ڈالنے کی غرض سے داخل ہونا" ہوگا

یہ آیت ایک اجمالی جواب ہے ان تمام باتوں اور حیلہ سازیوں کا۔

رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ میں کوئی نیا تازہ پیغمبر نہیں ہوں کہ جس نے توحید کی دعوت کی ہے، مجھ سے پہلے کئی انبیاء ہو گزرے ہیں جو سب کے سب نوع بشر میں سے تھے۔ وہ لباس بھی پہنتے تھے اور کھانا بھی کھاتے تھے، ان میں سے کوئی بھی مطلق غیب جاننے کا دعوے دار نہیں تھا۔ بلکہ ہر ایک یہی کہتا کہ ہم غیب کے بارے میں وہی کچھ جانتے ہیں جو کچھ خدا نے ہمیں بتایا ہے۔

ان میں سے کوئی بھی لوگوں کی قدم قدم پر معجزوں کی فرمائش اور نفسانی آرزو کے سامنے نہیں جھکا۔

یہ اس لیے ہے کہ سب لوگوں کو پتہ چل جائے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی خدا کے بندوں میں سے ایک بندہ ہیں۔ ان کی قدرت اور ان کا علم بھی خدا کے علم وقدرت کے مقابلے میں محدود ہے، قدرت مطلقہ اور علم مطلق صرف اور صرف ذات پروردگار کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ ایسے حقائق ہیں جن سے لوگوں کو باخبر رہنا چاہیئے اور اپنے ناروا اعتراضات کا سلسلہ بند کر دینا چاہیئے۔

یہ سب جوابات اس گفتگو کے بعد ذکر ہوئے ہیں جو گزشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہے کہ کبھی تو رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جادوگری کی تہمت سے متہم کرتے اور کبھی ان پر افتراء اور کذب کی تہمت لگاتے۔ ان سب ناجائز تہمتوں کا اصل سبب وہ توہمات تھے جن کا اس آیت میں جواب دیا گیا ہے۔

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس آیت کا مفہوم ان دوسری آیات کے منافی نہیں ہے، جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیب سے باخبر ہیں، جیسا کہ سورۂ فتح میں مکہ کی فتح اور مسجد الحرام میں داخلے کے بارے میں ہے (ملاحظہ ہو سورۂ فتح آیت ۲۷)، یا جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں سورۂ آل عمران آیت ۴۹ میں ہے، وہ فرماتے ہیں کہ :

"انبئکم بما تأکلون وما تدخرون فی بیوتکم"

"میں تمہیں ان چیزوں سے باخبر کرتا ہوں جو تم کھاتے ہو یا جمع کرتے ہو"

یہ اور اس قسم کی دوسری آیات کیونکہ جس آیت کی ہم تفسیر کر رہے ہیں وہ "مطلق علم غیب" کی نفی کر رہی ہے نہ کہ مطلقاً "علم غیب" کی با[لفاظ] دیگر یہ آیت استقلالی اور ذاتی علم غیب کی نفی کر رہی ہے، لیکن وہ آیات اس علم غیب کی بات کر رہی ہیں جو خدا کی طرف سے عطا کیا گیا ہے۔

ہماری اس گفتار پر شاہد سورۂ جن کی ۲۶ ویں اور ۲۷ ویں آیات ہیں، جن میں کہا گیا ہے :

"عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدًا الا من ارتضیٰ من رسول"

"خدا ہی عالم غیب ہے اور کسی بھی شخص کو اپنے مخفی علم سے آگاہ نہیں کرتا، مگر جن رسول کے لیے وہ چاہے"

بعض مفسرین نے زیر تفسیر آیت کی شان نزول یوں بیان کی ہے۔

"جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ پر مکہ میں مشکلات بہت بڑھ گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپؐ ایک ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کر رہے ہیں جس میں نخلستان ہیں، درختوں اور پانی کی فراوانی ہے۔ چنانچہ آپؐ نے یہ خواب اپنے دوستوں سے بیان کیا تو وہ سب بہت خوش ہوئے اور سمجھ گئے کہ بہت جلد مشرکین کے آزار اور اذیت سے چھٹکارا ملنے والا ہے۔ ایک عرصے تک صبر کیے رکھا، لیکن ایسی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! آپؐ نے جو فرمایا تھا اس کا تو کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا۔ آپؐ نے جس سرزمین کا خواب دیکھا تھا، ہم کب وہاں کو ہجرت کر جائیں گے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش ہوگئے اور اس ہنگام میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی کہ "وما ادری ما یفعل بی ولا بکم" (میں نہیں جانتا کہ خدا میرے ساتھ کیا کرے گا اور تمہارے ساتھ کیا کرے گا۔)

لیکن اس آیت کے لیے یہ شانِ نزول بعید معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس آیت میں مخاطب پیغمبر کے دشمن ہیں نہ کہ دوست، لیکن یہ بات ممکن معلوم ہوتی ہے کہ تطبیق کے طور پر آپؐ نے یہ فرمایا ہو۔ یعنی جب دوستوں کی طرف سے مذکورہ سوال کیا گیا ہو تو آپؐ نے اسی آیت سے استفادہ کرتے ہوئے انہیں جواب دیا ہو۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں گذشتہ آیات میں مذکور گفتگو کی تکمیل کے طور پر فرمایا گیا ہے:

یہ بھی کہہ دے کہ مجھے یہ تو بتاؤ کہ اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے ہو اور تم اس کا انکار بیٹھو، حالانکہ بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ اس کی گواہی بھی دے دے اور ایمان بھی لے آئے اور تم تکبر کرتے ہوئے اس کے آگے نہ جھکے تو تم سے بڑھ کر اور کون شخص گمراہ ہوگا؟ یقینی بات ہے کہ خدا ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا (قل ارءیتم ان کان من عند اللہ وکفرتم بہ وشھد شاھد من بنی اسرائیل علی مثلہ فاٰمن واستکبرتم ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین)۔[1]

اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ وہ گواہ کون تھا جس نے قرآن کی حقانیت اور صداقت پر گواہی دی؟

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد جناب موسیٰ بن عمران علیہ السلام ہیں جنہوں نے اپنے زمانے میں پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کی خبر دی اور اس کی علامات بتائیں۔

لیکن یہ احتمال "فاٰمن واستکبرتم" کے جملے سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے یہ شاہد پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آیا جبکہ مشرکین نے تکبر کا مظاہرہ کیا، کیونکہ

---

[1] جملہ شرطیہ "ان کان من عند اللہ" کی جزا محذوف ہے۔ جو تقدیری طور پر "من اضل منکم" ہے۔

جملے کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گواہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھا اور آنحضرت پر ایمان بھی لا چکا تھا جب کہ دوسرے لوگ تکبر کی راہوں پر گامزن رہے۔

کئی اور مفسر کہتے ہیں کہ یہ شخص اہل کتاب کے علماء میں سے تھا اور مکہ میں رہتا تھا اگرچہ یہود اور نصاریٰ کے مذہب کے پیروکار مکہ میں بہت کم تھے، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے کہ وہاں ان میں سے کوئی ایک بھی نہ رہتا ہو۔ لیکن پھر بھی یہ معلوم نہیں کہ بنی اسرائیل کا یہ عالم کون تھا اور اس کا کیا نام تھا؟

اس بات کے پیش نظر کہ اہل کتاب کا کوئی مشہور و معروف عالم ظہور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت موجود نہیں تھا اور نہ ہی کسی تاریخ نے اس کا نام ذکر کیا ہے، یہ تفسیر بھی مناسب معلوم نہیں ہوتی۔[1]

البتہ یہ تفسیر اور گذشتہ تفسیر اس بات کی مظہر ضرور ہیں کہ سورۂ احقاف مکی ہے۔

تیسری تفسیر جو اکثر مفسرین کے لیے بھی قابل قبول ہے وہ یہ ہے کہ یہ گواہ یہود کا مشہور عالم عبداللہ بن سلام تھا جو مدینہ میں اسلام لایا اور مسلمین کی صف میں شامل ہو گیا۔

ایک روایت میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ میں یہودیوں کی کسی عید کے موقع پر ان کے کنیسہ (عبادت گاہ) میں گئے۔ یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہاں آنے پر خوش نہیں تھے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اے یہود! تم اپنے میں سے بارہ شخص میرے سامنے لاؤ تاکہ وہ خدا کی وحدانیت اور محمدؐ کی نبوت کی گواہی دیں، اس طرح سے اللہ تعالیٰ تمام دنیا کے یہودیوں سے اپنا غضب اٹھا لے گا۔"

وہ سب خاموش رہے اور کسی نے بھی جواب نہیں دیا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جملے کو تین بار دہرایا لیکن تینوں مرتبہ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا، پھر آپؐ نے فرمایا:

"تم نے بیان حق سے انکار کیا ہے، لیکن خدا کی قسم "حاشر" اور "عاقب" (تورات میں پیغمبر اسلام کے القاب) میں ہوں، خواہ تم ایمان لے آؤ یا میری تکذیب کرو۔"

یہ کہہ کر آنحضرتؐ پلٹنے لگے۔ لیکن ابھی ایک قدم باہر نہیں نکالا تھا کہ ایک شخص پیچھے سے آیا اور آواز دی "اے محمدؐ! ٹھہر جاؤ!" پیغمبر اکرمؐ رک گئے۔ اس نے یہودیوں کی طرف منہ کر کے کہا: "مجھے کیسا آدمی پاتے ہو؟"

انہوں نے کہا: "خدا کی قسم ہمارے درمیان تم سے زیادہ عالم کوئی اور شخص نہیں ہے اور تمہارے باپ دادا سے بڑھ کر ہماری آسمانی کتابوں کا کوئی اور عالم نہیں ہے۔"

اس نے کہا: "میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ یہ وہی پیغمبرؐ ہے جس کا ذکر تورات اور انجیل میں آچکا ہے۔"

---

[1] "شاهد" کو یہاں نکرہ اس لیے لایا گیا ہے تاکہ عظمت کا اظہار ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاہد مشہور و معروف اور بزرگ شخصیت تھی۔

جب یہودیوں نے یہ دیکھا تو کہا: "تم جھوٹ کہتے ہو" یہ کہہ کر اسے خوب جی بھر کے گالیاں دیں۔

رسُول پاکؐ نے فرمایا:

"تم سب جھوٹ بولتے ہو، اقرار کے بعد تمہارا انکار ہرگز قابلِ قبول نہیں ہے"

یہ شخص عبداللہ بن سلام کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا اور اسی موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔ قل ارءیتم ان کان...

اس تفسیر کے مطابق یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے، ہر چند کہ یہ سُورت مکی ہے، اور یہ بات اسی آیت میں منحصر نہیں ہے، قرآن مجید کی دوسری سُورتوں میں بھی بعض مقامات پر ہم مکی آیتوں کو مدنی سُورتوں میں یا مکی سُورتوں میں مدنی آیتوں کو ملا ہُوا پاتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات پیغمبرِ اسلامؐ کے حکم سے کسی آیت کو جو سُورت کے مفہوم سے ہم آہنگ ہوتی تھی اس کی تاریخِ نزُول سے قطع نظر اسے اس سُورت میں ملا دیا جاتا تھا۔

یہ تفسیر کئی لحاظ سے مناسب تر معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] تفسیر مراغی جلد ۲ صفحہ

۱۱- وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ؕ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ○

۱۲- وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ○

۱۳- اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

۱۴- اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۱- اور کافر لوگ مومنوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر (دینِ اسلام) بہتر چیز ہوتا تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت حاصل نہ کر جاتے اور جب خود وہ اس کے ذریعے سے ہدایت نہیں پاتے تو کہتے ہیں کہ یہ تو ایک پرانا جھوٹ ہے۔

۱۲- اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی (اس نے اس کی نشانیوں کو بیان کیا ہے) اور یہ وہ کتاب ہے جو تورات کی نشانیوں سے ہم آہنگ ہے فصیح اور واضح عربی زبان میں ہے تاکہ ظالموں کو ڈرائے اور نیکوکاروں کو

خوش خبری دے۔

۱۳۔ بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر وہ اس پر قائم رہے تو ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

۱۴۔ وہی تو اہلِ جنت ہیں کہ جو اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ ان اعمال کا صلہ ہے جو وہ انجام دیتے رہے۔

شانِ نزُول

مفسرین نے زیرِ تفسیر آیات میں سے پہلی آیت کی متعدد شانِ نزُول بیان کی ہیں۔

① یہ آیت ابوذر غفاری کے بارے میں ہے، جو مکہ میں اسلام لائے اور ان کا قبیلہ بنی غفار بھی ان کے بعد اسلام لے آیا چونکہ بنی غفار ایک بادیہ نشین اور غریب قبیلہ تھا، لہذا کفار قریش کے دولت مند اور شہری لوگوں نے کہا کہ اگر اسلام بہتر چیز ہوتا تو یہ بے وقعت اور حقیر لوگ ہم سے سبقت حاصل نہ کر جاتے۔ اسی موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا۔

② ایک رُومی کنیز مکہ میں رہتی تھی۔ اس کا نام "زنی النیرہ"[1] تھا، اس نے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے ردِّ عمل میں بڑے بڑے قریشی کہنے لگے "جو چیز محمدؐ لے کر آیا ہے اگر وہ اچھی اور بہتر ہوتی تو "زنی النیرہ" جیسے لوگ ہم پر سبقت نہ لے جاتے۔

③ مکہ کے بادیہ نشین قبائل کے کچھ افراد شہر کے لوگوں سے پہلے اسلام لے آئے۔ مکہ کے رؤساء کہنے لگے کہ اگر اسلام کوئی اچھی چیز ہوتا تو یہ شتربان اور چرواہے ہم پر سبقت نہ لے جاتے"۔

④ کچھ نیک دل لیکن غریب اور تہی دست افراد مثلاً صہیبؓ، بلالؓ اور عمارؓ نے کھلے دل کے ساتھ اسلام کو قبول کیا تو مکہ کے رُؤساء کہنے لگے: "کیا یہ بات ممکن ہے کہ محمدؐ کا دین کوئی اچھی چیز ہو اور وہ ہم پر سبقت لے جائیں"؟

⑤ جب عبداللہ بن سلام اور ان کے کچھ دوست ایمان لے آئے تو مغرور یہودی کہنے لگے: "اگر اسلام اچھی

---

[1] "زنی النیرہ" ان خواتین میں سے تھیں، جنہوں نے بہت جلد اسلام کو قبول کیا، اسی لیے ابوجہل نے ان پر سخت تشدد کیا۔

چیز ہوتا تو وہ ہم سے پیش قدم نہ ہوتے"۔[1]

شانِ نزول کی پہلی چار قسموں کو صرف ایک جملے میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اسلام کی دعوت غربار، فقرار اور بادیہ نشین لوگوں میں بہت مقبول ہوگئی اور ان لوگوں نے بڑی تیزی سے اس کا کھلے دل سے استقبال کیا کیونکہ ایک تو ان کے ناجائز مفادات نہیں تھے، جن کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا۔ دوسرے ان کے دماغ میں تکبر اور غرور کی ہوا نہیں تھی اور تیسرے خوشحال، عیاش اور ہوس پرست طبقے کی نسبت ان کا دل زیادہ پاک اور صاف تھا۔

ایسے غریب غربار کی طرف سے اسلام کا اس قدر گرمجوشی کے ساتھ استقبال اس دین الٰہی کے طاقت ور ہونے کا ایک واضح ثبوت تھا، جسے مغرور اور متکبر لوگوں نے اس کی بہت بڑی کمزوری پر محمول کیا اور کہنے لگے کہ یہ کیسا دین ہے، جس کے پیروکار مٹھی بھر بادیہ نشین، غریب غربا، فقیر فقرار اور کنیز و غلام ہیں، اگر یہ کوئی معقول مکتبِ فکر ہوتا تو اسے نچلی سطح کے لوگ اور معاشرے کے پست افراد ہرگز نہ اپناتے اور ہم جو کہ بالائی سطح کے افراد اور معاشرے کے چشم و چراغ ہیں کبھی پیچھے نہ رہتے۔

لائقِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ غلط طرزِ تفکر آج بھی مغرور دولت مندوں اور خوش حال ہوس پرستوں میں مذہب کے بارے میں پایا جاتا ہے اور بڑی حد تک رائج ہے۔ وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ مذہب تو صرف فقرار و مساکین کے ہی کام کا ہے اور یہ دونوں (غربا اور مذہب) ایک دوسرے کے کام کے ہیں اور ہم تو بالا سطح کے لوگ ہیں۔

لیکن قرآن پاک نے زیرِ تفسیر آیات میں اس طرزِ تفکر کا کفایت کنندہ جواب دیا ہے۔

رہی پانچویں شانِ نزول کے بارے میں جو سطورِ بالا میں بیان ہوئی ہے کہ اس سے مراد عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی ہیں اگرچہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں اور قرطبی نے اپنی تفسیر قرطبی میں بھی اکثر مفسرینؒ نے اسی شانِ نزول کو نقل کیا ہے لیکن یہ دو لحاظ سے بعید معلوم ہوتی ہے۔

ایک تو یہ کہ "الذین کفروا" کا جملہ مطلق صورت میں عام طور پر مشرکین کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ کہ اہلِ کتاب یہود اور نصاریٰ کے لیے۔

دوسرے یہ کہ یہودیوں میں "عبداللہ بن سلام" کا مقام و مرتبہ اور عزت و حیثیت کوئی معمولی نہیں تھی کہ وہ ان کے بارے میں یہ کہتے کہ اگر اسلام اچھا دین ہوتا تو وہ اور اس کے ساتھی ہم پر سبقت نہ لے جاتے۔

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۹ صفحہ ۶۰۰۹۔

تفسیر

کامیابی کی دو شرطیں

یہ آیات بھی حسبِ سابق کفار کے اعمال و گفتار اور ان گمراہی کو زیر بحث لاکر ان کی نکوہش کر رہی ہیں۔
پہلے تو ان کی غرور آمیز اور کسی منطق سے عاری گفتگو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور کافر لوگوں نے مومنوں کے بارے میں کہا ہے کہ اگر ایمان اور اسلام کوئی اچھی چیز ہوتے تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے ہرگز سبقت حاصل نہ کر جاتے (وقال الذین کفروا للذین اٰمنوا لو کان خیراً ما سبقونا الیہ)۔[1]

یہ مٹھی بھر لوگ یا تو فقیر و بے بضاعت ہیں یا پھر دیہاتی، غلام اور اُجڈ اور یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ وہ حق کو سمجھ جائیں اور اس کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ہم جو کہ اس معاشرے کے چشم و چراغ ہیں اس بات سے غافل اور بے خبر رہ جائیں۔

لیکن وہ اس بات سے غافل تھے کہ عیب تو در اصل خود انہیں میں پایا جاتا ہے نہ کہ دینِ اسلام میں۔ اگر ان کے دلوں پر تکبر اور غرور کے پردے نہ پڑے ہوتے، اگر وہ مال و دولت، جاہ و منزلت مقام و منصب اور شہوات و خواہشات میں مست اور مگن نہ ہوتے، اگر خود پسندی اور خود نمائی انہیں تحقیقِ حق کی اجازت دیتی اور غریبوں کی طرح وہ بھی صاف دل حق خواہ اور حق طلب ہوتے تو یقیناً وہ بھی بہت جلد اسلام کے حلقہ بداماں ہو جاتے۔

لہٰذا آیت کے آخر میں اس لطیف پیرائے میں انھیں جواب دیا گیا ہے: چونکہ وہ خود قرآن کے ذریعے ہدایت نہیں پاتے تو بڑی جلدی کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ایک پرانا جھوٹ ہے (واذ لم یھتدوا بہ فسیقولون ھٰذا افک قدیم)۔[2]

---

[1] "للذین اٰمنوا" میں "لام" کا کیا معنی ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ لیکن سب سے مناسب یہی قول ہے کہ "لام" یہاں "فی" کے معنی میں ہے۔ اسی لیے آیت کے اس جملے کا معنی یوں ہوگا "کفار نے مومنین کے بارے میں یوں کہا ....." اور "سبقونا" میں فعل کے غائب ہونے کی وجہ سے بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی، جبکہ بعض نے اسے "لام تعلیل" سمجھا ہے اور بعض کے نزدیک "الذین اٰمنوا" یہاں پر مخاطب ہیں اور "سبقونا" کا جملہ "سبقتمونا" کے معنی میں ہے۔

[2] اس آیت میں "اذ" ظرفیت کے لیے ہے اور بعض مفسرین اسے "فسیقولون" سے متعلق سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "فا" وجود مانع نہیں ہے، جبکہ بعض دیگر مفسرین جیسے زمخشری، تفسیر کشاف میں اس بات کے معتقد ہیں کہ اس کے بعد کا فعل ماضی ہے اور فسیقولون فعل مضارع ہے۔ لہٰذا یہ اس کا متعلق نہیں بن سکتا، بلکہ کسی محذوف سے متعلق ہے، جس کی تقدیر یوں ہے، (بقیہ حاشیہ چرچہ آئندہ)

یعنی انہوں نے خود قرآن سے ہدایت حاصل نہیں کی ورنہ قرآن میں تو ہدایت کی کسی قسم کی کمی نہیں ہے۔

"افک قدیم" کی تعبیر اس تہمت کے مانند ہے جو ان کی زبانی قرآنی آیات میں نقل ہوئی ہے کہ وہ کہتے تھے "اساطیر الاولین" (گزشتہ لوگوں کے افسانے)۔ (فرقان / ۵)

نیز "سیقولون" کی تعبیر فعل مضارع کی صورت میں، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ہمیشہ یہ تہمت قرآن پر لگاتے رہتے تھے اور اس تہمت کو اپنے ایمان نہ لانے کا ایک بہانہ قرار دیتے تھے۔

پھر ایک اور دلیل کو بیان کیا جا رہا ہے جو قرآن کی حقانیت کے ثبوت اور مشرکین کی اس تہمت کی نفی کے لیے ہے، جو وہ کہتے تھے کہ یہ ایک قدیمی جھوٹ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس عظیم کتاب کی صداقت کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس سے پہلے موسیٰ کی وہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو لوگوں کی پیشوا اور رحمت تھی اور اس نے اپنے بعد کے انبیاء کی اوصاف کو بیان کیا ہے، اور یہ قرآن بھی ایسی کتاب ہے جو تورات میں مذکور نشانیوں سے ہم آہنگ ہے۔ (ومن قبله کتاب موسٰی اماما ورحمة وهذا کتاب مصدق)۔

تو پھر تم یہ کیسے کہتے ہو کہ یہ ایک قدیمی جھوٹ ہے!

قرآن میں کئی بار اس بات کو زور دے کر بیان کیا گیا ہے کہ قرآن تورات اور انجیل کی تصدیق کرتا ہے۔ یعنی ان نشانیوں سے ہم آہنگ ہے جو ان دو آسمانی کتابوں میں پیغمبر اسلام اور ان کی آسمانی کتاب کے بارے میں بیان ہوئی ہیں اور یہ نشانیاں اس حد تک اپنے معیار پر پوری اتری ہیں کہ قرآن نے بھی (بقرہ / ۱۴۶ میں) ارشاد فرمایا ہے۔

"الذین اٰتینا ھم الکتاب یعرفونه کما یعرفون ابناء ھم"

"اہل کتاب اسے اس حد تک بخوبی پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔"

زیر تفسیر آیت سے ملتی جلتی ایک اور آیت ہے جو سورہ ہود میں ہے۔

"افمن کان علٰی بینة من ربه ویتلوه شاهد منه ومن قبله کتاب موسٰی اماما ورحمة اولٰئک یؤمنون به"

"آیا جو شخص اپنے پروردگار کی واضح دلیل رکھتا ہو اور اس کے پیچھے پیچھے اس کی طرف سے ایک گواہ بھی آئے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب جو پیشوا اور رحمت ہے، اس پر گواہی دے رہی ہو وہ ایسے شخص کے مانند ہو سکتا ہے جو اس طرح کا نہ ہو؟"

(ہود / ۱۷)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۸ کا)

"واذ لم یھتدوا به ظھر عنادھم"؛

لیکن پہلا احتمال آیت کے معنی سے بہت ہم آہنگ ہے۔

" اماماً ورحمۃ " کی تعبیر ممکن ہے اس لیے ہو کہ امام اور پیشوا کے ذکر کے بعد کبھی کبھار ذہن میں فرض کی بجا آوری کا مسئلہ تکلیف دہ اور مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن " رحمت " کا ذکر اس تصور کی اصلاح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس امام کی امامت کے ساتھ رحمت بھی ہے، حتیٰ کہ اگر اس امام نے کسی فریضے کی بجا آوری کا حکم بھی دیا ہے تو بھی رحمت ہے اور نفوس کی تربیت سے بڑھ کر اور کیا رحمت ہو سکتی ہے؟

اس کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے " یہ اس حالت میں ہے کہ یہ آسمانی کتاب فصیح اور واضح عربی زبان میں ہے " جس سے تمام لوگ بہرہ ور ہوتے ہیں۔ (لساناً عربیاً)۔

آیت کے آخر میں نزول قرآن کے آخری مقصد کو دو مختصر سے جملوں میں اس طرح واضح کرتا ہے: مقصد یہ ہے کہ ظالموں کو ڈرائے اور نیکوکاروں کو خوشخبری دے (لینذر الذین ظلموا و بشرٰی للمحسنین)۔

چونکہ " ینذر " فعل مضارع ہے اور استمرار پر دلالت کرتا ہے، لہٰذا اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ قرآن کا ڈرانا بھی اس کی بشارت و خوشخبری کے مانند دائمی اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ تاریخ کے ہر دور اور زمانے میں ظالموں اور ستم گاروں کو ڈراتا چلا آرہا ہے اور نیک لوگوں کو خوشخبری سناتا آرہا ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ " ظالموں " کے مد مقابل " نیکوکاروں " کو قرار دیا ہے، کیونکہ یہاں پر " ظلم " کے وسیع معنی مراد ہیں جو ہر قسم کی برائی اور خلاف کاری پر محیط ہیں اور ظاہر ہے کہ دوسروں پر ظلم اور اپنے نفس پر ظلم اس میں داخل ہیں۔

بعد کی آیت درحقیقت " محسنین " (نیکوکاروں) کی تفسیر ہے جو گزشتہ آیت میں مذکور ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ اس پر قائم ہے تو نہ ان کو کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون)۔[1]

درحقیقت ایمان کے تمام مراتب اور ہر قسم کے اعمال صالحہ ان دو جملوں میں یکجا بیان ہوئے ہیں کیونکہ " توحید " تمام صحیح اعتقادیت کی بنیاد ہے تمام اصولِ عقائد کا مرجع توحید ہے۔ اور " استقامت " (صبر و شکیبائی) تمام اعمال صالحہ کی بنیاد ہے، کیونکہ تمام اعمال کا خلاصہ ان تین قسم کے صبر میں ہے: اطاعت پر صبر، معصیت پر صبر اور مصیبت پر صبر۔

بنا بریں " محسنین " وہ لوگ ہیں جو اعتقادی لحاظ سے " توحید " کے راستے پر اور عملی لحاظ سے " صبر و استقامت " کی بنیادوں پر قائم ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے افراد کو نہ تو آیندہ کے حوادث کا ڈر ہے اور نہ ہی وہ گزشتہ سے خائف ہیں۔

اس سے ملتا جلتا مفہوم سورہ حم سجدہ کی ۳۰ ویں آیت میں زیادہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ وہ یوں کہ:

" ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملٰئکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون "

---

[1] " الذین قالوا ربنا اللہ ...... " مبتدا ہے اور " لا خوف علیھم " اس کی خبر ہے: البتہ " فا " خبر پر نہیں آتی سوائے ان مواقع کے کہ جہاں شرط کا مفہوم پایا جاتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے۔

اس آیت میں دو اضافی چیزوں کا تذکرہ ہے، ایک تو یہ کہ انہیں فرشتوں کی طرف سے یہ خوشخبری دی جاتی ہے کہ ان پر نہ تو کسی قسم کا خوف ہے اور نہ ہی حزن، جبکہ زیرِ تفسیر آیت اس بارے میں خاموش ہے اور دوسرے یہ کہ خوف و حزن کی نفی کے ساتھ ساتھ انہیں بہشت موعود کی بھی خوشخبری دی گئی ہے، جب کہ زیرِ تفسیر آیت میں اس بات کی طرف اشارہ نہیں، بلکہ اس کے بعد کی آیت میں اس قسم کا اشارہ ملتا ہے۔

بہر صورت یہ دونوں آیات ایک ہی مطلب کو بیان کر رہی ہیں، ایک میں اجمال ہے اور دوسری میں تفصیل۔

علی بن ابراہیم کی تفسیر میں "ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا" کے جملہ کی تفسیر میں یوں کہا گیا ہے کہ استقاموا علی ولایۃ علی امیر المؤمنین" یعنی استقامت سے مراد علی ابن ابی طالب کی ولایت پر استقامت ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ علم و عمل اور عدالت و تقویٰ اپنانے میں امیر المومنین علیہ السلام کی پیروی خاص کر تاریک اور ظلماتی دور میں نہایت ہی مشکل کام ہوتا ہے جو استقامت و پائیداری کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، اسی لیے یہ زیرِ تفسیر آیت میں اس کے روشن مصداقوں میں سے ایک ہے نہ یہ کہ آیت کا مفہوم منحصر اسی میں ہے۔ جہاد اور اطاعت پروردگار میں صبر نیز خواہشات نفسانی اور شیطان کی چالوں کے مقابلے میں ہر طرح کی پائیداری اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

"استقامت" کے سلسلے میں سورہ حم سجدہ کی تیسویں آیت کی تفسیر میں ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

(ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد ۲۰)

اسی سلسلے کی آخری آیت میں توحید پرست نیکو کاروں کو اہم ترین بشارت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے، وہی تو اہلِ جنت ہیں کہ جو اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (اولٰئک اصحاب الجنۃ خالدین فیھا)۔

یہ ان اعمال کا صلہ ہے جو وہ انجام دیتے رہے (جزاءً بما کانوا یعملون)۔

جیسا کہ بعض مفسرین نے نتیجہ نکالا ہے کہ آیت کا ظاہری معنی حصر کا مفہوم بتا رہا ہے یعنی صرف اہلِ بہشت ہیں جو توحید اور استقامت کی راہوں پر گامزن ہیں، فطری امر ہے کہ دوسرے لوگ جو گناہوں سے آلودہ ہیں اگرچہ اپنے ایمان کی بدولت انجام کار بہشت میں جائیں گے، لیکن ابتدائی طور پر "اصحاب الجنۃ" نہیں ہیں۔

"اصحاب" (ساتھی) کی تعبیر بہشتی نعمتوں سے ان کی ہمیشہ کی ہم نشینی کی طرف اشارہ ہے۔

"جزاء بما کانوا یعملون" کی تعبیر ایک طرف تو اس بات کی دلیل ہے کہ بہشت قیمت کے بدلے میں ملتی ہے، حیلوں بہانوں سے نہیں اور دوسری طرف اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اصولی طور پر انسان آزاد اور خود مختار ہے۔

۱۵- وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسٰنًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَ
وَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصٰلُهُ ثَلٰثُونَ شَهْرًا ۚ حَتّٰى إِذَا
بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ
نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا
تَرْضٰهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي ۚ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ
الْمُسْلِمِينَ ○

۱۶- أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ
سَيِّاٰتِهِمْ فِي أَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ۖ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا
يُوعَدُونَ ○

ترجمہ

۱۵. اور ہم نے انسان کو نصیحت کی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے، اس کی
ماں تکلیف کی حالت میں اسے پیٹ میں رکھتی ہے اور تکلیف ہی سے اسے جنم دیتی
ہے اس کا پیٹ میں رہنا اور اس کی دودھ بڑھائی کی مدت تیس مہینے ہوتے، یہاں
تک کہ جب اپنی پوری جوانی کو اور کمالِ قدرت کو پہنچتا ہے اور چالیس برس کے سن میں
داخل ہوتا ہے تو کہتا ہے خداوندا! تو مجھے توفیق عطا فرما کہ تونے جو احسانات مجھ

پر اور میرے والدین پر کیے ہیں ان کا شکر بجا لاؤں اور ایسا نیک کام کروں جسے تو پسند کرے اور میری اولاد کو صالح بنا، میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں اور میں یقیناً فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

۱۶۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ جن کے بہترین اعمال ہم قبول کرتے ہیں اور ان کے گناہوں سے درگزر کرتے ہیں اور ان کا مقام اہل بہشت میں ہے۔ اُن سے کیا جانے والا یہ وعدہ سچا ہے۔

تفسیر

اے انسان! اپنے والدین سے نیکی کر:

یہ اور بعد کی آیات درحقیقت وہ وضاحت ہے جس کا گزشتہ آیات میں "ظالموں" اور "محسنین" کے بارے میں اجمالی طور پر تذکرہ ہو چکا ہے۔

سب سے پہلے نیکو کاروں کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے اور ان کی زحمات کا شکریہ ادا کرنے سے بات شروع کی گئی ہے جو شکر پروردگار کا مقدمہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ سے نیکی کرے۔ (ووصینا الانسان بوالدیہ احسانا)۔[1]

"وصیت" اور "توصیہ" مطلق سفارش کے معنی میں ہے اور اس کا مفہوم مرنے کے بعد کے امور میں منحصر نہیں ہے لہٰذا کچھ لوگوں نے یہاں پر اس کی "حکم اور فرمان" کے معنی میں تفسیر کی ہے۔

---

[1] "توصیہ" عام طور پر دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ البتہ دوسرا مفعول یا تو "با" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے یا "الی" کے ساتھ، بنا بریں مندرجہ بالا جملے میں "احساناً" کا کلمہ دوسرا مفعول واقع نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ کہ "وصینا" کو "الزمنا" کے معنی میں لیا جائے، جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور حرف جارہ کو بھی نہیں چاہتا۔ یا پھر آیت کے لیے کوئی محذوف مانیں، اور کہیں کہ اصل میں یوں ہے۔ "ووصینا الانسان بان یحسن بوالدیہ احساناً" تو ایسی صورت میں "احساناً" فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔

پھر ماں کے حقوق کی اولیت کو مدنظر رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے، اس کی ماں تکلیف کی حالت میں اسے پیٹ میں رکھتی ہے اور تکلیف ہی سے اسے جنم دیتی ہے اور اس کا پیٹ میں رہنا اور اس کی دودھ بڑھائی کی مدت تیس مہینے ہے۔ (حملته امه کرها و وضعته کرها وحمله وفصاله ثلثون شهرا)۔

اس تیس مہینے کی مدت میں ماں اپنے بچے کے بارے میں بہت بڑی فداکاری اور ایثار کا مظاہرہ کرتی ہے۔

انعقاد نطفہ کے پہلے ہی دن ماں کی حالت تبدیل ہونا شروع ہو جاتی ہے اور اس کے لیے مسلسل تکالیف کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اروشنے کی حالت[1] (VOMITING OF PREGNANCY) جو ماں کے سخت ترین حالات میں سے ایک ہے ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے اس حالت کے بارے میں ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ:

> یہ حالت ماں کے جسم میں اس غذائی قلت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو وہ اپنے بچے کے لیے ایثار کرتی ہے۔

جنین (پیٹ میں موجود بچہ) جس قدر نشو و نما پاتا رہتا ہے اسی قدر زیادہ سے زیادہ ماں کے جسم سے مواد حاصل کرتا رہتا ہے حتٰی کہ یہ مواد اس کی ہڈیوں اور اعصاب پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ بسا اوقات یہ بچہ ماں کی نیند، خوراک اور آرام و آسائش تک کو سلب کر لیتا ہے اور حمل کے آخری دنوں میں تو ماں کے لیے قدم اٹھانا اور نشست و برخاست بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ ماں کا جگر ہوتا ہے کہ وہ ان تمام مصائب و مشکلات کو بڑے حوصلے اور اس محبت اور امید کے ساتھ برداشت کرتی ہے کہ بہت جلد اس کا بچہ دنیا میں آنکھ کھولے گا اور اس کے سامنے مسکرائے گا۔

وضع حمل ـــــ جو ماں کی زندگی کے سخت ترین لمحات میں ایک ہے، کا زمانہ سر پر آجاتا ہے اور یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ بعض اوقات اولاد کے لیے ماں کو اپنی جان کی بازی لگا دینا پڑتی ہے۔

بہر حال ایک سنگین زمانہ گزر جاتا ہے اور ایک دوسرا سنگین دورانیہ شروع ہو جاتا ہے، بچہ کی رات دن کی دیکھ بھال کا دورانیہ کہ، جس میں ایسے بچے کی تمام ضروریات پوری کرنا ہوتی ہیں جو اپنی ضروریات کو بیان کرنے کی بھی قدرت نہیں رکھتا۔

اگر اسے کوئی درد ہوتا ہے تو وہ اس کی جگہ تک نہیں بتا سکتا، اگر اسے بھوک یا پیاس اور سردی یا گرمی کی کوئی تکلیف ہوتی ہے تو وہ اسے بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، سوائے اس کے کہ وہ رونا شروع کر دے اور ماں کو صحیح اندازہ کر کے صبر اور حوصلے کے ساتھ اس کی ایک ایک ضرورت کا مداوا کرنا پڑتا ہے۔

بچے کی صحت و صفائی اس دوران ایک طاقت فرسا مشکل ہوتی ہے، اسے غذا دینا بھی بہت بڑا ایثار ہے جو ماں ہی کے جسم سے حاصل ہوتی ہے۔

اس دوران بچے کو جو مختلف بیماریاں لاحق ہوتی ہیں وہ ایک اور مشکل ہیں جن کا مقابلہ ماں بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ کرتی ہے۔

---

[1] اس حالت میں حاملہ عورت کو کھٹی اور ترش چیزیں کھانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ (مترجم)

قرآن مجید نے یہاں صرف ماں کی مشکلات کو بیان کیا ہے اور باپ کا تذکرہ نہیں کیا، اس لیے نہیں کہ باپ کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی، کیونکہ ان میں سے بہت سی مشکلات میں باپ بھی ماں کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ ماں کا حصہ زیادہ ہوتا ہے لہٰذا ماں کے تذکرے کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ بقرہ کی ۲۳۳ ویں آیت میں رضاعت (دودھ پلانے) کی مدت پورے دو سال ذکر کی گئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

"والوالدات یرضعن اولادھنّ حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرّضاعۃ"

"مائیں اپنے بچوں کو دو سال مکمل دودھ پلاتی ہیں جو دودھ پلانے کے عرصے کو مکمل کرنا چاہیں"

جب کہ زیر تفسیر آیت میں "حمل اور رضاعت" کی مجموعی مدت صرف تیس ماہ بیان ہوئی ہے، تو کیا حمل کا دورانیہ چھ ماہ ہو سکتا ہے؟

فقہاء اور مفسرین نے اسلامی روایات کی روشنی میں جواب دیا ہے کہ:

جی ہاں! حمل کی کم از کم مدت ۶ ماہ اور مفید رضاعت کا زیادہ سے زیادہ عرصہ ۲۴ ماہ ہو سکتا ہے، حتیٰ کہ "جالینوس" اور ابن سینا" جیسے قدیم اطباء سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے یہ چیز دیکھی ہے کہ بچہ چھ ماہ کی مدت حمل کے بعد بھی پیدا ہوا ہے۔

ضمنی طور پر قرآنی تعبیر سے یہ بات بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ حمل کی مدت سے جس قدر عرصہ کم کیا جائے گا بچے کی رضاعت میں اسی قدر اس کا اضافہ کیا جائے گا تاکہ دونوں عرصہ مل کر تیس ماہ بن جائیں۔ ابن عباس سے بھی یہی بات نقل کی گئی ہے کہ اگر عورت کے حمل کی مدت نو ماہ ہو تو اسے اپنے بچے کو اکیس ماہ دودھ پلانا چاہیئے اور اگر چھ ماہ ہو تو چوبیس مہینے۔

قانون فطرت بھی اسی بات کا متقاضی ہے کیونکہ دوران حمل کی کمی کی تلافی رضاعت کی مدت کے دوران کی جانا چاہیئے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے: انسانی زندگی اسی طرح جاری اور ساری رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ زمانہ پہنچ جاتا ہے جس میں وہ جسمانی طاقت کے لحاظ سے اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے اور چالیس برس کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے (حتّیٰ اذا بلغ اشدہ و بلغ اربعین سنۃ)۔[1]

---

[1] "حتّیٰ" یہاں پر ایک محذوف جملے کے لیے غایت کے طور پر ہے جس کی تقدیری صورت یوں ہے۔

وعاش الانسان واستمرت حیاتہ حتّیٰ اذا بلغ اشدہ۔

بعض مفسرین اسے "وصینا" کی غایت یا "ماں باپ کی اپنے بچے کی نگرانی" کی غایت سمجھتے ہیں اور یہ دونوں احتمالات بعید معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ نہ تو ماں باپ کے ساتھ نیکی کے بارے میں حکم الٰہی چالیس سال تک ختم ہو جاتا ہے اور نہ ہی بچے کے لیے والدین کی دیکھ بھال چالیس سال تک قائم رہتی ہے۔

بعض مفسرین "بلوغ اشد" (انتہائی مرحلے تک پہنچ جانے) کو چالیس سال کے عرصے تک پہنچ جانے سے ہم آہنگ اور اس کی تاکید سمجھتے ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ "بلوغ اشد" اشارہ ہے جسمانی طور پر بالغ ہونے کی طرف اور "بلوغ اربعین سنۃ" (چالیس سال تک پہنچ جانا) فکری اور عقلی طور پر بلوغ کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ مشہور ہے کہ انسان عام طور پر چالیس سال کے سن میں عقل کے کامل ہونے کے مرحلے کو پہنچ جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اکثر و بیشتر انبیاء چالیس برس کے سن میں نبوت پر مبعوث ہوئے۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ جسمانی لحاظ سے قدرت و طاقت تک پہنچنے کا سن بلوغ کونسا ہے؟ اس بارے میں بھی مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ بعض لوگ تو بلوغ کا وہی مشہور سن جانتے ہیں جو سورۂ بنی اسرائیل کی ۳۴ ویں آیت میں مذکور ہوا ہے۔ یتیموں کے بارے میں جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جب کہ بعض روایات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ یہ سن اٹھارہ سال کا ہے۔

البتہ اس بارے میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ یہ تعبیر مختلف مقامات پر مختلف معانی دے جو قرینے سے ظاہر ہوتے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ:

"ان الشیطان یجر یدہ علی وجہ من زاد علی الاربعین ولم یتب، و یقول بابی وجہ لا یفلح"

شیطان اپنا ہاتھ ان لوگوں کے چہرے پر پھیرتا ہے جو چالیس سال کی عمر کو تو پہنچ جاتے ہیں لیکن گناہوں سے توبہ نہیں کرتے اور کہتا ہے میرا باپ قربان جائے اس چہرے پر جو کبھی کامیاب نہیں ہوگا (اور اس انسان کی پیشانی پر کامیابی کا نور نہیں چمک رہا)۔ [۱]

ابن عباس سے منقول ہے:

"من اتی علیہ الاربعون سنۃ فلم یغلب خیرہ شرہ فلیتجھز الی النار"

"جس شخص پر چالیس سال گزر جائیں اور اس کی نیکی اس کی برائی پر غالب نہ آئے اسے جہنم کے لیے آمادہ ہونا چاہیئے"

بہرحال قرآن مجید سلسلہ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ جب یہ لائق اور باایمان شخص چالیس سال کے سن کو پہنچتا ہے تو خدا سے تین چیزوں کی درخواست کرتا ہے، سب سے پہلے تو کہتا ہے۔

خداوندا! مجھے ہدایت عطا فرما اور توفیق دے کہ میں ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائی ہیں۔ (قال رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علیّ وعلی والدیّ)۔ [۲]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ باایمان شخص ایسے سن و سال میں ایک تو خدا کی عطا کردہ نعمتوں کی گہرائی اور گیرائی سے

---

[۱] تفسیر روح المعانی جلد ۲۶ ص۱۶۔

[۲] "اوزعنی" "ایزاع" کے مادے سے ہے، جس کے کئی معانی ہیں۔ (۱) ہدایت کرنا (۲) بے راہ روی سے روکنا۔ (۳) عشق و محبت پیدا کرنا (۴) توفیق دینا۔

آگاہ ہو جاتا ہے اور دوسرے اپنے والدین کی ان خدمات سے اچھی طرح باخبر ہو جاتا ہے جو وہ اس عرصے تک بجا لائے ہیں اور وہ اس عمر کو پہنچا ہے، کیونکہ ایسے سن وسال میں انسان عام طور پر خود بھی صاحب اولاد ہو جاتا ہے اور اپنے والدین کی طاقت فرسا تکالیف اور ایثار پر مبنی خدمات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور بے اختیار انھیں یاد کرتے ہوئے خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔

اپنی دوسری درخواست میں رب العزت کی بارگاہ میں عرض کرتا ہے۔ " خداوندا! مجھے توفیق عطا فرما کہ نیک اعمال بجا لاؤں ایسے اعمال جن سے تو راضی ہو" (وان اعمل صالحا ترضاہ)۔

آخر میں تیسری درخواست ان الفاظ میں پیش کرتا ہے: خداوندا! میری اولاد اور میرے خاندان کو اصلاح کے راستے پر مدام عطا فرما۔ (واصلح لی فی ذریتی)۔

"لی" (میرے لیے) کی تعبیر ضمنی طور پر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میری اولاد کی نیکی اور بہتری اس انداز میں ہو کہ اس کے نتائج مجھے بھی ملیں۔

" فی ذریتی" (میری اولاد میں) کی تعبیر مطلق صورت میں بیان ہوئی ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نیکی اور بہتری کی ہمیشگی اس کے تمام خاندان میں ہو۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ پہلی دعا میں والدین کو شریک کرتا ہے، تیسری میں اولاد کو، لیکن دوسری دعا میں اپنے آپ کو اور صالح انسان کو ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ اگر ایک آنکھ کے ساتھ خود کو دیکھتا ہے تو دوسری کے ساتھ ان لوگوں کو دیکھتا ہے جو اس پر حق رکھتے ہیں۔

اور آیت کے آخر میں ان دو مطالب کو بیان کر رہا ہے جو ایک دوسرے کے لیے مؤثر اور عملی امور ہیں۔ کہتا ہے: پروردگارا! میں اس عمر میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔ (انی تبت الیک)۔

میں ایسے مرحلہ پر پہنچ چکا ہوں کہ جس میں میری زندگی کے خطوط کو متعین ہونا چاہیئے اور آخر العمر تک مجھے اسی طرح برقرار رہنا چاہیئے۔ جی ہاں! میں چالیس سال تک پہنچ چکا ہوں اور میرے جیسے بندے کے لیے کتنی بری بات ہے کہ تیری طرف رجوع نہ کروں اور آب توبہ سے اپنے تئیں گناہوں سے پاک نہ کروں۔

اور یہ بھی کہتا ہے کہ: میں یقیناً فرمانبرداروں میں ہوں (وانی من المسلمین)۔

درحقیقت یہ دونوں جملے ان تین دعاؤں کی پشت پناہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ملا کر ان سب کا مفہوم یوں بنتا ہے کہ: جب میں نے توبہ کر لی ہے اور تیرے حکم کے سامنے غیر مشروط طور پر جھک گیا ہوں تو تو بھی بزرگواری فرما اور ان نعمتوں سے مجھے سرفراز فرما۔

بعد کی آیت میں اس مومن، شکرگزار، صالح العمل اور توبہ کرنے والے گروہ کے اجر اور جزا کا واضح ذکر ہے۔ اس میں تین اہم جزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: یہی تو وہ لوگ ہیں، جن کے بہترین اعمال ہم قبول فرمائیں گے (اولئک الذین نتقبل عنھم احسن ماعملوا)۔

اس سے بڑھ کر اور کیا خوش خبری ہو سکتی ہے کہ خداوند بزرگ وقادر ومنان ایک کمزور اور ناچیز بندے کے اعمال قبول فرمائے جو دوسرے اعزازات کے علاوہ بذاتِ خود ایک عظیم اعزاز اور بلند مرتبہ اور روحانی نعمت ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خداوند عالم تمام نیک اعمال کو قبول فرماتا ہے تو پھر کیوں کہتا ہے کہ "ان کے بہترین اعمال قبول کریں گے"۔

اس سوال کا جواب کچھ مفسرین نے یوں دیا ہے کہ بہترین اعمال سے مراد واجبات اور مستحبات ہیں جو مباحات کے مقابلے میں ہیں اگرچہ وہ نیک اعمال تو ہیں لیکن ان میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ مقبول بھی قرار پائیں اور ان کے ساتھ اجر اور ثواب کا تعلق ہو۔[1]

دوسرا جواب یہ ہے کہ خداوند عالم ان کے بہترین اعمال کو قبولیت کا معیار قرار دیتا ہے حتیٰ کہ دوسرے درجے اور کم اہمیت کے اعمال کو بھی اپنی رحمت اور اپنے فضل وکرم سے پہلے درجے کے اعمال میں شمار کرتا ہے اور یہ بالکل ایسے ہی ہوگا جیسے کوئی خریدار بیچنے والے کی طرف سے مختلف اجناس کو اپنے فضل وکرم سے اعلیٰ جنس کے حساب سے خریدے اور خداوند عالم کے فضل اور اس کے لطف وکرم کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جائے تعجب نہیں ہے۔

خدا کی دوسری مہربانی ان کے گناہوں سے صرفِ نظر ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے: ہم ان کے گناہوں سے درگزر کریں گے۔ (و نتجاوز عن سیّاٰتھم)۔

جبکہ ان کا مقام اہل بہشت میں ہے (فی اصحاب الجنۃ)[2]

خدا کی تیسری مہربانی ان کے ساتھ یہ ہوگی کہ باوجود ان کی لغزشوں کے اللہ تعالیٰ انہیں پاک وصاف کرکے نیک اور پاک لوگوں میں انہیں جگہ دے گا، جو مقربان بارگاہِ رب العزت ہوں گے۔

ضمنی طور پر یہاں اس تعبیر سے یہ استفادہ بھی ہوتا ہے کہ "اصحاب الجنۃ" سے یہاں مراد وہ مقربان بارگاہ ایزدی ہیں جن کے پاکیزہ دامن گناہ ومعصیت کے غبار سے کبھی آلودہ نہیں ہوئے اور توبہ کرنے والے یہ مومن مغفرتِ الٰہی کے بعد ان کے ساتھ اور ان کے زیر سایہ مقام پائیں گے۔

آیت کے آخر میں مذکورہ نعمتوں کی تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے، یہ وہ سچا وعدہ ہے جو ان سے کیا جاتا ہے (وعد الصدق الذی کانوا یوعدون)۔[3]

---

[1] طبرسی نے مجمع البیان میں، علامہ طباطبائی نے المیزان میں، فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اور دوسرے مفسرین نے اسی آیت کے ذیل میں اسی طرح لکھا ہے۔

[2] "فی اصحاب الجنۃ" ایسے محذوف سے متعلق ہے جو "ھم" ضمیر کا حال واقع ہو رہا ہے اور اس کی تقدیری صورت یوں ہے "حال کونھم موجودین فی اصحاب الجنۃ"۔

[3] "وعد الصدق" ایک فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے جو تقدیری طور پر یوں ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۹ پر ملاحظہ فرمائیں)

سچا وعدہ کیوں نہ ہو؛ جب کہ وعدہ خلافی یا تو کسی پشیمانی اور نادانی کی وجہ سے ہوتی ہے یا پھر کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے اور خداوندِ عالم ان سب سے منزہ ومبرّہ ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **بہشتی انسان کی صفات**: یہ آیات ایک ایسے بہشتی مومن کی تصویر کشی کر رہی ہیں جو پہلے تو اپنے جسمانی نشوونما، پھر عقلی کمال کے مرحلے کو طے کرنے کے بعد پروردگارِ عالم کی نعمتوں کے شکرانے اور والدین کی طاقت فرسا تکالیف کا شکریہ ادا کرنے کے مقام تک جا پہنچتا ہے، اپنی لغزشوں سے بر محل توبہ کرتا ہے، اولاد کی تربیت سمیت نیک اعمال کی بجا آوری کا اہتمام کرتا ہے اور آخر کار فرمانِ الٰہی کی تعمیل کے لیے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرکے دُنیا و آخرت کی سربلندی حاصل کر لیتا ہے۔

یہی چیز اس بات کا باعث بن جاتی ہے کہ وہ خداوندِ عالم کی گوناگوں نعمتوں اور اس کی رحمت ومغفرت کے دریا میں ہمیشہ مستغرق رہے۔ ایک بہشتی انسان کو انہی صفات سے پہچانا جا سکتا ہے۔

۲۔ **"ووصینا الانسان"**: (ہم نے انسان کو حکم دیا) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ والدین کے ساتھ نیکی انسانی اصولوں میں سے ایک اصول ہے یہاں تک کہ جو لوگ کسی دین و مذہب کے بھی پابند نہیں ہیں وہ بھی فطری ہدایت کے ذریعے اسی اصول کی پابندی کرتے ہیں۔ بنا بریں جو لوگ اس عظیم فریضے کو ٹھکرا دیتے ہیں وہ نہ صرف صحیح معنوں میں مُسلمان نہیں، بلکہ انہیں انسان کہنا بھی مناسب نہیں ہے۔

۳۔ **"احسانًا" کی تعبیر**: اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ اس قسم کے مقامات پر نکرہ کا استعمال کسی چیز کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حکمِ الٰہی کے تحت ماں باپ کی خدمات کے بدلے میں عظیم اور برجستہ نیکی انجام دینی چاہیئے۔

۴۔ **اولاد کی پرورش میں ماں کی تکالیف** کا تفصیلی ذکر ایک تو اس وجہ سے ہے کہ وہ تکالیف نہایت واضح اور نمایاں ہوتی ہیں اور دوسرے اس لیے کہ ماں کی تکالیف، باپ کی نسبت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ اسی لیے اسلامی روایات میں بھی ماں کے بارے میں زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت حاضر ہو کر عرض کی،

"من ابر؟ قال امك، قال ثم من؟ قال امك، قال ثم من؟ قال امك، قال ثم من؟ قال اباك!"

"یا رسول اللہ! کس شخص کے ساتھ نیکی کروں؟

(باقی حاشیہ ص۱۷۸ کا)

"یدھم وعد الصدق الذی کانوا یوعدون بلسان الانبیاء والرسل"

آپؐ نے ارشاد فرمایا:
اپنی ماں کے ساتھ!
پوچھا: پھر کس کے ساتھ؟
فرمایا:
ماں کے ساتھ!
پوچھا: پھر کس کے ساتھ؟
آپ نے فرمایا:
ماں کے ساتھ!
جب اس نے چوتھی بار سوال کیا تو آپ نے فرمایا:
اپنے باپ کے ساتھ۔[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک شخص نے اپنی بوڑھی ماں کو اپنے کندھوں پر سوار کرکے خانہ کعبہ کا طواف کرایا اور اسی اثنا میں حالت ماںؐ کی خدمت میں پہنچ کر آپؐ سے عرض کی۔

"ھل ادیت حقھا"
"حضور! کیا اس طرح سے میں نے اپنی والدہ کا حق ادا کر دیا ہے"؟
آپؐ نے ارشاد فرمایا۔
"لا، ولا بزفرۃ واحدۃ"
"ہرگز نہیں، تم نے تو ابھی ایک سانس کا حق بھی ادا نہیں کیا۔"[2]

۵۔ **قرآنی آیات میں خاندانی رشتہ:** والدین کے احترام و اکرام اور اولاد کی تربیت کو زبردست اہمیت دی گئی ہے اور مذکورہ بالا آیات میں ان سب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ عظیم انسانی معاشرہ خاندان کی مختلف اور چھوٹی چھوٹی اکائیوں سے تشکیل پاتا ہے، جس طرح ایک عظیم عمارت کئی چھوٹے بڑے کمروں سے اور کمرے مختلف پتھروں اور اینٹوں سے وجود میں آتے ہیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ ان چھوٹی اکائیوں میں باہمی وحدت اور استحکام جتنا زیادہ ہوگا اسی قدر معاشرے کی بنیادیں مستحکم تر ہوں گی۔ ہمارے صنعتی دور کے معاشرے کی تباہی کے اسباب میں سے ایک سبب خاندانی نظام کا بگاڑ ہے کیونکہ نہ تو اولاد اپنے والدین کا احترام کرتی ہے، نہ ہی والدین کو اپنی اولاد سے شفقت کا احساس ہے اور نہ ہی میاں بیوی کے مابین مہر و محبت کا حقیقی رابطہ ہے۔

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۲۶ صفحہ ۱۶۔

[2] فی ظلال القرآن جلد ۷ صفحہ ۱۵۹

آج کے صنعتی معاشرے میں بڑے بوڑھوں کے لیے جداگانہ آرام گاہیں، جن میں ضعیف اور کمزور والدین قیام پذیر ہوتے ہیں، نہایت ہی دردناک مناظر پیش کرتی ہیں کیوں کہ ان قیام گاہوں میں ایسے لوگ اقامت گزیں ہوتے ہیں جو کسی کام کے نہیں رہتے اور خاندان والے انہیں وہیں چھوڑ آتے ہیں۔

وہ زن و مرد جو ایک طویل عرصہ معاشرے کی خدمت انجام دیتے رہتے ہیں اور اپنی اولاد کو معاشرے کی خدمت کے لیے وقف کر چکے ہوتے ہیں جب انہیں اپنی اولاد کی مہر و محبت کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کی امداد کے محتاج ہوتے ہیں تو انہیں بری طرح دھتکار دیا جاتا ہے اور وہ وہیں پر موت کے انتظار میں اپنی زندگی کے باقی دن پورے کرتے رہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں ہمیشہ دروازے پر لگی رہتی ہیں کہ شاید کوئی واقف کار یہاں پر آجاتے اور ایسا اتفاق سال بھر میں شاید ایک یا دو مرتبہ ہی ہوتا ہے کہ کوئی دوست یا واقف شخص بھولے سے وہاں چلا جاتا ہے۔

سچ سچ جب انسان اس قسم کی زندگی کا تصور کرتا ہے تو اسی وقت جینا اس کے لیے دوبھر ہو جاتا ہے اور صرف مادی اور ایمان و مذہب سے عاری "مہذب" دنیا کے راہ و رسم ایسے ہی ہوتے ہیں۔

۶۔ "ان اعمل صالحًا ترضاہ" کا مفہوم: یہ جملہ اس حقیقت کو بیان کر رہا ہے کہ نیک اعمال ایسی چیز ہوتے ہیں جو خداوند عالم کی رضا اور خوشنودی کا موجب ہوتے اور "احسن ما عملوا" (بہترین کام جو انجام دیئے ہیں) کی تعبیر قرآن مجید کی متعدد آیات میں آچکی ہے اور یہ اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ خداوند عالم کا بے حساب فضل و کرم، بندوں کے اجر و ثواب کے موقع پر ان کے بہترین اعمال کو معیار قرار دیتا ہے اور سب اعمال اسی حساب سے قبول کرتا ہے۔

۱۷۔ وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَاۤ اَتَعِدٰنِنِیْۤ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْۚ وَهُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ ﳓ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚۖ فَیَقُوْلُ مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ۝

۱۸۔ اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ فِیْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِیْنَ ۝

۱۹۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِیُوَفِّیَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۷۔ اور جو شخص اپنے ماں باپ سے کہتا ہے کہ تم پر اُف! کیا تم مجھے وعدہ دیتے ہو کہ میں قیامت کے دن اُٹھایا جاؤں گا؟ حالانکہ بہت سے لوگ مجھ سے پہلے گزر چکے (اور ہرگز نہیں اُٹھائے گئے) اور وہ دونوں ہمیشہ فریاد کرتے اور خدا سے مدد طلب کرتے رہتے ہیں کہ تجھ پر وائے ہو ایمان لے آ۔ کیونکہ خدا کا وعدہ ضرور سچا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ یہ تو بس اگلے لوگوں کے افسانے ہیں۔

۱۸۔ یہ لوگ بھی جنوں اور انسانوں کی انہی (کافر) امتوں میں شامل ہیں جو ان سے پہلے گذر چکی ہیں اور جن کے بارے میں عذاب کا وعدہ پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے، کیونکہ یہ سب لوگ گھاٹا اٹھانے والے تھے۔

۱۹۔ اور لوگوں نے جیسے کام کیے ہوں گے انہی کے مطابق سب کے درجے ہوں گے تاکہ خدا انھیں ان کے اعمال بے کم وکاست سپرد کردے اور ان پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تفسیر

والدین کے حقوق پائمال کرنے والے

گذشتہ آیات میں ان مومن لوگوں کا تذکرہ تھا جو ایمان، عمل صالح، حق کی نعمتوں کے شکرانے اور والدین اور اولاد کے حقوق کی ادائیگی کے ذریعے تقرب الٰہی کی راہوں پر گامزن ہوئے ہیں اور اس کے خاص لطف وکرم سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ لیکن زیر تفسیر آیات میں ان لوگوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے جو بالکل ان کے برعکس ہیں یعنی بے ایمان، حق ناشناس اور ماں باپ کے نافرمان لوگ۔ ارشاد ہوتا ہے:

اور جو شخص اپنے ماں باپ سے کہتا ہے: تم پر اُف! کیا تم مجھے وعید دیتے ہو کہ میں قیامت کے دن اُٹھایا جاؤں گا حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سے لوگ گزر چکے ہیں جو مر گئے، لیکن دوبارہ ہرگز نہیں اُٹھائے گئے۔ (والذی قال لوالدیه اف لکما اتعدانني ان اخرج وقد خلت القرون من قبلي)۔[1]

لیکن والدین ایسے سرپھرے بیٹے کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے: اور وہ دونوں ہمیشہ فریاد کرتے ہیں اور خدا سے مدد طلب کرتے ہیں کہ اسے بیٹا! تجھ پر افسوس ہے، ایمان لے آ، کیونکہ خدا کا وعدہ ضرور سچا ہے: (وهما يستغيثان الله ويلك اٰمن ان وعد الله حق)۔

مگر وہ ہے کہ اسی طرح اپنی ہٹ دھرمی پہ قائم رہتا ہے اور اپنی سرکشی پر ڈٹا رہتا ہے۔ وہ تکبر اور بڑی بے پرواہی

---

[1] "والذی قال ......" مبتدا ہے اور بہت سے مفسرین کے مطابق "اولٰئك الذین ......" اس کی خبر ہے جو بعد کی آیت میں آئی ہے۔ "مبتدا" کے مفرد اور "اولٰئك" کے جمع ہونے میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے، کیونکہ اس سے جنس مراد ہے۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اس کی خبر محذوف ہو، جس کی تقدیری صورت یوں ہو:

"وفي مقابل الذين مضى وصفهم الذي قال لوالديه"

تو ایسی صورت میں بعد کی آیت مستقل ہے جس طرح کہ "اولٰئك الذين نتقبل عنهم ...." مستقل ہے۔

سے کہتا ہے، یہ تو بس اگلے لوگوں کے افسانے ہیں" (فیقول ما ھذا الا اساطیر الاولین)۔
یہ جو تم کہتے ہو کہ معاد و قیامت ہوگی اور حساب و کتاب ہوگا یہ سب خرافات ہیں اور گئے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں، میں ان کے سامنے کبھی سر نہیں جھکاؤں گا۔

اس آیت میں اس گروہ کے بارے میں جو اوصاف معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں :

والدین کے حق میں بے احترامی اور بے ادبی، کیونکہ "اُف" ہر غلیظ اور آلودہ چیز کو کہتے ہیں اور توہین اور حقارت کے اظہار کے موقع پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔[1]

نیز بعض ارباب لغت کے نزدیک "اُف" کا معنی وہ گندگی اور میل کچیل ہے جو ناخن کے نیچے اکٹھی ہو جاتی ہے جو گندی بھی ہوتی ہے اور حقیر بھی۔[2]

دوسری یہ کہ وہ معاد اور روز قیامت پر ہی ایمان نہیں رکھتے، بلکہ اس کا مذاق بھی اڑاتے ہیں اور اسے افسانہ اور خرافاتی باتیں سمجھتے ہیں۔

ان کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ ان کے پاس سننے والے کان نہیں ہیں۔ وہ حق کے سامنے سر نہیں جھکاتے بلکہ ان کی روح غرور، جہالت اور خود غرضی سے لبریز ہوتی ہے۔

یقیناً دل سوز ماں باپ کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اسے جہالت و نادانی کے گرداب سے نکال کر نجات کی راہوں پر لگا دیں تاکہ یہ فرزند دلبند خدا کے دردناک عذاب میں گرفتار نہ ہو، لیکن وہ ہے کہ مسلسل اپنے کفر پر ڈٹا ہوا ہے اور اسی پر مصر ہے آخر کار ناچار وہ اسے چھوڑ دیتے ہیں۔

جس طرح گزشتہ آیات میں صالح الاعمال مومنین کی جزا کا تذکرہ تھا، اسی طرح یہاں پر گستاخ اور عقل کے اندھے کافروں کا انجام مذکور ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، یہ لوگ جنوں اور انسانوں کی دوسری کافر امتیں جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں، ان ہی میں شامل ہیں۔ ان پر بھی عذاب کا وعدہ پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے اور یہ بھی دردناک عذاب میں گرفتار ہوں گے اور یہ بھی جہنمی ہیں۔ (اولئک الذین حق علیھم القول فی امم قد خلت من قبلھم من الجن والانس)۔[3]

کیونکہ وہ سب لوگ گھاٹا اٹھانے والے تھے (انھم کانوا خاسرین)۔

---

[1] مفردات راغب۔

[2] "اُف" کے بارے میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۲۳ کے ذیل میں ایک اور بحث بھی موجود ہے۔ (دیکھئے تفسیر نمونہ جلد ۱۲)

[3] "حق علیھم القول" کا جملہ اس گفتگو کی طرف اشارہ ہے، جو خدا نے کافروں اور گناہگاروں کی سزا کے بارے میں فرمائی ہے اور تقدیری طور پر یوں ہے۔

• حق علیھم القول بانھم اھل النار۔۔۔۔

اور" فی امم حال واقع ہوا ہے۔

اس سے بدتر گھاٹا اور کیا ہوگا کہ اپنا تمام سرمایہ حیات ضائع کرکے خدا کے غیظ و غضب کو خرید چکے ہیں۔

ان دونوں، بہشتی اور جہنمی گروہوں کے تقابل کی صورت میں ان آیات سے ہمیں مندرجہ ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

- بہشتی افراد اپنی ہدایت اور ارتقاء کے مراحل طے کرتے ہیں جبکہ اہل جہنم اپنا تمام سرمایہ لٹا کر خسارہ اٹھاتے ہیں۔
- وہ حق شناس اور شکرگزار ہیں حتیٰ کہ اپنے والدین کے بھی، لیکن یہ حق ناشناس، گستاخ اور بے ادب ہیں حتیٰ کہ اپنے والدین کے بھی۔
- وہ بہشت میں "مقربین الٰہی" کے ساتھ ہیں اور یہ دوزخ میں بے ایمان لوگوں کے زمرے میں گویا۔

  کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

- وہ جب کسی لغزش کا شکار ہوتے ہیں تو فوراً توبہ کرکے حق کے آگے جھک جاتے ہیں لیکن یہ مغرور و سرکش اور خودغرض و مست و متکبر ہوتے ہیں۔
- یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ ہٹ دھرم ٹولہ اپنی بے راہ روی کو گزشتہ اقوام کی کیفیت کا آئینہ دار قرار دیتا ہے۔ لہٰذا دوزخ میں بھی انہی کے ساتھ محشور ہوگا۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں پہلے قرآن دونوں گروہوں کے مختلف درجات اور مراتب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ان لوگوں نے جیسے کام کیے ہوں گے انہی کے مطابق سب کے درجے ہوں گے (و لکل درجات مما عملوا)[1]

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ بہشتی یا جہنمی سب ایک ہی درجے پر فائز ہوں، بلکہ وہ بھی اپنے اعمال کے تفاوت، خلوص نیت کے تناسب اور معرفت کے میزان کے لحاظ سے مختلف مقام رکھتے ہیں اور صحیح معنوں میں عدالت یہیں پر حکم فرما ہے۔

"درجات" "درجہ" کی جمع ہے جو عام طور پر اس زینے کو کہا جاتا ہے جس سے اوپر چڑھا جاتا ہے اور "درکات" "درک" (بروزن "مرگ") کی جمع ہے جو ان سیڑھیوں کو کہا جاتا ہے جن سے نیچے اترا جاتا ہے۔ لہٰذا بہشتیوں کے لیے "درجات" اور جہنمیوں کے لیے "درکات" کے کلمات استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن زیر تفسیر آیت میں دونوں کا یکجا تذکرہ ہوا ہے اور اہل بہشت کے مقام کی اہمیت کے پیش نظر دونوں کے لیے "درجات" کا لفظ آیا ہے اور اصطلاحی طور پر "غلبہ" کے باب سے ہے۔[2]

پھر فرمایا گیا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے "تاکہ خدا انہیں ان کے اعمال بے کم و کاست دے دے" (ولیوفیھم اعمالھم)۔

---

[1] "مما عملوا" میں "من" "نشویہ" ہے یا پھر تعلیل کے معنی میں ہے یعنی "من اجل ما عملوا"۔

[2] "درک" (را کے سکون کے ساتھ) اور "درک" (را پر زبر کے ساتھ) انتہائی گہرائی کے معنی کے لیے آتے ہیں اور کبھی درک (زبر کے ساتھ) نقصان کے معنی میں اور "درک" (سکون کے ساتھ) چیز کے سمجھنے اور ادراک کرنے کے معنی میں بھی آتے ہیں (شاید کسی چیز کی حقیقت اور گہرائی کی مناسبت سے)

یہ تعبیر "تجسم اعمال" کے مسئلے کی طرف ایک اور اشارہ ہے کہ وہاں پر انسان کے اعمال خود اسی کے ساتھ ہوں گے۔ اس کے نیک اعمال اس کے لیے رحمت اور اطمینان کا موجب بنیں گے اور برے عمل بلا، اضطراب، رنج اور عذاب کا سبب۔

آخر میں تاکیدی طور پر فرمایا گیا ہے: اور ان پر کچھ ظلم نہیں کیا جائے گا (وھم لا یظلمون)۔

کیونکہ وہ اپنے ہی اعمال کو پالیں گے تو پھر ظلم و ستم کا تصور کیسا؟

اس کے علاوہ ان کے "درجات" اور "درکات" بھی اچھی طرح مقرر کیے جا چکے ہیں اور ان کا چھوٹے سے چھوٹا نیک یا بد عمل بھی ان کی سرنوشت کے لیے مؤثر ہوگا۔ تو پھر ظلم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ آیت بنی اُمیہ کی طرف کیسے تحریف کی گئی؟

ایک روایت میں ہے کہ معاویہ نے اپنے مدینہ کے گورنر مروان کو خط لکھا کہ لوگوں سے اس کے بیٹے یزید کے لیے بیعت لے۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر بھی اسی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا: معاویہ یہ کام ہرقل اور کسریٰ (روم و ایران کے بادشاہوں) کے مانند انجام دینا چاہتا ہے کہ وہ بھی اپنے بیٹوں کو (خواہ وہ کتنا ہی نا اہل اور بدکار ہوتے) اپنا جانشین مقرر کرتے تھے۔

مروان نے منبر سے چلا کر کہا: خاموش رہو، تم تو وہی ہو جس کے بارے میں یہ آیت اتری ہے: "والذی قال لوالدیہ اف لکما"۔

حضرت عائشہ بھی وہیں پر موجود تھیں۔ مروان کی طرف منہ کرکے بولیں: "تم جھوٹ بکتے ہو، میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اگر کہو تو تمہیں اس کے نام و نسب سے بھی آگاہ کردوں! البتہ رسول اللہ نے تمہارے باپ پر اس وقت لعنت کی ہے جب تم ابھی اس کی پشت میں تھے، اس لیے تم رسولِ خدا کی لعنت کا نتیجہ ہو۔"[1]

جی ہاں! عبدالرحمٰن کا گناہ ایک تو یہ تھا کہ وہ امیرالمومنین علیہ السلام سے محبت کیا کرتے تھے، جو بنی امیہ کے لیے سخت ناگوار بات تھی۔ دوسرے وہ خلافت کو موروثی بنانے اور اسے ملوکیت میں تبدیل کرنے کے سخت مخالف تھے اور یزید کے لیے بیعت طلبی کو قیصر و کسریٰ کی پالیسی کا نام دیتے تھے۔ اسی لیے اسلام کے قسم خوردہ دشمنوں یعنی بنی امیہ کی طرف سے ان پر اس قسم کے شدید حملے کیے گئے اور ان کے بارے میں آیاتِ قرآنی کے معانی کی تحریف کی گئی۔

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر روح الجنان ابوالفتوح رازی جلد ۱۰ ص ۱۵۹۔ نیز قرطبی نے بھی اس روایت کو کچھ فرق کے ساتھ اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو جلد ۹ ص ۶۰۱۰۔

حضرت عائشہ نے مروان کو کیا خوب جواب دیا کہ "خدا نے تم پر اس وقت لعنت کی ہے جب تم ابھی پشت پدر میں تھے" اور یہ اشارہ ہے سورۂ بنی اسرائیل کی ۶۰ ویں آیت کی طرف جس میں کہا گیا ہے "والشجرۃ الملعونۃ فی القرآن"۔[1]

---

[1] اس آیت کی تفسیر کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱۲ کی طرف رجوع فرمائیں نیز یہ بھی توجہ رہے کہ مروان، حکم کا بیٹا، ابی العاص کا [illegible] ایسا پڑپوتا تھا۔

۲۰۔ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۖ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۰۔ جس دن کافر لوگ جہنم کے سامنے لائے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا، تم تو اپنی دنیاوی زندگی میں مزے لوٹ چکے ہو اور اس سے بہرہ مند ہو چکے ہو، تو آج تمھیں ذلت بار عذاب سے سزا دی جائے گی اس لیے کہ تم زمین میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس لیے بھی کہ تم گناہوں کا ارتکاب کرتے تھے۔

تفسیر

زهد اور آخرت کا ذخیرہ :

کفار و مجرمین کی سزا کے بارے میں یہ آیت بھی گزشتہ آیات کے مانند اسی سلسلے کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کر رہی ہے اور ان کے جسمانی اور روحانی عذاب کے چند گوشوں کو اُجاگر کر رہی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :

جس دن کافر لوگ جہنم کے سامنے لائے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ تم اپنی دنیاوی زندگی میں مزے لوٹ چکے ہو اور اس سے بہرہ مند ہو چکے ہو، تو آج تم کو ذلت بار عذاب سے سزا دی جائے گی اس لیے کہ تم زمین میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس لیے بھی کہ تم گناہوں کا ارتکاب کرتے تھے۔ (و یوم یعرض الذین

کفروا علی النار اذھبتم طیبٰتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بھا فالیوم تجزون عذاب الھون بما کنتم تستکبرون فی الارض بغیر الحق و بما کنتم تفسقون)۔ ؎۱

جی ہاں! تم لذتوں میں غرق تھے اور اس دُنیا کی مادی نعمتوں سے بہرہ برداری کے علاوہ تم اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ اور مادر پدر آزادی کی بنار پر تم معاد کا انکار کرتے تھے تاکہ تمہارے ہاتھ بالکل کھلے رہیں اور دُنیاوی نعمتوں کے حصُول میں تم دوسروں پر ہر طرح کا ظلم وستم روا رکھتے تھے لہٰذا آج تم ان تمام ہوسرانیوں، خواہشات پرستیوں، ظلم وتکبر اور فسق و فجور کی سزا پاؤ۔

چند اہم نکات

۱۔ کفار کا جہنم کو پیش کیا جانا: یہ آیت کہتی ہے کہ قیامت کے دن کفار جہنم کو پیش کیے جائیں گے اور اس سے ملتی جلتی سورۂ مؤمن کی ۴۶ ویں آیت ہے جو فرعون کے ساتھیوں کے بارے میں کہتی ہے:

"النار یعرضون علیھا غدوًا وعشیًا"

"ہر صبح وشام وہ جہنم کو پیش کیے جاتے ہیں"

جب کہ قرآن پاک کی بعض دوسری آیات میں ہے کہ جہنم "کفار کو پیش کی جائے گی، جیسا کہ سُورۂ کہف کی آیت ۱۰۰ میں ہے:

"وعرضنا جھنم یومئذ للکافرین عرضًا"

"اس دن ہم جہنم کو کافروں کیلئے پیش کریں گے۔"

لہٰذا بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ پیشی دو طرح کی ہے ایک تو حساب وکتاب سے پہلے پیشی اس وقت جہنم کو کفار کے سامنے لایا جائے گا تاکہ اس طرح سے خوف وہراس ان کے تمام وجود میں سما جائے (جو بجائے خود ایک رُوحانی عذاب ہے) اور دوسری حساب وکتاب اور انہیں جہنم کی طرف بھیجنے کے بعد کی پیشی تو اس وقت وہ خود عذاب جہنم کو پیش کیے جائیں گے۔ ؎۲

بعض مفسرین یہ بھی کہتے ہیں کہ عبارت میں ایک طرح کا "قلب" پایا جاتا ہے اور کفار کو جہنم کے لیے پیش کرنے سے مراد وہی جہنم کو کفار کے لیے پیش کرنا ہے، کیونکہ آگ میں عقل وشعور تو پایا نہیں جاتا کہ اسے کفار کے لیے پیش کیا جائے

؎۱ "یوم" ظرف ہے اور ایک محذوف فعل سے متعلق ہے جو بعد کے جملے سے سمجھا جاتا ہے اور تقدیری طور پر یُوں ہے:

"ویوم یعرض الذین کفروا علی النار یقال لھم اذھبتم طیبٰتکم ......"

؎۲ تفسیر المیزان جلد ۱۸ صفحہ ۲۱۱ انہی آیات کے ذیل میں۔

اور پیشی کا اطلاق ایسی صورت میں ہوتا ہے جب مد مقابل میں شعور پایا جاتا ہو۔

لیکن اس نظریئے کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ قرآن کی کچھ آیات میں جہنم کے لیے ایک طرح کے ادراک اور شعور کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا کے اس سے باتیں کرنے کا ثبوت بھی پایا جاتا ہے۔

چنانچہ خدا اس سے پوچھے گا کہ:

"ھل امتلأتِ"

"کیا تو بھر گئی ہے"

تو وہ جواب دے گی،

"ھل من مزید"

"آیا اور بھی کچھ ہے؟"

(ملاحظہ ہو سورۂ ق / ۳۰)

حق یہ ہے کہ "پیش کرنے" کی حقیقت یہ ہے کہ دو چیزوں کے درمیان موجود رکاوٹوں کو اس حد تک دُور کیا جائے کہ ایک چیز دوسری چیز کے اختیار میں آجائے۔ کفار اور دوزخ کے بارے میں بھی یہی صورتِ حال ہے کہ ان دونوں کے درمیان موجود رکاوٹیں ہٹادی جائیں گی۔ لہٰذا ایسی صورت میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انہیں آگ کے سامنے لایا جائے گا اور آگ کو ان کے سامنے لایا جائے گا۔ اور دونوں تعبیریں صحیح ہیں۔

اس صورت میں اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ "پیش کیے جانے" کو جہنم میں داخل ہونے کے معنی میں لایا جائے جیسا کہ طبرسی نے مجمع البیان میں ذکر کیا ہے، بلکہ یہ پیشی بھی بذاتِ خود دردناک اور ہولناک عذاب کی طرح ہے جو کہ جہنم میں داخل ہونے سے قبل اہلِ جہنم اس کے تمام حصوں کو باہر سے بچشم خود دیکھ لیں گے اور اپنے منحوس انجام کا مشاہدہ کرلیں گے اور دل ہی دل میں رنج اٹھائیں گے۔

۲۔ "اذھبتم طیباتکم" کا مفہوم: یہ جملہ دنیاوی لذتوں کے استفادے کے معنی میں ہے اور "اذھبتم" (تم لے گئے) کی تعبیر اس لیے ہے کہ یہ لذتیں اور نعمتیں استعمال کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔

یقیناً اس دُنیا میں خدا کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھانا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ جو بات بُری ہے وہ یہ ہے کہ انسان اِن مادی لذتوں میں مگن ہو کر خدا اور قیامت کو فراموش کردے یا گناہ آلود اور بے مہار ہو کر ان لذتوں سے بہرہ برداری کی جائے اور دوسروں کے حقوق غصب کیے جائیں یہ سب کچھ اسی زمرے میں آجاتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہ تعبیر قرآن مجید میں صرف اسی آیت میں دکھائی دیتی ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی انسان دنیاوی لذتوں سے چشم پوشی کر لیتا ہے یا خدائی فرائض کی بجا آوری کے لیے توانائی حاصل کرنے کی حد تک ہی ان سے استفادہ کرتا ہے تو ایسی صورت میں گویا وہ ان "طیبات" کو اپنی آخرت کے لیے ذخیرہ کرلیتا ہے۔

لیکن عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ چوپاؤں کے مانند بے مہار ہو کر ان سے استفادہ کرتا ہے اور سب کو اسی دُنیا ہی

میں ختم کرکے آخرت کی راہ لیتا ہے اور آخرت کے لیے کچھ بھی ذخیرہ نہیں کرتا بلکہ اُلٹا گناہوں کا بوجھ اپنے لیے فراہم کرتا ہے تو اس صورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآنی آیت کا اطلاق یوں ہوگا کہ " اذھبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا "

لغت کی بعض کتابوں میں منقول ہے کہ اس جملے سے مراد یہ ہے۔

" انفقتم طیبات ما رزقتم فی شھواتکم و فی ملاذ الدنیا ولم تنفقوھا فی مرضات اللہ "

" تمھیں جو پاکیزہ رزق عطا کیا گیا اسے تم نے اپنی خواہشاتِ نفسانی کی راہوں میں خرچ کر ڈالا اور خدا کی خوشنودی کے لیے اسے خرچ نہیں کیا " (مجمع البحرین مادہ " ذھب ")

۳۔ "طیبات" کا وسیع مفہوم : اس کا معنی وسیع ہے اور تمام دُنیاوی نعمتوں پر محیط ہے۔ ہر چند کہ بعض مفسرین نے اسے صرف جوانی کی توانائیوں کے معنی میں تفسیر کیا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ جوانی اس کا صرف ایک مصداق ہو سکتا ہے۔

۴۔ " عذاب الھون " (حقارت و توہین آمیز عذاب) ردِ عمل ہے ان کے زمین پر تکبر کرنے کا، کیونکہ خدائی سزا گناہ کی نوعیت سے بالکل ہم آہنگ ہوتی ہے، جن لوگوں نے اللہ کی مخلوق یہاں تک کہ اس کے انبیاء کے سامنے غرور و تکبر کا مظاہرہ کیا اور کسی قانون کے سامنے نہ جھکے انہیں ایسا تحقیر آمیز اور رسواکن عذاب دیکھنا ہی چاہیئے۔

۵۔ اہلِ جہنم کے دو گناہوں کا تذکرہ : آیت میں ان کے دو گناہوں کا ذکر ہے۔ ایک تو " زمین میں غرور " اور دوسرے " فسق "۔ ممکن ہے کہ پہلا ان کے آیاتِ الٰہی، بعثت انبیاء اور قیامت پر ایمان نہ لانے کی طرف اشارہ ہو اور دوسرا مختلف گناہوں کی طرف تو گویا ایک اصول دین کے ترک کرنے اور دوسرا فروع دین کے پائمال کرنے کی بات ہے۔

۶۔ "غیر الحق" کی تعبیر : یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ استکبار کی دو قسمیں ہیں ایک " حق " اور دوسری " ناحق " بلکہ اس قسم کی تعبیر عام طور پر تاکید کے لیے استعمال ہوتی ہے اور اس کی مثالیں عام ہیں۔

۷۔ عظیم پیشواؤں کا زہد : حدیث اور تفسیر کے مختلف ذرائع میں اسلام کی عظیم ہستیوں کے بارے میں بہت سی روایات نقل کی گئی ہیں، جن کے ذریعے اسی آیت کے بارے میں استناد کیا گیا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک دن حضرت عمر " مشربہ ام ابراھیم " (مدینہ کے نزدیک ایک مقام) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آنحضرت کھجور کی ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور بدن مبارک کا کچھ حصہ زمین پر ہے اور کھجور کے پتوں کا ایک تکیہ سر کے نیچے ہے۔ یہ دیکھ کر آپ پر سلام کیا اور بیٹھ گئے عرض کرنے لگے :

" آپ اللہ کے رسول اور اس کی بہترین مخلوق ہیں قیصر و کسریٰ تو طلائی تختوں اور ریشمی بستروں پر سوئیں اور آپ کی یہ حالت ہو؟

آنحضرت نے فرمایا :

" اولٰئک قوم عجلت طیباتھم وھی وشیکۃ الانقطاع وانما اخرت لنا طیباتنا "

"وہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کے طیبات اسی دنیا میں دے دیئے گئے ہیں جو جلد ختم ہو جائیں گے۔
جبکہ ہمارے طیبات کو آخرت کے لیے ذخیرہ کر لیا گیا ہے۔[1]

ایک اور روایت میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ ایک دن خاص قسم کا حلوہ آنجناب کی خدمت میں لایا گیا تو آپؑ نے اسے نوش فرمانے سے انکار کر دیا۔ پوچھا گیا "آیا آپ اسے حرام جانتے ہیں؟" فرمایا نہیں۔

"ولکنی اخشی ان تتوق الیہ نفسی فاطلبہ، ثم تلا ھذہ الآیۃ: اذھبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بھا"

"مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ میرا نفس اس کا مشتاق ہو جائے اور میں ہمیشہ اس کی طلب میں لگ جاؤں۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی اذھبتم طیباتکم ......[2]

ایک اور روایت میں ہے کہ:

ان امیر المؤمنین علیہ السلام اشتھی کبدًا مشویۃ علی خبز لینہ فاقام حولا یشتھیھا، ذکر ذالک للحسنؑ وھو صائم یومًا من الایام فصنعھا لہ فلما اراد ان یفطر قربھا الیہ، فوقف سائل بالباب فقال یا بنی! حملھا الیہ لاتقرأ صحیفتنا غدًا اذھبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بھا؛

"امیر المومنین علی علیہ السلام کا بھنی ہوئی کلیجی کو نرم روٹی کے ساتھ کھانے کو جی چاہا اور اس خواہش کو ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ ایک دن امام حسن علیہ السلام سے اس خواہش کی تکمیل کا اظہار فرمایا اور اس دن حضرت امیرؑ روزے سے تھے۔ جب مذکورہ کھانا افطار کے وقت تیار ہو گیا تو سائل نے آکر دروازے پر دستک دی، امیر المومنینؑ نے حکم دیا یہ کھانا سائل کو دے دیا جائے مبادا کل بروز قیامت جب ہمارا نامۂ اعمال پڑھا جائے تو ہم سے کہیں "اذھبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بھا۔ (تم تو اپنی طیبات سے دنیا میں بہرہ ور ہو چکے ہو۔ اور ان سے لذت اٹھا چکے ہو)۔[3]

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص۸۷۔

[2] تفسیر برہان جلد ۴ ص۱۷۸ اسی آیت کے ذیل میں۔

[3] سفینۃ البحار جلد ۲ مادہ "کبد"

۲۱۔ وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖۤ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○

۲۲۔ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○

۲۳۔ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ○

۲۴۔ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ؕ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ؕ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ○

۲۵۔ تُدَمِّرُ كُلَّ شَیْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ○

ترجمہ

۲۱۔ قوم عاد کے بھائی (ہود کی داستان) انہیں یاد دلا۔ جب انہوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف میں ڈرایا، جبکہ ان سے پہلے بہت سے ڈرانے والے انبیاء ماضی قریب

اور بعید میں گزر چکے تھے (ہود نے قوم سے کہا) خدائے واحد کے سوا کسی کو عبادت نہ کرو، میں تمہارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

۲۲۔ وہ بولے، کیا تو اس لیے آیا ہے کہ (جھوٹ اور فریب کے ذریعے) ہمیں ہمارے معبودوں سے پھیر دے۔ اگر تو سچ کہتا ہے تو جس عذاب کی ہمیں دھمکی دیتا ہے اُسے لے آ۔

۲۳۔ (ہود نے) کہا، علم تو بس خدا کے پاس ہے (اور وہی جانتا ہے کہ کب تمہیں سزا دیدے) اور میں جو احکام دے کر بھیجا گیا ہوں وہ تمہیں پہنچاتے دیتا ہوں۔ (میرا کام صرف یہی ہے) لیکن میں تمہیں ہمیشہ جہالت میں پڑی رہنے والی قوم دیکھتا ہوں۔

۲۴۔ جب انہوں نے اسے بادل کی صورت میں دیکھا کہ ان کے دروں اور ندی نالوں کی طرف اُمڈا آرہا ہے (تو خوش خوشی) کہنے لگے یہ تو بارش برسانے والا بادل ہے (لیکن ان سے کہا گیا) یہ وہی چیز ہے جس کے آنے کی تم جلدی مچا رہے تھے۔ (یہ) وحشت ناک آندھی ہے جو دردناک عذاب کی حامل ہے۔

۲۵۔ جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہر چیز کو تباہ و برباد کر دے گی۔ تو صبح ہوئی تو ان کی حالت یہ تھی کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ہم گناہگار لوگوں کو یونہی سزا دیا کرتے ہیں۔

تفسیر

قومِ عاد اور تباہ کن آندھی

قرآن مجید کلی حقائق کو بیان کرنے کے بعد ان کے قابلِ ذکر مصداق بیان کرتا ہے تاکہ وہ کلی حقائق سامنے آجائیں۔ لہٰذا یہاں پر بھی سرکش متکبرین اور ہوس پرست متکبرین کے احوال کی وضاحت قوم عاد کی مثال سے لی گئی ہے جو ایک واضح نمونہ ہے، ارشاد ہوتا ہے مکہ کے ان مشرکین کو قوم عاد کے بھائی (ہود) کی سرگزشت یاد دلا (واذکر اخا عاد)۔

"اخ" (بھائی) کی تعبیر اس عظیم پیغمبر کی اپنی قوم کے ساتھ نہایت ہی دل سوزی اور اس کے ساتھ نہایت ہی محبت کو بیان کر رہی ہے، جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ تعبیر بہت سے عظیم انبیاء کے بارے میں قرآن مجید میں استعمال ہوئی ہے وہ اپنی قوم کے لیے دل سوز اور مہربان بھائی تھے اور انہوں نے ان کے لیے کسی ایثار سے کبھی دریغ نہیں کیا۔

ممکن ہے یہ تعبیر ضمنی طور پر ان کی اپنی قوموں سے رشتہ داری کی طرف بھی اشارہ ہو۔

پھر فرمایا گیا ہے، جب انہوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف میں ڈرایا، جب کہ ان سے پہلے ماضی قریب اور بعید میں بہت سے انبیاء گزر چکے تھے، جنہوں نے اپنی قوم کو ڈرایا تھا (اذ انذر قومہ بالاحقاف وقد خلت النذر من بین یدیہ و من خلفہ)۔

"احقاف" کے متعلق ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ اس کا معنی وہ اُڑنے والی ریت ہے جو ہواؤں کے ذریعے جنگلوں اور بیابانوں میں مستطیل اور کج صورت میں ڈھیروں کی صورت میں جمع ہوتی رہتی ہے اور اس تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ قوم عاد کا علاقہ ایک بہت بڑا ریگستان تھا۔

بعض لوگ اس کا محل وقوع جزیرہ نمائے عرب کے دل یعنی "نجد"، "احساء"، "حضرموت" اور "عمان" کے درمیان کا علاقہ قرار دیتے ہیں۔[1]

لیکن یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے، کیونکہ دوسری قرآنی آیات (مثلاً سورۂ شعراء) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد ایسی جگہ رہتی تھی جہاں پانی کی فراوانی تھی اور خوبصورت درخت موجود تھے اور جزیرہ نمائے عرب میں ایسی چیز بہت بعید ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے اسے جزیرہ نمائے عرب کے جنوب میں بتایا ہے جو یمن کے اطراف میں یا بحیرہ

---

[1] اعلام قرآن ص ۱۰۶

عرب کے ساحلوں پر تھی ۔[1]

بعض حضرات کا خیال یہ بھی ہے کہ "احقاف" سرزمین عراق میں کلاہ اور بابل کے علاقوں میں سے ایک علاقہ ہے۔[2]

"طبری" کہتے ہیں کہ شام میں "احقاف" نامی ایک پہاڑ ہے ۔[3]

لیکن "احقاف" کے لغوی معنی کی مناسبت اور اس چیز کے پیش نظر کہ ان کی سرزمین چلنے والی ریت سے غیر محفوظ ہونے کے باوجود پانی کی دولت سے مالا مال اور درختوں سے سرسبز تھی ان لوگوں کے قول کو زیادہ تقویت حاصل ہوتی ہے کہ یہ سرزمین جزیرہ نمائے عرب کے جنوب اور یمن کے نزدیک تھی ۔

"وقد خلت النذر من بین یدیہ ومن خلفہ" (ڈرانے والے انبیاء جو ہود علیہ السلام کے آگے پیچھے آ چکے تھے) یہ ان انبیاء کی طرف اشارہ ہے جو ان سے پہلے مبعوث ہو چکے تھے، کچھ تو بہت کم مدت کے فاصلے سے آئے تھے، جن کے بارے میں قرآن نے "من بین یدیہ" کہا ہے اور کچھ بہت زیادہ مدت کے فاصلے سے کہ جنہیں "من خلفہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لیکن بعض حضرات نے جو یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس جملے سے مراد وہ انبیاء ہیں جو ہود سے پہلے گزر چکے تھے یا ہودؑ کے بعد آئے تھے، بہت ہی بعید معلوم ہوتا ہے اور "قد خلت" سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے جو زمانہ ماضی کا معنی دیتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس عظیم پیغمبر کی نبوت کن امور پر مبنی تھی ؟ قرآن کہتا ہے :

(ہود نے اُن سے کہا) خدائے واحد کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔ (الا تعبدوا الا اللہ)۔

پھر انھیں متنبہ کرتے ہوئے مزید کہا: میں تمہارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں (انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم)۔

اگرچہ "یوم عظیم" کے الفاظ عام طور پر قیامت کے دن کے معنی میں آئے ہیں، لیکن قرآنی آیات میں کبھی ان وحشت ناک اور سخت ایام پر بھی اس کا اطلاق کیا گیا ہے جو امتوں پر گزر چکے ہیں۔ اور یہاں پر بھی یہی معنی مراد ہیں، کیونکہ ہم انہی آیات میں آگے چل کر پڑھیں گے کہ آخر کار قوم عاد ایک سخت اور وحشتناک روز خدائی عذاب میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد ہو گئی۔

لیکن اس ہٹ دھرم اور سرکش قوم نے خدا کی اس دعوت کے مقابلے کی ٹھان لی اور حضرت ہودؑ سے اس قوم کے افراد بولے، کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں جھوٹ اور فریب کے ذریعے ہمارے خداؤں سے پھیر

---

[1] فی ظلال القرآن، انہی آیات کے ذیل میں۔

[2] مرحوم شعرانی نے تفسیر ابو الفتوح رازی کے حاشیہ پر نقل کیا ہے ملاحظہ ہو جلد ۱۰ ص ۱۲۵ ۔

[3] مرحوم شعرانی نے تفسیر ابو الفتوح رازی کے حاشیہ پر نقل کیا ہے ملاحظہ ہو جلد ۱۰ ص ۱۲۵ ۔

دے: (قالوا اجئتنا لتأفكنا عن آلهتنا) ۱؎
تُو اگر سچ کہتا ہے، تو جس عذاب کی ہمیں دھمکی دیتا ہے اسے لے آ (فأتنا بما تعدنا ان كنت من الصادقين)۔

یہ دونوں جملے اس سرکش قوم کی بے راہ روی اور ہٹ دھرمی کو بخوبی واضح کر رہے ہیں کیونکہ پہلے جملے میں وہ کہہ رہے ہیں کہ تیری یہ دعوت ان معبودوں کے برخلاف ہے جن کے ہم خوگر ہو چکے ہیں اور جو ہم نے اپنے آباو اجداد سے ورثے میں پائے ہیں۔ لہٰذا یہ سب کچھ جھوٹ اور فریب ہے۔

دوسرے جملے میں وہ عذاب کا تقاضا کرتے ہیں، ایسا عذاب کہ اگر نازل ہو جائے تو پھر اس سے خلاصی کی راہیں مسدود ہو جائیں۔ اس قسم کے عذاب کی کون عقل مند شخص تمنا کر سکتا ہے ہر چند کہ اس پر یقین نہ بھی رکھتا ہو!

لیکن ہُود علیہ السلام نے اس احمقانہ تقاضے کے جواب میں اُن سے کہا: "علم تو صرف خدا کے پاس ہے" (قال انما العلم عند الله)۔

وہی بہتر جانتا ہے کہ کب اور کن حالات میں وہ تباہ کُن عذاب کو نازل کرے۔ اس سے نہ تو تمہارے تقاضوں کا تعلق ہے اور نہ ہی میرے ارادے اور اختیار کو اس میں کچھ دخل ہے، صرف اتمام حجت کا مقصد پورا ہو جاتے کیونکہ اس کی حکمت کا یہی تقاضا ہے

پھر فرماتے ہیں، میرا کام تو صرف یہ ہے کہ میں جو احکام دے کر بھیجا گیا ہوں وہ تم تک پہنچائے دیتا ہوں" (و ابلغكم ما ارسلت به)۔

میرا اصل فریضہ اور ذمہ داری یہی ہے اور اطاعتِ الٰہی کے لیے ارادہ کرنا تمہارا کام ہے اور عذاب کا ارادہ اور مشیت خدا کا کام ہے۔

لیکن میں تمہیں دیکھ رہا ہے کہ تم ہمیشہ جہالت اور نادانی میں پڑی رہنے والی قوم ہو، (ولكني اراكم قوما تجهلون)۔

تمہاری بدبختی کا اصل سرچشمہ یہی جہالت ہے اور جہالت بھی ایسی جس میں ہٹ دھرمی، تکبر اور غرور پایا جاتا ہے اور وہ تمہیں خدا کے بھیجے ہُوئے بندوں کی دعوت کا مطالعہ کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ایسی جہالت جو تمہیں عذاب الٰہی کے نزول اور تمہاری نابودی پر اکسا رہی ہے۔ اگر تمہیں کچھ علم ہوتا اور ذرہ بھر سوجھ بوجھ ہوتی تو کم از کم اتنا تو ضرور سوچ لیتے کہ تمام منفی احتمالات کے مقابلے میں کم از کم ایک مثبت احتمال بھی تو موجود ہے کہ اگر متحقق ہو جائے تو تمہارا کچھ نہیں رہے گا۔

سرانجام ہُود علیہ السلام کی تمام نصیحتیں اور برادرانہ شفقت اور رہبری ان سنگدلوں پر کچھ اثر نہ کر سکی اور وہ حق کو قبول

۱؎ "لتأفكنا" "افک" کے مادہ سے ہے جس کا معنی جھوٹ اور حق سے انحراف ہے۔

کرنے کے بجائے اپنے باطل عقیدے پر بڑی ہٹ دھرمی کے ساتھ ڈٹے رہے، حتیٰ کہ نوح علیہ السلام کی بھی لوگ ان الفاظ کے ساتھ تکذیب کرتے تھے کہ "اگر سچ کہتے ہو تو جس عذاب کا وعدہ کیا ہے وہ کیا ہوا؟"

اب جب کہ کافی اتمام حجت ہو چکی اور انہوں نے زندہ رہنے کی عدم اہلیت کا ثبوت فراہم کر دیا تو حکمتِ الٰہی بھی اس بات پر آمادہ ہوگئی کہ ان پر استیصالی عذاب یعنی تباہ کن عذاب نازل کرے۔

انہوں نے اچانک دیکھا تو افق پر ایک ابر ظاہر ہوا اور بہت جلد پورے آسمان پر پھیل گیا۔

جب انہوں نے اسے بادل کی صورت میں دیکھا کہ ان کے دروں اور ندی نالوں کی طرف امڈا آرہا ہے تو خوشی خوشی کہنے لگے یہ تو بارش برسانے والا بادل ہے (فلما رأوه عارضا مستقبل اودیتھم قالوا ھذا عارض ممطرنا)۔[1]

مفسرین کہتے ہیں کہ ایک عرصے تک قوم عاد کے علاقے میں بارش نہیں برسی تھی۔ موسم بہت گرم اور خشک تھا یہاں تک کہ دم گھٹنے لگ گیا تھا۔ جب قوم عاد کی نگاہ گھنگھور گھٹا پر پڑی جو دور کی افق سے ان کے آسمان کی جانب رواں دواں تھی تو وہ لوگ اسے دیکھ کر بہت مسرور ہو گئے اور بارش کے استقبال میں اسی جانب چل پڑے اور دروں اور پہاڑی نالوں کے راستوں کے کنارے پہنچ گئے تاکہ بابرکت بارش کے برسنے کے منظر سے لطف اندوز ہوں۔

لیکن بہت جلد انہیں بتا دیا گیا کہ یہ بارش برسانے والے بادل نہیں ہیں۔ "یہ تو وہی وحشت ناک عذاب ہے جس کے آنے کی تم جلدی مچا رہے تھے" (بل ھو ما استعجلتم بہ)۔

"یہ وہ وحشت ناک آندھی ہے جو دردناک عذاب کی حامل ہے" (ریح فیھا عذاب الیم)۔

بظاہر یہ بات کہنے والا خود خدا وند بزرگ و برتر ہے یا پھر حضرت ہود علیہ السلام ہیں۔ جب ان کی خوشی کے نعرے سُنے تو اُن سے یہ کہا گیا۔

جی ہاں یہ تباہ کن آندھی ہے "جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہر چیز کو تباہ و برباد کر دے گی" (تدمر کل شیء بامر ربھا)۔

بعض مفسرین کے بقول "ہر چیز" سے مراد انسان، چوپائے اور ان کے اموال ہیں، کیونکہ بعد کے جملے میں فرمایا گیا ہے، تو ایسے عالم میں ان کی صبح ہوئی کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا (فاصبحوا لا یرٰی الا مساکنھم)، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے گھر تو صحیح سالم تھے لیکن وہ خود ہلاک ہو گئے اور ان کے اجسام اور اموال بھی تیز و تند آندھی کے ذریعے دُور دراز کے جنگلوں، بیابانوں یا پھر سمندر میں پھینک دیئے گئے۔

---

[1] "عارض" "عرض" کے مادہ سے ہے اور یہاں پر اس بادل کے معنی میں ہے جو آسمان پر پھیل جاتا ہے اور شاید یہ بارش برسانے والے بادلوں کی ایک علامت ہے، جو اسی افق پر پھیل کر اوپر بڑھتا جاتا ہے۔ "اودیۃ" "وادی" کی جمع ہے، جس کا معنی درہ اور پانی بہنے کی جگہ ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ جب وہ پہلی بار متوجہ ہُوئے کہ یہ سیاہ بادل تو گرد و غبار سے اٹی آندھی کے ہیں اور یہ وہ وقت تھا جب یہ بادل ان کے علاقے کے بالکل نزدیک پہنچ گئے اور ان کے جانوروں اور چرواہوں کو جو ارد گرد کے بیابانوں میں تھے زمین سے اُٹھا اٹھا کر پٹخنے لگے اور خیموں کو اکھاڑ کر اس قدر اوپر لے جانے لگے کہ وہ ایک ٹڈی کے مانند نظر آرہے تھے۔

انہوں نے جب یہ منظر دیکھا تو ڈر سے دوڑے اپنے گھروں میں جا گھسے اور دروازے بند کر لیے، لیکن ہوا نے ان کے دروازوں کو بھی اکھاڑ کر زمین پر دے مارا یا پھر اوپر پھینک دیا) اور "احقاف" یعنی اڑنے والی ریت کو ان کے جسموں پر ڈال دیا۔

سورۂ حاقہ کی ساتویں آیت یوں ہے کہ "یہ آندھی سات راتیں اور آٹھ دن تک مسلسل چلتی رہی تو وہ مسلسل ریت کے ٹیلوں کے نیچے سے چیخ پکار کر رہے تھے، پھر آندھی نے ریت کو ان کے اوپر سے ہٹا دیا اور ان کے بدن ظاہر ہو گئے پھر ان اجسام کو اپنے ساتھ لے جا کر سمندر میں پھینک دیا۔[1]

آخر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے کہ یہ انجام اس گمراہ قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہم گناہگار لوگوں کو یونہی سزا دیا کرتے ہیں" (کذالک نجزی القوم المجرمین)۔

یہ ایک تنبیہ ہے کہ تمام مجرموں، گناہگاروں، کافروں، ہٹ دھرم لوگوں اور خود غرض افراد کے لیے کہ اگر تم بھی اس راہ پر چلو گے تو تمہارا انجام بھی ان لوگوں سے قطعاً بہتر نہیں ہوگا۔

کبھی ان ہواؤں کو جو قرآن کے بقول "مبشرات بین یدی رحمتہ" (اس کی باران رحمت کے پیش قدم ہوتی ہیں) اور ان کا کام مردہ زمینوں کو زندہ کرنا ہوتا ہے، ہلاکت کا حکم ملتا ہے۔

کبھی وہ زمین جو انسان کے آرام و سکون کا گہوارہ ہوتی ہے ایک زبردست جھٹکے سے قبرستان میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

کبھی وہ بارش جو تمام موجودات کا سرمایہ حیات ہوتی ہے، سیلاب میں بدل جاتی ہے اور ہر چیز غرق کر دیتی ہے۔

جی ہاں! انسان کی زندگی پر مامور چیزوں کو اس کی موت کا عامل بنا دیا جاتا ہے اور کس قدر دردناک ہے ایسی موت جو زندگی کے عامل سے جنم لے۔ خاص کر جب قوم ہود جیسے افراد کے لیے کہ اوّل تو فرحت اور سرور پیدا کرے پھر عذاب میں مبتلا کر دے تاکہ یہ عذاب زیادہ دردناک ہو۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ فرمایا گیا ہے، یہ ہوا، ہوا کی یہ لطیف موجیں ہی تھیں جنہوں نے پروردگار کے حکم سے تمام چیزوں کو تباہ و برباد کر ڈالا۔[2]

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۸ صفحہ ۲۸ انہی آیات کے ذیل میں اور تفسیر قرطبی جلد ۹ صفحہ ۶۰۲۶ میں بھی یہی معنی ذکر کیا گیا ہے۔

[2] "تدمر" "تدمیر" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہلاک اور نیست و نابود کرنا ہے

۲۶۔ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

۲۷۔ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

۲۸۔ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ۭ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۶۔ اور ہم نے ان (قومِ عاد کے افراد) کو وہ قدرت دی جو تمہیں نہیں دی اور ان کے لیے کان اور آنکھ اور دل بنائے (لیکن نزولِ عذاب کے وقت) انہیں ان کی آنکھوں، کانوں، اور عقلوں نے کچھ فائدہ دیا، کیونکہ وہ خدائی آیات کا انکار کرتے تھے آخرکار جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، اس نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا۔

۲۷۔ اور ہم نے تمہارے اردگرد کی قوموں کو ہلاک کر دیا اور اپنی نشانیوں کو مختلف صورتوں میں ان کے سامنے بیان کیا تاکہ یہ لوگ باز آجائیں۔

۲۸۔ تو خدا کے سوا جنہیں ان لوگوں نے تقرب خدا کے لیے معبود بنا رکھا تھا

انہوں نے ان کی کیوں نہ مدد کی؟ بلکہ وہ تو ان سے گم ہو گئے، یہ تھا ان کے جھوٹ اور افتراء پردازیوں کا نتیجہ۔

تفسیر

تم قوم عاد سے زیادہ طاقتور نہیں ہو:

یہ آیات درحقیقت گزشتہ آیات کا نتیجہ بیان کر رہی ہیں، جن میں قوم عاد کی دردناک سزا کی گفتگو کی گئی تھی۔ مشرکین مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، ہم نے قوم عاد کو وہ طاقت دی تھی جو تم کو نہیں دی (ولقد مکناھم فیما ان مکناکم فیہ)۔ [1]

وہ جسمانی لحاظ سے بھی تم سے زیادہ طاقت رکھتے تھے اور مال و دولت اور مادی وسائل کے لحاظ سے بھی۔ اگر جسمانی طاقت مال و دولت اور مادی وسائل ہی لوگوں کو عذاب الٰہی سے نجات دلا سکتے تو قوم عاد کے افراد، آندھیوں میں خس و خاشاک کے کے مانند فضا میں نہ اڑتے پھرتے کہ چند ٹوٹے پھوٹے گھروں کے سوا ان کی اور کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی تھی۔

یہ آیت درحقیقت سورہ فجر کی ان آیات کے مانند ہے جو اسی قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہیں کہ:

"الم تر کیف فعل ربک بعاد ارم ذات العماد التی لم یخلق مثلھا فی البلاد"

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ کیا کیا؟ وہ بلند قامت قوم جن کی اونچی اونچی عمارتیں تھیں، وہ ایسی قوم تھی کہ شہروں میں جس کی مثل پیدا نہیں کی گئی۔ (فجر/ ۶ تا ۸)

یا سورہ ق کی ۳۶ ویں آیت کے مانند ہے، جس میں کہا گیا ہے:

"وکم اھلکنا قبلھم من قرن ھم اشد منھم بطشا"

"اور کس قدر ایسی قومیں ہیں جنہیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کر ڈالا جو ان لوگوں سے طاقت کے لحاظ سے بھی زیادہ تھیں اور افرادی قوت کے لحاظ سے بھی۔"

---

[1] "ان مکناکم فیہ" کے جملے میں "ان" نافیہ ہے۔ قرآنی آیات سے ہمارے پاس بہت سے دلائل ہیں جو تفسیر میں بیان ہوئے ہیں۔ لیکن بعض مفسرین نے اس "ان" کو یا شرطیہ مانا ہے یا زائدہ، جو صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جو لوگ تم سے طاقت میں کئی گناہ زیادہ تھے وہ خدا کی سزا کے طوفان کے سامنے نہ ٹھہر سکے تم کس باغ کی مولی ہو؟

پھر فرمایا گیا ہے: ہم نے ان کے لیے کان اور آنکھ اور دل بنائے (وجعلنا لهم سمعًا وابصارًا وافئدةً)۔ له وہ حقائق کے ادراک، نگاہ اور پہچان کے لحاظ سے بھی قوی اور طاقت ور تھے۔

لیکن نزول عذاب کے وقت انہیں ان کی آنکھوں، کانوں اور عقلوں نے کچھ فائدہ نہ دیا، کیونکہ وہ خدائی آیات کا انکار کرتے تھے (فما اغنی عنهم سمعهم ولا ابصارهم ولا افئدتهم من شیء اذ کانوا یجحدون بآیات الله)۔ له

آخرکار جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا! (وحاق بهم ما کانوا به یستهزءون)۔

جی ہاں وہ مادی وسائل سے بھی لیس تھے اور حقائق کے ادراک کے ذرائع سے بھی۔ لیکن چونکہ خدائی آیات سے ہٹ دھرمی اور تکبر کے ساتھ پیش آتے تھے اور انبیاء کی باتوں کا مذاق اڑاتے تھے، لہٰذا نور حق ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا اور غرور و تکبر اور حق دشمنی اس بات کا سبب بن گئے کہ وہ آنکھ کان اور عقل جیسے ہدایت و معرفت کے آلات و وسائل سے فائدہ نہ اُٹھا سکے اور نجات کے راستوں کو تلاش نہ کر سکے۔ آخرکار ایسے انجام سے دوچار ہوتے، جس کا تذکرہ گذشتہ آیات میں ہو چکا ہے۔

جہاں پر اس قدر قدرت اور وسائل کے باوجود ان کا کچھ بس نہ چل سکا اور ان کے بے جان ڈھانچے آندھیوں کی ہوا کی طرح میں خس و خاشاک کے مانند بُری رسوائی سے اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے، تم تو ان سے کہیں کمزور اور ناتواں ہو۔

خدا کے لیے یہ بات مشکل نہیں ہے کہ تمہیں تمہارے اعمال کے جرم میں سخت سے سخت عذاب میں مبتلا کر دے اور تمہاری زندگی کے عوامل کو تمہاری موت اور تباہی کے لیے مامور کر دے، یہ خطاب مکہ کے مشرکین کے لیے بھی ہے اور ہر دور کے مغرور، ظالم اور ہٹ دھرم لوگوں کے لیے بھی۔

یقیناً، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے، ہم پہلے انسان نہیں ہیں جنہوں نے رُوئے زمین پر قدم رکھا ہے ہم سے پہلے بھی بہت سی قومیں گزر چکی ہیں جن کے پاس وسائل بھی تھے اور طاقت بھی، کیا ہی اچھا ہو کہ ان کی تاریخ کو ہم آئینۂ عبرت بنائیں اور اس میں اپنے مستقبل اور انجام کو دیکھیں۔

له یہ بات قابل توجہ ہے کہ "ابصار" (آنکھیں) اور "افئدة" (دل اور عقول) جمع کی صورت میں بیان ہوئے ہیں، جب کہ "سمع" مفرد کی صورت میں ہے ممکن ہے کہ یہ فرق اس لیے ہو کہ "سمع" مصدری معنی کا حامل ہے اور مصدر ہمیشہ مفرد کی صورت میں استعمال ہوتا ہے یا اسلئے کہ دیکھی جانے والی اور درک کی جانے والی چیزوں کے مقابلے میں مسموعات (سنی جانے والی چیزیں) ہم آہنگ ہوتی ہیں۔

پھر بات کو زیادہ زور دے کر بیان کیا گیا ہے اور نصیحت آمیز انداز میں مشرکین مکہ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نہ صرف قوم عاد بلکہ "ہم نے تمہارے اردگرد کی سرکش قوموں کو بھی ہلاک کر ڈالا"۔ (ولقد اھلکنا ما حولکم من القریٰ)۔

جن قوموں کے علاقے تم سے زیادہ دور نہیں تقریباً جزیرہ نمائے عرب کے اردگرد ہی وہ آباد تھے، اگر قوم عاد "احقاف" میں اس جزیرہ نما کے جنوب میں رہتی تھی تو قوم ثمود اس کے شمال میں "حجر" نامی سرزمین میں رہتی تھی۔ قوم سبا، جو دردناک انجام سے دوچار ہوئی، یمن کی سرزمین میں رہتی تھی۔ قوم شعیب تو تمہارے شام جانے کے راستے میں سرزمین مدین میں زندگی بسر کرتی تھی۔ اسی طرح قوم لوط بھی اسی علاقے میں رہائش پذیر تھی اور یہ سب کی سب قومیں گناہوں، نافرمانیوں اور کفر کی وجہ سے مختلف عذابوں میں گرفتار ہوئیں۔

ان میں ہر قوم کا انجام عبرت کا آئینہ ہے اور ہر ایک ناطق گواہ کہ کیونکر وہ بیدار کرنے والے اس قدر وسائل و ذرائع کے باوجود بھی بیدار نہ ہوئیں؟

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اور ہم نے اپنی نشانیوں کو مختلف صورتوں میں ان سے بیان کیا تاکہ یہ لوگ باز آجائیں (و صرفنا الاٰیات لعلھم یرجعون)۔

کبھی تو ہم نے انہیں معجزے دکھائے، کبھی نعمت عطا کی، کبھی بلاؤں اور مصیبتوں میں گرفتار کیا، کبھی نیک لوگوں کی تعریف کی، کبھی بُرے لوگوں کی نکوہش کی اور کبھی دوسروں کو آلینے والے ہولناک عذاب کے تذکرہ سے انہیں نصیحت کی لیکن تکبر، غرور، خود خواہی اور ہٹ دھرمی نے انھیں ہدایت حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں انھیں سرزنش کرتے ہوئے ان الفاظ کے ساتھ ان پر تنقید کی گئی ہے، تو خدا کے سوا جن کو ان لوگوں نے تقرب خدا کے لیے معبود بنا رکھا تھا انہوں نے ان سخت اور حساس لمحات میں ان کی کیوں مدد نہ کی؟ (فلو لا نصرھم الذین اتخذوا من دون اللہ قرباناً اٰلھۃ)۔[1]

سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ برحق معبود ہوتے تو اپنے پیروکاروں کی ایسے سخت اور حساس لمحات میں مدد کرتے اور ہولناک عذاب کے چنگل سے انہیں چھٹکارا دلاتے یہی چیز ان کے عقیدہ کے باطل ہونے کی ایک محکم دلیل ہے جو ان بناوٹی معبودوں کو اپنے مصیبت کے دنوں کے لیے اپنی پناہ گاہ سمجھتے تھے۔

پھر فرمایا گیا ہے: نہ صرف ان کی امداد نہیں کی بلکہ ان سے گم بھی ہو گئے (بل ضلوا عنھم)۔

اس طرح کی بے حیثیت اور بے قیمت مخلوق جو نہ تو کسی کام کا مبدا ہے اور نہ ہی کسی قسم کا فائدہ پہنچا سکتی ہے اور

---

[1] "اتخذوا" کا پہلا مفعول محذوف ہے اور دوسرا مفعول "اٰلھۃ" ہے اور "قرباناً" حال ہے اور پورا جملہ تقدیری صورت میں یوں ہے "اتخذوا اٰلھۃ من دون اللہ حال کونھم متقرباً بھم" اور یہ احتمال بھی ہے کہ "قرباناً" مفعول لہ ہے۔ البتہ آیت کی ترکیب کے سلسلے میں اور بھی کئی احتمال پائے جاتے ہیں جو زیادہ قابل توجہ نہیں ہیں۔

ہر طرح کے حادثے اور سانحے کے وقت غائب اور گم ہو جاتی ہے وہ کیونکر عبادت کے لائق ہو سکتی ہے؟

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ تھا ان کے جھوٹ اور افتراء پردازیوں کا نتیجہ (وذالک افکھم وما کانوا یفترون)۔

یہ ہلاکت اور بدبختی، یہ دردناک عذاب اور مصیبت کے موقع پر معبودوں کا گم ہو جانا ان کے جھوٹ اور افتراء پردازیوں ہی کا تو نتیجہ ہیں۔[1]

---

[1] بنا بریں آیت میں ایک محذوف ہے اور اس کی تقدیری صورت یوں ہے: "وذالک نتیجة افکھم" اور یہ احتمال بھی ہے کہ آیت میں محذوف ماننے کی ضرورت ہی نہ ہو تو اس صورت میں اس کا معنی یوں ہوگا: "یہ تھا ان کا جھوٹ اور افتراء پردازیاں" لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۲۹۔ وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ○

۳۰۔ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○

۳۱۔ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○

۳۲۔ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

ترجمہ

۲۹۔ اور اس وقت کو یاد کر جب ہم نے جنوں میں سے ایک گروہ کو تیری طرف متوجہ کیا کہ قرآن سنیں، پھر جب وہ حاضر ہوئے تو ایک دوسرے سے کہنے لگے خاموش ہو کر سنتے رہو۔ جب تمام ہوا تو اپنی قوم کی طرف واپس گئے اور اُسے جا کر ڈرایا۔

۳۰۔ انھوں نے کہا: اے قوم! ہم ایک کتاب سُن کر آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے اور اپنے سے پہلے کی کتابوں کی نشانیوں سے ہم آہنگ حق کی طرف اور سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتی ہے۔

۳۱۔ اے ہماری قوم! خدا کی طرف بلانے والے کی بات مانو اور اس پر ایمان لے آؤ تاکہ تمھارے گناہوں کو بخش دے اور تمھیں دردناک عذاب سے پناہ دے۔

۳۲۔ اور جو شخص خدا کی طرف بلانے والے کی بات نہیں مانے گا وہ ہرگز خدا کے عذاب سے زمین میں فرار نہیں کرسکتا اور خدا کے علاوہ اس کا کوئی سرپرست اور مددگار نہیں ہوگا، اور ایسے لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔

شانِ نزول

ان آیات کی شانِ نزول میں مختلف روایات ذکر ہوئی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے:

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے طائف کے بازار عکاظ میں تشریف لے گئے۔ زید بن حارثہ بھی آنحضرتؐ کے ہمراہ تھے۔ اس سفر کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دی جائے، لیکن کسی نے بھی آپ کی دعوت قبول نہ کی۔ ناچار مکہ کی طرف واپس آئے، دورانِ سفر ایسی جگہ پہنچے جسے "وادیٔ جن" کہا جاتا تھا۔ رات کے دوران آپ نے قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔ وہاں سے کچھ جنات کا گزر ہوا۔ جب تلاوت کلام اللہ کی آواز ان کے کانوں میں پہنچی تو اسے غور سے سننے لگے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے ۔ خاموش رہو! جب آپ نے تلاوت مکمل کرلی تو وہ مسلمان ہوگئے اور مبلغ کی حیثیت سے اپنی قوم کی طرف لوٹ آئے اور انہیں اسلام لانے کی دعوت دی۔ ان میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئے اور مبلغین کے ہمراہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے انہیں اسلام کی تعلیمات یاد کروائیں۔ اسی موقع پر مندرجہ بالا آیات اور سورۂ جن نازل ہوئی۔[1]

---

[1] تفسیر نورالثقلین جلد ۵ صفحہ ۱۵ میں تفسیر علی بن ابراہیم سے نقل کیا گیا ہے (کچھ تلخیص کے ساتھ)

کچھ اور لوگوں نے ایک اور شانِ نزول ابن عباس سے نقل کی ہے جو گزشتہ شانِ نزول سے ملتی جلتی ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ اس کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور نماز کے دوران قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنات کے ایک گروہ کا وہاں سے گزر ہوا، جو تحقیق اور جستجو کر رہے تھے اور آسمان سے خبروں کے منقطع ہو جانے سے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔ جب انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے قرآن پڑھنے کی آواز سنی تو کہنے لگے کہ ہم سے آسمانی خبروں کے انقطاع کا سبب بس یہی چیز ہے، یہیں سے وہ اپنی قوم کی طرف لوٹ گئے اور جا کر اسے اسلام کی دعوت دی۔

مرحوم طبرسی نے تفسیر مجمع البیان میں ایک تیسری شانِ نزول بیان کی ہے[1] جس کی داستان آنحضرتؐ کے سفر طائف سے مربوط ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

حضرت ابوطالب کی وفات کے بعد پیغمبر اکرم کے لیے سخت مشکلات کا دور شروع ہو گیا اور آپ نے طائف کا سفر اختیار کیا کہ شاید وہاں پر کوئی دوست مددگار مل جائے۔ لیکن طائف کے سرداروں نے آپ کی زبردست تکذیب کی اور آپؐ کو اس قدر پتھر مارے کہ آپ کے پاؤں مبارک سے خون بہنے لگا۔ آپ تھک کر اور زخموں سے چور ایک باغ کے پاس پہنچے اور وہاں ایک کھجور کے درخت کے سائے کے نیچے بیٹھ گئے۔ خون آپ کے پاؤں سے جاری تھا۔

یہ عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کا باغ تھا جو قریش کے دو دولتمند افراد تھے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب انہیں دیکھا تو سخت پریشان ہو گئے کیونکہ آپؐ ان کی دشمنی سے پہلے ہی باخبر تھے۔

ان دونوں نے انگوروں کا ایک تھال بھر کر اپنے عیسائی غلام "عداس" کے ذریعے آپ کی خدمت میں بھیج دیا۔

آنحضرتؐ نے اس سے پوچھا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟

اس نے کہا: "نینوا" کا۔

فرمایا: خدا کے صالح بندے یونسؑ کے شہر کے۔

عداس نے پوچھا: آپؐ یونسؑ کو کہاں سے پہچانتے ہیں؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: میں خدا کا رسول ہوں اور خدا ہی نے مجھے بتایا ہے۔

یہ سن کر عداس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت کو تسلیم کر لیا۔ خدا کے حضور سجدہ کیا اور آپ کے قدموں کے بوسے لیے۔

جب وہ واپس لوٹ گیا تو عتبہ اور شیبہ نے اسے زبردست سرزنش کی کہ تم نے یہ کام کیوں کیا؟

اس نے کہا: یہ تو خدا کے صالح بندے ہیں، انہوں نے مجھے اس پردیس اور اجنبی ماحول میں ہمارے پیغمبر یونسؑ کے بارے میں بتایا ہے۔

---

[1] یہ روایت ہم نے خلاصہ کے ساتھ بیان کی ہے اور صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مسند امام احمد میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

("ظلال القرآن" جلد، ص ۴۲۹)

وہ یہ سن کر ہنسنے لگے اور کہنے لگے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں وہ تمہارے دین عیسائیت کے بارے میں دھوکا دے، کیونکہ وہ تو ایک دھوکا باز انسان ہے۔ (نعوذ باللہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ کی جانب واپس آگئے (اس سفر کا ماحصل صرف ایک مومن شخص تھا) راستے میں نصف شب کے قریب کھجور کے ایک درخت کے نزدیک پہنچے اور نماز پڑھنا شروع کردی۔ وہیں سے "نصیبین" یا "یمن" کے جنات کے ایک ٹولے کا گزر ہوا۔ آپ نماز صبح پڑھ رہے تھے انہوں نے نماز میں قرآن مجید کی تلاوت کی آواز پر کان لگائے اور ایمان لے آئے۔[1]

تفسیر

جنات ایمان لاتے ہیں :

ان آیات میں، جیسا کہ شانِ نزول میں اشارہ ہو چکا ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آسمانی کتاب پر جنات کے ایمان لانے کا ذکر تفصیل کے ساتھ آیا ہے تاکہ مشرکین مکہ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا جائے کہ جنات کا ایک بظاہر دور افتادہ ٹولہ اس پیغمبر پر جو انسان ہے اور تمہارے درمیان رہتا ہے، کس طرح ایمان لے آیا ہے اور تم ہو کہ اپنے کفر پر ڈٹے ہوئے ہو اور اس کی مخالفت پر ہمیشہ کمر بستہ رہتے ہو۔

"جنات" نامی مخلوق اور ان کی خصوصیات کے بارے میں انشاء اللہ سورہ جن کی تفسیر میں بحث ہوگی، یہاں پر صرف زیرِ تفسیر آیات کے بارے میں گفتگو ہوگی۔

* قوم ہود کی داستان درحقیقت مشرکین مکہ کے لیے ایک زبردست تنبیہ کی حیثیت رکھتی تھی، اور قوم جن کے ایمان لانے کی داستان ایک اور تنبیہ تھی۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: اس وقت کو یاد کر جب ہم نے جنوں میں سے ایک گروہ کو تیری طرف متوجہ کیا کہ دل لگا کر قرآن سنیں۔ (واذ صرفنا الیک نفرًا من الجن یستمعون القراٰن)۔

"صرفنا" "صرف" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل کرنا ہے۔ ممکن ہے یہ تعبیر اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ جنوں کا ٹولہ پہلے "استراق سمع" (خبریں چرانے) کے ذریعے آسمانوں کی خبروں کو سنا کرتا تھا، لیکن جب آنحضرت کا ظہور رسالت ہوا تو وہ اس سے روک دیئے گئے اور قرآن کی جانب متوجہ ہوئے۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۹۲۔ اس داستان کو ابن ہشام نے اپنی کتاب "السیرۃ النبویہ" میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ (جلد ۲ صفحہ ۳۳، صفحہ ۳۳)

"نفر" کے بارے میں راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ یہ لوگوں کے ایسے گروہ کو کہتے ہیں جو مل کر سفر کرتے ہوں۔ اور ارباب لغت کے درمیان مشہور یہ ہے کہ "نفر" تین سے دس تک مشتمل جماعت کو کہتے ہیں اور بعض لوگوں کے نزدیک تین سے چالیس افراد پر مشتمل جماعت کو کہتے ہیں۔ (ہر چند کہ فارسی زبان میں ایک فرد کو بھی "نفر" کہتے ہیں)۔

پھر فرمایا گیا ہے: جب وہ قرآن کے سامنے حاضر ہوئے اور اس کی روح پرور آیات کو سنا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے خاموش ہو کر سنتے رہو (فلما حضروہ قالوا انصتوا)۔

یہ اس وقت تھا جب پیغمبر اکرم نصف شب میں یا نماز صبح کے دوران قرآنی آیات کی تلاوت کر رہے تھے۔

"انصتوا" "انصات" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے خاموش ہو کر اور دل لگا کر پوری توجہ سے سننا۔

آخر الامر جب نور ایمان ان کے دل میں چمک اٹھا تو انہوں نے آیات قرآنی کی حقانیت کو اپنے اندر محسوس کر لیا۔ لہٰذا "جب قرآن پڑھنا تمام ہوا تو وہ مبلغین کے مانند اپنی قوم کی طرف واپس آگئے اور اسے جا کر ڈرایا اور جو حقیقت ان پر نمایاں ہو گئی تھی اس سے قوم کو آگاہ کیا (فلما قضی ولوا الی قومھم منذرین)۔

ایمان کے طلب گار افراد کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ایمان کی تلاش میں رہتے ہیں اور جن حقائق سے خود آگاہ ہوتے ہیں ان سے دوسروں کو بھی آگاہ کرتے ہیں اور ایمان کے منبع سے انہیں بھی مطلع کرتے ہیں۔

بعد کی آیت قوم کی طرف پلٹ جانے کے بعد ان جنوں کی دعوت و تبلیغ کی کیفیت بیان کر رہی ہے، ایسی دعوت جو جامع، نپی تلی، مختصر اور بامعنی ہے: انہوں نے کہا اے قوم! ہم ایک کتاب سن کر آئے ہیں جو موسٰی کے بعد نازل ہوئی ہے (قالوا یاقومنا انا سمعنا کتابا انزل من بعد موسٰی)۔

اس کتاب کی کچھ مخصوص صفات ہیں پہلی صفت تو یہ ہے کہ اپنے سے پہلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اس کے مضامین ان کے مضامین سے ہم آہنگ ہیں اور سابقہ کتابوں میں جو نشانیاں بیان کی گئی ہیں وہ اس میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں۔ (مصدقا لما بین یدیہ)[1]

اس کی دوسری صفت یہ ہے کہ سب کو حق کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ (یھدی الی الحق)۔

وہ یوں کہ جو شخص بھی اپنی عقل اور فطرت سے کام لے اسے اس میں حقانیت کی علامتیں بخوبی نظر آئیں گی۔

اس کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ "سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتی ہے" (والی طریق مستقیم)۔

حق کی طرف دعوت اور صراط مستقیم کی طرف دعوت میں بھی بظاہر فرق یہ ہے کہ پہلا (حق) صحیح اعتقادات کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا صراط مستقیم صحیح اور سیدھے عملی نظام کی طرف۔

"انزل من بعد موسٰی" اور "مصدقا لما بین یدیہ" کے جملے اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ جنات کا یہ گروہ گزشتہ آسمانی کتابوں خصوصاً حضرت موسٰی کی کتاب پر ایمان رکھتا تھا اور حق کی تلاش میں تھا اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسٰیؑ

---

[1] اس جملے کی تفسیر ہم نے تفسیر نمونہ جلد اول سورۂ بقرہ کی ۹۷ ویں آیت کی تفسیر میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

کی کتاب کا تذکرہ نہیں ہے حالانکہ وہ موسیٰ کی کتاب کے بعد نازل ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ بقول ابن عباس جنات عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے نزول سے مطلقاً بے خبر تھے۔ کیونکہ جنات تو آسمانی خبروں سے بھی باخبر تھے وہ زمین کی خبروں سے کس طرح غافل رہ سکتے ہیں؟

بلکہ اس لیے ہے کیونکہ "تورات" بنیادی کتاب تھی، حتیٰ کہ عیسائی حضرات بھی اپنے شرعی احکام اسی سے حاصل کرتے تھے اور کرتے ہیں۔

انہوں نے پھر کہا "اے ہماری قوم! خدا کی طرف بلانے والے کی بات مانو اور اس پر ایمان لے آؤ" (یا قومنا اجیبوا داعی اللہ و آمنوا بہ)۔

کہ وہ تمہیں عظیم اجر عطا فرمائے گا۔ تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے پناہ میں رکھے گا۔ (یغفر لکم من ذنوبکم و یجرکم من عذاب الیم)۔ [1]

"داعی اللہ" (خدا کا دعوت کرنے والا) سے مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، کہ جو انہیں "اللہ" کی طرف رہنمائی کرتے تھے اور چونکہ زیادہ تر خوف گناہوں اور قیامت کے دردناک عذاب سے ہوتا ہے، لہٰذا انہوں نے ان دونوں چیزوں سے بچاؤ کی بات کی ہے تاکہ قوم کی زیادہ توجہ اپنی طرف مبذول کروا سکیں۔

کئی مفسرین نے "من ذنوبکم" میں "من" کے کلمہ کو "زائدہ" سمجھا ہے، جو اس بات کی تاکید ہے کہ تمام گناہوں کی بخشش کا ایمان پر دارومدار ہے۔

لیکن بعض اور مفسرین نے اسے من "تبعیضیہ" اور ان گناہوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ وہ معاف کیے جائیں گے جو انہوں نے ایمان لانے سے پہلے انجام دیتے ہیں یا ان گناہوں کی طرف جن میں "حق اللہ" کا پہلو ہے نہ کہ "حق الناس" کا۔

لیکن زیادہ مناسب معنی وہی من کے زائدہ ہونے والا ہے جو تاکید ہے اور آیت مجیدہ تمام گناہوں کے بارے میں ہے۔

اس سلسلے کی آخری آیت میں جن مبلغین کی آخری گفت گو کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اور جو شخص خدا کی طرف بلانے والے کی بات نہیں مانے گا وہ ہرگز خدا کے عذاب سے زمین میں فرار نہیں کر سکتا۔ (ومن لا یجب داعی اللہ فلیس بمعجز فی الارض)۔

اور خدا کے علاوہ اس کا کوئی یار و مددگار اور سرپرست نہیں ہوگا (ولیس لہ من دونہ اولیاء)۔

اور لہٰذا "یہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں"۔ (اولئک فی ضلال مبین)۔

اس سے بڑھ کر اور کیا بدترین اور واضح ترین گمراہی ہوگی کہ انسان حق اور پیغمبر خدا حتیٰ کہ خود خدا کے مقابلے پر کمربستہ

---

[1] "یجرکم" "اجار" کے مادہ سے ہے جس کے کئی معانی ہیں، فریاد کو پہنچنا، عذاب سے بچانا، پناہ دینا اور حفاظت کرنا۔

ہو جائے کہ جس کے بغیر پوری کائنات میں نہ تو کوئی پناہ گاہ ہے اور نہ ہی اس کے ملک سے فرار کرکے کہیں اور جا سکتا ہے۔

ہم بار ہا کہہ چکے ہیں کہ لفظ "معجز" (اپنی تمام مشتقات سمیت) ایسے مقامات پر سزا اور تعاقب سے عاجز کرنے کے معنی میں آتا ہے، بالفاظ دیگر سزا کے چنگل سے فرار کرنے کے معنی ہیں۔

"فی الارض" (زمین میں) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زمین کے کسی خطے میں چلے جایئے، خدا ہی کی حکومت ہوگی، اور کچھ بھی اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں ہے اور اگر آسمان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جنات ہوں یا انسان سب کا ٹھکانا ہر حال زمین ہی ہے۔

چند نکات

۱۔ موثر تبلیغ : جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جنات، ان کے زندگی کے انداز اور ان سے متعلق دوسرے امور کے بارے میں تو ہم انشاء اللہ سورہ جن کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کریں گے، لیکن زیر تفسیر آیات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ صاحب عقل وشعور مخلوق ہیں اور ان پر خدائی فرائض کی بجا آوری ضروری قرار دی گئی ہے۔ ان کے دو فرقے ہیں ایک مومن اور دوسرا کافر، اور وہ خدا کی دعوت سے کافی آشنا ہیں۔

زیر نظر آیات میں جو چیز زیادہ قابل توجہ ہے وہ ان کی قوم میں اسلامی تبلیغ کا طریقہ کار ہے جو انہوں نے اپنایا۔

انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہونے، قرآنی آیات سننے اور ان کے مطالب سمجھنے کے بعد فوراً ہی اپنی قوم کی اصلاح کی ٹھان لی اور سیدھے اس کے پاس پہنچے اور تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا۔

انہوں نے سب سے پہلے قرآن کی حقانیت اور صداقت کی بات کی اور اسے تین دلائل کے ساتھ ثابت بھی کیا۔

پھر اسے شوق دلایا، اس آسمانی کتاب پر ایمان کے زیر سایہ اسے آخرت کے عذاب سے نجات کی خوشخبری سنائی، جس سے ایک طرف تو معاد کے مسئلے پر تاکید کرنا تھی اور دوسری طرف ناپائیدار دنیاوی اقدار کے مقابلے میں آخرت کے پائیدار اور اصل اقدار کی طرف متوجہ کرانا تھا۔

تیسرے مرحلے پر انہوں نے ترک ایمان کے خطرات سے بھی قوم کو آگاہ کیا اور استدلال اور دل سوزی کے ملے جلے انداز میں اسے متنبہ بھی کر دیا اور اس راستے سے انحراف کے انجام جو "ضلال مبین" یا کھلی گمراہی ہے سے بھی اسے خبردار کیا۔

تبلیغ کا یہ انداز ہر شخص اور جماعت کے لیے مؤثر ہے۔

۲۔ عظمت قرآن کی بہترین دلیل : مندرجہ بالا آیات، اسی طرح سورہ جن کی آیات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جنوں کا یہ گروہ قرآنی آیات سنتے ہی اس کا فریفتہ ہو گیا اور اس بات کی کوئی علامت نہیں ملتی کہ انہوں نے پیغمبر اسلام سے کسی اور معجزے کا تقاضا کیا ہو۔

انہوں نے صرف ان امور پر اکتفا کی کہ :

۱۔ قرآن مجید سابقہ آسمانی کتابوں کی نشانیوں سے ہم آہنگ ہے۔
۲۔ حق کی طرف بلاتا ہے۔
۳۔ اس کی منصوبہ بندی سیدھی راہ پر چلنے کے لیے کی گئی ہے۔

ان تینوں چیزوں کے پیشِ نظر انہوں نے قرآن کی حقانیت کا یقین کر لیا۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قرآنی مضامین اور مطالب میں غور و فکر ہمیں دوسرے تمام دلائل سے بے نیاز کر دیتا ہے۔
ایسی کتاب جو ایک ایسی شخصیت کی طرف سے پیش کی گئی ہو جس نے دنیا میں کسی سے کوئی درس نہیں پڑھا، اس میں اس قدر عظیم مطالب، پاک معارف و عقاید، خالص توحید، محکم قوانین، طاقت ور دلائل، پختہ اور تعمیری لائحہ عمل، واضح اور اعلیٰ وعظ و نصیحتیں ہوں اور وہ بھی ایسے جاذب اور زیبا انداز میں تو یہ یقیناً اس آسمانی کتاب کی حقانیت و صداقت کی بذات خود بہترین دلیل ہے۔ کیونکہ آفتاب آمد دلیل آفتاب [1]

---

[1] اعجاز قرآن کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد اوّل کی سورۂ بقرہ کی ۲۳ ویں آیت کی تفسیر میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

۳۳۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْىَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ؕ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝

۳۴۔ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝

۳۵۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

ترجمہ

۳۳۔ کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ جس خدا نے سارے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے ذرا بھی عاجز نہیں ہوا وہ اس بات پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کرے؟ وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔

۳۴۔ اس دن کا سوچ کہ جس دن کفار آگ کے سامنے پیش کیے جائیں گے (تو ان سے کہا جائے گا) کیا یہ برحق نہیں ہے؟ تو وہ لوگ کہیں گے بالکل، ہمارے پروردگار کی قسم (کہ برحق ہے، تو اس وقت) فرمائے گا تو تو اب اپنے انکار و کفر کے بدلے عذاب

کا مزہ چکھو۔

۳۵۔ بنا بریں جس طرح اولوالعزم پیغمبر صبر کرتے رہے تو بھی اس طرح صبر کر اور ان کے (عذاب کے) لئے تعجیل نہ کر، جس دن وہ اُن وعدوں کو دیکھیں گے جو ان سے کیے گئے تھے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ گویا ایک دن میں گھڑی بھر دنیا میں رہے ہیں، یہ ابلاغ ہے سب لوگوں کے لیے، تو کیا فاسق لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہو گا؟

تفسیر

اولوالعزم پیغمبروں کی طرح صبر کریں:

یہ آیات جو سورۂ احقاف کی آخری آیتیں ہیں "معاد" کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں، کیونکہ ایک تو گزشتہ آخری آیات میں جنوں کے مبلغین کی زبانی معاد کی بات ہوئی تھی اور دوسرے سورۂ احقاف کے ابتدائی حصوں میں توحید عظمت قرآن مجید اور پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کے اثبات کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے اور اس سورت کے آخری حصے میں معاد کے مسئلے کو پیش کیا جا رہا ہے۔ اس طرح سے تینوں اعتقادی اصولوں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے فرمایا گیا ہے، کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ جس خدا نے سارے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے ذرا بھی تھکا نہیں اور نہ ہی عاجز ہوا، وہ اس بات پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کرے، یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے (اولم یروا ان اللہ الذی خلق السماوات والارض ولم یعی بخلقھن بقادر علی ان یحیی الموتی بلی انہ علی کل شی قدیر)۔

آسمانوں اور زمین کو رنگا رنگ اور مختلف مخلوق سمیت خلق کرنا ہر چیز پر اس کی قدرت کی علامت ہے کیونکہ جو چیز بھی تصور میں آ جائے اسے خدا ہی نے اس دنیا میں خلق فرمایا ہے۔ تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ انسانوں کو دوبارہ زندگی عطا کرنے سے عاجز ہو؟ یہ امکان معاد پر ایک نہایت دندان شکن دلیل ہے۔

اصولی طور پر ہر چیز کے امکان کی دلیل اس کا خود اپنا وقوع پذیر ہونا ہے۔ ہم جب اس قدر جاندار چیزوں کو بے جان چیزوں سے معرض وجود میں آتا دیکھ رہے ہیں، تو معاد کے مسئلے میں اس کی قدرت مطلقہ کے بارے کس طرح شک کر سکتے ہیں؟

یہ معاد کے متعدد دلائل میں سے ایک ہے جو خداوند عالم نے قرآن مجید کی مختلف آیات میں بیان فرمائے ہیں، منجملہ ان کے سورۂ یٰس کی آیت ۸۱ میں بھی ہے۔[1]

بعد کی آیت میں گنا ہگاروں اور معاد کے منکروں کے دردناک سزا کے منظر کو مجسم کرکے فرمایا گیا ہے:

اس دن کا سوچ کہ جس دن کفار آگ کے سامنے پیش کیے جائیں گے (ویوم یعرض الذین کفروا علی النار)۔

جی ہاں! کبھی تو دوزخ کو کافروں اور گنا ہگاروں کے سامنے لایا جائے گا اور کبھی گنا ہگاروں اور کافروں کو دوزخ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور ہر ایک کا اپنا خاص مقصد ہوگا جن کے بارے میں چند آیات پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔

جب کفار کو جہنم کے سامنے پیش کیا جائے گا اور وہ جہنم کے جھلسا دینے والے کوہ پیکر اور وحشت ناک شعلوں کو دیکھیں گے تو ان سے کہا جائے گا: کیا یہ برحق نہیں (الیس ھٰذا بالحق)۔

آیا آج بھی قیامت، خدا کی عدالت اور اس کی سزا و جزا کا انکار کر سکتے ہو؟ اب بتاؤ کہ کیا یہ گزشتہ لوگوں کے خرافات پر مبنی قصے کہانیاں ہیں؟

انہیں اعتراف کے سوا کوئی اور صورت نظر نہیں آئے گی لہٰذا: کہیں گے بالکل ہمارے پروردگار کی قسم (برحق ہے اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں، ہم خود گمراہ تھے کہ اسے ناحق سمجھتے تھے) (قالوا بلٰی وربنا)۔

تو اس وقت خداوند تعالیٰ یا اس کے فرشتے کہیں: تو لو اب انکار اور کفر کے بدلے عذاب کا مزہ چکھو (قال فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون)۔

تو اس طرح سے وہ تمام حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور اعتراف کریں گے، اعتراف اور اقرار بھی ایسا کہ جو انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا اور سوائے روحانی اور وجدانی تکلیف و حسرت و اندوہ کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

اس سلسلے کی آخری آیت میں جو درحقیقت سورۂ احقاف کی بھی آخری آیت ہے، اللہ تعالیٰ گزشتہ آیات میں معاد کے اثبات اور کفار کی سزا کے پیش نظر اپنے رسول کو حکم دیتا ہے: "بنابریں! جس طرح اولوا العزم پیغمبر صبر کرتے رہے تو بھی صبر کر (فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل)۔

صرف آپ ہی کو اس قوم کی عداوت اور مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تمام اولوا العزم پیغمبروں کو بھی یہی مشکلات درپیش تھیں اور انہوں نے استقامت اور صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ عظیم پیغمبر نوحؑ نے ۹۵۰ سال تک تبلیغ دین کی لیکن تھوڑے سے لوگوں کے سوا ان پر کوئی ایمان نہ لایا بلکہ ان کو مسلسل تکلیفیں دیتے رہے اور ان کا مذاق اڑاتے رہے۔

ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا، موسیٰؑ کو جان سے مار دینے کی دھمکی دی گئی، ان کا دل قوم کی نافرمانیوں اور خلاف ورزیوں کی وجہ سے خون ہو گیا اور عیسیٰؑ کو زبردست تکلیفیں پہنچائی گئیں، انہیں بھی جان سے مار دینے کے منصوبے بنائے گئے، لیکن

---

[1] اس موضوع کے بارے میں اور معاد کے بارے میں مختلف دلائل کے سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے سورۂ یٰس کی آخری آیات کی تفسیر کا مطالعہ فرمایئے۔ (تفسیر نمونہ جلد ۱۰)

خدا نے انہیں بچا لیا، غرض جب سے دُنیا قائم ہے یہی کچھ ہوتا آرہا ہے اور صبر و استقلال کی طاقت کے بغیر ان مشکلات پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔

اولوا العزم پیغمبر کون تھے؟

اولوالعزم پیغمبر کون تھے، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں اور اس سلسلے میں تحقیق کرنے سے پہلے "عزم" کے معنی کو اچھی طرح سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ "اولوالعزم" کا معنی "صاحبانِ عزم" ہے۔

"عزم" محکم اور پختہ ارادے کو کہتے ہیں۔ راغب اپنی کتاب مفردات میں کہتے ہیں:

"عزم القلب علی امضاء الامر"

"کسی کام کو کر گزرنے کے بارے میں پختہ ارادہ کر لینا"

قرآن پاک میں "عزم" کبھی تو "صبر" کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسے:

"ولمن صبر و غفر ان ذالک لمن عزم الامور"

"جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو یقیناً یہ چیز عزم امور میں سے ہے۔ (شوریٰ/ ۴۳)

اور کبھی "ایفائے عہد" کے معنی میں، جیسے:

"ولقد عهدنا الی اٰدم من قبل فنسی ولم نجد له عزماً"

"ہم نے پہلے سے آدم کے ساتھ عہد کر لیا، لیکن وہ فراموش کر گئے اور اپنے عہد پر باقی نہ رہے"

(طٰہٰ/ ۱۱۵)

لیکن اس بات کے پیش نظر کہ جو انبیاء نئی شریعت اور جدید دین لے کر آئے تھے انہیں دوسروں سے زیادہ مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ان کا مقابلہ انہوں نے بڑے محکم عزم اور ارادے سے کیا لہٰذا ایسے انبیاء کو "اولوالعزم" کہا جاتا ہے اور زیر تفسیر آیت بھی بظاہر اسی چیز کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

ضمنی طور پر یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی انہی رسولوں میں سے ہیں کیونکہ قرآن کہتا ہے: تو بھی اسی طرح صبر کر جس طرح اولوالعزم رسول صبر کرتے رہے"

یہ جو بعض مفسرین نے "عزم" اور "عزیمت" کی "حکم اور شریعت" کے معنیٰ سے تفسیر کی ہے تو یہ اس کے معنی کی مناسبت سے ہے، ورنہ لغت میں "عزم" بمعنی "شریعت" نہیں آیا۔

بہرحال اس معنی کے لحاظ سے "من الرسل" میں "من" "تبعیضیہ" اور بزرگ انبیاء کے ایک خاص گروہ کی طرف اشارہ ہے جو صاحبانِ شریعت تھے، جیسا کہ سورہ احزاب کی ساتویں آیت میں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

"واذ اخذنا من النبيين ميثاقهم ومنك ومن نوح وابراهيم و

موسٰی وعیسی ابن مریم واخذنا منھم میثاقا غلیظا "

" اس وقت کو یاد کر جب ہم نے انبیاء سے پیمان لیا اور تجھ سے اور نوح، ابراہیم، موسٰی اور عیسٰی بن مریم سے بھی۔ ہم نے ان سب سے محکم اور پختہ پیمان لیا۔ (احزاب-۷)

یہاں پر تمام انبیاء کا جمع کی صورت میں ذکر کرنے کے بعد ان پانچ عظیم پیغمبروں کا نام لیا گیا ہے جو ان کی خصوصیت کی دلیل ہے۔

سورۂ شوریٰ کی تیرھویں آیت میں بھی انہی کا ذکر کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے:

" شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہ نوحًا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسٰی وعیسٰی "

" اس نے تمہارے لیے اس دین کو مقرر کردیا ہے جس کی نوح کو سفارش کی اور جس کی ہم نے تیری طرف وحی کی اور ابراہیم، موسٰی اور عیسٰی کو بھی اس کی سفارش کی "

شیعہ اور سُنی کتب میں اس بارے میں بہت سی روایات ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اولوا العزم پیغمبر ہی پانچ ہیں جیسا کہ حضرت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے ایک روایت ہے:

" منھم خمسۃ، اولھم نوح ثم ابراھیم ثم موسٰی ثم عیسٰی ثم محمد " [1]

ایک اور روایت میں جناب امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے:

" منھم خمسۃ اولوا العزم من المرسلین، نوح وابراھیم وموسٰی وعیسٰی ومحمد "

راوی نے پوچھا:

" لم سموا اولوا العزم؟ "

" انہیں اولوا العزم کیوں کہا جاتا ہے؟ "

تو امام نے فرمایا:

" لانھم بعثوا الی شرقھا وغربھا وجنھا وانسھا "

" کیونکہ وہ شرق و غرب اور جن و انس کی طرف مبعوث ہوئے " [2]

ایک اور حدیث میں بھی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۹۴ (انہی آیات کے ذیل میں)

[2] بحار الانوار جلد ۱۱ صفحہ ۵۸ حدیث ۱۰۔ اسی جلد کے صفحہ ۵۶ پر حدیث نمبر ۵ بھی صراحت کے ساتھ یہی کچھ کہتی ہے۔

"سادة النبیین والمرسلین خمسة وهم اولوا العزم من الرسل و علیهم دارة الرحی نوح وابراهیم وموسٰی وعیسٰی ومحمدٌ"

انبیاء و مرسلین کے سردار پانچ ہیں اور وہی اولوا العزم رسُول ہیں نبوّت و رسالت کی چکی ان کے گرد گھومتی ہے اور وہ ہیں حضرات نوح، ابراہیمؑ، مُوسٰی، عیسٰی اور محمد علیہم السلام۔[1]

تفسیر "درمنثور" میں ابن عباس سے بھی یہی چیز منقول ہے کہ اولوا العزم رسُول پانچ ہیں۔[2]

البتہ بعض مفسرین اولوا العزم رسولوں سے وہ رسُول مراد لیتے ہیں جنہیں دشمنوں سے لڑنے کا حکم ملا۔

بعض مفسرین نے ان کی تعداد تین سو تیرہ بتاتے ہیں۔[3]

جبکہ بعض دوسرے مفسرین تمام پیغمبروں کو اولوا العزم (قوی ارادے کا مالک) سمجھتے ہیں۔[4]

اور اس قول کے مطابق "من الرسل" میں "من" بیانیہ ہے تبعیضیہ نہیں ہے۔

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ صحیح ہے اور اسلامی روایات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں۔

ان سب باتوں کے بعد قرآن فرماتا ہے: اور ان کفار کے بارے میں عذاب کی تعجیل کر۔ (ولا تستعجل لهم)۔

کیونکہ قیامت جلد آنے والی ہے اور جس چیز کے بارے میں خود ان کو جلدی ہے وہ اسے بہت جلد اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اس دن انہیں سخت سزا دی جائے گی پھر انہیں اپنی غلطیوں کا پتہ چلے گا۔

دُنیا کی عمر آخرت کے مقابلے میں اس قدر کوتاہ ہے کہ جس دن وہاں وعدوں کو دیکھیں گے جو ان سے کیے گئے تھے تو انہیں معلوم ہوگا کہ گویا دن کی صرف ایک گھڑی وہ اس دُنیا میں ٹھہرے ہیں (کانهم یوم یرون مایوعدون لم یلبثوا الا ساعة من نهار)۔

آخرت کے مقابلے میں دنیا دی عمر کی کمی کا احساس یا تو اس لیے ہوگا کہ واقعاً یہ زندگی اس حیات جاوید کے مقابلے میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ہے، یا پھر اس لیے کہ یہ دنیا اس قدر تیزی سے گزر رہی ہے کہ گویا ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ہے یا اس لیے کہ انہوں نے اپنی پوری دنیا سے کما حقہ فائدہ اُٹھایا، لہٰذا اس کا ثمرہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ہے۔

اب حسرت ان کے دلوں پر چھائی ہوگی، لیکن اس کا کیا فائدہ؟ کیونکہ واپسی کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہوں گی۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ:

"کم ما بین الدنیا والاٰخرة؟

"دُنیا اور آخرت کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟"

تو آپ نے فرمایا:

---

[1] کافی جلد اول باب طبقات الانبیاء والرسل، حدیث نمبر ۳۔

[2] و [3] و [4] تفسیر درمنثور جلد ۶، ص ۴۵

"غمضة عین "
"صرف پلک جھپکنے کا "
پھر فرمایا خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے :
" کانھم یوم یرون ما یوعدون لم یلبثوا الا ساعة من نھار "[1]
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ " ساعة " کی تعبیر عام گھنٹے یا گھڑی کی مقدار کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ یہ زمانے کے مختصر اور کم ہونے کی طرف اشارہ ہے :
پھر تمام لوگوں کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : یہ ابلاغ ہے ، سب لوگوں کے لیے (بلاغ)۔[2]
ان سب لوگوں کے لیے جو پروردگار کی عبودیت کی راہ سے ہٹ گئے ہیں، ان لوگوں کے لیے جو دُنیا کی زودگزر زندگی اور اس کی خواہشات میں مگن ہو چکے ہیں۔ المختصر اس ناپایدار دُنیا میں رہنے والے تمام لوگوں کے لیے ابلاغ ہے۔
آخری جملے میں بامعنی اور تہدید آمیز سوال کے طور پر فرمایا گیا ہے : تو کیا فاسق لوگوں کے سوا کوئی اور ہلاک ہوگا ؟
فھل یھلک الا القوم الفاسقون)۔

آنحضرتؐ صبر و استقامت کا مجسم نمونہ تھے

خدا کے عظیم پیغمبروں خصوصاً پیغمبر اسلامؐ کی زندگی سخت مصائب، زبردست طوفانوں اور طاقت فرسا مشکلات کے مقابلے میں انتہائی صبر و استقامت کی آئینہ دار تھی، اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے راہ حق میں اس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، راہ حق کے راہیوں کو اس سے سبق لینا چاہیے۔
ہم عام طور پر تاریخ اسلام کے روشن نقطے سے اس کے ابتدائی تاریک ایام کو دیکھنے کے عادی ہیں، اور مستقبل کے جھروکوں سے ماضی کو دیکھنے کا یہ انداز حقائق و واقعات کو اور طرح سے پیش کرتا ہے۔ لیکن ہمیں ان ایام کو تصور میں لانا چاہیے جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تن تنہا تھے اور افق زندگی میں کامیابی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔
ہٹ دھرم دشمن ان کی نابودی پر کمر بستہ تھے، حتیٰ کہ ابولہب جیسے نزدیک ترین رشتہ دار بھی صف اوّل کے دشمنوں میں شامل تھے۔
آپ مسلسل قبائل عرب کے پاس جاتے تھے، انہیں اسلام کی دعوت دیتے تھے، لیکن کوئی بھی شخص مثبت جواب

---

[1] روضۃ الواعظین منقول از نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۵۔
[2] " بلاغ " مبتدائے محذوف کی خبر ہے، جس کی تقدیری صورت یہ ہے۔ " ھذا القرآن بلاغ " یا " ھذا الموعظ والانذار بلاغ "

نہیں دیتا تھا۔

آپ پر اس قدر پتھر برساتے کہ بدنِ مبارک سے خون بہنے لگ جاتا، لیکن آپ اپنے مشن پر ڈٹے رہے۔

ان کا سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی بائیکاٹ اس حد تک سخت کر دیا گیا تھا کہ ہر طرف کی راہیں آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر مسدود ہو گئی تھیں، کچھ تو بھوک کی وجہ سے اور کچھ بیماری کی وجہ سے راہئ ملک بقا ہو گئے۔

آپ کے ساتھیوں کو اس قدر ایذائیں پہنچائی گئیں اور شکنجوں میں جکڑا گیا کہ ان کے دل و جان پر اس کا اثر ہوا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر ایسے سخت دن بھی گزرے ہیں کہ جن کے ذکر سے زبان و قلم دونوں عاجز ہیں۔ جب آپ لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے طائف تشریف لے گئے تو اہل طائف نے نہ صرف آپ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا بلکہ اس قدر پتھر مارے کہ پاؤں مبارک سے خون جاری ہو گیا۔

بے سمجھ لوگوں کو اکسایا کہ آپ پر آوازے کسیں اور بدکلامی کریں، آپ کو مجبوراً ایک باغ میں پناہ لینا پڑی اور ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر اپنے خدا سے یوں راز و نیاز کرنے لگے۔

"اللّٰھم الیک اشکو ضعف قوتی، وقلۃ حیلتی، وھوانی علی الناس یا ارحم الراحمین! انت رب المستضعفین، وانت ربی، الیٰ من تکلنی؟ الیٰ بعید یتجھمنی؟ ام الیٰ عدو ملکتہ امری؟ ان لم یکن بک علی غضب فلا ابالی ......

"خداوندا! میں اپنی کمزوری، ناتوانی، مجبوری کی اور لوگوں کی مجھ سے بے احترامی کی تجھ سے شکایت کرتا ہوں، اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے تو مستضعفین کا پروردگار ہے، تو میرا پروردگار ہے، تو مجھے کس کے حوالے کرے گا؟ کیا دور دراز کے ان لوگوں کے جو مجھے غصے سے پھیرے در پیش آتے ہیں یا ان دشمنوں کے جو میرے امر کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے؟ پروردگارا! اگر تو مجھ سے راضی ہو جائے تو میرے لیے یہی کافی ہے ......"[1]

کبھی وہ لوگ آپ کو جادوگر کہتے تھے اور کبھی دیوانہ کہہ کر بلاتے تھے۔

کبھی آپ کے سر پر گرد و غبار اور کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا اور کبھی آپ کو شہید کرنے پر ایکا کر لیتے اور آپ کے گھر کا تلواروں سے محاصرہ کر لیتے۔

لیکن ان تمام مصائب و مشکلات کے باوجود آپ نے صبر و شکیبائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

اور آخر کار اس کا شیریں پھل بھی پا لیا۔ آپ کا دین نہ صرف جزیرہ نمائے عرب میں بلکہ مشرق سے مغرب تک پھیل گیا۔ اور آج ہر صبح و شام چار گوشۂ جہان سے اور دنیا کے پانچوں براعظموں میں اذان سنائی دیتی ہے جو آپ کی فتح اور کامرانی

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۶۱

کی آواز ہے۔ اور یہی ہے معنی " فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل " کا۔

اور یہ ہے شیاطین اور اہریمنوں کے ساتھ نبرد آزمائی کا طریقہ، ان پر کامیابی حاصل کرنے کا طریقہ کار اور خدا کے عظیم اہداف و مقاصد تک رسائی کا انداز۔

تو پھر آج آرام طلب لوگ صبر و شکیبائی اور رنج و غم اٹھائے بغیر کیونکر اپنے عظیم مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں؟

آج کے مسلمان اس قدر دشمنوں کے مقابلے میں جو ان کی نابودی پر تلے ہوئے ہیں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحیح اور اصلی مکتب سے ہدایت اور سبق حاصل کئے بغیر کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں؟

مسلمان راہنما اور لیڈر تو خاص طور پر یہ طرز عمل اپنانے کے پابند ہیں۔ جیسا کہ حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں،

" ان الصبر علی ولاة الامر مفروض لقول اللہ عز وجل لنبیہ، فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل، وایجابہ مثل ذالک علی اولیائہ واھل طاعتہ بقولہ، لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوة حسنة "

" رہبروں اور زمام داروں پر صبر و استقامت فرض ہے کیونکہ خدا نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا ہے " فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل اور اسی چیز کو اپنے دوستوں اور اطاعت گزاروں پر بھی فرض قرار دیا ہے کیونکہ اس کا ارشاد ہے کہ رسول اللہ کی ذات تمہارے لیے ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ (تم سب کو ان کی پیروی کرنی چاہیئے)۔ [1]

خداوندا! یہ عظیم نعمت، یہ آسمانی عطیہ اور مصائب و مشکلات کے مقابلے میں یہ صبر و شکیبائی اور استقامت ہمیں بھی عنایت فرما۔

پروردگارا! ہدایت کا یہ چراغ جسے تیرے اولوا العزم رسولوں خصوصا خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طاقت فرسا تکلیفیں اٹھا کر بشریت کے راستے میں روشن رکھا ہے، ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم اسے روشن ہی رکھیں اور پوری لیاقت کے ساتھ اس کی حفاظت کرتے رہیں۔

بار الٰہا! ہم جانتے ہیں کہ حق کے تمام دشمن متفق اور متحد ہو چکے ہیں اور کسی بھی جرم کے ارتکاب سے دریغ نہیں کرتے تو ان کی کوششوں سے زیادہ ہمیں صبر و شکیبائی کی توفیق عطا فرما تاکہ ان بے عدو حساب مشکلات کے سامنے ہم ہرگز نہ جھکنے پائیں اور طوفانی موجوں سے کامیابی سے گزر جائیں

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۳ بحوالہ احتجاج طبرسی۔

اور تیری امداد اور تیرے بے انتہا لطف و کرم کے بغیر قطعاً ناممکن ہے۔!

آمین یا رب العالمین

سورۂ احقاف

کی

تفسیر ختم ہوئی

جمعہ ۳ رمضان ۱۴۰۵ھ

سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی
اور
اس کی ۳۸ آیتیں ہیں

تاریخ آغاز

۳ شعبان جمعۃ المبارک ۱۴۰۵ھ

سورۂ محمدؐ
کے
مضامین

اس سورت کی دوسری آیت میں چونکہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام مذکور ہوا ہے اس لیے اس کا نام "محمدؐ" رکھا گیا ہے اور اس کا دوسرا نام قتال بھی ہے۔ واقع یہ ہے کہ دشمنانِ اسلام کے ساتھ جنگ اور جہاد جو نہایت اہم موضوع ہے اس سورت پر سایۂ فگن ہے جب کہ اس سورت کی دوسری بہت سی آیات میں کفار اور مومنین کے حالات اور صفات و خصوصیات کا تقابل کیا گیا ہے اسی طرح ان کے اُخروی انجام کو بیان کیا گیا ہے۔ کلی طور پر اس سورت کے ذیل کے مضامین کو چند حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

① ایمان اور کفر کا مسئلہ اور اس دُنیا میں اور اس جہان میں مومنین اور کفار کے حالات کا تقابل۔

② دشمنوں کے ساتھ جنگ اور جہاد کے مسئلے پر واضح اور تفصیلی بحث اور جنگی قیدیوں کے متعلق حکم۔

③ اس کا ایک بڑا حصہ منافقین کے حالات کی تشریح کرتا ہے، جو ان آیات کے نزول کے وقت مدینہ میں تخریبی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

④ ایک اور حصے میں "زمین کی سیر" اور گزشتہ اقوام کے انجام کے سلسلے میں تحقیق کی بات کی گئی ہے اور ان کے انجام سے درسِ عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

⑤ کچھ آیات میں جنگ کے مسئلے کی مناسبت سے الٰہی امتحان کا تذکرہ ہے۔

⑥ ایک اور حصے میں "انفاق" (راہِ خدا میں خرچ کرنے) کی بات کی گئی ہے جو بذاتِ خود جہاد کی ایک قسم ہے اور اس کا نقطہ مقابل "بخل" ہے۔ اس کے بارے میں بھی گفتگو کی گئی ہے۔

⑦ سورت کی بعض آیات میں اسی مناسبت سے کفار کے ساتھ صلح (جو شکست اور ذلت کا موجب بنے) کی بات کی گئی ہے اور اس قسم کی صلح سے روکا گیا ہے۔

مجموعی طور پر اس سورت میں جس اصل مسئلے پر زیادہ زور دیا گیا ہے وہ جنگ کا مسئلہ ہے اور باقی مسائل اسی محور کے گرد گھومتے ہیں، کیونکہ یہ سورہ مدینہ میں اس وقت نازل ہوئی جب مسلمانوں کی دشمنانِ اسلام کے ساتھ جنگ زوروں پر تھی اور بعض مفسرین کے بقول جنگِ اُحد کے دوران یا اس کے بہت تھوڑے عرصے بعد نازل ہوئی۔ ایسی جنگ جو تقدیر ساز اور مومنین کو کفار اور منافقین کی صفوف سے جدا کر دینے والی ہو، ایسی جنگ جو اسلام کی بنیادوں کو

ختم کردے اور ان دشمنانِ اسلام کو سبق سکھائے جو اسلام اور مسلمانوں کی نابودی کا ارادہ رکھتے ہوں۔

سورۂ محمدؐ کی تلاوت کی فضیلت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"من قرأ سورة محمد كان حقا على الله ان يسقيه من انهار الجنة"

"جو شخص سورۂ محمدؐ کی تلاوت کرے گا، خدا پر حق بن جاتا ہے کہ اسے بہشت کی نہروں سے سیراب کرے۔"[1]

کتاب "ثواب الاعمال" میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی ایک حدیث نقل کی گئی جس میں آپؑ نے فرمایا ہے:

"من قرأ سورة الذين كفروا (سورة محمد) لم يرتب ابدا، ولم يدخله شك في دينه ابدا، ولم يبتله الله بفقر ابدا، ولا خوف سلطان ابدا، ولم يزل محفوظا من الشرك والكفر ابدا حتى يموت، فاذا مات وكله الله به في قبره الف ملك يصلون في قبره ويكون ثواب صلاتهم له ويشيعونه حتى يوقفوه موقف الامن عند الله عز وجل ويكون في امان الله وامان محمد"

"جو شخص سورۂ محمدؐ کی تلاوت کرے، کبھی بھی شک وشبہ اس کے دین میں داخل نہیں ہوگا اور خدا اسے کبھی بھی دین کے فقر میں مبتلا نہیں کرے گا اور اسے ہرگز بادشاہ کا خوف لاحق نہیں ہوگا اور آخر عمر تک شرک وکفر سے محفوظ اور امان میں ہوگا اور جب مرے گا تو خدا ایک ہزار فرشتے کو حکم دے گا کہ اس کی قبر میں جاکر نماز ادا کریں اور اس نماز کا ثواب اس مرنے والے کو ملے گا اور یہ ہزار فرشتے محشر تک اس کے ساتھ رہیں گے اور عرصہ محشر میں اسے امن وامان کے مقام پر لے جاکر کھڑا کریں گے اور وہ ہمیشہ اللہ اور محمدؐ کی امان میں رہے گا۔"[2]

ظاہری بات ہے کہ جو لوگ ان آیات کے مندرجات کو اپنی ذات پر نافذ کریں گے اور سخت، بے رحم اور بے منطق دشمن کے ساتھ برسرپیکار ہوں گے تو ان کے دل میں نہ تو کسی قسم کا شک وشبہ پیدا ہوگا اور نہ ہی ارادہ میں لغزش، ایک تو ان کے دین کی بنیادیں مستحکم ہوں گی اور دوسرے خوف، ذلت اور تنگ دستی کا خاتمہ ہوگا اور ساتھ ہی قیامت میں رحمت

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۹، سورۂ محمدؐ کا آغاز۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۵ بحوالہ ثواب الاعمال۔

الٰہی کے جوار میں نعمتوں سے بہرہ ور ہوں گے۔[1]

ایک اور حدیث میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

"من اراد ان یعرف حالنا وحال اعدائنا فلیقرء سورة محمد فانه یراها

اٰیة فینا واٰیة فیهم"؛

"جو ہمارے اور ہمارے دشمنوں کے حال کو دیکھنا چاہے اسے سورۂ محمدؐ کی تلاوت کرنا چاہیئے

کیونکہ اس کی ایک آیت ہمارے حق میں اور ایک آیت ہمارے دشمنوں کے بارے میں ہے"۔[1]

اس حدیث کو "اہل سنت کے مفسر آلوسی نے "روح المعانی"[2] میں اور سیوطی نے درمنثور میں بھی نقل کیا ہے[3]

یہ حدیث اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ ایمان کا کامل نمونہ اہل بیت پیغمبر علیہم السلام اور کفر و نفاق کا مجسم نمونہ بنی امیہ ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سورۃ میں اہل بیتؑ کے نام سے تصریح نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی بنی امیہ کا نام لیا گیا ہے لیکن چونکہ مومن اور منافق گروہوں کے بارے میں اور ان کی خصوصیات کے سلسلے میں بحث کی گئی ہے، لہٰذا سب سے پہلے ان دو واضح مصداقوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ البتہ تمام مومنین اور تمام منافقین پر اس کے صادق آنے میں کوئی مانع نہیں ہے۔

---

1. مجمع البیان جلد ۹، اسی سورت کا آغاز۔
2. تفسیر روح المعانی جلد ۲۶ صفحہ ۳۴۔
3. تفسیر در منثور جلد ۶ صفحہ ۴۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ○

۲۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ○

۳۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور لوگوں کو خدا کے راستے سے روکا وہ ان کے اعمال کو اکارت کر دیتا ہے۔

۲۔ اور جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کیے اور جو کچھ محمدؐ پر نازل ہوا اور سب برحق ہے اور پروردگار کی جانب سے ہے، اس پر بھی ایمان لے آئے تو خدا اُن کے گناہوں کو بھی بخش دے گا اور ان کی حالت سنوار دے گا۔

۳۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ کافروں نے باطل کی پیروی کی اور مومنوں نے اس حق کی جو ان کے پروردگار کی طرف سے تھا۔ اللہ اس طرح لوگوں کے لیے ان کی زندگی کو بیان کرتا ہے۔

تفسیر

مؤمن حق کی اور کافر باطل کی اتباع کرتے ہیں:

یہ تین آیات درحقیقت مقدمہ ہیں ایک اہم جنگی حکم کا جو چوتھی آیت میں دیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں کفار کا اور دوسری میں مومنین کا حال بیان کرنے کے بعد تیسری آیت میں ان کا آپس میں تقابل کیا گیا ہے تاکہ جب دونوں خطوط اور راستے واضح ہو جائیں تو ظالم اور بے رحم دشمن کے ساتھ عقیدے پر مبنی جنگ کے لیے پوری آمادگی حاصل ہو جائے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے، جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور لوگوں کو خدا کے راستے سے روکا اللہ ان کے اعمال اکارت کر دیتا ہے (الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ اضل اعمالهم)۔

یہ کفار کے سرغنوں اور مکہ کے مشرکین کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے اسلام کے خلاف جنگ کی آگ بھڑکائی تھی۔ وہ خود ہی کافر نہیں تھے بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی مختلف حیلوں اور بہانوں سے خدا کے راستے سے روکتے تھے۔

اگرچہ بعض مفسرین مثلاً کشاف میں زمخشری کے مانند یہاں پر "صد" کی ایمان سے "روگردانی" کے معنی کی تفسیر کی گئی ہے بعد کی آیات کے مقابل میں جن میں ایمان کی بات کی گئی ہے۔ لیکن اس کلمے کے قرآن مجید میں استعمال کے مواقع کے پیش نظر اس کے اصلی معنی کو ہی لیا جائے گا جو "روکنے اور منع کرنے" کے ہیں۔

"اضل اعمالهم" سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعمال اکارت کر دے گا، کیونکہ گم کرنا، کنایہ ہے کسی چیز کے بے سرپرست ہونے کے لیے کہ جس کے نتیجے میں وہ چیز ختم ہو جاتی ہے۔

بہرحال بعض مفسرین نے اس جملے کو ان لوگوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے جنہوں نے جنگ بدر کے دن اونٹ نحر کر کے لوگوں میں تقسیم کیے۔ ابوجہل نے دس اونٹ، صفوان نے دس اونٹ، اور سہل بن عمرو نے بھی دس اونٹ اپنے فوجیوں کے لیے نحر کیے تھے۔[1] لیکن چونکہ یہ کام شیطانی مقاصد اور شرک کے لیے تھے لہٰذا سب ضبط ہو گئے۔

لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اسی معنی میں محدود نہیں ہے، بلکہ انہوں نے محتاجوں یا مہمانوں کی امداد وغیرہ کے لیے جو بھی ظاہری اعمال انجام دیے ہیں ان کے خدا پر ایمان نہ ہونے کے سبب سب کے سب اکارت جائیں گے۔

علاوہ ازیں انہوں نے اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے جو کام بھی کیے ہیں خدا تعالیٰ نے ان سب کو بھی فنا اور نامراد بنا دیا اور انہیں مقصد تک پہنچنے سے روک دیا۔

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۲۶ صفحہ ۳۳۔

بعد کی آیت مومنین کی کیفیت بیان کر رہی ہے جو کفار کے مدمقابل ہیں اور ان کفار کی کیفیت گزشتہ آیت میں مذکور ہو چکی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اور جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور انہوں نے اچھے اچھے کام کیے اور جو کچھ محمد پر نازل ہوا اور سب برحق ہے اور پروردگار کی جانب سے ہے، اس پر بھی ایمان لے آئے تو خدا ان کے گناہوں کو بھی بخش دے گا اور ان کی دنیا اور آخرت میں حالت سنوار دے گا۔ (والذین اٰمنوا وعملوا الصالحات واٰمنوا بما نزل علی محمد وھوالحق من ربھم کفر عنھم سیاٰتھم واصلح بالھم)۔[1]

مطلق ایمان کا ذکر کرنے کے بعد جو کچھ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اُس پر ایمان کا تذکرہ رسول اعظم کے تمام اُمور پر ایمان لانے کا تاکیدی بیان ہے گویا یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے اور اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کردہ چیزوں پر ایمان نہ لایا جائے اس وقت تک خدا پر ایمان کی تکمیل ناممکن ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ شاید یہ پہلا جملہ خدا پر ایمان کی طرف اشارہ ہو جو اعتقادی پہلو کا حامل ہے اور یہ جملہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات اور اسلام کے پیش کردہ نظام اور احکامات پر ایمان کی طرف اشارہ ہو جو عملی پہلو کا حامل ہے۔

بالفاظ دیگر صرف خدا پر ایمان لانا کافی نہیں ہے "ما نزل علیہ" پر ایمان بھی ضروری ہے، قرآن پر ایمان، جہاد پر ایمان نماز روزے پر ایمان اور ان اخلاقی اقدار پر ایمان جو آپ پر نازل ہوئیں۔

ایسا ایمان جس سے اعمال صالحہ کی بجا آوری کے لیے تحرک پیدا ہو۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس جملے کے بعد فرمایا گیا ہے:

"وھوالحق من ربھم۔

حالانکہ وہ برحق اور خدا کی طرف سے ہے۔

یعنی ان کا ایمان نہ تو کسی حساب و کتاب کے بغیر ہوتا ہے اور نہ ہی بغیر کسی دلیل و استدلال کے ہے، کیونکہ انہوں نے حق کو پہچانا ہے، لہٰذا اس پر ایمان لے آئے ہیں۔

اور "من ربھم" (ان کے پروردگار کی طرف سے) اس حقیقت کی تاکید ہے کہ حق ہمیشہ پروردگار کی طرف سے ہوتا ہے، اسی سے معرض وجود میں آتا ہے اور اسی کی طرف پلٹ جاتا ہے۔

یہ بات بھی شایان توجہ ہے کہ جس طرح راہ حق سے روکنے والے کفار کے لیے دو سزائیں بیان ہوئی ہیں اسی طرح صالح العمل مومنین کے لیے بھی جزائیں بیان ہوئی ہیں، ان میں سے ایک تو لغزشوں کی معافی اور خطاؤں کی بخشش ہے جن کے ارتکاب سے کوئی بھی غیر معصوم محفوظ نہیں ہے اور دوسرے حالات کی اصلاح اور امور کا سنوارنا جسے "اصلاح بال" کہا گیا ہے۔

"بال" کے مختلف معانی مذکور ہوئے ہیں مثلاً حال، کام اور دل لیکن مفردات میں راغب کے بقول "زبردست اہمیت کے حامل حالات" کے معنی میں ہے۔ بنا بریں "اصلاح بال" کا معنی تمام زندگی کے مکمل امور کو سنوارنا اور سدھارنا ہے جو

---

[1] کچھ مفسرین نے "وھوالحق من ربھم" کے جملہ کو جملہ معترضہ سمجھا ہے۔

فطری طور پر دنیا اور آخرت کی کامیابی پر مشتمل ہوتے ہیں کفار کے انجام کے بالکل برعکس کہ "اضلّ اعمالھم" کے پیش نظر جن کی تمام محنت و کوشش بے نتیجہ رہتی اور سوائے شکست کے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

یہ بات بھی جا سکتی ہے کہ گناہوں کی معافی ان کے ایمان کا نتیجہ ہوتی ہے اور "اصلاح بال" ان کے اعمال صالحہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔

مومنین کو ایک تو ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے اور دوسرے انہیں عملی پروگراموں میں کامیابی حاصل ہوتی ہے جو وسیع پیمانے پر اصلاح امور کی صورت ہوتی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہو سکتی ہے کہ انسان کو روحانی سکون اور قلبی اطمینان کے حصول کے علاوہ مفید اور تعمیری پروگراموں پر عمل پیرا ہونا نصیب ہو۔

اس سلسلے کی آخری آیت میں مومنین کی کامیابی اور کفار کی شکست کا اصل نکتہ ایک مختصر لیکن واضح تقابل کی صورت میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ اس وجہ سے ہے کہ کافروں نے باطل کی پیروی کی اور مومنوں نے اس حق کی جو ان کے پروردگار کی طرف سے تھا۔ (ذالک بان الذین کفروا اتبعوا الباطل وان الذین اٰمنوا اتبعوا الحق من ربھم)۔

تمام مطالب کی جان یہی ایک نکتہ ہے جس سے "ایمان" اور "کفر" کے دو خطوط بالترتیب "حق" اور "باطل" سے حاصل ہوتے ہیں۔ "حق" یعنی عینی حقیقتیں جن میں سرفہرست پروردگار عالم کی ذات پاک ہے اور اس کے بعد وہ حقائق ہیں جن کا انسانی زندگی سے تعلق ہوتا ہے اور وہ قوانین ہیں جو بندے اور خدا کے درمیان نیز خود بندوں کے درمیان باہمی رابطے کا کام دیتے ہیں۔

"باطل" یعنی اٹکل پچو، خیالات، نیرنگیاں، خرافاتی افسانے اور بے ہودہ اور بے مقصد کام، غرض عالم ہستی پر حکم فرما ہر قسم کے گمراہ کن قوانین۔

جی ہاں! مومنین حق کی اس معنی کے ساتھ جو بیان ہوا ہے پیروی کرتے ہیں اور کفار، باطل کی۔ یہی وجہ ہے کہ مومنین کو کامیابی اور کفار کو ناکامی اور شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

"وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلاً"

"ہم نے تمام آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے باطل پیدا نہیں کیا۔" (ص / ۲۷)

بعض مفسرین نے "باطل" کو "شیطان" کے اور بعض نے "بیہودہ اور بے مقصد" کے معانی سے تفسیر کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم ابھی بتا چکے ہیں "باطل" وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے جو ان معنی اور دوسرے معانی پر بھی محیط ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خدا لوگوں کے لیے ان کی زندگی یوں بیان فرماتا ہے (کذالک یضرب اللہ للناس امثالھم)۔

یعنی جس طرح اللہ نے مومنین اور کفار کی زندگی کے خطوط، ان کے عقائد اور عملی پروگرام اور نتائج کو ان آیات میں بیان

فرمایا ہے اسی طرح وہ ان کی زندگی کے انجام اور عاقبت الامر کو بھی واضح فرماتا ہے۔

راغب اپنی کتاب مفردات میں کہتے ہیں کہ "مثل" کسی چیز کے بارے میں ایسی گفتگو کو کہتے ہیں جیسی اس مطلب کے مشابہ کے بارے میں کی گئی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے کو واضح کریں۔

راغب کی دوسری گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کرکبھی تو "مشابہت" کے معنی میں اور کبھی "توصیف" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

زیر تفسیر آیت میں بظاہر دوسرا معنی مراد ہے، یعنی خدا اس طرح لوگوں کے حالات بیان کرتا ہے جیسا کہ سورہ محمد (۱۵) کی پندرھویں آیت میں ہے:

"مثل الجنة التی وعد المتقون"

"بہشت والوں کی صفت کہ جس بہشت کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا کچھ یوں ہے ....."

بہر حال اس آیت سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ ہم حق کے جتنا نزدیک ہوں گے اسی قدر ایمان کے نزدیک ہوں گے۔ اور ہمارا ایمان و عمل جس قدر باطل کے نزدیک ہوگا اسی قدر ہم ایمان سے دور ہوں گے، کیوں کہ ایمان و کفر کے خطوط ہی تو حق و باطل کے خطوط ہوتے ہیں۔

۴۔ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۛۚ ذٰلِكَ ؕ وَ لَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَاۡ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ○

۵۔ سَيَهْدِيْهِمْ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ ○

۶۔ وَ يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ○

ترجمہ

۴۔ جب تم میدانِ جنگ میں کافروں کے آمنے سامنے آجاؤ تو ان کی گردنیں مار دو، اور اس کام کو برابر جاری رکھو، یہاں تک کہ کافی حد تک دشمن کا ستیاناس کر دو، ایسے میں قیدیوں کو خوب باندھ لو، پھر اس کے بعد یا ان پر احسان کر دو (اور انہیں چھوڑ دو) یا رہائی کے بدلے میں ان سے فدیہ لو اور یہ صورتِ حال اسی طرح جاری رہے، یہاں تک کہ جنگ اپنا سنگین بوجھ زمین پر رکھ دے۔ طریقہ کار یہی ہے، اگر خدا چاہتا تو ان سے کسی اور طریقے سے انتقام لے لیتا، لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمہاری آزمائش ایک دوسرے سے کرے، اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے

گئے ہیں، خدا ان کے اعمال ہرگز اکارت نہیں کرے گا۔

۵۔ عنقریب ان کی ہدایت کرے گا اور ان کا کام سنوار دے گا۔

۶۔ اور انھیں (اپنی جاودانی) بہشت میں داخل کرے گا، جس کے اوصاف اس نے اُن سے بیان کر رکھے ہیں۔

تفسیر

میدانِ جنگ میں ارادے کی پختگی ضروری ہے

جیساکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں گذشتہ آیات مسلمانوں کو ایک اہم جنگی حکم کے لیے آمادہ کرنے کے لیے مقدمہ تھیں، جس کے بارے میں زیرِ تفسیر آیات میں تفصیل سے گفتگو کی جارہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب میدانِ جنگ میں کافروں کے آمنے سامنے آجاؤ تو پوری طاقت کے ساتھ ان پر حملہ کرو اور ان کی گردنیں مار دو (فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب)۔[1]

ظاہر سی بات ہے کہ "گردن ماردینا" قتل کے لیے کنایہ ہے، لہٰذا اس کی ضرورت نہیں ہے کہ مجاہدین اس بات کی کوشش کریں کہ وہ ان کی صرف گردنیں اڑائیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ دشمن کا صفایا کردیں، لیکن چونکہ گردن اڑانا قتل کا روشن ترین مصداق ہے لہٰذا اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

اور ہر حالت میں یہ حکم میدانِ جنگ کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ "لقیتم" جو "لقاء" کے مادہ سے ہے ایسے مواقع پر "جنگ" کے معنی میں آتا ہے، متعدد قرینے بھی خود آیت میں اسی معنی پر گواہ ہیں، جیسے "قیدیوں کی اسارت"، "حرب" (جنگ) کا لفظ اور "راہِ خدا میں مارا جانا" وغیرہ۔

قصہ مختصر یہ کہ "لقاء" کبھی تو ہر قسم کی ملاقات کے لیے استعمال ہوتا ہے اور کبھی میدانِ جنگ میں دشمن سے مڈبھیڑ کے لیے اور قرآن مجید میں بھی دونوں معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اور زیرِ نظر آیات میں دوسرے معنی کے لیے

---

[1] "ضرب" مصدر ہے اور ایک فعل مقدر کا مفعول مطلق ہے، جس کی تقدیر یوں ہے "اضربوا ضرب الرقاب" جیساکہ سورہ انفال آیت ۱۲ میں اس کی تصریح کی گئی ہے کہ "فاضربوا فوق الاعناق"۔

استعمال ہوا ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کی غرض سے آیت کا دوسرے انداز میں معنی کرتے ہیں کہ اسلام کہتا ہے "جب تم کسی کافر کے آمنے سامنے آجاؤ تو اس کی گردن اڑا دو" بدنیتی اور خود غرضی کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ یہ آیت صراحت کے ساتھ میدان جنگ میں مڈبھیڑ ہونے کی بات کر رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب انسان میدان جنگ میں کسی خونخوار کا سامنا کرتا ہے تو اگر پورے عزم اور دو ٹوک انداز میں دشمن پر سخت اور تابڑ توڑ حملے نہ کرے اور اس پر کاری ضربیں نہ لگائے تو خود فنا ہو جائے اور یہ ایک صحیح اور بالکل منطقی حکم ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: یہ کاری ضربیں ان پر برابر جاری رکھو یہاں تک کہ دشمن کا ستیاناس کر دو اور ان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دو۔ ایسے میں قیدیوں کی گرفتاری کا کام کرو اور انھیں خوب باندھ لو۔ (حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق)۔

"اثخنتموھم" "ثخن" (بروزن شکن) ٹھوس اور سخت ہونے کو کہتے ہیں۔ اسی لیے اس کا اطلاق دشمن پر مکمل فتح و کامرانی، واضح غلبہ اور مکمل تسلط حاصل کر لینے پر ہوتا ہے۔

اگرچہ اکثر مفسرین نے اس کو "دشمن کو کثرت اور شدت کے ساتھ قتل کرنے کے معنی میں لیا ہے لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں یہ اس کا لغوی معنی نہیں ہے۔ لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک دشمن کو زبردست اور وسیع پیمانے پر قتل نہ کر دیا جائے اس وقت تک خطرہ ٹلتا نہیں ہے۔

لہٰذا ان حالات میں قتل کرنا اس کا ایک مصداق تو ہو سکتا ہے اس کا اصل مفہوم نہیں ہے۔[1]

بہر حال مندرجہ بالا آیت ایک نہایت حساب شدہ جنگی حکمت عملی بیان کر رہی ہے کہ جب تک دشمن کا زور پوری طرح ٹوٹ نہ جائے اس وقت تک جنگی قیدی بنانے کا اقدام نہ کیا جائے، کیونکہ اس اقدام سے بعض اوقات مسلمانوں کے میدان جنگ میں پاؤں اکھڑ جانے کا احتمال ہوتا ہے اور جنگی قیدیوں کی گرفتاری اور انہیں محاذ سے پیچھے منتقل کرنے کی وجہ سے اصل فرائض کی ادائیگی سے رہ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

"فشدوا الوثاق" کی تعبیر اس بات کے پیش نظر کہ "وثاق" رسی یا ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو باندھا جائے، جنگی قیدیوں کو اچھی طرح باندھنے کی طرف اشارہ ہے مبادا کوئی قیدی موقع ملنے پر اپنے آپ کو چھڑا لے اور کوئی زبردست نقصان پہنچا دے۔

بعد کے جملے میں جنگی قیدیوں کے بارے میں حکم بیان کیا جا رہا ہے کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ ارشاد فرمایا گیا ہے: یا تو ان پر احسان کرو اور کسی معاوضے کے بغیر انہیں چھوڑ دو یا پھر ان سے فدیہ اور معاوضہ لے کر رہا کر دو۔ (فاما منًّا بعد واما فداء)۔

---

[1] "لسان العرب" میں "ابن اعرابی" سے نقل کیا گیا ہے کہ "اثخن اذا غلب وقھر"، قہر و غلبہ کے معنی میں ہے۔

اس طرح سے جنگی قیدیوں کو جنگ کے خاتمہ کے بعد قتل نہ کرو، بلکہ اسلامی رہنما مصلحت کے پیش نظر یا تو ان سے معاوضہ لے کر انہیں چھوڑ دے یا معاوضہ لیے بغیر انہیں رہا کر دے اور یہ معاوضہ درحقیقت ایک قسم کا جنگی تاوان ہے جو دشمن کو ادا کرنا پڑتا ہے۔

البتہ اس سلسلے میں اسلام کا ایک تیسرا حکم بھی ہے وہ یہ کہ ان قیدیوں کو غلام بنا لیا جائے۔ لیکن یہ ایک لازمی حکم نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے سربراہ کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ خاص حالات اور زمان و مکان کی مصلحت کے پیش نظر اس حکم پر عمل درآمد ضروری سمجھتا ہو۔ شاید اسی لیے قرآنی متن میں اس کا صراحت کے ساتھ حکم نہیں آیا، صرف اسلامی روایات میں ذکر کیا گیا ہے۔

ہمارے مشہور فقیہ "فاضل مقداد" "کنز العرفان" میں فرماتے ہیں:

"اگر جنگ کے خاتمے پر کوئی قیدی پکڑا جائے تو مسلمانوں کے امام کو ان تین امور میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی اجازت ہے:

۱۔ غیر مشروط طور پر اسے چھوڑ دے۔

۲۔ فدیہ اور معاوضہ لے کر اسے رہا کر دے۔

۳۔ اسے غلام بنا لیا جائے اور کسی بھی صورت میں اسے قتل کرنا جائز نہیں۔"

اور ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

غلام بنانے کا مسئلہ روایات سے تو ثابت ہے، لیکن قرآن کی کس آیت سے ثابت نہیں ہے۔[1]

یہ مسئلہ دوسری فقہی کتابوں میں بھی درج ہے۔[2]

"غلامی" کی بحث کے سلسلے میں انہی آیات کے ضمن میں ہم اس بات کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔

اسی آیت کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ صورت حال اس وقت تک جاری رہے اور دشمنوں پر اس وقت تک کاری ضربیں لگاتے رہو اور کچھ لوگوں کو جنگی قیدی بنا لو، یہاں تک کہ جنگ اپنا سنگین بوجھ زمین پر رکھ دے (حتّٰی تضع الحرب اوزارھا)۔[3]

جنگ سے صرف اس وقت ہاتھ اٹھاؤ جب دشمن کی تمام توانائیاں ختم ہو جائیں اور جنگ کی آگ بجھ جائے۔

"اوزار" "وزر" کی جمع ہے جس کا معنی "سنگین بوجھ" ہے، اور بعض اوقات اس کا اطلاق "گناہوں" پر بھی ہوتا

---

[1] کنز العرفان جلد ۱ ص ۳۶۵۔

[2] "شرائع الاسلام" کتاب الجہاد۔ و "شرح لمعہ" احکام غنیمت۔

[3] "حتّٰی"، "فضرب الرقاب" کے لیے غایت ہے۔ اس بارے میں اور بھی بہت سے احتمالات بیان کیے گئے ہیں جو قابل اعتنا نہیں ہیں۔

ہے، کیونکہ وہ بھی تو گناہگاروں کے کندھے کے بوجھ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں اس سنگین بوجھ کی نسبت جنگ کی طرف دی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے، جنگ اپنا سنگین بوجھ زمین پر رکھ دے۔ یہ سنگین بوجھ مختلف "اسلحہ جات" اور "مشکلات" کے لیے کنایہ ہے، جسے مجاہدین اپنے کندھے پر لیے ہوتے ہیں یا ان کا انہیں سامنا ہوتا ہے اور جب تک جنگ کا خاتمہ نہ ہو جائے اس وقت تک یہ سنگین بوجھ ان کے کندھوں پر رہتا ہے۔

لیکن اسلام اور کفر کے درمیان جنگ کب ختم ہوگی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے، جس کے بارے میں مفسرین نے مختلف جوابات دیئے ہیں۔ ابن عباس اور بعض دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک روئے زمین پر ایک بھی بت پرست باقی اور شرک موجود ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اسلام اور کفر کے درمیان جنگ اس وقت تک جاری ہے جب تک مسلمان "دجال" پر غلبہ حاصل نہ کر لیں۔ انہوں نے اس نظریئے کا استدلال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان سے کیا ہے:

"والجہاد ماض مذ بعثنی اللہ الی یقاتل اخر امتی الدجال"

جب سے خدا نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اس وقت سے لے کر تب تک جہاد جاری رہے گا جب تک میری امت کا آخری شخص دجال سے لڑتا رہے گا"۔[1]

دجال کے بارے میں ایک لمبی چوڑی بحث ہے، لیکن اس حد تک ضرور معلوم ہے کہ دجال ایک یا کئی مکار انسان ہیں جو آخری زمانے میں لوگوں کو اصول توحید اور حق و عدالت کی راہوں سے ہٹانے میں سرگرم عمل ہوں گے اور حضرت امام مہدی علیہ السلام اپنی عظیم طاقت کے ذریعے انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیں گے۔

اس طرح جب تک دجال روئے زمین پر موجود ہیں، حق اور باطل کی معرکہ آرائی جاری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی کفر کے ساتھ دو طرح کی معرکہ آرائی جاری ہے ایک محدود اور قلیل المیعاد جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غزوات جو آپ نے اپنے دشمنوں سے کئے اور ہر جنگ کے بعد تلواریں نیاموں میں چلی جاتیں اور دوسری مسلسل اور طویل المیعاد جو شرک، کفر، ظلم، برائی اور فتنہ و فساد کے خلاف ہے اور یہ سلسلہ حضرت امام مہدیؑ کے ذریعے عالمی سطح پر عدل و انصاف کی حکومت کے قائم ہونے تک جاری رہے گا۔

پھر فرمایا گیا ہے: تمہاری صورتِ حال یہی ہونی چاہیئے (ذالک)۔[2]

اور اگر خدا چاہتا تو ان سے کسی اور طریقے سے انتقام لے لیتا، (ولو یشاء اللہ لانتصر منھم)۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۹۸۔

[2] ذالک، ایک محذوف مبتدا کی خبر ہے جو تقدیری طور پر یوں ہے ؛ الامر ذالک۔

آسمانی بجلیوں، زلزلوں، آندھیوں اور دوسری آفات کے ذریعے سے، تاہم اس صورت میں آزمائش و امتحان کی بات ختم ہوجاتی۔" لیکن خدا چاہتا ہے کہ تمھاری ایک دوسرے کے ذریعہ آزمائش کرے"۔ (ولکن لیبلوا بعضکم ببعض)۔

جنگ کا حقیقی فلسفہ اور حق و باطل کی معرکہ آرائی کا اصل نکتہ بھی یہی ہے، جنگوں میں حقیقی مومنین کی صفیں غیر حقیقی مومنین سے جدا ہوجاتی ہیں اور کردار کے غازی گفتار کے غازیوں سے جدا ہوجاتے ہیں۔ صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں، استقامت اور پامردی کا احیاء ہوتا ہے اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کا اصل مقصد حاصل ہوتا ہے، یعنی قوتِ ایمان کو پرورش ہوتی ہے اور انسانی اقدار کا صحیح معنوں میں احیاء ہوتا ہے۔

اگر مومنین ایک گوشے میں بیٹھ کر اپنے معمول کی زندگی بسر کرنے میں لگ جاتے اور جب بھی مشرکین اور ظالموں کا کوئی لشکر مسلمانوں پر حملہ کرتا اور خدا غیب کی راہوں اور معجزے کے ذریعے انہیں تباہ و برباد کردیتا تو معاشرے کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی، معاشرے میں ٹھہراؤ، سستی، کمزوری اور کاہلی وجود میں آجاتے اور اسلام و ایمان صرف نام کی حد تک ہوتے۔

خلاصۃ الکلام یہ کہ اللہ کو اپنے مقدس دین کے استقلال کے لیے ہماری جنگ و جدال کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہم خود، دشمن کے مقابلے میں تربیت پاتے ہیں اور ہمیں اس مقدس جنگ کی ضرورت ہے۔

یہی قرآن مجید کی دوسری آیات میں دیگر صورتوں میں بیان ہوا ہے۔ مثلاً:

"ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم ویعلم الصابرین"

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم صرف ایمان کے خالی دعووں سے بہشت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی تک خدا نے تم میں سے مجاہدین اور صابرین کو معین نہیں کیا ہے۔

(آل عمران / ۱۴۲)

اس سے پہلی آیت میں ہے "ولیمحص اللہ الذین امنوا ویمحق الکافرین" مقصد یہ ہے کہ خدا (ان جنگوں کے سایے میں) مومنین کو خالص کرے اور کفار کو نیست و نابود کرے۔

زیر تفسیر آیت کے آخری جملہ میں ان شہیدوں کا تذکرہ ہے جو ایسی جنگوں میں اپنی شیریں زندگی کو قربان کرتے ہیں اور اسلامی معاشرے پر ان کا بہت بڑا حق ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ہیں خدا ان کے اعمال کو ہرگز اکارت نہیں کرے گا (والذین قتلوا فی سبیل اللہ فلن یضل اعمالھم)۔

ان کی زحمتیں، تکلیفیں اور ایثار و فداکاریاں ضائع نہیں ہوں گی، سب خدا کی بارگاہ میں محفوظ ہیں۔ اس دنیا میں بھی ان کی فداکاریوں کے آثار باقی رہ جاتے ہیں، "لا الٰہ الا اللہ" کی جو بھی صدا سنائی دیتی ہے انہی کی تکلیفوں کا ثمرہ ہے، جو مسلمان بھی اللہ کی بارگاہ میں سربسجود ہوتا ہے تو ان کی فداکاریوں کی برکت سے ہے، غلامی کی زنجیریں ان کے مصائب جھیلنے سے ٹوٹتی ہیں اور مسلمانوں کی عزت و آبرو بھی انہی کی مرہونِ منت ہے۔

شہدا پر خدا کی یہ ایک عنایت ہے۔

تین اور عنایتوں کا تذکرہ بعد کی آیات میں ہوتا ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے، اللہ انہیں ہدایت کرے گا (سیھدیھم)۔

بلند مرتبہ مقامات، عظیم کامیابی اور رضوان الہٰی کی طرف ہدایت۔

دوسری عنایت یہ کہ "ان کے حالات سنوار دے گا: (ویصلح بالھم)۔

اللہ انھیں تسکین، اطمینان خاطر اور روحانی سرور عطا فرماتا ہے۔ فرشتوں کے ہم آہنگ صفائے باطن اور روحانی مدارج سے نوازتا ہے جو ان کے ہمدم ہوتے ہیں۔

اور اپنی رحمت کے جوار میں انہیں اپنی ضیافت میں بلاتا ہے۔

آخری عنایت یہ ہے کہ "انہیں اپنی جاودانی بہشت میں داخل کرے گا جس کے اوصاف انہیں پہلے بتا رکھے ہیں (ویدخلھم الجنۃ عرفھا لھم)۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ انہیں بہشت بریں اور مقام رضوان کے صرف کلی اوصاف ہی سے آگاہ نہیں کرتا، بلکہ بہشت کے محلات کی علامتوں اور نشانیوں سے بھی مکمل طور پر آگاہ کر دیتا ہے، اس حد تک کہ جب بھی وہ بہشت میں داخل ہوں گے سیدھے اپنے اپنے محلات میں چلے جائیں گے۔[1]

بعض مفسرین نے "عرفھا" کی "عرف" (بروزن فکر) عطر اور خوشبو، کے معنی سے تفسیر کی ہے۔ یعنی خدا انہیں ایسی بہشت میں پہنچائے گا جو وہاں کے لیے سراسر معطر ہوگی۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اگر ان آیات کو: "ولاتحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا" (آل عمران/ ۱۶۹) کے ساتھ ملا دیں تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ "اصلاح بال" سے مراد وہی جاودانی زندگی ہے، جس کے سائے میں شہدائے راہ خدا پردے اور حجابات ہٹ جانے کے بعد اپنے رب کے حضور شرف یابی کے لیے تیار ہوں گے۔[2]

چند نکات

۱۔ **شہدا کا بلند مقام:** اقوام کی تاریخ میں ایسے دن بھی آجاتے ہیں جن میں بے حد ایثار و قربانی اور فداکاری و جانفشانی کے بغیر خطرات نہیں ٹل سکتے اور عظیم اور مقدس مقاصد نہیں بچ سکتے۔ ایسے مواقع پر مؤمن

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۹۹۔

[2] المیزان جلد ۱۸ صفحہ ۲۴۳

اور فداکاروں کو آگے آنا چاہیئے اور اپنے خون کی قربانی دے کر آئین حق کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ اسلامی منطق کی رُو سے ایسے افراد کو "شہید" کہا جاتا ہے۔

"شہید" "شہود" کے مادہ سے ہے اور اس کا ان پر اطلاق اس لیے ہوتا ہے کہ :

۱۔ کیونکہ وہ دشمنانِ حق کے مقابلے میں میدان میں حاضر ہوتے ہیں یا

۲۔ بوقتِ شہادت، رحمت کے فرشتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں یا

۳۔ خدا کی جو عظیم نعمتیں ان کے لیے فراہم کی جاچکی ہے ان کا مشاہدہ کرتے ہیں یا

۴۔ بارگاہِ رب العزت میں پہنچ کر حاضری دیتے ہیں جیسا کہ آیت مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

"ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون" (آلِ عمران/۱۶۹)

اسلام میں بہت کم لوگ شہداء کے مرتبے کے برابر ہیں، وہی شہداء خود سوچ سمجھ کر اور خلوص قلب کے ساتھ معرکہ حق و باطل میں قدم رکھتے ہیں اور اپنے پاکیزہ خون کے آخری قطرات تک نچھاور کر دیتے ہیں۔

شہداء کے مقام اور مرتبے کے بارے میں اسلامی ماخذ میں بہت سی حیرت انگیز روایات ملتی ہیں جن سے شہداء کے کارناموں کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے :

"ان فوق کل بر برًا حتی یقتل الرجل شہیدًا فی سبیل اللہ"

"ہر نیکی سے بڑھ کر ایک نیکی ہوتی ہے جب تک انسان راہِ خدا میں شہید نہ کر دیا جائے۔ جب اسے شہادت مل جاتی ہے تو پھر اس سے بڑھ کر کوئی اور نیکی نہیں ہے۔"[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے :

"المجاھدون فی اللہ قواد اھل الجنۃ"

"مجاہدینِ راہِ خدا بہشت والوں کے قائد ہوں گے۔"[2]

ایک اور حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"ما من قطرۃ احب الی اللہ من قطرۃ دم فی سبیل اللہ، او قطرۃ من دموع عین فی سواد اللیل من خشیۃ اللہ، وما من قدم احب الی اللہ من خطوۃ الی ذی رحم، او خطوۃ یتم بھا زحفًا فی سبیل اللہ"

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۰۰ صفحہ ۱۵

[2] بحار الانوار جلد ۱۰۰ صفحہ ۱۰

"کوئی قطرہ خدا کو خون کے اس قطرے سے زیادہ محبوب نہیں ہے جو راہ خدا میں بہایا جاتا ہے یا آنسو کے اس قطرے سے جو رات کی تاریکی میں خوف خدا سے جاری ہوتا ہے۔ اور کوئی قدم خدا کو اس قدم سے زیادہ محبوب نہیں ہے جو صلۂ رحمی کے لیے اٹھایا جائے یا اس قدم سے جو راہِ خدا میں جنگ کے لیے آگے بڑھتا ہے، جس سے جنگ اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔"[1]

اگر تاریخ اسلام کی ورق گردانی کی جائے تو معلوم ہوگا کہ شہدائے راہِ خدا نے ہی اسلام کے بہت سے جھنڈے کو اعزاز بخشا ہے اور اس طرح سے انہوں نے اسلام کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔

نہ صرف ماضی میں بلکہ آج بھی شہادت ایک تقدیر ساز کلمہ ہے، جس سے دشمنوں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور انہیں اسلام کے قلعوں میں رخنہ ڈالنے سے مایوس کر دیتا ہے اور شہادت کا کلمہ مسلمانوں کے لیے کس قدر مبارک اور دشمنانِ اسلام کے لیے کس قدر خطرناک ہے؟

لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ شہادت کوئی مقصد نہیں بلکہ اصل مقصد دشمن پر کامیابی اور آئینِ حق کی حفاظت اور پاسداری ہوتا ہے۔ لیکن یہ مجاہدین اپنے آپ کو اس حد تک تیار رکھیں کہ اگر اس راہ میں انہیں خون کی قربانی بھی دینا پڑے تو اس سے دریغ نہ کریں اور یہی ہے امت شہید پرور کا معنی نہ یہ کہ شہادت کو ایک مقصد سمجھ لیا جائے۔

اسی لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مفصل حدیث کے آخر میں ہم پڑھتے ہیں جو آپؐ سے حضرت علی علیہ السلام نے روایت کی ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قسم اٹھا کر فرماتے ہیں:

"والذی نفسی بیدہ لو کان الانبیاء فی طریقھم لترجلوا لھم لما یرون من بھائھم ویشفع الرجل منھم سبعین الفا من اھل بیتہ وجیرتہ"

"اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، جب شہداء عرصۂ محشر میں وارد ہوں گے، اگر انبیاء بھی ان کے راستے میں سوار ہوں گے تو ان کے نور اور شان و شوکت کی وجہ سے سواریوں سے اتر پڑیں گے اور ان میں سے ہر ایک شخص اپنے خاندان اور ہمسایوں میں سے ستر ہزار لوگوں کی شفاعت کرے گا۔"[2]

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اسلامی ثقافت میں شہادت کے دو مختلف معانی ہیں ایک خاص اور دوسرا عام۔ شہادت کا خاص معنی تو یہ ہے کہ انسان راہِ خدا میں میدانِ جنگ میں مارا جائے اور اس کے اسلامی فقہ میں کچھ مخصوص احکام ہیں، مثلاً اسے غسل و کفن کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اسی خون آلودہ لباس میں ہی اسے دفن کیا جائے گا۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۰۰ ص ۱۰۔

[2] بحار الانوار جلد ۱۰۰ ص ۱۲۔

جبکہ شہادت کا وسیع اور عام معنی یہ ہے کہ انسان خدائی فریضے کی انجام دہی میں مارا جائے یا مرجائے اور جو شخص بھی اس قسم کے فریضے کی ادائگی کرتا ہوا کسی حالت میں بھی دنیا سے اُٹھ جائے وہ "شہید" ہے۔

اسی لیے اسلامی روایات میں وارد ہوا ہے کہ چند قسم کے لوگ اس دنیا سے "شہید" ہو کر جاتے ہیں۔

(i) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

"اذا جاء الموت طالب العلم وھو علی ھذا الحال مات شھیدًا"

"جو شخص حصولِ علم کے راستے میں مرجائے وہ شہید ہو کر مرتا ہے۔"[1]

(ii) امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"من مات منکم علی فراشہ وھو علی معرفۃ حق ربہ وحق رسولہ واھل بیتہ مات شھیدًا"

"جس شخص کو موت آجائے لیکن وہ حق معرفت پروردگار اور حق معرفت رسُول و اہل بیت رکھتا ہو تو وہ شہید ہو کر مرتا ہے۔"[2]

(iii) ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "من قتل دون مالہ فھو شھید"

اسی طرح کئی اور لوگ ہیں جو راہ حق میں مار دیئے جاتے ہیں یا اپنی طبعی موت مرتے ہیں اور یہیں سے اس اسلامی ثقافت اور اس کی ہمہ گیریت کا پتہ چلتا ہے۔

(iv) اس بحث کو حضرت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کی ایک حدیث کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچاتے ہیں۔ امامؑ نے اپنے آباؤ اجداد کے ذریعے رسُول اللہؐ سے یُوں روایت کی ہے۔

"اول من یدخل الجنۃ الشھید"

"سب سے پہلے شہید ہی بہشت میں جائے گا۔"[3]

۲۔ **اسلام میں جنگ کے مقاصد:** اسلام میں جنگ کو کبھی بھی اقدار کی حیثیت حاصل نہیں رہی۔ بلکہ انسانوں کی تباہی و بربادی اور ذرائع و وسائل کی نابُودی کی وجہ سے اسے "خلاف اقدار" شمار کیا گیا ہے۔ اسی لیے قرآن کی بعض آیات میں اسے عذابِ الٰہی کے زمرے میں ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ سُورۂ انعام کی ۶۵ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

"قل ھو القادر علیٰ ان یبعث علیکم عذابًا من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعًا و یذیق بعضکم بأس بعض"

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۱ مادہ "شہد"

[2] نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۱۸۵ (آخری خطبہ)۔

[3] بحار الانوار جلد ۱، ص ۲۷۴

" کہہ دے کہ خدا اس بات پر قادر ہے کہ تم پر (بجلیوں کے مانند) تمہارے اوپر سے یا (زلزلوں کے مانند) تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیج دے یا تمہیں ٹولیوں کی صورت میں متفرق کردے، یا تمہیں ایک دوسرے کے خلاف جنگ اور خوں ریزی کا مزہ چکھائے۔

اس آیت میں جنگ کو "صاعقہ" اور "زلزلہ" جیسی ارضی و سماوی آفات کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے۔ اسی لیے اسلام میں تا حد امکان جنگ سے پرہیز کیا جاتا ہے۔

لیکن جب کسی قوم کے وجود کو خطرہ لاحق ہو، یا اس کے مقدس اور اعلیٰ مقاصد کو تباہی کا اندیشہ ہو تو اس وقت جنگ کو "قدار" کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور جنگ "جہاد فی سبیل اللہ" کا مقام حاصل کر لیتی ہے۔

اسی وجہ سے اسلام میں جہاد کی کئی قسمیں بتائی گئی ہیں:

① آزادی خواہی پر مبنی ابتدائی جہاد۔

② دفاعی جہاد۔

③ فتنہ و فساد، اور شرک و بُت پرستی کی آگ بُجھانے کا جہاد۔

اس کی تفصیل ہم کسی اور جگہ بیان کر چکے ہیں۔[1]

بنا بریں اسلامی جہاد (جیسا کہ اسلام کے زبردست مخالفین پروپیگنڈا کرتے ہیں) عقیدہ مسلط کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اصولی طور پر مسلط کردہ عقیدے کی اسلام میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، بلکہ جہاد ایسے وقت ہوتا ہے جب دشمن جنگ کو اسلامی اُمت پر مسلط کردیں یا ان سے خداداد آزادی چھیننا چاہیں، یا اس کے حقوق پامال کرنا چاہیں یا ظالم، مظلوم کا گلا دبانا چاہیں تو اس وقت تمام مسلمانوں پر فرض بن جاتا ہے کہ وہ مظلوم کی امداد کریں خواہ انہیں ظالم قوم سے لڑنا پڑے۔

گذشتہ آیات میں ایک مختصر اور لطیف جملے میں یہی بات بیان ہوئی ہے، جہاں فرمایا گیا ہے کہ کفار تو باطل کی پیروی کرتے ہیں اور مومنین حق کی اتباع کرتے ہیں۔ تو اس لحاظ سے وہ جنگ "حق اور باطل کے درمیان جنگ" سمجھی جائے گی، نہ کہ کشور کشائی، وسعت طلبی، دوسروں کے سرمائے کی لوٹ مار اور قدرت نمائی اور طاقت منوانے کے لیے۔

اسی وجہ سے ہم گذشتہ آیات کی تفسیر میں ایک روایت میں پڑھ چکے ہیں کہ انسانی معاشرے میں جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک دجالوں کے وجود کا خاتمہ نہیں ہو جاتا اور زمین ان کے نجس وجود سے پاک نہیں ہو جاتی۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اسلام میں دوسرے آسمانی ادیان کے پیروکاروں کے ساتھ پُر امن بقائے باہمی پر بہت زور دیا گیا ہے اور اس کی زبردست تاکید کی گئی ہے۔ قرآنی آیات، اسلامی روایات اور فقہ اسلامی میں

---

[1] تفسیر نمونہ جلد اوّل سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۳ کے ذیل میں۔

اس بارے میں "اہل ذمہ کے احکام" کے عنوان سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اگر اسلام عقائد مسلط کرنے اور اپنی طاقت بزور شمشیر منوانے کا حامی ہوتا، تو پھر اسے پُرامن بقائے باہمی اور اہل ذمہ کے متعلق قوانین بنانے کی کیا ضرورت تھی؟

۴۔ **جنگی قیدیوں کے احکام:** ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ میدان جنگ میں دشمن کی مکمل شکست سے پہلے مسلمانوں کو کسی بھی صورت میں جنگی قیدی بنانے کا اقدام نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ اس سے ہر حالت میں سنگین خطرات کا احتمال ہے لیکن زیر تفسیر آیات کے لب ولہجہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دشمن پر کامیابی کے بعد انہیں قتل کرنے کے بجائے قیدی بنا لیا جائے اسی لیے قرآن فرماتا ہے: جب تم دشمن کا سامنا کرو تو اس پر کاری ضربیں لگاؤ۔

پھر فرمایا گیا ہے: یہ کاری ضربیں ان پر برابر جاری رکھو، یہاں تک کہ دشمن کا ستیاناس کر دو اور انہیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دو، ایسے میں قیدیوں کی گرفتاری کے لیے اقدام کرو اور انہیں خوب باندھ لو (فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتیٰ اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق)

لہٰذا دشمن پر قابو پانے کے بعد انہیں قتل کرنے کے بجائے اسیر بنا لیا جائے اور یہ ایسا کام ہے جس سے گریز ناممکن ہے، کیونکہ اگر دشمن کو چھوڑ دیا جائے تو ممکن ہے کہ وہ دوبارہ سنبھل کر پھر حملہ کر دے۔

لیکن قیدی بنانے کے بعد حالات یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں اور اسیر تمام جرائم کے باوجود مسلمانوں کے ہاتھ میں خدا کی ایک امانت کی صورت میں آجاتا ہے جس کے بہت سے حقوق کی حفاظت مسلمانوں پر فرض ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید نے ایسے لوگوں کی زبردست تعریف کی ہے، جنہوں نے ایثار سے کام لیا اور اپنا کھانا اسیر کو دے دیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

"ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما واسیرا"

"خدا کے نیک بندے کھانے کی خواہش رکھنے کے باوجود اپنا کھانا مسکین، یتیم اور اسیر کو دے دیتے ہیں" (دھر۔۸)

مشہور روایت کے مطابق یہ آیت حضرت علی، جناب فاطمہ زہرا اور حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہم السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے اپنے افطار کا کھانا مسکین، یتیم اور اسیر کو دے دیا۔

حتیٰ کہ بعض استثنائی حالات میں مثلاً ان کے خطرناک ہونے یا خاص قسم کے جرائم کے ارتکاب کی وجہ سے جن قیدیوں کو سزائے موت کا حکم سنایا جاتا ہے، ان کے بارے میں بھی حکم یہی ہے کہ سزا پر عمل درآمد سے پہلے تک ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

"اطعام الاسیر والاحسان الیہ حق واجب وان قتلتہ من الغد"

"اسیر کو کھانا کھلانا اور اس سے حسن سلوک کرنا ایک واجب حق ہے، ہر چند کہ یہ طے پا چکا

ہو کہ کل اسے سزائے موت دی جائے گی۔"[1]

اس بارے میں اور بھی بہت سی احادیث موجود ہیں۔[2]

ایک حدیث میں حضرت امام علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اذا اخذت اسیرًا فعجز عن المشی ولیس معک محمل فارسلہ، ولا تقتلہ، فانک لا تدری ما حکم الامام فیہ"

"جب تم کسی کو اسیر بنالو اور اپنے ساتھ لے آؤ، لیکن وہ چلنے سے عاجز ہو اور تمہارے پاس اس کے لیے سواری بھی نہ ہو تو اسے چھوڑ دو اور قتل نہ کرو، کیونکہ تم یہ نہیں جانتے کہ جب اسے امام کے پاس لے جاؤ تو وہ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرے۔"[3]

حتیٰ کہ تاریخ میں رہبرانِ اسلام کے حالات میں ملتا ہے کہ جو کھانا وہ خود کھاتے تھے، اسیروں کو بھی وہی کھلاتے تھے۔

لیکن اسیروں کے بارے میں حکم جیسا کہ ہم آیات کی تفسیر میں بتا چکے ہیں، جنگ کے خاتمے کے بعد ان تینوں چیزوں میں سے ایک ہے: یا تو انہیں غیر مشروط طور پر چھوڑ دیا جائے یا فدیہ (تاوان) لے کر انہیں آزاد کر دیا جائے یا پھر انہیں غلام بنا لیا جائے۔ البتہ مذکورہ تینوں صورتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب امام مسلمین اور پیشوائے اسلام کی مرضی پر موقوف ہے اور وہ بھی اُسرار کے حالات، داخلی اور خارجی لحاظ سے اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو بات بھی اسے زیادہ مناسب نظر آئے گی اختیار کرے گا اور اس پر عمل درآمد کا حکم دے گا۔

بنابریں نہ تو تاوان لینا ضروری ہے اور نہ ہی غلام بنانا بلکہ یہ سب کچھ امام المسلمین کی صوابدید پر منحصر ہے کہ اگر مصلحت اس بات میں ہے کہ تاوان لے کر چھوڑ دیا جائے تو وہ ایسا ہی کرے گا اور اگر مصلحت غلام بنانے میں ہے تو غلام بنائے گا اور اگر مصلحت اس بات میں ہو کہ غیر مشروط طور پر چھوڑ دے تو ایسا ہی کرے گا۔

فدیہ اور تاوان کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۷، سورہ انفال کی ۷۰ ویں آیت کی تفسیر میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

۴۔ **اسلام اور غلامی:** اگرچہ قرآن مجید میں جنگی قیدیوں کے "استرقاق" (غلام بنانے) کا مسئلہ ایک حتمی حکم کے عنوان سے بیان نہیں ہوا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ قرآن پاک میں غلاموں کے احکام بھی بیان ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صدرِ اسلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں بھی غلام تھے، جیسے غلام کے ساتھ ازدواج، محرم

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۱ ص۶۹۔

[2] فروع کافی جلد ۵ ص۳۵ باب الرفق بالاسیر واطعامہ۔

[3] فروع کافی جلد ۵ ص۳۵ باب الرفق بالاسیر واطعامہ۔

ہونے یا "مکاتبت" (غلاموں کی آزادی کے لیے عہد و پیمان)، کے احکام وغیرہ، جو قرآن مجید کی متعدد آیات میں بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً سورۂ نساء، سورۂ نحل، سورۂ مومنون، سورۂ نور، سورۂ روم اور سورۂ احزاب کی آیات۔

یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ اسلام پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے اپنی تمام اعلیٰ تعلیمات اور انسانی اقدار کو بلند کرنے کے باوجود غلامی کے مسئلے پر بطور کلی خط تنسیخ کیوں نہیں کھینچا اور ایک دو ٹوک اور عمومی حکم کے ذریعے تمام غلاموں کی آزادی کا اعلان کیوں نہیں کیا؟

یہ ٹھیک ہے کہ اسلام نے غلاموں کے بارے میں بڑی سفارش کی ہے، لیکن سب سے اہم بات ان کی غیر مشروط آزادی ہے۔ آخر ایک انسان دوسرے انسان کا مملوک اور بندہ کیوں ہو اور آزادی جو خدا کی بہترین نعمت اور قدرت کا بہترین عطیہ ہے اس سے وہ کیوں بہرہ مند نہ ہو؟

ایک مختصر جملے میں اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لیے ایک جچا تلا اور ایک شیڈول پر مبنی پروگرام دیا ہے کہ جس کے مطابق وہ آہستہ آہستہ آزادی کی نعمت سے مالا مال ہو جاتے ہیں اور اسی طرح کی آزادی سے معاشرے پر بھی کوئی ناخوشگوار اثر نہیں پڑتا۔

لیکن اس اسلامی منصوبے کی تشریح اور تفصیل سے پہلے ہم مقدمے کے طور پر یہاں پہ قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراتے ہیں۔

(۱) اسلام غلامی کا موجد ہرگز نہیں ہے:

یہ بات مسلم ہے کہ غلامی کی ایجاد اسلام نے نہیں کی، بلکہ وہ اس وقت ظہور پذیر ہوا جب ساری دنیا میں غلامی کا دور دورہ تھا اور غلامی انسانی معاشرے میں رچ بس چکی تھی، حتیٰ کہ اسلام کے بعد تک بھی غلامی کا رواج جاری رہا اور آج سے تقریباً ایک صدی قبل اس وقت تک تھا جب غلاموں کی آزادی کی تحریک شروع نہیں ہوئی تھی، کیونکہ انسانی زندگی کے نظام کی تبدیلی سے غلام بنانے کی پرانی روش اب قابل قبول نہیں رہی تھی۔

غلامی کے خلاف جد و جہد سب سے پہلے یورپ سے شروع ہوئی، پھر اس کا دائرہ، امریکہ اور ایشیائی ملکوں تک بھی پھیل گیا۔

انگلستان میں ۱۸۴۰ء تک، فرانس میں ۱۸۴۸ء تک، ہالینڈ میں ۱۸۶۳ء تک اور امریکہ میں ۱۸۶۵ء تک غلامی کا سلسلہ جاری رہا، آخر کار برسیلز میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ایک مشترکہ اعلامیہ کے ذریعے ساری دنیا میں غلامی کے سلسلے کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا گیا اور یہ ۱۸۹۰ء کی بات ہے (یعنی تقریباً سو سال سے بھی کم عرصہ گزرا ہے)

(۲) اس دور میں غلامی کے انداز بدل گئے ہیں:

یہ ٹھیک ہے کہ اہل یورپ غلامی کے خاتمے کے لیے پیش قدم ثابت ہوئے، لیکن جب اس مسئلے پر ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ غلامی کا نہ صرف خاتمہ ہی نہیں ہوا، بلکہ یہ پہلے سے زیادہ خطرناک اور وحشت ناک صورت میں ظاہر ہوئی ہے، یعنی قوموں کے استعمار اور ملکوں پر سامراجیت کی صورت میں، وہ اس طرح سے

کہ انفرادی غلامی جتنا جتنا کمزور ہوتی گئی اجتماعی غلامی اور سامراجیت اسی قدر افزوں تر اور قوی تر ہوتی گئی، برطانوی شہنشاہیت اگر انفرادی غلامی کے خاتمے کے لیے پیش قدم ہے تو استعمار اور سامراجیت کے لیے بھی پیش گام دکھائی دیتی ہے۔

مغربی سامراجیوں نے اپنے سامراجی تسلط کے دوران جن جرائم کا ارتکاب کیا ہے وہ نہ صرف غلامی کے دور اسیئے کے جرائم سے کم نہیں بلکہ وسعت اور شدت کے لحاظ سے اس سے چار قدم آگے دکھائی دیتے ہیں۔

حتیٰ کہ سامراج کے چنگل سے آزاد ہونے والے ملکوں میں قوموں کی غلامی کا سلسلہ پھر بھی جاری رہا۔ غلامی سے یہ آزادی ایک نام نہاد سیاسی آزادی تھی، جب کہ آج بھی سامراج کے چنگل سے آزاد ہونے والے ملکوں اور دوسرے کئی ملکوں میں بھی اقتصادی اور ثقافتی غلامی اور استعمار کی حکمرانی ہے۔

یہ صورت حال کیمونسٹ ملکوں میں تو خصوصیت کے ساتھ جاری ہے، آزادی کا دم بھرتے اور غلامی کے خاتمہ کے لیے دوسروں سے زیادہ شور مچاتے ہیں حالانکہ وہ خود ایک شرمناک قسم کی بردہ داری میں گرفتار ہیں۔

جو لوگ ان ملکوں میں رہتے ہیں وہ غلاموں کے مانند بالکل بے اختیار ہیں اور ان ملکوں کے باشندوں کے تمام اختیار کیمونسٹ پارٹی کے لیڈروں کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر کوئی شخص اختلاف رائے کا اظہار کرتا ہے تو اسے یا تو جبری کام کے مراکز میں بھیج دیا جاتا ہے یا پھر زندان کی کال کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جاتا ہے اور اگر اس کا شمار دانشوروں میں ہو تو اسے نفساتی مریض قرار دے کر پاگل خانے میں بھیج دیا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ غلامی نام کے تابع نہیں ہے، جو چیز ناپسندیدہ اور بری ہے وہ ہے اصل غلامی اور اس کا حقیقی مفہوم اور ہر ایک کو معلوم ہے کہ یہ مفہوم سامراجی تسلط میں موجود اور کیمونسٹ ممالک میں بدترین صورت میں موجود اور معمول ہے۔

خلاصتاً کلام یہ کہ آج کی دنیا میں غلامی کے خاتمے کی ایک ظاہری صورت تھی جس نے حقیقت میں ایک نئی صورت اختیار کر لی ہے۔

(iii) ماضی میں غلاموں کا دردناک انجام:

تاریخی لحاظ سے غلاموں کی ایک نہایت دردناک تاریخ ہے اور وہ ساری زندگی اندوہناک انجام سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر (SRARTA) کے غلاموں کی تاریخ کو لے لیجیے جو کہ بزعم خود ایک متمدن قوم تھی، کتاب "روح القوانین" کے مصنف کے بقول (SPARTA) کے غلام اس قدر مصیبت زدہ تھے کہ ان میں سے کوئی بھی غلام کسی فرد واحد کا غلام نہیں ہوتا تھا بلکہ تمام معاشرے کا غلام ہوتا تھا اور ہر شخص کسی بھی قانونی خوف کے بغیر اپنے یا کسی دوسرے کے غلام کو جتنا چاہتا دکھ اور ایذائیں پہنچاتا۔ درحقیقت اس معاشرے کے غلاموں کی زندگی حیوانات سے بھی بدتر تھی۔

جب کسی پسماندہ ملک سے غلاموں کا شکار کیا جاتا تھا، شکار کے وقت سے لے کر منڈیوں تک لانے کے عرصے میں بہت سے غلام مر جایا کرتے تھے، جو بچ جاتے تھے وہ لالچی بردہ فروشوں کی کمائی کا ذریعہ بنتے تھے، انہیں

کھانے کو صرف اس حد تک دیا جاتا کہ جس سے وہ جسم اور روح کا رشتہ بحال رکھ سکتے اور کام بجا لاتے تھے۔ جب وہ بوڑھے ہو جاتے یا کسی جان لیوا بیماری کا شکار ہو جاتے تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا اور وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتے۔

لہٰذا تاریخی طور پر غلامی کا نام اپنے ساتھ ہولناک جرائم کی ایک تفصیلی داستان رکھتا ہے۔

یہ چند موٹے موٹے نکات اجمالی طور پر بیان کرنے کے بعد ہم اسلام کے غلاموں کو بالتدریج آزاد کرنے کے منصوبے پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔

(۱۷) غلاموں کی آزادی کے لیے اسلام کا منصوبہ:

جس چیز پر عام طور سے زیادہ توجہ نہیں دی جاتی وہ یہ ہے کہ اگر کوئی غلط نظام کسی معاشرے میں رواج پا جائے تو اسے ختم کرنے کے لیے ایک مدت درکار ہوتی ہے اور اس سلسلے میں کوئی بھی اقدام جو سوچے سمجھے منصوبے کے بغیر کیا جائے اس کا نتیجہ اُلٹا نکلتا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے کوئی شخص کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو جائے اور اس کی یہ بیماری اپنی انتہا تک پہنچ چکی ہو، یا جیسے کوئی شخص کسی بُری عادت کا شکار ہو جائے اور اس کی یہ عادت سالہا سال سے اس میں راسخ ہو چکی ہو تو ایسے حالات میں ایک تدریجی شیڈول کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے تحت اس کا علاج کیا جاتا ہے تب کہیں جا کر کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہیں کہ اگر اسلام ایک عمومی حکم کے ذریعہ اس زمانے کے تمام غلاموں کی آزادی کا حکم دے دیتا ہے تو قوی امکان تھا کہ ان میں سے اکثر و بیشتر غلام تباہی و بربادی کا شکار ہو جاتے، کیونکہ بعض مقامات پر تو نصف سے زیادہ آبادی غلاموں کی تھی، جن کا نہ تو کوئی مستقل ذریعہ معاش تھا، نہ سر چھپانے کے لیے اپنا گھر اور نہ ہی پیٹ پالنے اور زندہ رہنے کے لیے کوئی اور ذریعہ۔

اگر ایک مقررہ دن اور مقررہ وقت پر وہ سب آزاد ہو جاتے تو معاشرے کا ایک بہت بڑا حصہ بے کار اور بے روزگار ہو جاتا، جس سے ایک تو ان کی اپنی زندگی خطرے میں پڑ جاتی اور دوسرے ممکن تھا کہ معاشرے کے نظم و نسق میں خلل پڑ جاتا اور جب ہر طرف سے انہیں مایوسیوں اور محرومیوں کا سامنا کرنا پڑتا تو وہ ہر ایک پر حملہ آور ہوتے جس سے خانہ جنگی اور خوں ریزی کا زبردست اندیشہ تھا۔

اسی لیے ضروری معلوم ہوا ہے کہ غلاموں کو تدریجی طور پر آزاد کیا جائے تاکہ وہ ماحول اور معاشرے میں رچ بس جائیں جس سے نہ تو انہیں خود کو کسی قسم کا خطرہ ہو اور نہ ہی معاشرے کے لیے امن و امان کا مسئلہ کھڑا ہو۔ لہٰذا اسلام نے بھی ٹھیک اسی سوچے سمجھے منصوبے کو اپنایا ہے۔

اس قسم کے منصوبے کو کئی طرح سے عملی جامہ پہنانے کا حکم دیا گیا ہے، جس کے اہم پہلوؤں کو ہم دفعات کی صورت میں فہرست وار بیان کرتے ہیں۔ البتہ اس کی تفصیل کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

دفعہ ۱۔ "غلامی کی بیخ کنی": تاریخی لحاظ سے غلامی کے کئی مختلف اسباب ملتے ہیں۔ صرف جنگ ہی میں گرفتار ہونے

والے قیدیوں کو غلام نہیں بنایا جاتا تھا، بلکہ جو مقروض اپنا قرض ادا نہیں کر سکتے تھے انہیں بھی غلام بنا لیا جاتا تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ زور، غلبہ اور طاقت بھی غلام بنانے کے اسباب تھے۔ طاقت ور ملک مختلف اسلحہ سے مسلح کرکے اپنے افراد افریقہ اور اس جیسے دوسرے پسماندہ ملکوں میں بھیجتے تھے اور وہ وہاں پر جا کر ٹولیوں اور گروہوں کی صورت میں انسانوں کا شکار کرتے تھے اور انہیں قیدی بنا کر کشتیوں کے ذریعے ایشیائی اور یورپی ممالک کی منڈیوں میں جاکر بیچ ڈالتے تھے۔

اسلام نے ان تمام مسائل کی روک تھام کی ہے اور صرف ایک موقعہ پر غلام بنانے کی اجازت دی ہے اور وہ ہے، جنگی قیدیوں کے بارے میں اور وہ بھی ضروری طور پر نہیں بلکہ جیسا کہ ہم مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں بتا چکے ہیں، اس بات کی اجازت بھی دے دی تھی کہ یا تو انہیں غیر مشروط طور پر رہا کر دیں یا فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔

اس زمانے میں قید خانے نہیں ہوتے تھے کہ جنگی قیدیوں کو ان کا انجام واضح ہونے تک قید خانوں میں رکھا جاتا۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ انہیں مختلف کنبوں میں تقسیم کرکے، غلاموں کی صورت میں ان کی نگہداشت کی جاتی۔

ظاہر ہے کہ جب مذکورہ صورت تبدیل ہو جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسیروں کے بارے میں امام المسلمین غلامی کا حکم صادر کرے وہ "من" اور "فداء" کے ذریعے سے انہیں آزاد کر سکتا ہے، کیونکہ اسلام نے مسلمانوں کو اس بارے میں اجازت دے رکھی ہے کہ وہ مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مذکورہ صورتوں میں سے کوئی ایک اپنا لیں۔ اس طرح اسلام میں غلامی کا راستہ تقریباً بند ہو جاتا ہے۔

دفعہ ۲ "آزادی کی راہیں": اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے کا ایسا وسیع منصوبہ تشکیل دیا ہے کہ اگر مسلمان اس پر عمل کرتے تو سب کے سب غلام تدریجاً اور نہایت ہی قلیل مدت میں آزاد ہو جاتے اور اسلامی معاشرے میں گھل مل کر اس کا جزو بن جاتے۔ اس منصوبے کے چیدہ چیدہ اصول یہ ہیں:

(الف) اسلام میں زکوٰۃ کے آٹھ مصرف ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس سے غلاموں کو خرید کر آزاد کر لیا جا سکے۔ (ملاحظہ ہو سورۂ توبہ/۶۰)

اس طرح سے اسلامی بیت المال میں ایک مستقل اور دائمی حصہ مقرر کیا گیا ہے تاکہ غلاموں کی مکمل آزادی کا سلسلہ جاری رہے۔

(ب) اس مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اسلام میں کچھ قوانین وضع کیے گئے ہیں جن کی رُو سے غلام اپنے آقا سے ایک طرح کا سمجھوتہ کرتا ہے اور عہد و پیمان باندھتا ہے جس کی رُو سے وہ اپنی محنت و مشقت سے حاصل کی ہوئی رقم سے آزاد ہو جاتا ہے۔ (اس بارے میں اسلامی فقہ میں "مکاتبۃ" کے عنوان سے ایک مستقل فصل موجود ہے)۔[۱]

(ج) اسلام میں غلاموں کی آزادی کو بہترین عبادات میں سے اور عمل خیر قرار دیا گیا ہے اور اس بارے میں پیشوایان اسلام پیش پیش نظر آتے ہیں جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام کے حالات میں مورخین نے لکھا ہے کہ:

---

[۱] "مکاتبۃ" کے بارے میں اور اس کے دلچسپ احکام کے متعلق ہم نے تفسیر نمونہ چودھویں جلد میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

"اعتق الف مملوک من کد یدہ"

"آپ نے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے ایک ہزار غلام آزاد کیے"۔ [1]

(د) اسلام کے عظیم رہبر اور آئمہ اطہار علیہم السلام بہانے بہانے سے غلاموں کو آزاد کر دیا کرتے تھے تاکہ اس طرح وہ غلاموں کی آزادی کے لیے دوسرے لوگوں کے لیے نمونہ قرار پائیں۔ چنانچہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے ایک غلام نے ایک معمولی سا اچھا کام انجام دیا تو امامؑ نے اسے فرمایا:

"اذھب فانت حرفانی اکرہ ان استخدم رجلاً من اھل الجنۃ"۔

"جاؤ! تم آزاد ہو، کیونکہ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ اہل بہشت میں سے کسی سے خدمت لوں"۔ [2]

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے حالات میں ملتا ہے کہ:

"آپ کا غلام آپؑ کے سر پہ پانی ڈال رہا تھا کہ پانی کا برتن اس کے ہاتھ سے گرا جس سے آپ مجروح ہو گئے۔ امام نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو اس نے یہ قرآنی آیت پڑھی "والکاظمین الغیظ" حضرت نے فرمایا "میں نے اپنا غصّہ پی لیا" اس نے کہا "والعافین عن الناس" امام نے فرمایا میں نے تجھے معاف کیا، خدا بھی تجھے معاف کرے"۔ اس نے فوراً کہا "واللہ یحب المحسنین" تو امامؑ نے فرمایا: جاؤ! راہِ خدا میں تم آزاد ہو"۔ [3]

(ھ) بعض اسلامی روایات میں ہے کہ سات سال کے بعد غلام خود بخود آزاد ہو جاتا ہے، جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"من کان مؤمنا فقد عتق بعد سبع سنین، اعتقہ صاحبہ ام لم یعتقہ ولا یحل خدمۃ من کان مؤمنا بعد سبعۃ سنین"۔

"مومن غلام سات سال کے بعد خود بخود آزاد ہو جاتا ہے، خواہ اس کا مالک اسے آزاد کرے یا نہ کرے اور سات سال کے بعد مومن غلام سے خدمت لینا جائز اور حلال نہیں ہے"۔ [4]

---

[1] بحار الانوار جلد ۴۱ ص۴۳۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۶ ص۳۳۔

[3] تفسیر نور الثقلین جلد ۱ ص۳۹۰۔

[4] وسائل الشیعہ جلد ۱۶ ص۳۶۔

اسی باب میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث بھی درج کی گئی ہے، آپ فرماتے ہیں:

"مازال جبرئیل یوصینی بالمملوک حتیٰ ظننت انہ سیضرب لہ اجلا یعتق فیہ"

"مجھے غلاموں کے بارے میں جبرائیل بار بار سفارش کرتے رہے ہیں، جس سے میں یہ سمجھنے لگا کہ بہت جلد ان کی آزادی کی تاریخ مقرر کر دیں گے کہ جس میں وہ آزاد کر دیئے جائیں گے"[1]

(و) جو شخص کسی مشترک غلام کو اپنے حصے کی نسبت آزاد کر دے، اس پر فرض بن جاتا ہے کہ بقیہ حصے کی خریداری کر کے اسے آزاد کرے۔[2]

جو شخص اپنے تمام غلام کے کچھ حصے کو آزاد کر دے تو یہ آزادی اس کے تمام حصوں میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ خود بخود مکمل طور پر آزاد ہو جاتا ہے۔[3]

(ز) جو شخص اپنے والد یا والدہ یا نانا یا نانی یا دادا یا دادی یا اولاد یا چچا یا پھوپھی، ماموں یا خالہ یا بھائی یا بہن یا بھتیجے یا بھانجے یا بھتیجی یا بھانجی کا مالک بن جائے تو وہ فوراً آزاد ہو جاتے ہیں۔

(ح) جب آقا کی اپنی کنیز سے کوئی اولاد ہو جائے تو اس کنیز کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے اور اپنی اولاد کے حصے سے وہ فوراً آزاد کر دی جائے۔

یہ صورت حال بہت سی کنیزوں کی آزادی کا سبب بن جاتی تھی کیونکہ وہ اپنے آقاؤں کی بیوی کی حیثیت سے ہوتی تھیں اور ان سے صاحب اولاد ہو جاتی تھیں۔

(ط) اسلام میں بہت سی خلاف ورزیوں کا کفارہ غلاموں کی آزادی مقرر کیا گیا ہے (مثال کے طور پر قتل خطاً، روزے کو جان بوجھ کر نہ رکھنا اور قسم وغیرہ کے کفارے)۔

(ی) کئی ایسی سخت سزائیں ہیں کہ اگر آقا اپنے غلام کو وہ سزائیں دے تو غلام خود بخود آزاد ہو جاتا ہے۔[4]

دفعہ ۳ "غلاموں کی شخصیت کا احیاء": اسلام نے اس درمیانی مدت کے لیے غلاموں کے حقوق کے احیاء کے لیے وسیع اقدامات کیے ہیں جو وہ اسلامی منصوبے کے تحت آزادی کے لیے طے کر رہے ہوتے ہیں ایسے اقدامات کے تحت جہاں ان کے حقوق کا احیاء مقصود ہوتا ہے وہاں ان کی انسانی شخصیت کے احیاء کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے تاکہ

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۶ ص ۳۷۔

[2] شرائع الاسلام کتاب العتق۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۶ ص ۲۱۔

[3] شرائع الاسلام کتاب العتق۔

[4] وسائل الشیعہ جلد ۱۶ ص ۲۶۔

انسانی شخصیت کے لحاظ سے آزاد اور غلام کا فرق مٹ جائے۔ اسی لیے اسلام نے انسانی شخصیت کا معیار "تقویٰ" قرار دیا ہے، اسی لیے غلاموں کو بھی اجازت دی گئی کہ ہر قسم کے اہم معاشرتی مناصب حتیٰ کہ قاضی جیسے نہایت اہم عہدے پر بھی فائز ہو سکتے ہیں۔[1]

عصر رسالت مآبؐ میں لشکر کی سپہ سالاری سے لے کر دوسرے اہم ترین اور حساس ترین عہدوں پر غلام یا آزاد کردہ غلام فائز رہے ہیں۔

رسولِ اعظمؐ کے بہت سے دوست اور صحابی یا تو غلام تھے یا آزاد غلام تھے اور ان میں سے بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو بزرگانِ اسلام کے معاون و مددگار کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور اس بارے میں سلمان فارسیؓ، عمار یاسرؓ اور قنبرؓ جیسے صحابیوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔

"غزوہ بنی مصطلق" کے بعد رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قبیلے کی ایک آزاد شدہ کنیز سے ازدواج فرمایا اور یہ بات اس قبیلے کے تمام گرفتار شدہ قیدیوں کی آزادی کا بہانہ بن گئی۔

دفعہ ۴ "غلاموں سے انسانی سلوک": اسلام میں غلاموں کے ساتھ نرمی برتنے اور ان کے ساتھ مدارات اور حسن سلوک کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے، حتیٰ کہ انہیں اپنے آقاؤں کے ساتھ زندگی میں حصے دار بھی بنایا گیا ہے، جیسا کہ رسول اللہ فرماتے ہیں:

"جس شخص کا بھائی اس کے زیر دست ہے، اسے چاہیئے کہ جو کچھ وہ خود کھاتا ہے ویسا ہی اسے کھلائے، جو خود پہنتا ہے اسے بھی ویسا پہنائے اور اس کی طاقت سے زیادہ اس سے کام نہ لے۔[2]

حضرت علی علیہ السلام اپنے غلام قنبر سے فرمایا کرتے تھے:

"مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ میں تجھ سے اچھا لباس پہنوں، کیونکہ رسولِ خدا فرمایا کرتے تھے جو کچھ تم خود پہنتے ہو ویسا ہی انہیں پہناؤ اور جو تم خود کھاتے ہو، ویسا ہی انہیں کھلاؤ۔"[3]

امام جعفر صادق علیہ السلام فرمایا کرتے تھے:

"میرے والد جب کسی غلام کو کسی کام کے بجالانے کا حکم دیتے تو اگر وہ کام مشکل ہوتا تو پہلے خود بسم اللہ کہہ کر اسے انجام دیتے اور اس کی امداد کیا کرتے تھے۔[4]

---

[1] شرائع الاسلام، کتاب القضاء۔

[2] بحار الانوار جلد ۷۴، صفحہ ۱۴۱ (حدیث ۱۱)

[3] بحار الانوار جلد ۷۴، صفحہ ۱۴۲ (حدیث ۱۹)

[4] بحار الانوار جلد ۷۴، صفحہ ۱۴۲ (حدیث ۱۴)

اس تدریجی اور عبوری عرصے کے دوران غلاموں کے بارے میں اسلام کے حسن سلوک کا حکم اس حد تک ہے کہ اسلام سے اجنبی افراد بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور اس کی تعریف کی ہے۔

مثال کے طور پر جرجی زیدان (عیسائی مؤرخ) اپنی کتاب تاریخ تمدن میں لکھتے ہیں:

"اسلام، غلاموں کے ساتھ حد سے زیادہ مہربان ہے، پیغمبر اسلام نے غلاموں کے بارے میں بڑی تاکید کی ہے، یہاں تک کہ پیغمبر اسلام کا کہنا ہے: جن کاموں کی بجا آوری غلاموں کے بس کی بات نہیں وہ ان کے ذمے نہ لگائے جائیں، جو کچھ تم کھاتے ہو ویسا ہی غلاموں کو کھلاؤ"

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں: "اپنے غلاموں کو کنیز یا غلام نہ کہو، بلکہ انہیں میرا بیٹا اور میری بیٹی کہہ کر بلایا کرو۔"

قرآن نے بھی غلاموں کے بارے میں بڑی عمدہ سفارشات پیش کی ہیں، چنانچہ کہتا ہے:

"خدا کی عبادت کرو، اس کا شریک مت ٹھہراؤ، ماں باپ، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، بے نواؤں، نزدیک اور دور کے ہمسایوں، دوستوں، بے خانماں لوگوں اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو، خدا خود پسند لوگوں سے بیزار ہے۔" [1]

دفعہ "آدم فروشی کو بدترین فعل بتایا گیا ہے": اصولی طور پر اسلام میں غلاموں کی خرید و فروخت کو بدترین اور سب سے زیادہ قابل نفرت کاروبار قرار دیا گیا ہے، حتیٰ کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ:

"شر الناس من باع الناس"

"بدترین لوگ وہ ہیں جو غلاموں کو بیچتے ہیں۔" [2]

غلاموں کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے لیے یہی بات کافی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی منصوبوں کا رُخ کس طرف کو ہے۔

اس سے بڑھ کر دلچسپ اور جاذب توجہ یہ امر ہے کہ اسلام میں جو گناہ ناقابل معافی شمار کیے گئے ہیں ان میں سے ایک گناہ یہ بھی ہے کہ انسان کی آزادی اور حریت کو سلب کر لیا جائے اور اسے ایک سودے کی صورت میں تبدیل کر دیا جائے۔ جیسا کہ آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے:

"ان اللّٰہ تعالیٰ غافر کل ذنب الا من جحد مهراً، او اغتصب اجيراً اجره، او باع رجلاً حراً"

"خدا تین گناہوں کے علاوہ دوسرے سب گناہ معاف کر دے گا: جو شخص اپنی زوجہ کے

---

[1] تاریخ تمدن اسلام جلد ۴ ص ۴۵۔

[2] مستدرک الوسائل جلد ۲ کتاب التجارۃ باب ۱۰ حدیث ۱۔

مہر کا انکار کر دے ۲۔ مزدور کی مزدوری غصب کرلے ۳۔ کسی انسان کو بیچ ڈالے۔ [1]

اس حدیث کی رُو سے عورتوں کے حقوق کا غصب کرنا، مزدور کی مزدوری کا غصب کرنا اور انسانی آزادی کا چھین لینا تین ناقابل معافی گناہ ہیں۔

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام نے صرف ایک موقع پر غلام بنانے کی اجازت دی ہے اور وہ بھی جنگی قیدیوں کو اور وہ بھی ہرگز لازمی نہیں ہے، جبکہ ظہور اسلام کے زمانے میں اور اس کے کئی صدیاں بعد تک طاقت کے ذریعے اور سیاہ فام لوگوں کے ملکوں پر حملہ کر کے آزاد انسانوں کو گرفتار کر کے انہیں غلام بنانے کا طریقۂ کار عام تھا اور بعض اوقات تو وحشت ناک تعداد میں اس قسم کے غلاموں کا سودا کیا جاتا یہاں تک کہ ۱۸ ویں صدی عیسوی کے آخر میں حکومت برطانیہ سالانہ دو لاکھ انسانوں کو غلاموں کی صورت میں فروخت کیا کرتی تھی اور ہر سال ایک لاکھ انسانوں کو افریقہ سے پکڑ کر غلاموں کی صورت میں انہیں امریکہ لے جایا جاتا۔ [2]

مختصر یہ کہ جو لوگ غلاموں کے بارے میں اسلام کی حکمت عملی پر اعتراض کرتے ہیں انہوں نے دُور ہی سے اس بارے میں کچھ سُن رکھا ہے اور اس پروگرام کے اصولوں اور اسلام کے ہدف سے قطعاً ناآشنا ہیں، کیونکہ اسلام کا اصولی پروگرام غلاموں کی تلخی کے بغیر تدریجی آزادی ہے۔ یا وہ لوگ پھر ان مفاد پرستوں کی باتوں میں آکر ایسی باتیں کرتے ہیں جنہوں نے اپنے خیال میں اسے اسلام کا زبردست کمزور نقطہ سمجھ لیا ہے اور اسی چیز کو لے کر اسلام کے خلاف پروپیگنڈے میں مصروف ہیں۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۴ ص ۱۶۰ (حدیث ۱۱)

[2] تفسیر المیزان جلد ۶ ص ۳۶۰۔

۷۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ○

۸۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ○

۹۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ○

۱۰۔ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۡ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ○

۱۱۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ○ ع

ترجمہ

۷۔ اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! اگر تم خدا کی مدد کروگے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔

۸۔ اور جو لوگ کافر ہیں وہ مر جائیں اور ان کے اعمال اکارت ہوں۔

۹۔ یہ اس لیے کہ خدا نے جو چیز نازل فرمائی انہوں نے اسے ناپسند کیا تو خدا نے ان کے اعمال کو حبط کر دیا۔

۱۰۔ تو کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں تاکہ دیکھتے کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا انجام کیا ہوا؟ خدا نے انہیں ہلاک کر دیا اور کافروں کے لیے اسی طرح کی سزا ہوگی۔

۱۱۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ خدا ایمان داروں کا مولا اور سرپرست ہے، لیکن کافروں کا کوئی سرپرست نہیں۔

تفسیر

تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کریگا

یہ آیات مثل سابق مومنین کو دشمنان حق کے خلاف قیام کی ترغیب دے رہی ہیں اور دلکش تعبیر کے ساتھ انہیں جہاد پر آمادہ کر رہی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے، "اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کریگا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔ (یاایھا الذین امنوا ان تنصروا اللہ ینصرکم و یثبت اقدامکم)۔

"ایمان کے مسئلے پر تاکید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سچے دل سے ایمان کی ایک علامت دشمنان دین کے ساتھ جنگ ہے۔

خدا کی مدد کرنے کا مطلب واضح ہے کہ اس کے دین کی مدد کی جائے، اس کے پیغمبرؐ کی نصرت کی جائے، پیغمبرؐ کی شریعت اور تعلیمات کی نصرت کی جائے۔ اسی لیے قرآن مجید کی دوسری آیات میں خدا اور رسولؐ کی نصرت ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ مذکور ہوئی ہیں، جیسا کہ سورہ حشر کی آٹھویں آیت میں ہے:

"وینصرون اللہ ورسولہ اولٰئک ھم الصادقون"

باوجودیکہ خدا کی قدرت بے انتہا ہے اور مخلوق کی قدرت اس کے مقابلے میں بالکل ہی ناچیز ہے، لیکن پھر بھی "خدا کی مدد" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں تاکہ جہاد اور آئین حق کے دفاع کی اہمیت واضح کی جائے اور اس سے بڑھ کر اس موضوع کے لیے کوئی اور باعظمت تعبیر نہیں مل سکتی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خدا نے اپنے دین کے دفاع کے بدلے جو وعدہ مجاہدین سے کیا ہے وہ کیا ہے؟ ارشاد ہوتا ہے: "خدا تمہاری مدد کرے گا" لیکن کس طریقے سے؟ بہت سے طریقے ہیں: تمہارے دل میں نور ایمان، تمہاری روح میں تقویٰ، تمہارے ارادوں میں قوت اور تمہارے افکار میں اطمینان ڈال کر۔

پھر یہ بھی کہ فرشتے تمہاری امداد کے لیے بھیجتا ہے، حالات کا دھارا تمہارے حق میں موڑ دیتا ہے، لوگوں کے دلوں کو تمہاری طرف پھیر دیتا ہے، تمہاری باتوں میں تاثیر بخشتا ہے، تمہاری سرگرمیوں کو مفید اور نتیجہ خیز بناتا ہے، غرض خدا کی مدد تمہارے جسم و جان اور تمہارے ظاہر و باطن پر چھا جاتی ہے۔

لیکن امداد کی مذکورہ تمام صورتوں میں "ثبات قدم" کے مسئلے پر زیادہ زور دیا گیا ہے، کیونکہ دشمن کے مقابلے میں

استقامت اور پامردی میں کامیابی کا سب سے زیادہ اور اہم راز پوشیدہ ہے اور میدان جنگ میں انہیں کامیابی حاصل ہوتی ہے جو ثبات قدم اور استقامت کا زیادہ ثبوت پیش کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کے عظیم سپہ سالار حضرت طالوت کی ایک ستم گار، خونخوار اور طاقت ور بادشاہ جالوت کے ساتھ جنگ کے واقعے میں ہے کہ جب مومنین کی مختصر سی تعداد جو طالوت کے ساتھ تھی، طاقتور دشمن کے مقابلے میں آئی تو کہا:

"ربنا افرغ علینا صبرًا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین"

"خداوندا! تو ہمارے لیے صبر و استقامت کی فراوانی کر دے اور ہمارے قدموں میں ثبات عطا فرما اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما" (بقرہ- ۲۵۰)

چنانچہ اس کے بعد کی آیت میں ہے:

"فھزموھم باذن اللہ"

"طالوت کے ساتھیوں نے جالوت کے طاقت ور لشکر کو حکم الٰہی سے شکست دے دی"

یقیناً! ثبات قدم کا نتیجہ دشمن پر مکمل فتح اور کامرانی ہوتا ہے۔

چونکہ بعض اوقات دشمن کا جم غفیر اور ان کی افرادی قوت اور مختلف قسم کے اسلحہ جات مجاہدین راہ حق کے افکار کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں، لہٰذا بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: اور جو لوگ کافر ہیں وہ ہلاک ہوں اور ان کے اعمال برباد ہوں (والذین کفروا فتعسًا لھم واضل اعمالھم)۔[1]

"تعس" (بروزن "نحس") کا معنی ڈگمگانا اور منہ کے بل گرنا ہے، بعض لوگوں نے اس کا معنی ہلاکت، انحطاط اور پستی بیان کیا ہے۔ انہوں نے درحقیقت اس کے نتیجے کو بیان کیا ہے۔

بہرصورت ان دونوں گروہوں کے درمیان تقابل بڑی حد تک بامعنی ہے۔ پہلے مومنین کے بارے میں فرمایا گیا ہے: "انہیں ثابت قدم رکھے گا" لیکن کافروں کے متعلق فرمایا گیا ہے: "انہیں سقوط و لغزش نصیب ہو" اور وہ بھی نفرین کی صورت میں کہ جس کی گہرائی اور گیرائی واضح ہے۔

جی ہاں! جب بے ایمان لوگ لغزش کرتے ہیں تو کوئی بھی انہیں سہارا نہیں دے سکتا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ شکست کھا جاتے ہیں، لیکن مومنین کی امداد کے لیے فرشتے موجود ہوتے ہیں جو انہیں بڑھ کر تھام لیتے ہیں اور انہیں لغزش اور ڈگمگاہٹ سے فورًا بچا لیتے ہیں۔ جیسا کہ ایک اور جگہ پر خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

---

[1] "تعسًا" ایک فعل مقدر کا مفعول مطلق ہے جس کی تقدیر یوں ہے "تعسھم تعسًا" اور "اضل اعمالھم" کا جملہ اسی فعل مقدر پر عطف ہے اور دونوں جملے نفرین کی صورت میں ہیں، جیسے "قاتلھم اللہ" اور ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے نفرین اس کے وقوع پذیر ہونے کے معنی میں ہے

"ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیہم الملائکۃ"

(حٰم سجدہ/۳۰)

مومنین کے اعمال میں برکت ہوتی ہے، لیکن کفار کے اعمال برکت سے خالی ہوتے ہیں جو بہت جلد نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

بعد کی آیت ان کے سقوط اور ان کے اعمال کی بربادی کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہے : یہ اس لیے کہ خدا نے جو چیز نازل فرمائی انہوں نے اسے ناپسند کیا تو خدا نے بھی ان اعمال کو اکارت کر دیا۔ (ذالک بانھم کرھوا ما انزل اللہ فاحبط اعمالھم)۔

خدا نے ہر چیز سے پہلے آئین توحید کو نازل فرمایا، لیکن انہوں نے اس سے منہ موڑ لیا اور شرک کی طرف متوجہ ہو گئے خدا نے حق و عدالت اور طہارت و تقوٰی کا حکم دیا، لیکن انہوں نے اس کی طرف بھی پیٹھ کر لی اور ظلم و فساد کو اپنا لیا، حتّی کہ جب ان کے سامنے خدا ئے وحدہٗ لاشریک کا نام لیا جاتا تو وہ اس سے بھی اظہار نفرت کرتے، جیسا کہ سورۂ زمر کی ۴۵ ویں آیت میں ہے۔

"واذا ذکر اللہ وحدہ اشمأزت قلوب الذین لا یؤمنون بالآخرۃ"

جی ہاں! جب یہ لوگ ان چیزوں سے متنفر ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس راہ میں قدم بھی نہیں اُٹھاتے بلکہ ان کی تمام سعی و کوشش باطل کی راہوں پر گامزن ہونے میں صرف ہوتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے اعمال اکارت ہو جاتے ہیں۔

ایک روایت میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

"کرھوا ما انزل اللہ فی حق علی"

"ان لوگوں نے ہر اس چیز کو ناپسند کیا جو خدا نے علی علیہ السلام کے حق میں نازل کی"۔[1]

البتہ "ما انزل اللہ" کی تعبیر ایک وسیع معنی کی حامل ہے، جس کا ایک روشن اور واضح مصداق امیرالمومنین علیہ السلام کی ولایت کا مسئلہ بھی ہے نہ یہ کہ مفہوم اسی میں منحصر ہے۔

قرآن مجید بہت سے مقامات پر ظالموں کو "حسّی نمونے" دکھاتا ہے لہٰذا یہاں پر بھی انہیں گذشتہ اقوام کے حالات کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے، تو کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں، تاکہ دیکھتے کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا کیا انجام ہوا، وہی جنہوں نے کفر و سرکشی کی راہیں اختیار کیں اور خدا نے انہیں ہلاک کر دیا۔ (افلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم دمر اللہ علیھم)۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان انہی آیات کے ذیل میں۔

وہ یہ گمان نہ کریں کہ اس قسم کا دردناک انجام گذشتہ اقوام کے سرکش لوگوں کے لیے مخصوص تھا اور وہ بچ جائیں گے، نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ "مشرکین اور کفار کے لیے بھی اس قسم کی سزا ہوگی"۔ (وللکافرین امثالھا)۔ [1]

وہ اس بات کی توقع ہرگز نہ رکھیں کہ ان جیسے کردار کا مظاہرہ بھی کریں گے اور ان جیسے انجام سے دوچار بھی نہیں ہوں گے، انہیں چاہیئے کہ گزشتہ لوگوں کے آثار بھی دیکھیں اور اپنے مستقبل اور انجام کا بھی ان کی زندگی کے آئینے میں مشاہدہ کریں۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ "دمر" "تدمیر" کے مادہ سے ہے جس کا اصل معنی "ہلاک کرنا" ہے، لیکن جب "علی" کے ساتھ مذکور ہو تو اس کا معنی ہر چیز کو حتیٰ کہ انسان کا اپنی اولاد، خاندان اور مخصوص اموال کو ملیامیٹ اور نیست و نابود کرنا ہوتا ہے [2] اس طرح سے یہ تعبیر ایک بہت بڑی دردناک مصیبت کی نشاندہی کر رہی ہے اور خاص کر جب لفظ "علی" پر توجہ مرکوز کی جائے کہ جو کسی کام پر تسلط اور غلبہ کے لیے استعمال ہوتا ہے، تو اب پورے جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے ان اقوام پر، ان کے اموال پر اور ان کی تمام پسندیدہ چیزوں پر ہلاکت اور تباہی و بربادی کو گرا دیا۔

"زمین میں چلنے پھرنے" کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۲ (سورۂ آلِ عمران کی ۱۳۷ ویں آیت) کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اسی طرح سولہویں جلد میں اسی ضمن میں بات کی گئی ہے۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں خدا نے مومنین کو اپنی مکمل حمایت کی یقین دہانی کرواتے ہوئے سرکش کفار کی نابودی کی خبر دی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ خدا ایمان داروں کا مولا اور سرپرست ہے، لیکن کافروں کا کوئی مولا نہیں ہے۔

(ذالک بان اللہ مولی الذین امنوا وان الکافرین لا مولی لھم)۔ [3]

"مولی" بمعنی "ولی"، سرپرست، دوست اور مددگار ہے۔ تو اس لحاظ سے خدا نے مومنین کی ولایت، سرپرستی اور امداد کو اپنے ذمے لیا ہے اور کافروں کو اس اپنی ولایت کے دائرے سے نکال دیا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ جو لوگ اس کی ذات پاک کی ولایت کے زیرِ سایہ ہوتے ہیں، خدا ان کے ہر آڑے وقت میں مدد فرماتا ہے اور ثباتِ قدمی عطا فرماتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنے گوہرِ مراد کو پا لیتے ہیں، لیکن جو لوگ اس دائرے سے خارج ہوتے ہیں ان کے اعمال کو اکارت کر دیتا ہے اور انجام کار وہ ہلاکت سے دوچار ہوتے ہیں۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ زیرِ تفسیر آیت میں اللہ کو صرف "مومنین کا مولا" کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے جب کہ دوسری بعض آیات میں کافروں کا مولا بھی بتایا گیا ہے، مثلاً سورۂ یونس کی تیسویں آیت میں ہے۔

"وردوا الی اللہ مولاھم الحق وضل عنھم ما کانوا یفترون"۔

---

[1] "امثالھا" کی ضمیر "عاقبۃ" کی طرف لوٹ رہی ہے، جو پہلے جملے سے سمجھی جاتی ہے۔

[2] تفسیر روح المعانی، تفسیر روح البیان اور تفسیر فخر الرازی۔

[3] "ذالک" کا اشارہ ایسے مومنین کو نیک انجام اور کفار کا برا انجام ہے جن کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہو چکا ہے۔

"وہ اپنے حقیقی مولا خدا کی طرف لوٹائے جائیں گے اور جن بتوں کو وہ جھوٹ سے خدا کا شریک گردانتے تھے وہ غائب اور نابود ہو جائیں گے۔"

اگر ایک نکتے کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ ایک بات واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کی "ولایت عامہ" یعنی خالق اور مدبر ہونا سب کے لیے ہے، لیکن اس کی "ولائیت خاصہ" کہ جس میں اس کی طرف سے حمایت بھی شامل ہے، صرف مومنین کے شامل حال ہوتی ہے۔[1]

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت قرآن کی تمام دوسری آیات سے زیادہ امید بخش ہے یعنی "ارجی آیۃ فی القرآن" ہے۔ کیونکہ یہ تمام مومنین ہیں، خواہ وہ عالم ہیں یا جاہل، زاہد ہیں یا راغب، چھوٹے ہیں یا بڑے، مرد ہیں یا عورت اور بوڑھے ہیں یا جوان، یہ آیت ان سب مومنین کے لیے پروردگار عالم کی خاص عنایت اور حمایت کی نشاندہی کرتی ہے، حتیٰ کہ گناہگار مومنوں کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کرتی۔ خدا نے سخت حوادث اور جانکاہ مصائب میں اپنی حمایت کے نمونے دکھا چکا ہے اور ہر شخص اپنی زندگی میں اس چیز کو ضرور محسوس کرتا ہے اور تاریخ میں بھی اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی جنگ سے واپسی پر ایک درخت کے نیچے اکیلے بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک مشرک نے تلوار نیام سے نکال کر آپ پر تان کر کہا:

"من یخلصك منی؟"

"اب بتاؤ کہ تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟"

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے برجستہ فرمایا: اللہ! یہ سن کر اس مشرک کے پاؤں ڈگمگا گئے۔ وہ زمین پر گر پڑا اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

رسول اللہؐ نے وہ تلوار اٹھا کر فرمایا: "اب تم بتاؤ کہ تمہیں میرے ہاتھوں سے کون چھڑا سکتا ہے؟" تو اس نے کہا، کوئی نہیں! یہ کہا اور ایمان لے آیا۔[2]

جی ہاں! خدا تمام مومنین کا مولا ہے اور کفار کا نہ تو کوئی مولا ہے اور نہ ہی کوئی پناہ گاہ۔

---

[1] بعض مفسرین مثلاً آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں زیر نظر آیت کی تفسیر کے سلسلے میں "مولا" کا معنی "ناصر" اور سورۂ یونس کی آیت جیسی آیات میں مولا کا معنی "مالک" لکھا ہے۔

[2] تفسیر روح البیان جلد ۸ ص۔

۱۲۔ إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَهُمْ ۝

۱۳۔ وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِنْ قَرْيَتِكَ الَّتِي أَخْرَجَتْكَ أَهْلَكْنَاهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۝

۱۴۔ أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّهِ كَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ ۝

ترجمہ

۱۲۔ خدا ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے اور اچھے اچھے کام کرتے رہے، بہشت کے ان باغات میں پہنچا دے گا، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور جو کافر ہیں وہ دُنیا کی جلد ختم ہونے والی متاع سے استفادہ کرتے ہیں اور چوپایوں کے مانند کھاتے ہیں اور آخر ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

۱۳۔ اور جس شہر نے تجھے نکال دیا، کتنے شہر تھے جو اس سے زیادہ طاقت ور تھے کہ جنہیں ہم نے تباہ و برباد کر دیا اور کوئی ان کا مددگار بھی نہیں تھا۔

۱۴۔ تو کیا جو شخص اپنے پروردگار کی طرف سے روشن دلیل رکھتا ہو اس شخص کے برابر ہو

سکتا ہے، جس کی بداعمالیاں اسے بھلی کر کے دکھائی گئی ہوں اور وہ اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرتا ہو؟۔

تفسیر

مُؤمنین اور کفار کا انجام:

گذشتہ آیات میں حق و باطل اور ایمان و کُفر کی مُسلسل آویزش کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ اب ان آیات میں ایک واضح تقابل کے ذریعے مومنین اور کفار کا انجام بیان کیا جا رہا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ دونوں گروہ دُنیا ہی کی زندگی میں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں، بلکہ آخرت میں بھی ان کی زندگی میں زبردست فرق ہوگا ارشاد ہوتا ہے: خدا ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے اور اچھے اچھے کام کرتے رہے بہشت کے ان باغات میں پہنچا دیگا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں (ان اللہ یدخل الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات جنات تجری من تحتها الانهار)۔

جبکہ کافر لوگ دُنیا کی زود گزر متاع سے استفادہ کرتے ہیں اور چوپایوں کے مانند کھاتے ہیں اور آخر ان کا ٹھکانا جہنم ہے (والذین کفروا یتمتعون ویأکلون کما تأکل الانعام والنار مثوی لهم)۔[1]

یہ ٹھیک ہے کہ دونوں قسم کے لوگ اسی دنیا میں رہ رہے ہیں اس کی نعمتوں سے بہرہ مند بھی ہو رہے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ مومنین کی زندگی کا مقصد ایسے اعمال صالح کی بجا آوری ہے جو مفید، تعمیری اور رضائے الٰہی کے حصول کا سبب ہوتے ہیں، جبکہ کفار کی زندگی کا اصل مقصد صرف کھانا پینا اور سونا اور دنیاوی لذتوں سے لطف اندوز ہونا ہوتا ہے۔

مومنین کا ہر ایک اقدام معرفت پر مبنی ہوتا ہے، جب کہ کفار بے مقصد زندگی گزارتے ہیں اور بے مقصد موت کو اختیار کرتے ہیں بالکل ویسے ہی جیسے چوپائے ہوتے ہیں۔

مومنین نے دنیاوی زندگی میں اپنے لیے بہت سی شرائط اور حدیں عائد کر رکھی ہیں وہ دُنیاوی امور کے جواز حصُول اور مصرف کی کیفیت کے سلسلے میں بڑی سوچ و بچار سے کام لیتے ہیں، لیکن کفار چوپایوں کے مانند ہوتے ہیں جنہیں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ یہ چارہ ان کے مالک کا ہے یا غصبی؟ کسی یتیم اور بیوہ کا اس میں حق ہے یا

---

[1] "کما یأکل..." ایک مقدر مفعول مطلق کے مقام نصب پر ہے، اصل میں یوں ہے: یأکلون اکلا کما یأکل الانعام۔

پاتے نہیں۔

مؤمنین جب کبھی دنیاوی نعمت سے استفادہ کرتے ہیں تو اس کے عطا کرنے والے کے بارے میں سوچتے ہیں، اس نعمت میں اُس کی آیات کو دیکھتے ہیں اور منعم حقیقی کا شکر بجا لاتے ہیں۔ جب کہ کفار کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے اور کسی چیز کے بارے میں سوچے بغیر اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ہمیشہ اپنے ظلم و گناہ کے بوجھ میں اضافہ کرتے رہتے ہیں، خود کو ہلاکت کے نزدیک کرتے رہتے ہیں بالکل ویسے ہی جیسے کوئی موٹی تازہ بکری جتنا زیادہ کھاتی جاتی ہے اتنا ہی زیادہ موٹی ہوتی جاتی ہے اور ذبح ہونے کے زیادہ قریب ہوتی جاتی ہے۔

بعض مفسرین نے ان دونوں گروہوں کا باہمی فرق ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"ان المؤمن لا یخلو اکلہ عن ثلاث، الورع عند الطلب، واستعمال الادب، والاکل للسبب، والکافر یطلب للنھمۃ، ویأکل للشھوۃ وعیشہ فی غفلۃ"

"مؤمن کا کھانا تین صورتوں سے خالی نہیں ہوتا، کھانے کے حصول میں پرہیزگاری، ادب کو کام میں لانا اور صرف میں مقصد کو پیش نظر رکھنا، جب کہ کافر کی طلب روزی غیر مشروط، اس کا کھانا شہوت کے لیے اور اس کی تمام زندگی غفلت میں گزرتی ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ مؤمنین کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ "خدا انہیں بہشت کے باغوں میں پہنچا دیگا" لیکن کفار کے متعلق فرمایا گیا ہے "ان کا ٹھکانا جہنم ہے"؛ پہلی تعبیر اہلِ ایمان کے احترام اور ان کی طرف توجہ کی غماز ہے۔ جب کہ دوسری تعبیر کفار کی تحقیر اور ان سے بے اعتنائی کی آئینہ دار ہے کیونکہ وہ خدا کی ولایت کے دائرے سے نکل چکے ہیں۔

بعض مفسرین نے "والنار مثوی لھم" (جہنم کی آگ ان کا ٹھکانا ہے) کے جملے سے یہ سمجھا ہے کہ وہ اس وقت بھی جہنم میں ہیں۔ ان کے بقول کیونکہ یہ جملہ فعل مضارع اور مستقبل کی صورت میں نہیں ہے بلکہ حال کی خبر دے رہا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ ان کے اپنے کردار اور کرتوت ہی آگ ہیں جس میں وہ گرفتار ہیں اور وہ انھیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے ہر چند کہ یہ حیوان صفت لوگ اس چیز سے غافل اور بے خبر ہیں چنانچہ ہم سورۂ توبہ کی آیت ۴۹ میں پڑھتے ہیں،

"وان جھنم لمحیطۃ بالکافرین"

"جہنم نے کافروں کو ہر طرف سے گھیرا ہوا ہے۔"

قرآن مجید کی کچھ اور آیات میں بھی ان جہنمیوں کو چوپایوں سے تشبیہ دی گئی ہے، بلکہ انہیں ان سے بھی بدتر گردانا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"اولٰئک کالانعام بل ھم اضل اولٰئک ھم الغافلون" (اعراف/۱۷۹)

"یہ لوگ چوپایوں کے مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی بدتر یہ غافل لوگ ہیں۔

اس کی مفصل تشریح ہم تفسیر نمونہ کی ساتویں جلد کے ابتدائی حصے میں پیش کر چکے ہیں۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے بعد کی آیت میں مشرکین مکہ اور سابقہ دور کے بت پرستوں کے درمیان ایک تقابلی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے اور واضح لفظوں میں انہیں سخت تنبیہ کی جا رہی ہے اور ضمنی طور پر ان کے ان بعض جرائم کو بیان کیا جا رہا ہے جو جنگ کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے "اور جس شہر سے لوگوں نے تجھے نکال دیا ہے اس سے زیادہ قوی بہت سے شہر تھے، جن کو ہم نے تباہ و برباد کر دیا، جبکہ کوئی ان کا مددگار نہیں تھا" (وكاين من قرية هي اشد قوة من قريتك التي اخرجتك اهلكناهم فلا ناصر لهم)۔

وہ یہ گمان نہ کریں کہ چند روزہ دنیا ان کے کچھ کام آئے گی، اس لیے وہ اس قدر جسور اور جری ہو چکے ہیں کہ خدا کے عظیم رسولؐ کو مقدس ترین شہر سے نکال دیا ہے۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ صورتِ حال ہمیشہ یونہی رہے گی، نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے یہ لوگ قوم عاد و ثمود، فراعنہ مصر اور ابرہہ کے لشکر کے مقابلے میں تو بہت ہی کمزور اور ناتواں ہیں، خدا نے تو ان کو بھی نابود کر دیا تھا، اور انھیں تہس نہس کر دیا تھا، ان کی سرکوبی تو معمولی بات ہے۔

ابن عباس سے ایک روایت منقول ہے کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے غار ثور کی طرف جا رہے تھے تو آپؐ نے مکہ کی طرف منہ کر کے کہا:

"انت احب البلاد الى الله وانت احب البلاد الى ولولا المشركون اهلك اخرجونى لما خرجت منك"

"تو خدا کے نزدیک بھی محبوب ترین شہر ہے اور میرے نزدیک بھی محبوب ترین شہر ہے اگر تیرے رہنے والے مشرک لوگ مجھے نہ نکالتے تو میں اپنی مرضی سے کبھی نہ نکلتا"

اسی موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی (جس میں پیغمبر کو نصرت الٰہی کی خوشخبری دی گئی ہے اور مشرکین کو سزا کے لیے متنبہ کیا گیا ہے)۔[1]

اس شانِ نزول کے مطابق یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ شانِ نزول سورہ قصص کی ۸۵ ویں آیت سے متعلق ہے اور بہت سے مفسرین نے اسے وہیں پر ذکر کیا ہے اور اس کی زیادہ مناسبت بھی اسی آیت کے ساتھ معلوم ہوتی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے:

"ان الذى فرض عليك القرآن لرادك الى معاد"

"جس خدا نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے وہی تجھے تیری (ولادت کی) جگہ لوٹائے گا"۔[2]

یہاں پر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آنحضرتؐ کو باہر نکال دینے کی نسبت شہر مکہ کی طرف دی گئی ہے جبکہ

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۹ صفحہ ۶۰۵۵۔

[2] اس بارے میں مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۹ میں ملاحظہ فرمایئے (مذکورہ آیت کی تفسیر کے ذیل میں)۔

نکالنے والے اہالیان شہر تھے۔ یہ ایک لطیف کنایہ ہے، جو اس شہر پر ایک خاص گروہ کے تسلط کو بیان کرتا ہے۔
اس طرح کے کنایئے قرآن مجید کی اور بھی آیات میں ذکر ہوئے ہیں۔
ضمنی طور پر ہم پھر یہ بتاتے چلیں کہ لفظ "قریۃ" شہر اور آبادی کے لیے بولا جاتا ہے نہ کہ "گاؤں" کے معنی میں ہے اور اس بات کو ہم پہلے بھی کئی مقامات پر بیان کر چکے ہیں۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں مومنین اور کفار کے درمیان ایک اور تقابل کو پیش کیا گیا ہے۔ ان دونوں گروہوں کا آپس میں ہر چیز میں فرق ہے۔ ایک گروہ ایمان پر قائم اور اعمال صالح پر کاربند ہے، جب کہ دوسرا گروہ پورے طور پر حیوانی زندگی گزار رہا ہے۔ ایک پروردگار کی ولایت کے زیر سایہ رہ رہا ہے اور دوسرا بے مولا اور بے سرپرست ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تو کیا جو شخص اپنے پروردگار کی طرف سے روشن دلیل پر ہو اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے، جس کی بداعمالیاں اسے بھلی کر کے دکھائی گئی ہوں اور وہ اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرتا ہو۔ (افمن کان علی بینۃ من ربہ کمن زین لہ سوء عملہ واتبعوا اھوائھم)۔

پہلے گروہ نے اپنے راستے کو پا لیا ہے اور وہ صحیح معرفت، یقین دلیل، اور قطعی برہان کے ساتھ اس پر گامزن ہے اپنے راستے اور مقصد کو واضح طور پر دیکھ رہا ہے اور اس کی طرف رواں دواں ہے، جبکہ دوسرا گروہ غلط پہچان اور حقائق کے عدم ادراک کا شکار ہے اور اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے راہ سے بھٹک کر منزل مقصود سے کوسوں دور ہے اس بھٹکنے کا اصل سبب سرکش نفس کی خواہشات کی اتباع ہے کیونکہ خواہشات نفسانی انسان کی عقل و فکر پر پردے ڈال دیتی ہیں۔ اچھائیوں کو برائیاں اور برائیوں کو اچھائیاں بنا کر پیش کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات سرکش نفس کا تابع انسان اپنے ناپاک اور شرم آور کردار پر فخر و مباہات کرنے لگتا ہے، جیسا کہ سورۂ کہف کی ۱۰۳ تا ۱۰۵ آیات میں ہے:

"قل ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالا الذین ضل سعیھم فی الحیوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا اولئک الذین کفروا بایات ربھم ولقائہ فحبطت اعمالھم فلا نقیم لھم یوم القیامۃ وزنا"

"کہہ دے: کیا ہم تمہیں ایسے لوگوں کے بارے میں بتائیں کہ جو سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہیں؟ یہ وہی لوگ تو ہیں کہ دنیاوی زندگی کے لیے جن کی سعی و کوشش کا کچھ حاصل نہیں اور پھر بھی وہ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے کام انجام دے رہے ہیں، وہی تو ہیں جو اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کے منکر ہیں، اسی لیے تو ان کے اعمال اکارت جائیں گے اور قیامت کے دن ہم ان کے لیے میزان اور ترازو قائم نہیں کریں گے۔ (کیونکہ ان کے اعمال میں کوئی وزن نہیں ہوگا)۔

"بینۃ" آشکار اور روشن دلیل کے معنی میں ہے اور یہاں پر قرآن مجید پیغمبر اکرمؐ کے معجزات اور دوسرے عقلی دلائل

کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ "افمن کان ...." میں استفہام "استفہام انکاری" ہے یعنی یہ دونوں گروہ آپس میں ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان نفس پرستوں کے بُرے اعمال کو کون بھلا بنا کر پیش کرتا ہے؟ خود وہ آپ یا خدا، یا شیاطین؟ تو جواب یہ ہے کہ سب کے سب! کیونکہ قرآنی آیات میں ان تینوں کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ سورۂ نمل کی چوتھی آیت میں فرمایا گیا ہے:

"ان الذین لا یؤمنون بالاٰخرة زینا لھم اعمالھم"

"جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم ان کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں مزین کر دیتے ہیں۔"

دوسری متعدد آیات بشمول سورۂ عنکبوت کی ۳۸ ویں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ شیطان نے ان کے اعمال کو بنا سنوار کر پیش کیا ہے۔

"وزین لھم الشیطان اعمالھم"

اور زیر تفسیر آیت میں "واتبعوا اھواءھم" کے جملے کے پیش نظر یہ زینت ان کی خواہشات نفسانی کی اتباع کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہ بات مکمل طور پر قابل فہم ہے کہ خواہشات نفسانی کی اتباع انسان سے ادراک اور تشخیص کی صلاحیت سلب کر لیتی ہے۔

البتہ اس کی شیطان کی طرف نسبت بھی صحیح ہے کیونکہ وہ نفسانی خواہشات کو بھڑکاتا اور انسان کو ہمیشہ دھوکے میں ڈالتا رہتا ہے۔

اور اگر اس کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے تو اس لیے کہ وہ "مسبب الاسباب" ہے اور ہر سبب کا جو اثر ہوتا ہے وہ اسی کی جانب سے ہے۔ اسی نے آگ کو تپش عطا کی ہے اور خواہشات نفسانی کو حقائق پر پردہ ڈالنے کی تاثیر بھی نیز وہ اس تاثیر کے بارے میں بتا بھی چکا ہے۔ تو اس طرح سے ساری ذمہ داری خود انسان پر عائد ہوتی ہے۔

بعض مفسرین نے "افمن کان علی بینة من ربه" کو پیغمبرؐ کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور بعد کے جملے کو کفار مکہ کی طرف۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ آیت کا وسیع معنی ہے اور یہ مفاہیم اس کے مصداق ہیں۔

۱۵۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۖ فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۖ وَلَهُمْ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ ۖ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ ○

ترجمہ

۱۵۔ جس بہشت کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی صفت یہ ہے کہ اس میں صاف و شفاف پانی کی نہریں ہیں کہ جن میں بدبو نہیں ہے اور دودھ کی نہریں ہیں جن کا مزا تک نہیں بدلا اور شراب (طہور) کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے لذت ہی لذت ہیں، اور صاف و شفاف شہد کی نہریں ہیں اور وہاں ان کے لیے ہر قسم کے پھل ہیں اور (ان سب سے بڑھ کر) ان کے پروردگار کی طرف سے بخشش ہے۔ بھلا یہ لوگ ان کے برابر ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ کی آگ میں رہیں گے اور انہیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا تو وہ ان کی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔

تفسیر

بہشت کی ایک اور صفت:

یہ آیت گذشتہ آیات کے مانند کافر اور مومن دونوں گروہوں کے اوصاف بیان کر رہی ہے۔ ایک گروہ کے شرم ناک اور بُرے اعمال ہیں جو ان کی نظر میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور دوسرے کے نیک اور صالح۔

اس آیت میں اہل بہشت کی چھ قسم کی نعمتوں اور اہل دوزخ کے دو قسم کے سخت اور دردناک عذاب کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان کے انجام کو واضح کیا گیا ہے۔

اہل بہشت کی نعمتوں میں چار نہروں کا نام لیا گیا ہے، جن میں سے ہر ایک ایک خاص چیز کی ہے اور ہر ایک کا اپنا مزہ ہے، پھر بہشت کے پھلوں کا ذکر ہے اور آخر میں روحانی نعمتوں کا تذکرہ ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: جس بہشت کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی صفت یہ ہے کہ اس میں صاف و شفاف پانی کی نہریں ہیں جن میں بدبو نہیں ہے (مثل الجنة التی وعد المتقون فیها انهار من ماء غیر اٰسن)۔ [1]

"اٰسن" کا معنی "بدبو" ہے۔ لہٰذا "ماء غیر اٰسن" کا معنی ہوگا، وہ پانی جو مدتوں رہنے کے باوجود بدبودار نہیں ہوتا۔ یہ بہشت کی نہروں کی وہ پہلی قسم ہے جس کا پانی صاف و شفاف، خوشبودار اور خوش ذائقہ ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: اور دودھ کی نہریں ہیں جن کا مزہ تک نہیں بدلا (و انهار من لبن لم یتغیر طعمه)۔

اصولی طور پر بہشت ایک ایسا مقام ہے، جہاں پر نہ تو کسی چیز کے بگڑنے کا اندیشہ ہے نہ ہی خراب ہونے کا۔ یہ تو اس مادی دُنیا کا خاصہ ہے جس میں مختلف قسم کے جراثیم ہوتے ہیں جو غذا کو خراب کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد بہشت کی تیسری قسم کی نہروں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور شراب (طہور) کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے لذت ہی لذت ہیں (و انهار من خمر لذة للشاربین)۔

آخر میں بہشت کی چوتھی قسم کی نہر کا حال اس سورت میں بیان فرمایا گیا ہے: اور صاف و شفاف شہد کی نہریں

---

[1] اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ملتے ہیں۔ سب سے مناسب قول یہی ہے کہ "مثل الجنة" مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، جو تقدیری طور پر یوں ہے "مثل الجنة التی وعد المتقون جنة فیها انهار" در حقیقت یہ آیت سورۂ رعد کی ۳۵ ویں آیت سے ملتی جلتی ہے، جس میں کہا گیا ہے:

"مثل الجنة التی وعد المتقون تجری من تحتها الانهار"

ہیں (و انهار من عسل مصفی)۔

ان گوناگوں نہروں جن میں سے ہر ایک علیحدہ مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہے کے علاوہ پانچویں نعمت کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے اور وہ ہے بہشت کے مختلف النوع پھل ارشاد فرمایا گیا ہے، اور وہاں ان کے لیے ہر قسم کے پھل ہیں (ولهم فيها من كل الثمرات)۔ [۱]

طرح طرح کے پھل مختلف ذائقے اور مختلف خوشبو کے ساتھ، جن کا ہم تصور کر سکتے ہیں یا ہمارے تصور سے باہر ہیں سب کے سب بہشت والوں کو عطا ہوں گے۔

آخر میں خدا کی چھٹی نعمت کا تذکرہ ہے جو گذشتہ مادی نعمتوں سے ہٹ کر ہے اور روحانی حیثیت کی حامل ہے ارشاد ہوتا ہے: ان کے لیے ان کے پروردگار کی طرف سے بخشش ہے (و مغفرة من ربهم)۔

ایک عظیم اور وسیع رحمت جو ان کی تمام لغزشوں کو چھپا رہی ہوگی اور انہیں روحانی تسکین عطا کر رہی ہوگی، اور بارگاہ رب العزت کا محبوب بنا رہی ہوگی اور " رضی الله عنهم و رضوا عنه ذالك الفوز العظيم (خدا ان سے راضی اور وہ خدا سے راضی) اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ (مائدہ ۱۱۹) کا مصداق بنا رہی ہیں۔

تو اس طرح سے پاک باز اور صالح العمل مومنین بہشت بریں میں خدا کی ہر طرح کی مادی اور روحانی نعمتوں سے اس کے جوار میں رہ کر بہرہ مند ہوں گے۔

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان کا مقابل گروہ کس انجام سے دوچار ہوگا چنانچہ اسی آیت میں اسے بھی بیان فرمایا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: بھلا یہ لوگ ان کے برابر ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ کی آگ میں رہیں گے اور انہیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا، تو وہ انکی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا (كمن هو خالد في النار وسقوا ماءً حميمًا فقطع امعاءهم)۔ [۲]

" امعاء " جمع ہے " معی " (بر وزن " سعی ") کی، اور " معا " (بر وزن " خفا ") کا معنی آنت ہے اور کبھی اس کا اطلاق شکم کے اندر موجود تمام چیزوں پر بھی ہوتا ہے اور ان کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جہنم کا یہ وحشت ناک مشروب اس قدر گرم ہوگا کہ پیٹ میں موجود تمام چیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔

---

[۱] اس جملے کا ایک محذوف ہے جو تقدیری صورت میں یوں ہے۔

" لهم فيها انواع من كل الثمرات "

[۲] اس آیت کی تفسیر میں بھی مختلف اقوال ملتے ہیں اور ان سب میں مناسب تر یہی ہے کہ کہا جائے کہ اس آیت میں ایک مقدار ہے جس کی کلی اور تقدیری صورت یوں ہے۔

" افمن هو خالد الجنة التي هذه صفاته كمن هو خالد في النار "

چند نکات

۱۔ بہشت کی چار نہریں: قرآنی آیات سے یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ بہشت میں مختلف قسم کی نہریں اور چشمے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا اپنا فائدہ اور اپنا لطف و مزہ ہے، جن میں سے چار کا نمونہ تو مندرجہ بالا آیت میں پیش کیا گیا ہے اور باقی کے نمونے انشاء اللہ سورۂ دہر کی تفسیر میں بیان ہوں گے۔

ان چار قسم کی نہروں کو "انہار" کے لفظ سے یاد کیا گیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نہر نہیں بلکہ کئی کئی نہریں ہوں گی۔

ہم پہلے بھی کئی مرتبہ بتا چکے ہیں کہ بہشت کی نعمتیں ایسی ہیں جنہیں روزمرہ کی دنیاوی زندگی کے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، الفاظ ان نعمتوں کی کما حقہ تصویر کشی سے قاصر اور عاجز ہیں، بلکہ صرف ان کا ایک ہلکا اور معمولی سا خاکہ پیش کر سکتے ہیں۔

زیر تفسیر آیت میں بہشت کی چار پانی، دودھ، شراب طہور، اور شہد کی نہروں کا ذکر کیا گیا ہے، ممکن ہے پہلی نہر پیاس دور کرنے کے لیے، دوسری خوراک کے حصول کے لیے تیسری نشاط اور فرحت بخشنے کے لیے اور چوتھی لذت و قوت پیدا کرنے کے لیے ہو۔

یہ بات بھی جاذب توجہ ہے کہ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اہل بہشت ان تمام نہروں سے سیراب نہیں ہوں گے، بلکہ مراتب اور منصب کے لحاظ سے ان سے بہرہ ور ہوں گے۔ جیسا کہ سورۂ مطففین کی ۲۸ ویں آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

"عینا یشرب بھا المقربون"

"ایسا چشمہ ہے جس سے مقربین بارگاہ الٰہی پانی پئیں گے۔"

۲۔ شراب طہور: واضح سی بات ہے کہ بہشت کی شراب کا اس دنیا کی غلیظ اور نجس شراب سے کسی قسم کا کوئی رابطہ اور واسطہ نہیں ہے، جیسا کہ قرآن مجید ایک اور مقام پر اس شراب بہشت کی یوں تعریف کرتا ہے۔

"لا فیھا غول ولا ھم عنھا ینزفون"

"وہ شراب ایسی ہے، جس سے نہ تو عقل خراب ہوتی ہے اور نہ مستی کا سبب بنتی ہے۔"

(صافات / ۴۷)

۳۔ خراب نہ ہونے والے مشروبات: بہشت کی نہروں کی ایک مرتبہ "غیر اٰسن" (اس کی بو نہیں بدلی) کے ساتھ اور دوسری مرتبہ "لم یتغیر طعمہ" (اس کا ذائقہ نہیں بدلا) کے ساتھ تعریف و توصیف کی گئی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ بہشت کے مشروبات اور غذائیں ہمیشہ تر و تازہ رہیں گی۔ پہلے دن کی سی تازگی آخر ایسا کیوں نہ ہو جب کہ خوراک کا تغیر اور اس میں خرابی جراثیم کی وجہ سے عمل میں آتی ہے، اگر یہ دنیا میں نہ ہوتے تو کسی چیز میں کوئی خرابی پیدا نہ ہوتی اور ہر چیز اپنی اصلی حالت پر باقی رہتی، لیکن چونکہ بہشت خرابی پیدا کرنے والوں کی جگہ نہیں ہے، لہٰذا وہاں ہر چیز پاک، صاف، صحیح و سالم اور تر و تازہ رہے گی۔

۴۔ پھل کیوں ؟ اس آیت میں بھی اور قرآن کی دوسری آیات میں بھی بہشت کی غذاؤں کے تذکرے میں پھلوں کا ذکر لازمی طور پر ہوا ہے، مختلف الانواع پھل جو تمام ذائقوں کا باب ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پھل بہشت کی نہایت اہم غذا ہیں۔ حتیٰ کہ اس دنیا میں بھی انسانی غذاؤں میں سب سے زیادہ صحیح و سالم اور بہترین غذا پھل ہی ہیں۔

۵۔ "سقوا" (انہیں پلایا جائے گا) کی تعبیر فعل مجہول کے ساتھ کی گئی ہے جو اس حقیقت کی غماز ہے کہ ان دوزخیوں کو کھولتا اور جلتا پانی زبردستی پلایا جائے گا وہ اپنی خوشی سے نہیں پئیں گے اور جہنم کی اس آگ میں ان کے سیراب ہونے کے بجائے، ان کی آنتوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور دوزخ کے معمول کے مطابق پھر وہ اپنی اصلی حالت میں آجائیں گے، کیونکہ وہاں موت نہیں ہے۔

۱۶۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۟ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ○

۱۷۔ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ○

۱۸۔ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ○

۱۹۔ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ○ ع

ترجمہ

۱۶۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو تیری طرف کان لگائے رہتے ہیں، لیکن جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو جن لوگوں کو خدا نے علم و دانش عطا کی ہے، ان سے (بطور مذاق) کہتے ہیں، ابھی اس شخص نے کیا کہا تھا؟ یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر خدا نے مہر لگا دی ہے اور وہ اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کرتے ہیں (لہذا کچھ نہیں سمجھتے)۔

۱۷۔ جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں ان کو خدا مزید ہدایت کرتا ہے اور انھیں پرہیز گاری کی

رُوح عنایت فرماتا ہے۔

۱۸۔ تو کیا یہ لوگ بس قیامت کے انتظار میں ہیں کہ ان پر ناگہان آجائے (تو اس وقت وہ ایمان لائیں گے) حالانکہ اس کی نشانیاں تو آچکی ہیں، لیکن جس وقت وہ آپہنچے گی تو اس وقت ان کی توجہ اور ایمان انہیں کچھ فائدہ نہ دے گا۔

۱۹۔ پس جان لے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے گناہ پر اور ایمان دار مردوں اور ایمان دار عورتوں کے لیے استغفار کر اور خداوند تعالیٰ تمہارے چلنے پھرنے اور ٹھہرنے کی جگہ کو جانتا ہے۔

تفسیر

قیامت کی نشانیاں ظاہر ہو چکی ہیں :

یہ آیات وحی الٰہی، آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ کے بارے میں منافقین کی کیفیت کی تصویر کشی اور دشمنان اسلام کے ساتھ جنگ و جہاد کے مسئلے کو بیان کر رہی ہیں۔

مدنی سورتوں میں منافقین کا بہت تذکرہ ملتا ہے جب کہ مکی سورتوں میں ایسا نہیں ہے، کیونکہ منافقت اور نفاق کا مسئلہ اسلام کی کامیابی اور اس کے مکمل طور پر مسلط ہو جانے کے بعد پیدا ہوا، کیونکہ مخالفین کی طاقت کمزور ہو گئی تھی اور وہ کھلم کھلا طور پر اسلام کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا وہ بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے تاکہ اس طرح سے وہ مسلمانوں کے غیظ و غضب سے بچے رہیں، لیکن باطنی طور پر مختلف سازشوں میں مصروف رہے۔ مدینہ کے یہودی جو فوجی اور اقتصادی لحاظ سے بہت طاقت ور تھے وہ بھی منافقین کے پشت پناہ ثابت ہوئے۔

بہر حال، وہ سچے مومنین کی صفوں میں گھس آئے، نماز جمعہ اور دیگر اجتماعات میں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے، لیکن قرآنی آیات کے مقابلے میں ان کا ردعمل ان کے دلوں کی بیماری کا آئینہ دار ہوتا۔

اس لیے زیرِ تفسیر آیات میں سے پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: ان میں سے کچھ لوگ تیرے پاس آتے ہیں،

تیری باتوں کو کان لگا کر سنتے بھی ہیں، لیکن جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو جن لوگوں کو خدا نے علم و دانش عطا کی ہے ان سے تحقیر اور تمسخر کے انداز میں کہتے ہیں، ابھی اس شخص نے کیا کہا تھا؟ (ومنھم من یستمع الیک حتی اذا خرجوا من عندک قالوا للذین اوتوا العلم ماذا قال انفا)۔

"اس شخص" سے ان کی مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات تھی۔

ان لوگوں کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی گوہر بار گفتگو کے بارے میں ردِعمل، اس قدر تحقیر آمیز غلط اور ناروا تھا جس سے صاف سمجھا جاتا تھا کہ وہ آسمانی وحی پر بالکل ایمان نہیں رکھتے۔

"انفا" "انف" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے "ناک" اور ناک چونکہ انسان کے چہرے پر خاص طور سے ایک نمایاں چیز ہے۔ لہٰذا یہ کلمہ کسی قوم کے شریف اور معزز افراد کے لیے استعمال ہوتا ہے اور زمانے کے لحاظ سے اس کا اطلاق زمانۂ حال پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ اسی آیت میں ذکر ہوا ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ "للذین اوتوا العلم" کی تعبیر اس بات کی نشان دہی کر رہی ہے کہ مومنین کی علامت ان کا کافی حد تک علم کا حامل ہونا بھی ہے، کیونکہ علم ہی ایمان کا سرچشمہ ہوتا ہے اور ایمان ہی کی وجہ سے علم حاصل ہوتا ہے۔

لیکن آیت کے آخر میں قرآن مجید ان (کفار) کو دندان شکن جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے، رسولؐ کی باتوں میں نہ تو کسی قسم کی پیچیدگی ہوتی ہے اور نہ ہی بے معنی ہوتی ہیں، بلکہ یہ لوگ خود ایسے ہیں جن کے دلوں پر خدا نے مہر لگا دی ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں، لہٰذا انھیں کچھ سمجھ نہیں آتا (اولٰئک الذین طبع اللہ علی قلوبھم واتبعوا اھواءھم)۔

درحقیقت دوسرا جملہ پہلے جملے کی علت ہے۔ یعنی خواہشات نفسانی کی پیروی انسان سے حقائق کے ادراک کی طاقت اور تشخیص کی صلاحیت سلب کر لیتی ہے اور اس کے دل پر پردہ ڈال دیتی ہے، گویا خواہش پرستوں کے دل اس ظرف کے مانند ہو جاتے ہیں جس کا منہ بند کر دیا جائے اور اسے سربمہر کر دیا جائے۔ نہ تو اس میں کوئی چیز رکھی جا سکتی ہے اور نہ ہی اس سے نکالی جا سکتی ہے۔

ان کے برعکس سچے مومنین ہیں، جن کے بارے میں بعد کی آیت میں گفتگو ہو رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں انہیں مزید ہدایت کرتا ہے اور انہیں تقوے اور پرہیزگاری کی روح عطا فرماتا ہے۔

(والذین اھتدوا زادھم ھدًی واٰتاھم تقواھم)۔

جی ہاں! انہوں نے ہدایت کیلیے پہلے از خود اقدام کیا، اپنی عقل و خرد اور فطرت سے صحیح معنوں میں کام لیا پھر خدا بھی حسب وعدہ اپنی راہ پر چلنے والے مجاہدوں کی زیادہ سے زیادہ ہدایت اور رہنمائی کرتا ہے، ان کے دلوں میں نورِ ایمان ڈال دیتا ہے اور شرح صدر اور روشن بینی سے انہیں بہرہ مند کرتا ہے۔ یہ تو ہوتا ہے ایمان اور اعتقاد کے لحاظ سے، لیکن عملی لحاظ سے بھی ان میں تقویٰ کی روح کو اس حد تک زندہ کرتا ہے کہ انہیں گناہوں سے نفرت ہونے

لگتی ہے اور اطاعت دینی سے جنون کی حد تک محبت کرنے لگتے ہیں ۔

بعد کی آیت میں مذاق اڑانے والے اس بے ایمان ٹولے کو زبردست تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، تو کیا یہ لوگ بس قیامت ہی کے انتظار میں ہیں کہ ان پر ناگہاں آجائے (تو اس وقت وہ ایمان لائیں گے) حالانکہ اس کی نشانیاں تو آ ہی چکی ہیں ۔ لیکن جس وقت قیامت ان کے سر پر آ پہنچے گی تو اس وقت ان کے لیے بیداری، توجہ اور ایمان مفید واقع نہیں ہوں گے (فهل ینظرون الا الساعة ان تأتیهم بغتة فقد جاء اشراطها فانی لهم اذا جاءتهم ذکراهم) ۔

جی ہاں! جس وقت ان لوگوں کو ایمان لانا چاہیئے اور وہ ایمان ان کے لیے مفید بھی ہو اس وقت تو ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور حق کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے بلکہ تمسخر اڑاتے اور ٹھٹھا مذاق کرتے ہیں، لیکن جب ہولناک حوادث اور قیامت کا آغاز دنیا کو لرزہ براندام کر دے گا تو اس قسم کے لوگ وحشت زدہ ہو کر خضوع و خشوع اور ایمان کا اظہار کریں گے، لیکن اس وقت انھیں اس کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

اس کی مثال یوں سمجھئے، جیسے ہم کسی کو کہیں کہ آیا تم اس انتظار میں ہو کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے اور تمہارا مریض موت کے دہانے تک پہنچ جائے، پھر ڈاکٹر اور دوا کا بندوبست کرو؟ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ موقع ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے کوئی مفید اور مؤثر قدم اٹھاؤ۔

" اشراط " " شرط " (بر وزن " شرف ") کی جمع ہے جس کا معنی علامت ہے ۔ بنا بریں " اشراط الساعة " سے مراد قیامت کے قریب ہونے کی علامتیں ہیں۔

یہاں پر قیامت کے قریب ہونے سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے اس بارے میں تفصیلی بحث کی ہے، حتیٰ کہ اس سلسلے میں بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔

لیکن بہت سے لوگ اس بات کے معتقد ہیں کہ زیر تفسیر آیت میں " اشراط الساعة " سے مراد خود پیغمبر اسلام کا قیام ہے اور اس کی گواہ خود آپ کی یہ حدیث ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے :

" بعثت انا والساعة کهاتین و ضم السبابة والوسطیٰ "

" میری بعثت اور قیامت ان دو کے مانند ہیں" اور پھر آپ نے اپنی دو انگلیوں کو ملا کر اشارہ کیا ایک درمیانی انگلی اور دوسری انگشت شہادت " [1]

بعض مفسرین نے " شق القمر " کے مسئلے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دور میں رونما ہونے والے بعض دوسرے واقعات کو بھی " اشراط الساعة " میں شمار کیا ہے۔

اس بارے میں بہت سی حدیثیں بھی وارد ہوئی ہیں، خصوصاً بہت سے گناہوں کا عوام الناس میں عام ہو جانا بھی

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر قرطبی، تفسیر فی ظلال القرآن اور کئی دوسری تفسیریں، انہی آیات کے ذیل میں۔ (تعبیر میں قدرے تفاوت کے ساتھ)

قیامت سے قریب ہونے کی علامات میں شمار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ شیخ مفید علیہ الرحمہ نے پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث "روضۃ الواعظین" میں درج کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"من اشراط الساعۃ ان یرفع العلم، ویظھر الجھل ویشرب الخمر ویفشد الزنا"

"قیامت کی علامتوں میں سے ہے، علم کا اٹھا لیا جانا، جہالت کا آشکار ہو جانا، شراب کا پیا جانا اور زنا کی کثرت۔" [1]

حتیٰ کہ اہم اور موثر واقعات کو بھی "اشراط الساعۃ" میں شمار کیا گیا ہے جیسے امام مہدیؑ (ارواحنا فداہ) کا قیام ہے۔

لیکن یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ہم کبھی تو "اشراط الساعۃ" کے بارے میں بطور مطلق بحث کرتے ہیں کہ قیامت کے نزدیک ہونے کی کیا علامتیں ہیں اور کبھی صرف اور خاص طور پر آیت کے بارے میں۔

آیت کے بارے میں مطلب وہی ہے جو ہم بتا چکے ہیں، لیکن مطلق طور پر قیامت کے نزدیک ہونے کی علامتوں کے بارے میں بڑی حد تک بحث کی گئی ہے اور اس بارے میں بہت سی روایات مشہور اسلامی کتابوں میں درج ہیں اور ہم بھی نکات کی بحث میں اس طرف اشارہ کریں گے۔ [2]

کیا پیغمبرِ اسلام کی بعثت قیامت کے قریب ہونے کی علامت ہے؟

یہاں پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کو کیونکر قرب قیامت کی علامت قرار دیا گیا ہے، جب کہ چودہ سو سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے، مگر اب تک قیامت کا کچھ پتہ نہیں؟

اس سوال کا جواب ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ باقی ماندہ دنیا کو اس کے گزشتہ حصے کے تناظر میں دیکھنا چاہیئے اور آیندہ کو گذشتہ سے تقابل کر کے دیکھا جانا چاہیئے اور اس تقابل میں دنیا کا جو حصہ باقی رہ گیا ہے وہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ جیسا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک دن آنحضرتؐ نے عصر کے بعد اور غروب آفتاب سے کچھ پہلے اپنے اصحاب سے خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا:

"والذی نفس محمد بیدہ مثل ما مضی من الدنیا فیما بقی منھا الا مثل ما مضی من یومکم ھذا فیما بقی منہ، وما بقی منہ الا الیسیر"

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص۳۰۔

[2] جو کچھ ہم بتا چکے ہیں اگر اس کو مدنظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا "فقد جاء اشراطھا" کے جملے سے یہ مراد نہیں ہے کہ قیامت کی تمام علامات پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں ظاہر ہو چکی ہیں، بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ ان میں سے بعض علامتیں ظاہر ہو چکی ہیں، جو قیامت کے قریب ہونے کی خبر دیتی ہیں ہر چند کہ کچھ اور علامتیں ابھی بعد میں ظاہر ہوں گی۔

"اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے، جو مدت دُنیا کی گزر چکی ہے اس حصّے کی نسبت جو کچھ باقی رہ گیا ہے اس مقدار کے مانند ہے جو تمہارے آج کے دن کا حصّہ گزر چکا ہے اس حصّے کی نسبت جو کچھ باقی رہ گیا ہے اور تم دیکھ رہے ہو کہ اس دن کا حصّہ تھوڑی سی مقدار سے زیادہ باقی نہیں ہے۔[1]

اس سلسلے کی آخری آیت ایمان وکفر اور مومنین وکفار کے انجام کے متعلق تمام گفتگو کے نتیجے کے طور پر بیان ہوئی ہے ارشاد ہوتا ہے: پس جان لو کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے (فاعلم انہ لا الٰہ الا اللہ)۔

یعنی توحید کی راہ پر قائم رہو کیونکہ شفا عطا کرنے کی دوا اور نجات کا بہترین وسیلہ یہی توحید ہے کہ جس کی علامات اس سے پہلے کی آیات میں بیان ہو چکی ہیں۔

بنابریں اس آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم توحید سے بے خبر تھے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس راہ پر برقرار رہیں اور ثابت قدم۔ بالکل ویسے ہی جیسے سورۂ حمد کی یہ آیت ہے "اھدنا الصراط المستقیم" مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہم ہدایت پر نہیں، لہٰذا صراطِ مستقیم کی ہدایت فرما، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہمیں ہدایت کی راہ پر ثابت قدم رکھ۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ امر توحید میں زیادہ غور وفکر سے کام لیا جائے اور اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات کی طرف ارتقاء کی کوشش کی جائے، کیونکہ یہ ایک ایسا امر ہے کہ جس میں جتنا زیادہ سوچ بچار اور غور وفکر سے کام لیا جائے اور خدا کی آیات کا جتنا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا جائے اتنا ہی اعلیٰ سے اعلیٰ مراحل کی طرف ترقی ہوتی جاتی ہے اور گزشتہ آیات میں ایمان اور کفر کے متعلق جو کچھ بتایا جا چکا ہے اس کے بارے میں تحقیق وجستجو بھی ایمان وکفر کے اضافے کا بذاتِ خود ایک عامل ہے۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد توحید کا عملی پہلو ہے۔ یعنی آپ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ پوری کائنات میں صرف خدا ہی کی ذات ہے جو پناہ گاہ کی حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا اس کی پناہ میں آجایئے اور مشکل کا حل بھی اسی کے پاس ہے لہٰذا اسی سے حل مشکلات کی دعا کیجئے اور دشمن کی افرادی قوت سے ہرگز نہ گھبرایئے۔

ان تینوں تفسیروں کا آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور ممکن ہے کہ تینوں آیت کے مفہوم میں جمع ہوں۔

عقیدے پر مبنی اس مسئلے کے بیان کے بعد ایک بار پھر تقوے اور گناہوں سے پاک ہونے کی بات کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اور اپنے لیے اور ایمان دار مردوں اور ایمان دار عورتوں کے گناہوں پر استغفار کرتے رہو (واستغفر لذنبك وللمؤمنين والمؤمنات)۔

ظاہری بات ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عصمت کی بنا پر ہرگز کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے اور اس قسم کی تعبیر

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۲۶ صفحہ ۴۰۔

یا تو" خوب تر" کو چھوڑ کر" خوب" کو اپنانے اور" حسنات الابرار سیئات المقربین" کی طرف اشارہ ہے، یا پھر مسلمانوں کے لیے تنبیہ اور نمونۂ عمل ہے (جب معصوم نبی کو استغفار کا حکم ہے، تم گناہگار تو بطریق اولیٰ استغفار کرنے کے لیے مامور ہیں)۔

ایک روایت میں ہے کہ" حذیفہ یمانی" کہتے ہیں" میں ایک تند زبان شخص تھا اور اپنے گھر والوں سے سخت کلامی سے پیش آتا تھا، رسول اللہ کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ! مجھے اس بات کا خوف ہے کہ زبان کی یہ تندی مجھے جہنم میں نہ لے جائے! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

" فاین انت من الاستغفار؟ انی لاستغفر اللہ فی الیوم ماۃ مرۃ"

" تم استغفار سے کیوں غافل ہو؟ حتیٰ کہ خود میں بھی روزانہ سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں"۔ (اور بعض روایات میں ہے ستر مرتبہ)۔ [1]

اگر دوسرے لوگ اپنے گناہوں اور معاصی پر استغفار کرتے ہیں تو پیغمبر اکرم جس لمحے یاد خدا نہ کر سکتے یا" خوب تر" کے بجائے" خوب" کو انجام دیتے تھے تو استغفار کرتے تھے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ یہاں پر خدا نے مومنین اور مومنات کے لیے شفاعت کی سفارش کی ہے اور اپنے پیغمبر کو ان کیلیے استغفار کا حکم دیا ہے تاکہ اپنی رحمت ان کے شامل حال کرے۔ چنانچہ اس سے دنیا و آخرت میں مسئلہ" شفاعت" کی گہرائی اور مسئلہ" توسل" کی اہمیت بھی واضح اور آشکار ہو جاتی ہے۔

اس آیت کے ذیل میں علت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، خدا تمہارے چلنے پھرنے اور ٹھہرنے کی جگہ کو جانتا ہے (واللہ یعلم متقلبکم ومثواکم)۔

وہ تمہارے ظاہر و باطن، اندرون و بیرون اور اشارے کنائے کو اچھی طرح جانتا ہے، حتیٰ کہ تمہارے افکار، نیتوں اور حرکات و سکنات سے بھی پوری طرح باخبر ہے۔ اسی لیے تمہیں چاہیئے کہ تم اس کی طرف توجہ کرو اور اس کی بارگاہ سے طلب مغفرت کرو۔

" متقلب" کا معنی آمد و رفت کی جگہ اور" مثویٰ" کا معنی ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ [2]

ظاہر یہ ہے کہ ان دونوں کلمات کا مفہوم وسیع اور عام ہے، جس میں انسان کی تمام حرکات و سکنات آجاتی ہیں خواہ وہ دنیا میں ہوں یا آخرت میں، شکم مادر میں ہوں یا قبر کے پیٹ میں، اگرچہ بہت سے مفسرین نے ان کے محدود معانی بتائے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ اس سے انسان کی دن کو حرکات اور رات کو سکون مراد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے دنیا

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۱۰۲ (انہی آیات کے ذیل میں)۔

[2] بنا بریں" متقلب" اسم مفعول ہے جو یہاں پر اسم مکان کے معنی میں ہے۔ لیکن کچھ اور مفسرین اسے" مصدر میمی" سمجھتے ہیں جس کا معنی ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونا ہے۔ لیکن" مثویٰ" کے قرینے کے پیش نظر جو مسلّم طور پر اسم مکان ہے، پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

میں چلنے پھرنے کی اور آخرت میں انسان کے ٹھہرنے کی جگہ مراد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے انسان کا باپوں کی پشت اور ماؤں کے رحم میں منتقل ہونا اور قبر میں ثبات و قرار مراد ہے اور بعض کہتے ہیں اس سے انسان کا سفر میں حرکت کرنا اور حضر میں آرام کرنا مراد ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں آیت کا مفہوم وسیع اور عام ہے جو مذکورہ تمام تفاسیر کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

"اشراط الساعة" کیا ہیں؟

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ "اشراط" "شرط" کی جمع جس کا معنی "علامت" ہے اور "اشراط الساعة" قرب قیامت کی علامتوں کو کہتے ہیں، شیعہ سنی کتابوں میں اس بارے میں بہت سی روایات درج ہیں جب کہ قرآن مجید میں صرف اسی آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اس بارے میں سب سے زیادہ مفصل اور جامع وہ حدیث ہے جو ابن عباس کے بقول حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد کی ہے۔ جس میں بہت سے مسائل ہمارے لیے درس آموز ہیں اور وہ بہت سے نکات کی حامل ہے۔ اسی لیے ہم یہاں پر مکمل حدیث کو نقل کیے دیتے ہیں۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ ہم حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرتؐ کے ہمراہ تھے (حجۃ الوداع اس حج کو کہتے ہیں جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری عمر میں ادا کیا تھا) پیغمبرِ خدا نے خانہ کعبہ کے دروازے کی زنجیر کو پکڑ کر ہماری طرف منہ کر کے ارشاد فرمایا:

"آیا تمہیں "اشراط الساعة" سے آگاہ کروں؟"

حضرت سلمان نے جو اس وقت آنحضرتؐ کے سب سے زیادہ نزدیک تھے، عرض کی، ضرور ارشاد فرمایئے یا رسولؐ اللہ!"

آپ نے ارشاد فرمایا: قیامت کی نشانیوں میں سے ہے نماز کو ضائع کردینا شہوتوں کی پیروی کرنا، خواہشات نفسانی کی طرف مائل ہونا، دولت مندوں کی عزت کرنا، دین کو دنیا کے بدلے بیچ ڈالنا، ایسے موقع پر مومن کا دل یوں گھلتا رہے گا جس طرح نمک پانی میں گھلتا ہے، کیونکہ وہ ان برائیوں کو دیکھے گا، لیکن ان کا ازالہ اور تبدیلی اس کے بس سے باہر ہوگی۔"

سلمان نے عرض کی: یا رسول اللہؐ! ایسا بھی ہوگا؟

فرمایا، ہاں اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، سلمان! اس زمانے میں حکام ظالم، وزراء فاسق پیشہ، ورظالم اور امانت میں خیانت کرنے والے لوگوں پر حکومت کریں گے۔"

سلمان، "یا رسولؐ اللہ! ایسا بھی ہوگا۔

فرمایا: "سلمان! اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اس وقت اچھائیاں برائیاں اور برائیاں

اچھائیاں سمجھی جائیں گی، امانت خائنوں کے سپرد کی جائے گی، امین خائن بن جائیں گے، جھوٹوں کی تصدیق اور سچوں کی تکذیب کی جاتے گی۔"

سلمان: تو کیا ایسا بھی ہوگا؟ اے اللہ کے رسولؐ!"

فرمایا: ہاں! خدا کی قسم اے سلمان! اس وقت حکومت عورتوں کے ہاتھ میں ہوگی، غلاموں سے مشورہ کیا جائے گا، لڑکے منبروں پر بیٹھیں گے، جھوٹ دل لگی کے طور پر بولا جائے گا، زکوٰۃ کو تاوان سمجھا جائے گا اور بیت المال کو غنیمت سمجھ کر لوٹا جائے گا"

"لوگ اپنے والدین سے برائی اور دوستوں سے اچھائی کریں گے، آسمان پر دم دار ستارہ ظاہر ہوگا۔"

سلمان: "یا رسولؐ اللہ! کیا ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا: ہاں سلمان! اُس کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اس وقت عورت اپنے شوہر کے ساتھ تجارت میں شریک ہوگی (اور دونوں کی سرگرمیاں گھر سے باہر کے ماحول سے متعلق ہوں گی اور دونوں کی توجہ دولت سمیٹنے پر مرکوز ہوگی) بارشیں کم ہوں گی، سخی لوگ بخیل ہو جائیں گے اور غریبوں کو حقیر سمجھا جائے گا، اس وقت بازار ایک دوسرے کے نزدیک ہو جائیں گے ایک (دوکاندار) کہے گا: میں نے کچھ نہیں بیچا، دوسرا کہے گا مجھے منافع حاصل نہیں ہوا، غرض سب اپنے رب کی شکایت اور مذمت کرتے ہوں گے۔

سلمان! اللہ کے رسولؐ! ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا: "ہاں سلمان! اُس کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اس وقت ایسی قومیں حکومت کریں گی کہ اگر کوئی شخص بات کرے گا تو وہ لوگ اسے مار ڈالیں گے اور اگر خاموشی اختیار کرے گا تو اس کا سب کچھ مباح سمجھ کر لوٹ لیا جائے گا، اس کی عزت و احترام کو پامال کرکے اس کا خون بہایا جائے گا، دلوں کو خوف و وحشت اور دشمنی سے بھر دیا جائے گا اس وقت سب لوگوں پر خوف و وحشت طاری ہوگی۔"

سلمان: "یا رسولؐ اللہ! آیا ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا: ہاں سلمان! اس کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے اس وقت کچھ مشرق سے لے آئیں گے اور کچھ مغرب سے لے آئیں گے (کچھ قانون مشرق سے اور کچھ قانون مغرب سے لے آئیں گے) اور میری اُمت مختلف رنگ اختیار کرے گی۔ اس وقت کی امت کے کمزور افراد پر افسوس ہے نہ تو چھوٹوں پر رحم کریں گے نہ ہی بڑوں کا احترام کریں گے اور نہ ہی کسی گناہ گار کو بخشیں گے۔ ان کے جسم تو انسانوں جیسے ہوں گے لیکن دل شیاطین کے سے۔"

سلمان: "یا رسولؐ اللہ! آیا ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا: "ہاں! اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اے سلمان! اس زمانے میں مرد، مردوں پر قناعت کریں گے اور عورتیں عورتوں پر، اور لڑکوں پر اسی طرح رقابت کریں گے جس طرح لڑکیوں پر ان کے

خاندانوں میں کی جاتی ہے، عورتیں خود کو مردوں کے مشابہ بنائیں گی اور مرد عورتوں کے اور عورتیں زین سواری کریں گے (اور خود نمائی کریں گی)، خدا کی ان پر لعنت ہو۔

سلمان! "اللہ کے رسولؐ! آیا ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا: "ہاں سلمان! اس کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اس زمانے میں مسجدوں کو یوں سجایا جائے گا جس طرح یہود و نصاریٰ اپنی عبادت گاہوں کو سجاتے ہیں، قرآنوں کو مزین کریں گے (اس کے مضامین پر عمل نہیں کریں گے) مسجدوں کے مینار اونچے اونچے ہوں گے اور نمازیوں کی صفیں بڑی تعداد میں ہوں گی، لیکن ان کے دل ایک دوسرے کے دشمن اور زبانیں مختلف ہوں گی۔"

سلمان، "یا رسول اللہ! آیا ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا: "ہاں سلمان! اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس زمانے میں میری اُمت کے لڑکے سونے کے ساتھ زینت کریں گے، حریر و دیبا پہنیں گے اور چیتے کی کھال سے اپنا لباس تیار کر کے پہنیں گے۔"

سلمان، "یا رسولؐ اللہ! آیا ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا، ہاں سلمان! اس کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، اس وقت زنا عام ہو جائے گا، کام غیبت اور رشوت سے انجام پائیں گے، دین کو پائمال کریں گے اور دُنیا کو سر پر رکھیں گے۔"

سلمان! "یا رسولؐ اللہ! آیا یوں بھی ہوگا؟"

فرمایا، ہاں! سلمان! اس کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے، اس وقت طلاق کی بہتات ہو جائے گی۔ خدا کی کسی حد کا اجراء نہیں کیا جائے گا لیکن یہ بات خدا کو نقصان نہیں پہنچائے گی (بلکہ وہ لوگ خود نقصان اٹھائیں گے)۔"

سلمان: "آیا ایسا بھی ہوگا یا رسولؐ اللہ!"

فرمایا: "ہاں سلمان! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس کی قسم اس زمانہ میں عورتیں گانا گائیں گی، لہو و لعب اور گانے بجانے کے آلات کھلم کھلا ہوں گے اور میری اُمت کے شریر ان کے پیچھے پھریں گے۔"

سلمان: "یا رسولؐ اللہ! ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا: ہاں سلمان! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اُس کی قسم، اس وقت میری اُمت کے مالدار لوگ تفریح کی غرض سے، متوسط طبقہ تجارت کے قصد سے اور غریب لوگ ریا کاری کے لیے حج پر جائیں گے۔ اس وقت ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن کو غیر خدا کے لیے سیکھیں گے اور اس کے ساتھ لہو و لعب کے آلات کا سا سلوک کریں گے اور ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو غیر خدا کے لیے علم دین حاصل کریں گے، زنا کی اولاد کثرت سے ہوگی، قرآن کو راگ کی طرز میں پڑھا جائے گا اور دُنیا کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں گے۔"

سلمان: "ایسا بھی ہوگا یا رسولؐ اللہ!؟"

فرمایا: ہاں سلمان! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس کی قسم یہ اس وقت ہوگا، جب حرمت کے پردے

چاک ہو جائیں گے، گناہ کثرت سے رونما ہوں گے، بدکار لوگ نیک لوگوں پر مسلط ہو جائیں گے، جھوٹ عام ہو جائے گا، ہٹ دھرمی زیادہ ہو جائے گی اور فقر و فاقہ کی کثرت ہو جائے گی۔ لوگ مختلف لباسوں کی وجہ سے ایک دوسرے پر فخر کریں گے، بارشیں بے موقع ہوں گی، جوا اور آلات موسیقی کو اچھا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بُرا سمجھیں گے۔

" حالات اس حد تک بگڑ جائیں گے کہ اس وقت مومن تمام لوگوں سے زیادہ ذلیل ہوگا، قرآن کے قاری اور عبادت گزار لوگ ایک دوسرے کی بدگوئی کریں گے اور انہیں ملکوت اعلیٰ میں نجس اور پلید لوگوں کے نام سے پکارا جائے گا۔"

سلمان: "یا رسول اللہ! کیا ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا، "ہاں سلمان! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس کی قسم اس وقت مالدار لوگ غریبوں پر کوئی رحم نہیں کریں گے، حتّیٰ کہ کوئی ضرورت مند لوگوں میں کھڑا ہو کر اپنی حاجت کا اظہار کرے گا تو کوئی اسے کچھ نہیں دے گا۔"

سلمان: "ایسا بھی ہوگا یا رسول اللہ!"

فرمایا: "ہاں سلمان! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس کی قسم، اس وقت "رویبضہ" بھی بات کرے گا۔"

سلمان، "یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان جائیں، "رویبضہ" کیا ہے؟"

فرمایا: "جس نے کبھی کوئی بات نہیں کی ہوگی وہ بھی مظلوم و محروم انسان کے حق میں بات کرے گا" (وہ شخص بھی بولنے لگے جسے بولنے کا موقع نہیں دیا جاتا ہوگا)۔

" تو اس وقت زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ زمین سے اس انداز میں چیخ بلند ہوگی کہ ہر گروہ یہ سمجھے گا کہ یہ آواز اسی کے علاقے سے اُٹھ رہی ہے۔

پھر ایک عرصے تک جب تک خدا چاہے گا لوگ اسی حال پر باقی رہیں گے، پھر اسی دوران میں پتھر زمین میں شگاف کریں گے اور زمین اپنے دل کے ٹکڑے باہر نکال پھینکے گی، یعنی سونا اور چاندی۔"

پھر آپؐ نے ہاتھ سے ستون مسجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "ان کے مانند" اور اس روز سونا اور چاندی کسی کام کے نہیں رہیں گے (بحکم الٰہی پہنچ جائے گا) یہ ہے معنی خدا کے اس فرمان کا "فقد جاء اشراطها")[1]

---

[1] تفسیر نور الثقلین بحوالہ تفسیر علی بن ابراہیم و تفسیر صافی اسی آیت کے ذیل میں۔

۲۰- وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ ۚ فَإِذَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ مُحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ ۙ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَأَوْلَىٰ لَهُمْ ۞

۲۱- طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَعْرُوفٌ ۚ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ۞

۲۲- فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ۞

۲۳- أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ۞

۲۴- أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ۞

ترجمہ

۲۰- اور مؤمنین کہتے ہیں کہ (جہاد کے بارے میں) کوئی سورت کیوں نازل نہیں ہوتی؟ لیکن جب کوئی محکم سورت نازل ہوتی ہے کہ جس میں جہاد کا ذکر ہو تو تو بیمار دل منافقوں کو دیکھے گا کہ تیری طرف اس طرح دیکھیں گے، جس طرح کسی کو موت آنے لگے۔ پس موت اور تباہی ان کے لیے بہتر ہے۔

۲۱- لیکن اگر وہ اطاعت کریں اور سنجیدہ اور شائستہ بات کریں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے پھر جب جہاد کا حتمی حکم آجائے تو اگر یہ لوگ خدا سے سچے رہیں (اور صدق و صفا

کا راستہ اختیار کریں، تو ان کے حق میں بہتر ہے۔

۲۲۔ لیکن اگر تم روگردانی اختیار کرو تو تم سے سوائے زمین میں فساد اور قطع رحمی کے اور کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔

۲۳۔ یہ ایسے لوگ ہیں جنھیں خدا نے اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے، ان کے کانوں کو بہرہ اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔

۲۴۔ کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا پھر کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہُوئے ہیں۔

تفسیر

وہ جہاد کے نام سے بھی ڈرتے ہیں:

ان آیات میں جہاد کے متعلق مومنین اور منافقین کا ردعمل بیان کیا جا رہا ہے، گزشتہ آیات میں ان دونوں گروہوں کے متعلق گفتگو کے سلسلے میں یہ آیات تتمہ کی حیثیت رکھتی ہیں، چنانچہ سب سے پہلے فرمایا گیا ہے، مومنین ہمیشہ کہتے رہتے ہیں کہ کوئی سُورت کیوں نازل نہیں ہوتی (ویقول الذین امنوا لولا نزلت سورۃ)۔

ایسی سُورت کہ جس میں جہاد کا حکم ہو اور سنگدل، خونخوار اور بے منطق دشمن کے مقابلے میں ہمیں ہمارے فرائض سے آگاہ کرے۔ ایسی سُورت کہ جس کی آیات ہمارے دلوں کے لیے نور ہدایت ہوں اور ہماری رُوح کو اپنے فروغ سے روشن کریں۔

یہ تو ہے حقیقی مومنین کی کیفیت۔

لیکن منافقوں کا حال یہ ہے کہ جب کوئی محکم سُورت نازل ہوتی ہے جس میں جنگ اور جہاد کا ذکر ہو تو تو بیمار دل منافقوں کو دیکھے گا کہ تیری طرف اس طرح دیکھیں گے جس طرح کوئی موت کے کنارے پہنچ کر پریشان اور مبہوت ہو کر دیکھتا ہے اور جس کی آنکھوں کے ڈھیلے حرکت کرنے سے رُک جاتے ہیں (فاذا انزلت سورۃ محکمۃ وذکر فیھا القتال رأیت الذین فی قلوبھم مرض ینظرون الیک نظر المغشی علیہ

من الموت)۔

جنگ کا نام سننے سے وحشت و اضطراب انہیں سر تا پاؤں گھیر لیتے ہیں جیسے قریب ہے کہ دل ان کے سینے سے باہر آجائیں، ان کی عقلیں ماؤف ہو جائیں، آنکھیں پتھرا جائیں جس طرح موت کے قریب انسان کی آنکھیں بے حس و حرکت اور کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور یہ ڈرپوک اور بزدل منافقین کی کیفیت کی ایک واضح اور مکمل تصویر ہے۔

آخر جہاد کے بارے میں مومنین اور منافقین کا مختلف ردّ عمل کیوں نہ ہو، جبکہ پہلا گروہ اپنے محکم ایمان کی وجہ سے ایک تو اپنے پروردگار کے لطف و کرم اور امداد کا امیدوار ہوتا ہے اور دوسرے اس کی راہ میں شہادت سے بھی نہیں گھبراتا۔

ان کے لیے میدانِ جہاد، محبوب سے اظہارِ عشق کا مقام، شرافت اور فضیلت کا میدان، استعداد اور صلاحیت کے پروان چڑھنے کی جگہ اور استقامت و فتح و کامرانی کا میدان ہوتا ہے۔ اس طرح کے میدان سے خوف کے کیا معنی۔

جبکہ منافقین کے لیے موت، تباہی اور بربادی کا مقام، شکست اور دنیاوی لذتوں کو خیرآباد کہنے کی جگہ ظلمتوں اور تاریکیوں بھرا میدان اور ایسا میدان ہوتا ہے جس کا مستقبل وحشت ناک اور نامعلوم ہوتا ہے۔

بعض مفسرین کے نظریہ کے مطابق "سورۃ محکمۃ" سے مراد وہ سورتیں ہیں جن میں جہاد کے مسائل بیان کیے گئے ہیں لیکن اس تفسیر کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ بلکہ اس کی بظاہر تفسیر یہ ہے کہ "محکم" یہاں پر مستحکم، پائدار، دو ٹوک اور ہر قسم کے ابہام سے خالی کے معنی میں ہے جو بعض اوقات "متشابہ" کے مقابل میں ذکر ہوتا ہے، البتہ چونکہ آیات جہاد میں عام طور پر واضح اور دو ٹوک حکم ہوتا ہے لہٰذا اس مفہوم سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، لیکن اس میں منحصر نہیں ہے۔

"الذین فی قلوبھم مرض" (جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے) کی تعبیر قرآنی زبان میں عام طور پر منافقین کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ بعض مفسرین اس سے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد "ضعیف الایمان" لوگ ہیں تو ان کا نظریہ نہ تو قرآن کی دوسری آیات سے ہم آہنگ ہے اور نہ ہی زیر تفسیر آیت سے قبل و بعد کی آیات سے جو سب کی سب منافقین کے متعلق گفتگو کر رہی ہیں۔

بہرحال آیت کے آخر میں مختصراً فرمایا گیا ہے، ان پر افسوس ہے کہ موت اور تباہی ان کے لیے ان کی زندگی سے بہتر ہے۔ (فاولی لھم)۔

"اولی لھم" کا جملہ عربی ادب میں عام طور پر کسی کو دھمکی دینے کسی پر لعنت بھیجنے، کسی سے اظہار نفرت کرنے اور کسی کے لیے بدبختی اور پریشانی کی آرزو کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔[1]

بعض مفسرین نے اس کی "الموت اولی لھم" (موت ان کے لیے بہتر ہے) کے معنی سے تفسیر کی ہے۔

---

[1] کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ یہ جملے کا معنی یوں ہوں گا، "یلیہ مکروہ" اور اسے "ویل لھم" کے ہم معنی سمجھا ہے۔

اور اگر ان دونوں معانی کو آپس میں ملا دیا جائے جس طرح ہم نے آیت کی تفسیر میں کیا ہے تو کوئی مانع موجود نہیں ہے۔

بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے، لیکن اگر وہ اطاعت کریں اور فرمانِ جہاد سے منہ نہ موڑیں، نیک، سنجیدہ اور اچھی باتیں کریں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے (طاعة وقول معروف)۔ [1]

ممکن ہے "قولِ معروف" کی تعبیر منافقین کی جہاد کے بارے میں ان نا موزوں اور غیر مناسب باتوں کے مقابلے میں ہو جو وہ جہاد کی آیات نازل ہونے کے بعد کیا کرتے تھے، کبھی تو کہتے تھے کہ:

"لا تنفروا فی الحر"

"اس قدر شدید گرمی میں میدانِ جہاد کی طرف مت نکلو" (توبہ / ۸۱)

اور کبھی کہتے:

"واذ یقول المنافقون والذین فی قلوبھم مرض ما وعدنا اللہ و رسولہ الا غرورا"

"خدا اور اس کے رسولؐ نے ہمیں کامیابی کے جھوٹے وعدے کے سوا اور کچھ نہیں دیا" (احزاب / ۱۲)

کبھی مؤمنین کو نا امید کرنے اور انہیں میدان جنگ سے روکنے کے لیے کہتے:

"ھلم الینا"

"ہماری طرف آؤ اور خوش رہو" (احزاب / ۱۸)

وہ لوگوں کو نہ صرف جہاد کی ترغیب نہیں دیتے تھے بلکہ ان کے حوصلے پست کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور بھی لگایا کرتے۔

مزید فرمایا گیا ہے: پھر جب لڑائی ٹھن جائے اور حکم جہاد قطعی ہو جائے تو اگر یہ لوگ خدا سے سچے رہیں اور صدق و صفا کی راہ اختیار کریں تو ان کے حق میں بہتر ہے (فاذا عزم الامر فلو صدقوا اللہ لکان خیرا لھم)۔

یہ بات دنیا میں بھی ان کی سرفرازی کا باعث ہے اور آخرت میں بھی وہ ثواب عظیم اور بہت بڑی کامیابی حاصل کریں گے۔

"عزم الامر" دراصل کسی کام کے پختہ اور محکم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن قبل و بعد کی آیات کے قرینے کی وجہ سے اس سے مراد "جہاد" ہے۔

---

[1] "طاعة" مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے جو تقدیری طور پر یوں ہوگی: طاعة وقول معروف امثل لھم، بعض اسے مبتدا محذوف کی خبر سمجھتے ہیں جو تقدیری طور پر یوں ہوگی "امرنا طاعة" لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بعد کی آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے : لیکن اگر مخالفت کا راستہ اختیار کرو اور فرمان الٰہی اور اس کی کتاب پر عمل کرنے سے روگردانی کرو تو تم سے سوائے روئے زمین پر فساد برپا کرنے اور قطع رحمی کے اور کیا توقع رکھی جا سکتی ہے (فھل عسیتم ان تولیتم ان تفسدوا فی الارض وتقطعوا ارحامکم)۔[1]

کیونکہ اگر تم قرآن اور توحید سے روگرداں ہو جاؤ تو یقیناً جاہلیت کی طرف لوٹ جاؤ گے اور جاہلیت کا طریقہ کار تو بس "فساد فی الارض" قتل وغارت اور خون ریزی اور قریبی عزیزوں اور بیٹیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا ہے۔

یہ اس صورت میں ہے جب "تولیتم" کو "تولی" یعنی روگردانی کے مادہ سے لیا جائے، لیکن بہت سے مفسرین نے اسے "ولایت" (حکومت) کے مادہ سے لیا ہے جس کا معنی یہ ہوگا کہ اگر حکومت کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ آجائے تو تم سے تباہی و بربادی، خون ریزی اور قطع رحمی کے علاوہ اور کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔

گویا کچھ منافقین نے میدان جہاد سے راہ فرار اختیار کرنے کے یہ بہانہ گھڑ لیا تھا کہ ہم میدان جنگ میں کیوں قدم رکھیں اور کیوں وہاں پر خون ریزی کا ارتکاب کریں اور اپنے قریبیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر "مفسد فی الارض" بنیں۔

قرآن مجید ان کے اس بہانے کے جواب میں کہتا ہے، تو کیا جب حکومت تمہارے پاس تھی، اس وقت تم "فساد فی الارض" قتل وغارت اور خون ریزی اور قطع رحمی کے علاوہ اور کیا کیا کرتے تھے؟ یہ سب بہانے ہیں۔ اسلام میں جنگ کا مقصد فتنہ کی آگ کو بجھانا ہے نہ کہ فتنہ وفساد کو ہوا دینا اور ظلم وستم کی بساط کو الٹنا ہے نہ کہ قطع رحمی۔

اہل بیت اطہار علیہم السلام سے منقول بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت بنی امیہ کے بارے میں ہے کہ جب انہوں نے زمام حکومت سنبھالی تو نہ تو کسی چھوٹے پر رحم کیا اور نہ ہی کسی بڑے پر۔ حتیٰ کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی موت کے گھاٹ اتارنے سے نہیں چوکے۔[2]

ظاہر ہے کہ ابو سفیان سے لے کر اس کے پوتوں پڑپوتوں تک تمام بنی امیہ اس آیت کا روشن مصداق تھے اور روایت کی مراد بھی یہی ہے، لیکن آیت کا مفہوم عام اور وسیع ہے جس میں تمام ظالم اور مفسد منافقین شامل ہیں۔

بعد کی آیت اس منافق اور بہانہ جو مفسد گروہ کے حتمی انجام کو ان لفظوں میں بیان کرتی ہے: "یہ وہی لوگ ہیں جنہیں خدا نے اپنی رحمت سے دور رکھا، ان کے کانوں کو بہرہ اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ نہ تو وہ کسی

---

[1] اگرچہ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں بہت کم بحث کی ہے، لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ "ان تولیتم" کا جملہ "عسیٰ" کے اسم اور خبر کے درمیان واقع ہوا ہے جملہ شرطیہ ہے اور اس کی جزاء "فھل عسیتم ان تفسدوا فی الارض" کا مجموعی جملہ ہے جو تقدیری طور پر یوں ہے "ان تولیتم عن کتاب اللہ فھل یترقب منکم الا الفساد فی الارض"۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۰۔

حقیقت کو سن سکتے ہیں اور نہ ہی اسے دیکھ سکتے ہیں (اولٰئک الذین لعنھم اللہ فاصمھم واعمٰی ابصارھم) ۔

وہ اسلامی جہاد کو ، جو حق وعدالت پر مبنی ہوتا ہے قطع رحمی اور فساد فی الارض سے تعبیر کرتے ہیں لیکن دورِ جاہلیت میں انہوں نے خود جن جرائم کا ارتکاب کیا ہے اپنی حکومت کے دوران بے گناہوں کا جو خون بہایا ہے اور معصوم نومولود بچوں کو اپنے ہاتھوں سے زندہ درگور کیا ہے ، کیا وہ سب حق بھی تھا اور عدالت پر مبنی بھی ؟ خدا کی لعنت ہو ان پر جن کے پاس نہ تو حق سننے کے لیے کان ہیں اور نہ ہی حقیقت کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ۔

حضرت امام علیؑ بن الحسینؑ سے روایت ہے کہ آپ نے اپنے فرزند امام محمد باقر علیہ السلام سے فرمایا :

" ایاک ومصاحبة القاطع لرحمه ، فانی وجدته ملعونًا فی کتاب اللہ عز وجل فی ثلاث مواضع ، قال اللہ عز وجل " فهل عسیتم ..... "

" میرے بیٹے ! ان لوگوں کی دوستی سے پرہیز کرو جو قطع رحمی کرتے ہیں ، کیونکہ میں نے انھیں قرآن میں تین مقام پر ملعون پایا ہے اور پھر آپ نے آیت " فهل عسیتم ..... " کی تلاوت فرمائی " ۔[1]

" رحم " دراصل شکمِ مادر میں جنین کے رہنے کی جگہ کو کہتے ہیں ، بعد ازاں اس تعبیر کا تمام رشتہ داروں پر اطلاق ہونے لگا ، اس لیے کہ ان سب کا ایک ہی " رحم " سے تعلق ہوتا ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے :

" ثلاثة لا یدخلون الجنة مدمن خمر و مدمن سحر و قاطع رحم "

تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جو بہشت میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے ، شرابی ، جادوگر اور قطع رحمی کرنے والے ۔[2]

ظاہری بات ہے کہ ایسے لوگوں پر خدا کی لعنت اور رحمت خدا سے دوری اسی طرح ان سے حقائق کے ادراک کی قوت کا سلب ہو جانا ، ہرگز جبر پر مبنی نہیں ہے ، کیونکہ یہ خود ان کے اپنے اعمال کی سزا اور ان کے کردار و گفتار کا ردِ عمل ہے ۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت میں اس بدبخت گروہ کے انحراف اور گمراہی کے سبب کو یوں بیان فرمایا گیا ہے : تو کیا یہ لوگ قرآنی آیات میں غور نہیں کرتے (تاکہ حقائق ادراک کر کے اپنے فرائض کو انجام دیں) یا پھر کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں (افلا یتدبرون القراٰن ام علٰی قلوب اقفالھا) ۔

---

[1] اصول کافی جلد ۲ باب من تکرہ مجالستہ حدیث ، ، لیکن دوسری دو آیتیں جو حدیث کے ضمن میں بیان ہوئی ہیں ایک تو سورۂ رعد کی ۲۵ ویں آیت ہے اور دوسری سورۂ بقرہ کی ۲۷ ویں آیت ہے ایک میں صراحت کے ساتھ لعنت کا تذکرہ ہے اور دوسری میں کنایہ کے طور پر ۔

[2] خصال صدوق ۔

جی ہاں! ان کی مصیبت کا سبب ان دو چیزوں میں سے ایک ہے یا تو وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے جو قرآن ہدایت الٰہی کا حامل اور شفا عطا کرنے کا مکمل نسخہ ہے یا اگر غور تو کرتے ہیں، لیکن خواہشات نفسانی کی اتباع اور پہلے سے انجام دیئے ہوئے کردار کی وجہ سے ان کے دلوں پر ایسے قفل پڑ چکے ہیں کہ کوئی بھی حقیقت ان کے دلوں تک نہیں پہنچ پاتی۔

دوسرے لفظوں میں اگر کوئی شخص تاریکیوں میں اپنا راستہ کھو بیٹھے اور اس کے ہاتھ میں کوئی چراغ بھی نہ ہو یا اگر چراغ تو ہو لیکن اس کی آنکھیں نابینا ہوں تو وہ راستے سے بھٹک جائے گا لیکن اگر ہاتھ میں چراغ بھی ہو اور آنکھیں بھی صحیح و سالم ہوں تو راستہ واضح ہوتا ہے۔

"اقفال" "قفل" کی جمع ہے، جو اصل میں "قفول" (واپس پلٹ جانا) کے مادہ سے ہے یا "قفیل" (بمعنی خشک چیز) کے مادہ سے، چونکہ جس وقت دروازے کو بند کرکے اسے تالا لگا دیا جاتا ہے تو جو شخص بھی آتا ہے وہاں سے واپس پلٹ جاتا ہے اور خشک اور ٹھوس چیز کے مانند کوئی چیز بھی اس میں داخل نہیں ہو سکتی لہٰذا یہ کلمہ اس مخصوص اوزار پر استعمال ہونے لگا۔

چند نکات

۱۔ قرآن فکر و عمل کی کتاب ہے: قرآن کی مختلف آیات اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان کر رہی ہیں کہ یہ عظیم آسمانی کتاب صرف تلاوت کرنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس کا منتہائے مقصود "ذکر" (یاد دہانی)، "تدبر" (نتائج پر غور و خوض)، "انذار" (لوگوں کو ظلمات سے نکال کر نور تک پہنچانا) اور "شفا، رحمت اور ہدایت" ہے۔

"و ھذا ذکر مبارک انزلناہ"

"یہ بابرکت یاد دہانی ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔" (انبیاء/ ۵۰)

"کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا اٰیاتہ"

"یہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے تجھ پر نازل کیا ہے تاکہ تو اس کی آیات میں غور کرے"

(ص/ ۲۹)

سورۂ انعام کی ۱۹ ویں آیت میں ہے:

"و اوحی الی ھذا القراٰن لانذرکم بہ و من بلغ"

"یہ قرآن مجھ پر وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے سے تمہیں اور ان لوگوں کو ڈراؤں جن تک یہ پیغام پہنچے۔"

سورۂ ابراہیم کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے:

"کتاب انزلناہ الیک لتخرج الناس من الظلمات الی النور"

یہ ایک کتاب ہے، جسے ہم نے تجھ پر نازل کیا ہے تاکہ اس کے ذریعے تو لوگوں کو تاریکیوں

سے نکال کر نور تک پہنچائے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی ۸۲ ویں آیت میں ہے:

"وننزل من القراٰن ما هو شفاء و رحمة للمؤمنين"

"ہم قرآن کی ایسی آیتیں بھی نازل کرتے ہیں جو مومنین کے لیے شفا اور رحمت کا سبب ہیں۔"

اس طرح قرآن مجید کو مسلمانوں کی زندگی کے لیے راہنما کی حیثیت سے اختیار کیا جانا چاہیئے اور اسے اپنے لیے اسوہ اور نمونۂ عمل قرار دینا چاہیئے، اس کے احکام پر پورے طور پر عمل کرنا چاہیئے اور اس سے سرمو انحراف نہیں کرنا چاہیئے اور زندگی کے تمام خطوط کو اس سے ہم آہنگ کرنا چاہیئے۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کا سلوک اس سے نہایت ہی ناروا ہے اور اسے صرف بے معنی ورد و ذلیفہ تک محدود کر دیا گیا ہے۔ صرف سرسری تلاوت پر اکتفا کیا جاتا ہے زیادہ سے زیادہ تجوید، خوش الحانی اور اچھی آواز سے پڑھنے کو اہمیت دیتے ہیں، مسلمانوں کی بہت بڑی بدبختی ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کو اپنی زندگی کے پروگراموں سے نکال کر بس اس کے الفاظ پر گزارہ کر رکھا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان زیرِ تفسیر آیات میں بڑی صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ دل کے مریض ان منافق لوگوں نے قرآن میں تدبر نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں یہ سیاہ اور تاریک دن دیکھنے نصیب ہوئے۔

"تدبر" "دبر" (بروزن "ابر") کے مادے سے ہے جس کا معنی ہے، کسی چیز کے نتائج اور انجام پر غور کرنا۔ یہ "تفکر" کے برعکس ہے، جس کا زیادہ تر اطلاق کسی چیز کے اسباب اور وجوہات پر غور کرنے پر ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ان دونوں کلموں کا استعمال نہایت ہی معنی خیز ہے۔

نیز اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ قرآن مجید سے استفادہ کے لیے ایک قسم کی خودسازی کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن مجید خود بھی اس قسم کی خودسازی کے لیے معاون ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اگر دلوں پر ہوا و ہوس، تکبر اور غرور، ہٹ دھرمی اور تعصب کے تالے لگے ہوئے ہوں تو یہ رکاوٹیں نورِ حق کو ان میں داخل ہونے سے روک دیتی ہیں اور زیرِ تفسیر آیات میں بھی اس تفسیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کیا ہی زیبا فرمان ہے امیرالمومنین علی علیہ السلام کا جو ایک خطبے کے ضمن میں متقین کے بارے میں ہے:

• اما الليل فصافون اقدامهم، تالين لاجزاء القراٰن، يرتلونها ترتيلا يحزنون به انفسهم، ويستثيرون به دواء دائهم، فاذا مروا باٰية فيها تشويق ركنوا اليها طمعًا، وتطلعت نفوسهم اليها شوقًا، وظنوا انها نصب اعينهم واذا مروا باٰية فيها تخويف اصغوا اليها مسامع قلوبهم وظنوا ان زفير جهنم وشهيقها فى اصول اٰذانهم"

وہ رات کے وقت قیام کرتے ہیں، قرآن کی ٹھہر ٹھہر کر اور سوچ سمجھ کر تلاوت کرتے ہیں۔

اپنے آپ کو اس کے ذریعے پر سوز کرتے ہیں، اپنے درد کی دوا اس میں تلاش کرتے ہیں، جب کسی ایسی آیت پر پہنچتے ہیں جس میں شوق دلایا گیا ہے تو وہ بڑے اشتیاق کے ساتھ اس کی طرف مائل ہوتے ہیں، دل کی آنکھیں بڑے شوق کے ساتھ اور غور سے اسے دیکھتی ہیں اور ہمیشہ اسے اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں اور اگر کسی آیت پر پہنچتے ہیں جس میں ڈرایا گیا ہے تو دل کے کان کھول کر اسے سنتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جلا ڈالنے والی دوزخ کی آگ کی چیخ و پکار اور اس کے شعلوں کی لپیٹوں کی آواز ان کے دل کے کانوں میں گونج رہی ہے۔[1]

۲۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام "ام علی قلوب اقفالھا" کے جملہ کی تفسیر میں یوں فرماتے ہیں:

"ان لک قلبا و مسامع وان اللہ اذا اراد ان یھدی عبدا فتح مسامع قلبہ، واذا اراد بہ غیر ذالک ختم مسامع قلبہ، فلا یصلح ابدا وھو قول اللہ عزوجل: ام علی قلوب اقفالھا"

تمہارے لیے دل بھی ہے اور کان بھی (جن میں داخل ہونے کے رستے ہیں) اور جب خدا کسی بندے کو (اس کے تقوےٰ کی وجہ سے) ہدایت کرنا چاہے تو اس کے دل کے کانوں کو کھول دیتا ہے اور جب اس کے علاوہ اور برعکس چاہتا ہے تو اس کے دل کے کانوں پر مہر لگا دیتا ہے اور اس کی کبھی اصلاح نہیں ہو سکتی اور یہی ہے معنی خدا کے اس قول "ام علی قلوب اقفالھا" کا۔[2]

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۳، معروف بہ خطبہ ہمام۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ صلا۔

۲۵۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ ارۡتَدُّوۡا عَلٰۤی اَدۡبَارِہِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُمُ الۡہُدَی ۙ الشَّیۡطٰنُ سَوَّلَ لَہُمۡ ؕ وَ اَمۡلٰی لَہُمۡ ○

۲۶۔ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡا لِلَّذِیۡنَ کَرِہُوۡا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ سَنُطِیۡعُکُمۡ فِیۡ بَعۡضِ الۡاَمۡرِ ۚ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ اِسۡرَارَہُمۡ ○

۲۷۔ فَکَیۡفَ اِذَا تَوَفَّتۡہُمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یَضۡرِبُوۡنَ وُجُوۡہَہُمۡ وَ اَدۡبَارَہُمۡ ○

۲۸۔ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمُ اتَّبَعُوۡا مَاۤ اَسۡخَطَ اللّٰہَ وَ کَرِہُوۡا رِضۡوَانَہٗ فَاَحۡبَطَ اَعۡمَالَہُمۡ ○

ترجمہ

۲۵۔ جو لوگ حق کے واضح ہو جانے کے بعد بھی اُلٹے پاؤں پھر گئے ہیں شیطان نے ان کے بُرے اعمال کو ان کی نگاہوں میں بنا سجا کر پیش کیا ہے اور انہیں لمبی آرزوؤں پر فریفتہ کیا ہے۔

۲۶۔ یہ اس لیے ہے کہ وہ (منافقین) ان لوگوں سے کہتے ہیں جو (پیغمبرؐ پر) جو نزول وحی کو ناپسند کرتے ہیں کہا کہ بعض کاموں میں ہم تمہاری پیروی کریں گے، جب کہ خدا ان کے رازوں سے آگاہ ہے۔

۲۷۔ اس وقت ان کا کیا حال ہو گا جب (موت کے) فرشتے ان کے چہروں اور ان کی پشت پر مارتے ہوں گے (اور ان کی رُوح قبض کریں گے)۔

۲۸۔ یہ سب اس وجہ سے ہے کہ جس چیز سے خدا ناخوش ہے، اس کی تو یہ لوگ پیروی

کرتے ہیں اور جس میں خدا کی خوشی ہے اس سے بیزار ہیں۔ لہٰذا خدا نے ان کے سب اعمال اکارت کردیئے۔

تفسیر

وہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے؟

یہ آیات بھی منافقین کے بارے میں ہیں اور ان کے مختلف اعتراضات بیان کررہی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: بیشک جو لوگ حق واضح ہوجانے کے بعد بھی اُلٹے پاؤں پھر گئے ہیں، شیطان نے ان کے بُرے اعمال کو ان کی نگاہوں میں بنا سجا کر پیش کیا ہے اور انہیں لمبی آرزوؤں پر فریفتہ کردیا ہے (ان الذین ارتدوا علی ادبارھم من بعد ما تبین لھم الھدی الشیطان سول لھم و املی لھم)۔

اگرچہ بعض مفسرین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ آیت ان بعض اہل کتاب کافروں کے متعلق گفتگو کررہی ہے جو پیغمبر اسلامؐ کی بعثت سے پہلے اپنی آسمانی کتابوں سے آنحضرتؐ کی نشانیاں بیان کیا کرتے تھے اور آپؐ کے ظہور کے شدید منتظر تھے لیکن جب آپؐ تشریف لے آئے اور وہ نشانیاں بھی ظاہر ہوگئیں تو اُلٹے پاؤں پھر گئے اور خواہشات نفسانی اور مادی فوائد ان کے ایمان کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔

لیکن گذشتہ اور آیندہ آیات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ یہ آیت بھی منافقین کی بات کررہی ہے، جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نزدیک سے دیکھا آپؐ کی حقانیت کے دلائل کا بخوبی مشاہدہ کیا اور سنا لیکن نفسانی خواہشات اور شیطانی پھندوں میں آکر پیٹھ پھیر دی۔

"سول"، "سؤل" (بروزن "قفل") کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ایسی حاجت ہے جس کے پورا ہونے کے لیے نفس انسانی حریص ہوتا ہے[1] "تسویل" کا معنی ان امور کی بابت رغبت اور شوق دلاتا ہے جن کی انسان کو حرص ہوتی ہے۔ اس امر کی شیطان کی طرف نسبت ان وسوسوں کی وجہ سے ہے جو وہ انسان کے دل میں ڈالتا ہے اور اس کی ہدایت کے آگے رکاوٹ بنتا ہے۔

"املی لھم" "املاء" سے ہے جس کا معنی لمبی چوڑی اور دور دراز کی امیدیں اور آرزوئیں باندھنا ہے جو انسان

---

[1] لہٰذا بعض مفسرین نے اس کی "امید" اور "آرزو" کے معنی میں تفسیر کی ہے جیسا کہ سورہ طٰہٰ کی ۳۶ ویں آیت میں ہے۔ "قد اوتیت سؤلک یا موسٰی"۔

کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں اور حق سے باز رکھتی ہیں۔

بعد کی آیت ان شیطانی تسویلات اور سجادٹوں کی اس طرح تشریح کرتی ہے: یہ اس لیے کہ وہ ان لوگوں سے کہتے ہیں جو پیغمبر اسلام پر نزول وحی کو ناپسند کرتے ہیں، ہم بعض کاموں میں تمہاری بات مانیں گے (ذالک بانهم قالوا للذین کرهوا ما نزل الله سنطیعکم فی بعض الامر)۔

منافقین کا کام یہی ہوتا ہے کہ وہ غلط کار اور مخالف لوگوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور اگر تمام پہلوؤں کے لحاظ ان میں مشترک قدریں نہ پائی جاتی ہوں تو جس حد تک بھی ان کی قدریں آپس میں مشترک ہوتی ہیں ان سے تعاون بلکہ ان کی اطاعت کرتے ہیں۔

منافقین مدینہ بھی بنی نضیر اور بنی قریظہ کے یہودیوں کے پاس آئے جو آنحضرت کی بعثت سے قبل اسلام کے مبلغ تھے۔ لیکن جب آنحضرتؐ کی بعثت ہوگئی تو حسد، تکبر اور مفادات خطرے میں پڑ جانے کی وجہ سے ظہور اسلام کو ناپسند کرنے لگے اور چونکہ پیغمبر اسلام کی مخالفت اور آپ کے خلاف سازشیں منافقین اور یہود کے درمیان قدر مشترک تھیں لہٰذا ان سے باہمی تعاون کا وعدہ کر لیا۔

"فی بعض الامر" کی تعبیر شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم صرف اس حد تک تمہارے ساتھ تعاون کریں گے۔ لیکن تم چونکہ بُت پرستی کے مخالف اور روز قیامت کے معتقد ہو لہٰذا ہم ان امور میں تمہارے ساتھ نہیں ہیں۔[1]

یہ بات سورۂ حشر کی گیارہویں آیت سے ملتی جلتی ہے، جس میں کہا گیا ہے:

"الم تر الی الذین نافقوا یقولون لاخوانهم الذین کفروا من اهل الکتاب لئن اخرجتم لنخرجن معکم ولا نطیع فیکم احدا ابدا وان قوتلتم لننصرنکم"

"کیا تم نے منافقین کو نہیں دیکھا جو اپنے اہل کتاب کافر بھائیوں سے کہتے ہیں کہ اگر تم ان شہروں سے کوچ کرو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ آئیں گے اور تمہاری مخالفت میں کسی بھی شخص کی اطاعت نہیں کریں گے اور اگر وہ تمہارے ساتھ لڑیں گے تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔"

آیت کے آخر میں انہیں مختصر سی عبارت کے ساتھ تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے خدا ان کی مخفی باتوں اور رازوں سے آگاہ ہے (والله یعلم اسرارهم)۔

ان کے باطنی کفر اور نفاق سے بھی آگاہ ہے اور یہودیوں کے تعاون سے یہ جو سازشیں تیار کرتے ہیں ان سے بھی آگاہ ہے اور وقت آنے پر انہیں سزا دے گا۔

---

[1] اس آیت کی تفسیر میں کئی اور احتمالات کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو گذشتہ اور آئندہ آیات سے ہم آہنگ نہیں ہیں لہٰذا انہیں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

نیز یہ بھی کہ یہود کی مخفی دشمنی و عناد اور حسد سے بھی آگاہ ہے، وہ اپنی کتاب کی گواہی کے پیش نظر پیغمبرِ اسلام کی نشانیوں سے اس قدر آگاہ تھے کہ انہیں ویسے پہچانتے تھے جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے تھے اور یہ نشانیاں آپ کے ظہور سے پہلے لوگوں کو کھلے بندوں بتاتے تھے۔ لیکن آپ کے ظہور کے بعد انہوں نے ان سب کو چھپا دیا ہے، خدا اس مخفی کام سے آگاہ ہے۔

امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ "کرھوا ما نزل اللّٰہ" سے مراد بنی امیہ" ہیں جو حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے بارے میں فرمان الٰہی کے نزول کو پسند نہیں کرتے تھے۔[1]

ظاہری بات ہے کہ یہ تطابق اور بیان مصداق ہے کہ آیت کا مفہوم اسی میں منحصر ہے۔

بعد کی آیت اس تہدید کی وضاحت ہے جس میں کہا گیا ہے، اس وقت ان کا کیا حال ہوگا جب موت کے فرشتے ان کے چہروں اور پشت پر ماریں گے اور ان کی رُوح قبض کریں گے (فکیف اذا توفتھم الملائکة یضربون وجوھھم وادبارھم)۔[2]

جی ہاں یہ فرشتے مامور ہیں کہ موت کے آغاز ہی میں انہیں سزا دینا شروع کر دیں تاکہ وہ کفر و نفاق اور ہٹ دھرمی و عناد کا مزہ چکھیں، ان کے چہروں پر اس لیے ماریں گے کہ انہوں نے دشمنانِ خدا کی طرف منہ کیا ہوگا اور پشت پر اس لیے کہ خدا کی آیات اور پیغمبر کی طرف پشت کی ہوگی۔

یہ بات سورۂ انفال کی ۵۰ ویں آیت سے ملتی جلتی ہے جو کفار و منافقین کے بارے میں ہے، اسی میں ہے۔

"ولو ترٰی اذ یتوفی الذین کفروا الملائکة یضربون وجوھھم وادبارھم وذوقوا عذاب الحریق"

"اور اگر تو کافروں کو اس وقت دیکھے کہ جب موت کے فرشتے ان کی رُوح قبض کرتے ہیں اور ان کے چہروں اور پشت پر مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جلا ڈالنے والے عذاب کا مزہ چکھو"

اس سلسلے کی آخری آیت میں بھی بوقت وفات ان پر عذاب الٰہی کی علت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، یہ عذاب اور سزا اس لیے ہے کہ جس چیز سے خدا ناخوش ہے اس کی تو یہ لوگ پیروی کرتے ہیں اور جس میں خدا کی خوشی ہے اس سے بیزار ہیں، لہٰذا خدا نے ان کے سب اعمال کو اکارت کر دیا ہے (ذالک بانھم اتبعوا ما اسخط اللّٰہ وکرھوا رضوانہ فاحبط اعمالھم)۔

کیونکہ تمام اعمال کی قبولیت اور ہر قسم کی سعی و کوشش منظور ہونے کی شرط اولین خدا کی رضا ہے، بنا بریں فطری بات ہے کہ جو لوگ خدا کو ناراض کرنے پر تلے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کی رضا مندی کی مخالفت کرتے ہیں ان کے

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص۱۰۵۔

[2] "کیف" ایک مبتدا محذوف کی خبر ہے جو تقدیری صورت میں یوں ہے "فکیف حالھم...."۔

اعمال اکارت جائیں گے اور وہ گناہوں کا بوجھ کاندھوں پر اُٹھائے اِس عالم سے اس عالم کو سدھاریں گے۔

ان لوگوں کا حال مومنین کے حالات کے بالکل برعکس ہے کیونکہ موت کے فرشتے بوقت وفات ان کے استقبال کو آتے ہیں اور خندہ پیشانی کے ساتھ انہیں کہتے ہیں: تم پر سلام ہو، اب تم اپنے انجام دیئے ہوئے اعمال کی وجہ سے بہشت میں چلے جاؤ۔ قرآن کے الفاظ میں،

"الذین تتوفاھم الملائکۃ طیبین یقولون سلام علیکم ادخلوا الجنۃ بما کنتم تعملون" (نحل/۳۲)

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ خدا کی ناراضی کے بارے میں جملہ فعلیہ "ما اسخط اللہ" آیا ہے اور اس کی رضامندی کے کے بارے میں جملہ اسمیہ "رضوانہ" ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ تعبیر کے اس فرق میں عجیب قسم کا لطف ہے اور وہ یہ کہ خدا کی ناراضی کبھی ہوتی ہے اور اس کی رضا ورحمت دائمی اور ہمیشہ ہے۔

یہ نکتہ بھی واضح ہے کہ خدا کے بارے میں ناراضی، غضب اور غصے کا ذکر نفسانی تاثرات کے معنی میں نہیں، جیسا کہ اس کی رضامندی رُوحانی خوشی کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"غضب اللہ عقابہ ورضاہ ثوابہ"

"خدا کا غضب اس کا عذاب ہے اور اس کی رضا اس کا ثواب ہے"[1]

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۰ صفحہ ۲۶۶ بحوالہ توحید صدوق۔

۲۹۔ اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ اَنۡ لَّنۡ یُّخۡرِجَ اللّٰہُ اَضۡغَانَہُمۡ ○

۳۰۔ وَ لَوۡ نَشَآءُ لَاَرَیۡنٰکَہُمۡ فَلَعَرَفۡتَہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ ؕ وَ لَتَعۡرِفَنَّہُمۡ فِیۡ لَحۡنِ الۡقَوۡلِ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ اَعۡمَالَکُمۡ ○

۳۱۔ وَ لَنَبۡلُوَنَّکُمۡ حَتّٰی نَعۡلَمَ الۡمُجٰہِدِیۡنَ مِنۡکُمۡ وَ الصّٰبِرِیۡنَ ۙ وَ نَبۡلُوَا۠ اَخۡبَارَکُمۡ ○

ترجمہ

۲۹۔ کیا وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے، ان کا یہ خیال ہے کہ خدا ان کے کینوں کو ظاہر نہیں کرے گا؟

۳۰۔ اگر ہم چاہیں تو انھیں تجھ کو دکھا دیں تاکہ تو انھیں ان کے چہرے مہرے سے پہچان لے اگرچہ تو انھیں ان کے اندازِ گفتگو سے پہچان سکتا ہے اور خدا تمھارے اعمال سے واقف ہے۔

۳۱۔ اور ہم تم لوگوں کو ضرور آزمائیں گے تاکہ معلوم ہو جائے کہ تم لوگوں میں صحیح معنوں میں مجاہد اور صابر کون ہیں؟ اور ہم تمھاری خبروں کو بھی آزمائیں گے۔

تفسیر

منافقین اندازِ گفتگو سے پہچانے جاتے ہیں :

ان آیات میں بھی ایک اور بحث کے حوالے سے منافقین کی صفات اور علامات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ، اور اس بات پر خاص تاکید کی گئی ہے کہ یہ لوگ یہ تصور نہ کریں کہ ہمیشہ اپنے نفاق کو رسولِ خدا اور مومنین سے چھپائے رکھیں گے اور اپنے آپ کو بہت بڑائی رسوائی سے بچاتے رہیں گے ۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے : کیا وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے انہیں یہ خیال ہے کہ خدا ان کے شدید کینوں کو ظاہر نہیں کرے گا (ام حسب الذین فی قلوبھم مرض ان لن یخرج اللہ اضغانھم) [1]

"اضغان" "ضغن" (بروزن "حرص" اور بروزن "عقد") سخت اور شدید کینے کے معنی میں ہے ۔

ان کے دل میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کے بارے میں زبردست کینہ تھا اور ہر وقت اس بات کی انتظار میں تھے کہ کوئی موقع ملے اور ان پر کاری ضربیں لگائیں ، قرآن پاک انہیں متنبہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ یہ تصور نہ کریں کہ وہ ہمیشہ اپنے حقیقی چہرے کو چھپائے رکھیں گے ۔

لہٰذا بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے : اگر ہم چاہیں تو انھیں تجھ کو دکھا بھی دیں تاکہ تو اُن کو ان کے چہرے مہرے سے پہچان لے (ولو نشاء لاریناکھم فلعرفتھم بسیماھم)

ہم ان کے چہروں پر ایسا نشان لگائیں گے جسے دیکھ کر آپ ان کے نفاق سے آگاہ ہوجائیں گے اور "رأی العین" سے انھیں دیکھیں گے ۔

پھر فرمایا گیا ہے : اگرچہ تو اب بھی انہیں ان کے اندازِ گفتگو سے پہچان سکتا ہے ۔ (ولتعرفنھم فی لحن القول) ۔

راغب مفردات میں کہتے ہیں کہ "لحن" کا معنی یہ ہے کہ لفظ کو اپنے قواعد اور اصل طریقۂ کار سے پھیر دیا جائے یا اصلی اعراب کی جگہ کوئی دوسرا اعراب دیا جائے یا صراحت سے اشارے اور کنائے کی طرف لے جایا جائے ۔ زیر تفسیر آیت میں اس سے تیسرا معنی مراد ہے ، یعنی دل کے مریض منافقوں کو اس طرح پہچانا جا سکتا ہے کہ وہ ایک صریح اور واضح معنی کو کنائے تکلیف دہ تعبیر اور دل دکھانے کے انداز میں استعمال کرتے ہیں ۔

---

[1] بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت میں "ام" کو "استفہامیہ" سمجھا ہے اور بعض دوسرے مفسرین نے اسے "منقطعہ" یعنی "بل" سمجھا ہے ۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے ۔

جہاں پر جہاد کی بات ہوتی ہے، وہاں پردہ کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کے ارادے کمزور اور ان کے حوصلے پست کردیں۔ جہاں پر حق اور عدالت کی بات ہوتی ہے وہاں پردہ اسے دوسرے لفظوں میں پھیرے جاتے ہیں اور جہاں پر نیک اور پاکیزہ اور اسلام کے پیش قدم لوگوں کا تذکرہ آتا ہے تو وہ کوشش کرتے ہیں کہ انھیں عیب دار اور کم حیثیت بنا کر پیش کریں۔

لہٰذا ابو سعید خدری سے مروی ایک مشہور روایت میں ہے:

"لحن القول بغضهم علی بن ابی طالب، وکنا نعرف المنافقین علیٰ عهد رسول الله ببغضهم علی بن ابی طالب"

"لحن القول" سے مراد علی بن ابی طالب کے ساتھ بغض ہے اور پیغمبر خدا کے زمانے میں منافق لوگوں کو ہم علی بن ابی طالب کے ساتھ دشمنی سے پہچانا کرتے تھے۔[1]

جی ہاں منافقوں کی ایک واضح علامت یہ بھی ہے کہ وہ مسلمانوں میں سے مومن اول اور اولین جانبازِ اسلام سے دشمنی کیا کرتے تھے۔

اصولی طور پر یہ بات ممکن نہیں ہے کہ انسان کسی چیز کو دل میں چھپائے رہے اور اسے ایک طویل عرصے تک اس قدر مخفی رکھے کہ اشارات وکنایات اور "لحن القول" میں بھی اسے ظاہر نہ کر پائے۔ اسی لیے تو حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ما اضمر احد شیئًا الا ظهر فی فلتات لسانه وصفحات وجهه"

"کوئی شخص کسی چیز کو اپنے دل میں مخفی نہیں کرتا مگر یہ کہ باتوں باتوں میں اس کے منہ سے غیر شعوری طور پر نکل جاتی ہے اور اس کے چہرے پر آشکار ہو جاتی ہے۔"[2]

قرآن مجید کی دوسری آیات میں منافقین کی تکلیف دہ باتوں کو بیان کیا گیا ہے جو اسی "لحن القول" کا مصداق ہیں، یا پھر ان کی مشکوک حرکتوں کو نقل کیا گیا ہے، شاید اسی وجہ سے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ زیرِ تفسیر آیت کے نزول

---

[1] تفسیر مجمع البیان اسی آیت کے ضمن میں۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ اس روایت کو اہل سنت کے بہت سے بزرگوں نے بھی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، جن میں سے چند ایک علماء اور ان کی کتابوں کے نام یہ ہیں۔ احمد نے کتاب "فضائل" میں، ابن عبدالبر نے "استیعاب" میں ذہبی نے "تاریخ اول الاسلام" میں، ابن اثیر نے "جامع الاصول" میں، علامہ گنجی نے "کفایۃ الطالب" میں محب الدین طبری نے "ریاض النضرۃ" میں سیوطی نے "درمنثور" میں، آلوسی نے "روح المعانی" میں اور دوسرے بہت سے علماء نے اپنی اپنی کتابوں میں اسے درج کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسی مسلمہ روایت میں سے ہے کہ جو پیغمبر اسلام سے منقول ہوئی ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے "احقاق الحق" جلد سوم ص۲۱۱ ملاحظہ فرمایئے)۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار جملہ ۲۶۔

کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منافقین کو ان کی علامتوں سے بخوبی پہچان لیا کرتے تھے۔
اس بات کی واضح دلیل یہ چیز ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ:

"ولا تصل علیٰ احد منھم مات ابداً ولا تقم علیٰ قبرہ"

"جب ان میں سے کوئی مر جائے تو اس پر نماز نہ پڑھیں اور اس کی بخشش کے لئے دُعا کرنے کی خاطر کھڑے نہ ہوں۔" (توبہ/۸۴)

جن موقعوں پر خاص طور پر منافقین اپنے حقیقی چہرے ظاہر کیا کرتے تھے ایک جہاد کا موقع بھی تھا، جنگ سے قبل امداد کی جمع آوری کے وقت، میدانِ جنگ میں دُشمن کے شدید حملوں کے موقع پر اور جنگ کے بعد تقسیم غنائم کے وقت۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں خاص کر سورۂ توبہ اور سورۂ احزاب کی آیتوں میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ایک عام مسلمان تک بھی انہیں ایسے موقع پر پہچان لیا کرتا تھا۔

آج کے دور میں بھی "لحن القول" کے ذریعے اور ان کے اہم اجتماعی مسائل خصوصاً بحرانوں اور جنگوں میں ردّ عمل کی وجہ سے منافقین کی پہچان مشکل بات نہیں ہے اور ذرا سا غور و فکر کرنے سے انہیں ان کی رفتار اور گفتار سے پہچانا جا سکتا ہے کیا ہی بہتر ہو کہ مسلمان بیدار ہوں اور اس آیت سے ہدایت لیتے ہوئے اس خطرناک اور کینہ پرور گروہ کو پہچانیں اور اسے الم نشرح کریں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خدا تم سب کے اعمال کو جانتا ہے (واللہ یعلم اعمالکم)۔

بعد کی آیت میں مومنین اور منافقین میں تمیز اور پہچان کے ذرائع پر زیادہ سے زیادہ تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے:
اور ہم تم لوگوں کو ضرور آزمائیں گے تاکہ معلوم ہو جائے کہ تم لوگوں میں صحیح معنوں میں مجاہد اور صابر کون ہیں اور مجاہدوں کی شکل کے سست عناصر منافق کون ہیں؟ (ولنبلونکم حتّٰی نعلم المجاھدین منکم والصابرین)۔

اگرچہ اس آزمائش کا میدان وسیع اور عام ہے اور تمام فرائض کی ادائیگی کے موقع پر صبر و شکیبائی بھی اس میں شامل ہے، لیکن "مجاہدین" کے لفظ اور اوّل و آخر کی آیات کی مناسبت سے زیادہ تر میدانِ جہاد و جنگ میں آزمائش مراد ہے اور یہ ہے بھی حقیقت کہ میدان جہاد ایک عظیم اور سخت آزمائش کا مقام ہوتا ہے اور وہاں پر بہت کم ہی کوئی شخص اپنے حقیقی چہرے کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپا سکتا ہے۔

نیز اسی آیت کے ذیل میں فرمایا گیا ہے: تمہاری آزمائش کے علاوہ "ہم تمہاری خبروں کو بھی آزمائیں گے"۔ (ونبلوا اخبارکم)۔

بہت سے مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں پر "اخبار" سے مراد انسانوں کے اعمال ہیں کیونکہ جب کوئی عمل انسان سے سرزد ہوتا ہے تو وہ "خبر" کے مانند لوگوں میں نشر ہو جاتا ہے۔ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ یہاں پر "اخبار" سے مراد انسان کے اندرونی راز ہیں، کیونکہ لوگوں کے اعمال ان اسرار کی خبر دیتے ہیں۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہاں پر "اخبار" ان خبروں کے معنی میں ہو کہ جو لوگ اپنی کیفیت یا معاہدات کے

متعلق دیتے ہیں مثلاً منافقین نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدہ کیا ہوا تھا کہ میدان جنگ سے پیٹھ نہیں پھیریں گے۔ اور پھر انہوں نے اپنے اس معاہدے کو توڑ ڈالا۔ چنانچہ سورۂ احزاب کی ۱۵ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

«ولقد کانوا عاھدوا اللہ من قبل لا یولون الادبار»

نیز ان میں سے کچھ پیغمبر اسلامؐ سے میدان جہاد سے پلٹ جانے کی اجازت مانگا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں جب کہ وہ غیر محفوظ نہیں تھے، ان کا اصل مقصد میدان سے فرار کرنا ہوتا تھا، قرآنی الفاظ میں:

«ویستاذن فریق منھم النبی یقولون ان بیوتنا عورۃ وما ھی بعورۃ ان یریدون الا فرارا» (احزاب۔ ۱۳)

تو اس طرح سے خداتعالیٰ انسانوں کے اعمال کو بھی آزماتا ہے اور ان کی گفتار اور خبروں کو بھی۔

اس تفسیر کے مطابق زیر تفسیر آیت کے دونوں جملوں کے دو مختلف معانی ہیں جب کہ پہلی تفسیر کے مطابق یہ دونوں جملے ایک دوسرے کی تاکید کرتے ہیں۔

بہرحال یہ پہلی مرتبہ نہیں ہے کہ خداوند عالم لوگوں کو علی الاعلان فرما رہا ہو کہ ہم تمہیں آزمائیں گے تاکہ تمہاری صفیں ایک دوسرے سے نمایاں اور ممیز ہو جائیں اور حقیقی مومنین کو ضعیف الاعتقاد اور منافقین سے علیحدہ پہچانا جا سکے۔ قرآن کی بہت سی آیات میں آزمائش و امتحان کے مسئلے کو بیان کیا گیا ہے۔

ہم نے بھی پہلی جلد سورہ بقرہ کی آیت ۱۵۵ کے ذیل میں خدا کی آزمائش کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے اسی طرح سورہ عنکبوت کے آغاز میں بھی (ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد ۱ اور جلد ۹ متعلقہ حصے)۔

ساتھ ہی یہ بتاتے چلیں کہ "حتیٰ نعلم المجاھدین منکم" (تاکہ تم میں سے مجاہدین کی شناخت ہو جائے) کا جملہ اس معنی میں نہیں ہے کہ خدا ان لوگوں سے واقف نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد خدا کے علم کا خارج میں ظہور اور ایسے افراد کو نمایاں کرنا ہے یعنی اس طرح سے خارج میں بھی خدا کا علم حقیقت کی صورت اختیار کرے اور حقیقی مجاہدین کی صفیں بھی دوسرے نام نہاد مجاہدین سے علیحدہ ہو جائیں گی۔

۳۲۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ۝

۳۳۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝

۳۴۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۝

ترجمہ

۳۲۔ بے شک جو لوگ کافر ہو گئے اور انہوں نے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا، اور حق کے ظاہر ہو جانے کے بعد رسولِ خدا کی مخالفت کی تو وہ خدا کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچاتے اور وہ بہت جلد ان کے اعمال کو اکارت کر دے گا۔

۳۳۔ اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! خدا کی اطاعت کرو اور رسولِ خدا کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔

۳۴۔ جو لوگ کافر ہو گئے اور انہوں نے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا پھر کافر ہی مر گئے تو خدا ان کو ہرگز نہیں بخشے گا۔

تفسیر

کفر کی حالت میں مرنے والے نہیں بخشے جائیں گے:

گذشتہ آیات میں منافقین کے بارے میں مختلف زاویوں سے گفتگو کی گئی تھی اب ان آیات میں کفار کے ایک اور ٹولے کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: بے شک جو لوگ کافر ہو گئے انہوں نے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا اور حق ظاہر ہو جانے کے بعد رسولؐ خدا کی مخالفت کی تو وہ خدا کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچاتے اور وہ بہت جلد ان کے اعمال کو اکارت کر دے گا (ان الذین کفروا و صدوا عن سبیل اللہ و شاقوا الرسول من بعد ما تبین لھم الھدیٰ لن یضروا اللہ شیئاً و سیحبط اعمالھم)۔

ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ وہی مشرکین مکہ ہوں یا مدینہ کے کافر یہودی ہوں یا دونوں قسم کے لوگ ہوں، کیونکہ "کفر" اور "صد عن سبیل اللہ" (لوگوں کو راہِ خدا سے روکنا) کی تعبیر قرآنی آیات میں دونوں قسم کے لوگوں کے بارے میں آئی ہے۔

"تبیین ھدایت" مشرکین مکہ کے بارے میں معجزات کے ذریعے تھی اور اہلِ کتاب کافروں کے بارے میں ان کی آسمانی کتاب کے ذریعے سے۔

ان کے اعمال کا اکارت جانا یا تو ان کے ان نیک اعمال کی طرف اشارہ ہے جو وہ کبھی کبھار انجام دیا کرتے تھے جیسے مہمان نوازی، مسافرین کی امداد اور انھیں کھلانا پلانا وغیرہ یا پھر ان کے اسلام کے خلاف منصوبوں کی ناکامی کی طرف اشارہ ہے۔

بہر حال ان لوگوں میں تین قسم کی صفات پائی جاتی تھیں ایک کفر، دوسری "صد عن سبیل اللہ" اور تیسری رسولؐ پاک سے دشمنی۔ پہلی صفت تو خدا کے ساتھ مخالفت پر مبنی تھی، دوسری اس کے بندوں کے ساتھ مخالفت پر اور تیسری رسولؐ اللہ کے ساتھ مخالفت پر۔

بعد کی آیت میں روئے سخن مومنین کی طرف ہے اور کفار و منافقین کے طرزِ عمل کو واضح کرنے کے بعد ان کے راستے کی ان الفاظ میں وضاحت کی گئی ہے: اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! خدا کی اطاعت کرو، رسولؐ خدا کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرو (یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول ولا تبطلوا اعمالکم)۔

حقیقت یہ ہے کہ مومنین کی تمام زندگی کفار و منافقین کی زندگی کے بالکل برعکس ہے کیونکہ کفار و منافقین فرمانِ الٰہی کی مخالفت کرتے ہیں اور مومنین اطاعت کرتے ہیں وہ رسولؐ خدا سے دشمنی کرتے ہیں اور یہ آپ کی فرمانبرداری، اُن کے اعمال کفر، ریاکاری اور احسان جتانے کے ذریعے اکارت ہو جاتے ہیں جبکہ مومنین کے اعمال ان چیزوں سے خالی ہوتے ہیں اور ان کی جزا خدا کے پاس محفوظ ہے۔

بہر حال آیت کا انداز بتا رہا ہے کہ اس زمانے میں کچھ ایسے مومنین بھی تھے جو خدا اور رسول کی اطاعت اور اپنے

اعمال کی حفاظت کے معاملے میں کوتاہی کیا کرتے تھے، جنہیں خداوند عالم نے ان آیات کے ذریعے خبردار کیا ہے۔

بعض فقہانے "ولا تبطلوا اعمالکم" کے ذریعے نماز کو توڑنے کی حرمت پر استدلال قائم کیا ہے لیکن جیسا کہ گذشتہ اور آیندہ آیات اسی طرح خود یہی آیت گواہی دے رہی ہیں کہ اس کا اس معنی سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ شرک و کفر، ریاکاری اور احسان جتانے وغیرہ کے ذریعے اپنے اعمال کو باطل نہ کرنا ہے۔

اسی سلسلے کی آخری آیت، گزشتہ آیات میں کفار کے متعلق جو کچھ بیان ہو چکا ہے، ان کی وضاحت اور تاکید کے طور پر ہے اور ساتھ ہی ان لوگوں کو توبہ اور بازگشت کے رستے بتا رہی ہے جو توبہ کرنے کے لیے مائل ہوں، ارشاد ہوتا ہے، بے شک جو لوگ کافر ہو گئے اور انہوں نے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا، پھر کافر ہی مر گئے تو خدا ان کو ہرگز نہیں بخشے گا۔ (ان الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ ثم ماتوا وھم کفار فلن یغفر اللہ لھم)

کیونکہ موت کے ساتھ ہی توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے کفر اور دوسروں کی گمراہی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس دنیا سے سدھاریں گے، تو پھر انہیں کیسے معاف کیا جا سکتا ہے؟

تو اس طرح ان آیات میں مجموعی طور پر تین قسم کے لوگوں کا تذکرہ ہوا ہے، منافقین کا، کفار کا اور مومنین کا اور ان میں سے ہر ایک کی صفات اور انجام کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔

ثواب ضائع ہونے کے اسباب:

قرآن کی مختلف آیات بشمول زیر تفسیر آیت میں جن حساس نکتوں کی طرف زیادہ توجہ دلائی گئی ہے اور خبردار کیا گیا ہے ان میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ مومنین ہوشیار رہیں کہ ان کے اعمال بھی کفار کے اعمال کی طرح اکارت نہ چلے جائیں۔ بالفاظ دیگر خود عمل ایک علیحدہ بات ہے اور اس کی حفاظت ایک اور بات۔ اگرچہ عمل بھی اہم چیز ہے لیکن عمل کی حفاظت اس سے اہم تر ہے۔ ایک پاک و پاکیزہ، صحیح و سالم اور مفید عمل وہی ہوتا ہے جو آغاز سے ہی صحیح و سالم اور بے عیب ہو اور آخری عمر تک اس کی حفاظت کی جائے۔

جو اسباب و عوامل انسان کے اعمال کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں یا انہیں نیست و نابود کر دیتے ہیں، بہت ہیں جن میں چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ احسان جتانا اور تکلیف پہنچانا۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

"یا ایھا الذین اٰمنوا لا تبطلوا صدقاتکم بالمن والاذی کالذی ینفق مالہ رئاء الناس ولا یؤمن باللہ والیوم الاٰخر۔

"اے ایمان دارو! اپنے مال کے راہ خدا میں خرچ کو احسان جتانے اور تکلیف پہنچانے کے ذریعے ضائع مت کرو، اس شخص کے مانند جو اپنے مال کو لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور خدا اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ (بقرہ/ ۲۶۴)

یہاں پر عمل ضائع ہونے کے دو عوامل بتائے گئے ہیں۔ ایک منت جتانا اور تکلیف پہنچانا اور دوسرے ریاکاری اور کفر ہیں، پہلا عامل عمل کی انجام دہی کے بعد درپیش آتا ہے اور دوسرا اس کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ لو نیک اعمال کو آگ میں ڈال دیتا ہے۔

۲۔ عُجب اور خود پسندی ایک اور عامل ہے جو آثار عمل کو مٹا دیتا ہے۔ لہٰذا حدیث میں ہے:

" العجب یأکل الحسنات کما تأکل النار الحطب "

خود پسندی نیکیوں کو یوں ختم کر دیتی ہے، جس طرح آگ ایندھن کو۔ [۱]

۳۔ حسد بھی نیکیوں کے ضائع ہونے کا ایک سبب ہے اور اس کے بارے میں بھی حدیث میں تقریباً وہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو عُجب و خود پسندی کے بارے میں ہیں۔

چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

" ایاکم والحسد فان الحسد یأکل الحسنات کما تأکل النار الحطب " [۲]

اصولی طور پر جس طرح اچھائیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں

" ان الحسنات یذھبن السیئات "

اسی طرح کبھی کبھی برائیاں بھی اچھائیوں کو بالکل بے اثر بنا دیتی ہیں۔

۴۔ مرتے دم تک ایمان پر قائم رہنا بقائے عمل کی اہم ترین شرط ہے، کیونکہ قرآن مجید صراحت کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ جو لوگ بے ایمان ہو کر مرتے ہیں ان کے سارے کے سارے عمل اکارت جاتے ہیں۔ [۳]

اسی سے ہم اعمال کی حفاظت کے مسئلے کی اہمیت اور مشکلات کا اندازہ لگاتے ہیں، لہٰذا ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

" الابقاء علی العمل اشد من العمل، قال وما الابقاء علی العمل؟ قال یصل الرجل بصلة وینفق نفقة للہ وحدہ لا شریک لہ، فکتب لہ سرًّا، ثم یذکرھا فتمحی فتکتب لہ علانیة، ثم یذکرھا فتمحی وتکتب لہ ریاء "

" اعمال کی حفاظت خود اعمال کی بجا آوری سے زیادہ سخت ہے۔ راوی نے عرض کیا، اعمال

---

[۱] تفسیر روح البیان جلد ۸، ص ۵۲۳۔

[۲] بحار الانوار جلد ۷۳، ص ۲۵۵

[۳] سورۂ زمر آیت ۶۵۔

کی حفاظت سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: انسان کبھی بخشش کرتا ہے یا راہِ خدا میں چھپ کر خرچ کرتا ہے تو اس کے نامۂ اعمال میں ایک مخفی عمل لکھا جاتا ہے۔ پھر کسی جگہ پر اس کا تذکرہ کرتا ہے تو مخفی نیکی کے بجائے ظاہری نیکی لکھ دی جاتی ہے۔ پھر ایک اور جگہ پر اسے بیان کرتا ہے تو نیکی کو مٹا کر ریاکاری لکھ دی جاتی ہے۔" [1]

زیرِ تفسیر آیت مذکورہ تمام امور کی طرف ایک اجمالی اشارہ کرتے ہوئے فرماتی ہے:

"ولا تبطلوا اعمالکم"۔ [2]

---

[1] کافی جلد ۲ باب ریا، حدیث ۱۶۔

[2] اعمال کے ضائع ہونے کے بارے میں مزید تفصیل تفسیر نمونہ جلد دوم سورۂ بقرہ کی ۲۱۷ ویں آیت کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں

۳۵۔ فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَن يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ ○

ترجمہ

۳۵۔ تم کبھی ہمت نہ ہارو اور دشمن کو (رسواکن) صلح کی دعوت نہ دو تم تو غالب ہو اور خدا تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال کے ثواب میں ہرگز کمی نہ کرے گا۔

تفسیر

بے جا اور رسواکن صلح:

گذشتہ آیات جہاد کے سلسلہ میں تھیں اور یہ آیت بھی جہاد ہی کے بارے میں ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور وہ یہ کہ سست اور ضعیف الایمان افراد جہاد کی سختیوں اور میدانِ جنگ کی مشکلات سے جان چھڑانے کے لیے عام طور پر "صلح" کا پرچار کرنے لگتے ہیں۔ یقیناً صلح ایک بہت اچھی چیز ہے، لیکن اپنے مقام پر۔ ایسی صلح جو اسلام کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کرے اور مسلمانوں کی عزت وعظمت اور شرافت کی حفاظت کرے، نہ کہ وہ صلح جو مسلمانوں کی ذلت اور خواری کا باعث بن جائے۔

اسی لیے ارشاد فرمایا گیا ہے: اب جب کہ گذشتہ احکام کو تم نے سن لیا تو اب تم ہمت نہ ہارو اور دشمن کو صلح کی دعوت نہ دو، تم برتر ہو۔ (فلا تهنوا وتدعوا الى السلم وانتم الاعلون)[1]

یعنی اب جبکہ تمہاری فتح وبرتری کی علامت ظاہر ہو چکی ہے تو تم ایسی صلح کی پیش کش کر کے اپنی کامیابی کو ملیامیٹ

---

[1] "تدعوا" مجزوم ہے اور "لا تهنوا" پر اس کا عطف ہے، جس کا معنی یہ ہے:
"لا تهنوا ولا تدعوا الى السلم"

کر بیٹھو جس صلح کا معنی پیچھے ہٹنا اور شکست تسلیم کرنا ہے۔ یہ تو سستی اور کمزوری کی وجہ سے ہے، یہ ایک طرح کی بڑی اہم غلطی ہے، جس کے نتائج نہایت ہی دردناک اور خطرناک ہوتے ہیں۔

اسی آیت کے ضمن میں مسلم مجاہدین کے حوصلے بلند کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: اور خدا تمہارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تمہارے اعمال کے ثواب کو کم نہ کرے گا (واللہ معکم ولن یترکم اعمالکم)۔

جس کے ساتھ خدا ہے کامیابی کے تمام اسباب و عوامل بھی اسی کے پاس ہیں وہ اپنے آپ کو کبھی اکیلا نہیں سمجھتا۔ نہ تو کبھی سستی کا اظہار کرتا ہے اور نہ ناتوانی کا، صلح کے نام پر دشمن کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتا، شہداء کے خون سے حاصل ہونے والے نتائج کو برباد نہیں کرتا۔

"لن یترکم" "وتر" (بروزن "سطر") کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے "اکیلا"۔ اسی لیے ان لوگوں کو "وتر" (بروزن "فکر") کہتے ہیں جن کے قریبی رشتہ دار میدانِ جنگ میں مارے جاتے ہیں اور وہ اکیلے رہ جاتے ہیں۔ نقص اور کمی کو بھی "وتر" کہتے ہیں اور زیر تفسیر آیت میں اسی چیز کو لطیف کنایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ خدا تمہیں اکیلا نہیں چھوڑے گا اور تمہارے اعمال کے اجر و ثواب کو تمہارے ہمراہ کردے گا۔

خاص کر یہ تو جب تم جانتے ہو کہ جہاد کی راہ میں تم جو بھی قدم اٹھاتے ہو وہ لکھ لیے جاتے ہیں اس سے صرف یہ نہیں کہ تمہارے اجر و ثواب میں سے کچھ کمی نہیں کرتا، بلکہ اپنے فضل و کرم سے اس میں اضافہ بھی کرتا ہے۔

ہمارے ان تمام بیانات کا جو صلح کے بارے میں ہیں سورۂ انفال کی ۶۱ ویں آیت سے کوئی تضاد نہیں ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ:

> "وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله انه هو السميع العليم"
>
> اگر وہ صلح پر مائل ہو جائیں تو تجھے بھی صلح کر لینی چاہیئے اور خدا پر بھروسہ رکھو، کیونکہ وہ سننے اور جاننے والا ہے۔

ان میں سے کسی آیت کو دوسری کا ناسخ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بلکہ ان دونوں کا اپنا اپنا خاص موقع ہے ایک "معقول صلح" کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا "بے جا صلح" کی طرف ایک وہ صلح ہے جس میں مسلمانوں کے ہر قسم کے مفادات کا تحفظ کیا جاتا ہے اور دوسری وہ ہے جو فتح اور کامرانی کے نزدیک کے وقت ضعیف اور سست ایمان مسلمانوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے، اسی لیے سورۂ انفال والی آیت کے بعد کے حصے میں فرمایا گیا ہے:

> "وان یریدوا ان یخدعوک فان حسبک اللہ"
>
> اور اگر وہ صلح کی بات کرکے تمہیں دھوکا دینا چاہیں اور اس کے پردے میں کوئی فریب کاری کارفرما ہو تو ان کی باتوں میں ہرگز نہ آ اور نہ ہی گھبرا، کیونکہ خدا تیرا پشت پناہ ہے۔"

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام مالک اشتر کے نام اپنے ایک فرمان میں ان دونوں قسم کی صلح کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"ولا تدفعن صلحا دعاك اليه عدوك ولله فيه رضا"

"جب دشمن تمہیں ایسی صلح کی دعوت دیں جس میں خدا کی رضامندی ہو تو اس پیش کش کو مت ٹھکراؤ۔"[1]

دشمن کی طرف سے صلح کی دعوت ایک طرف ہے اور خدا کی رضا کا اس میں شامل ہونا دوسری طرف ہے۔ تو اس طرح صلح دو حصوں میں تقسیم ہو گئی جن کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔

بہر حال مسلمان سربراہوں کو صلح و جنگ کے موقع کی پہچان کرنی چاہیئے، کیونکہ یہ ایک نہایت ہی باریک ترین اور پیچیدہ ترین مسئلہ ہے، جس میں نہایت ہی دقت اور ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس بارے میں ذرا سی حسابی غلطی کا ہولناک اور مہیب انجام ہوتا ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۵۳

۳۶۔ اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ۝

۳۷۔ اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ۝

۳۸۔ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَاۗءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ ۝ ع

ترجمہ

۳۶۔ دنیاوی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے، اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ اختیار کرو تو وہ تم کو پورا اجر دے گا اور (اس کے عوض میں) تم سے تمہارا مال طلب نہیں کرے گا۔

۳۷۔ کیونکہ اگر وہ تم سے مال طلب کرے بلکہ تم سے اصرار کرکے مانگے بھی تو تم بخل کرتے ہو اور وہ تمہارے غصے اور کینے کو ظاہر کرے گا۔

۳۸۔ جی ہاں! تم تو وہی لوگ ہو جو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے بلائے جاتے ہو تو بعض تم میں سے ایسے ہیں جو بخل کرتے ہیں اور جو شخص بخل کرتا ہے تو وہ اپنے ہی سے بخل کرتا ہے اور خدا تو بے نیاز ہے اور تم سب محتاج ہو۔ اور اگر تم روگردانی کرو گے

تو خدا تمھاری جگہ پر دوسرے لوگوں کو لے آئے گا اور وہ تمھاری طرح نہیں ہوں گے۔

تفسیر

اگر تم روگردانی کروگے تو دوسرے لوگ آجائیں گے:

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ سورۂ "محمد" سورۂ جہاد ہے جو جہاد کے مسئلے سے شروع ہوتی ہے اور جہاد ہی کے مسئلے پر ختم ہوتی ہے۔

زیر تفسیر آیات جو اس سورت کی آخری آیات ہیں، اسی سلسلے میں انسانی زندگی کے ایک اور مسئلے کو بیان کر رہی ہیں اور مسلمانوں کو اطاعت الٰہی کے لیے عموماً اور مسئلہ جہاد کے لیے خصوصاً پہلے سے زیادہ شوق دلا رہی ہیں اور انہیں زیادہ سے زیادہ متحرک کر رہی ہیں اور بتا رہی ہیں کہ دُنیاوی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، کیونکہ جہاد سے باز رکھنے کا ایک اہم عامل دنیاوی زندگی سے مانوس ہونا اور مادی دُنیا سے دل لگانا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: دنیاوی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے۔(انما الحیٰوۃ الدنیا لعب و لھو)۔

"لعب" (کھیل) ایسے کام کو کہا جاتا ہے جس میں ایک طرح کا خیالی نظم و نسق پایا جائے، جس کے ذریعے ایک خیالی مقصد تک پہنچا جا سکے اور "لھو" (فضول مشغولیت و تماشا) ہر اس کام کو کہا جاتا ہے جو انسان کو اپنی طرف مشغول رکھے اور اصولی مسائل سے اس کی توجہ ہٹا دے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیا وی زندگی ایک "کھیل" تماشا اور مہمل مشغولیت ہے۔ نہ تو جس سے کوئی کیفیت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی حال۔ نہ اس کو کوئی دوام حاصل ہے اور نہ ہی بقا، یہ تو چند گزرنے والے لمحات اور ناپائیدار لذتوں پر مشتمل ہے، جس کے ساتھ کئی طرح کا سر درد بھی ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اگر تم ایمان رکھو اور تقوٰے اختیار کرو، تو وہ تم کو پورا اجر دے گا اور اس کے عوض میں تم سے تمہارا مال طلب نہیں کرے گا۔ (وان تؤمنوا و تتقوا یؤتکم اجورکم ولا یسئلکم اموالکم)۔[1]

ہدایت و راہنمائی اور دنیا و آخرت میں اس قدر جزا و ثواب کے بدلے میں نہ تو خدا تم سے کسی مال کا مطالبہ کرتا ہے اور نہ ہی اس کا رسولؐ، اصولی طور پر خدا کو تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے اور پیغمبرؐ کی ساری ضرورتیں خود خدا پوری کرتا ہے۔

اگر تمھارے مال میں سے کچھ مختصر سا حصہ زکوٰۃ اور شرعی حقوق کے نام سے تم سے لیا جاتا ہے تو وہ بھی خود تم پر ہی

---

[1] "لا یسئلکم" کا جملہ مجزوم اور جملہ شرطیہ کی جزا یعنی "یؤتکم" پر عطف ہے۔

خرچ ہوتا ہے، تمھارے یتیموں، حاجت مندوں اور مسافروں کی ضرورت یا نگہداشت کے لیے اور تمھارے ملک کا امن و امان بحال رکھنے اور استقلال اور آزادی کی حفاظت، ملک کا نظم و نسق چلانے، ملکی ضروریات کو پورا کرنے اور شہر و قصبات کو آباد رکھنے کے لیے ہے۔

بنا بریں یہ مقدار بھی خود تمھارے لیے ہے، کیونکہ خدا اور رسولؐ تم سب لوگوں سے بے نیاز ہیں۔ تو اس طرح سے آیت کے مفہوم اور صدقات و زکوٰۃ اور راہِ خدا میں خرچ کرنے کا حکم دینے والی دوسری آیات کے مفہوم کے درمیان کوئی تناقض نہیں

"ولا یسئلکم اموالکم" کے جملے کی تفسیر اور احتمال تناقض دُور کرنے کے لیے اور بھی کئی احتمالات ذکر کیے گئے ہیں چنانچہ:

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ہدایت اور ثواب کے بدلے میں تمھارے مال سے کچھ نہیں مانگتا۔

بعض کہتے ہیں تمھارا سارا مال تم سے نہیں مانگتا، بلکہ اس کا ایک تھوڑا سا حصہ مانگتا ہے۔

بعض دوسرے کہتے ہیں: یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سب مال خدا کے ہیں اگرچہ: ع

"چند روزے ایں امانت نزد ماست"

لیکن سب سے زیادہ مناسب وہی پہلی تفسیر ہے۔

بہر حال یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ جہاد کا ایک حصہ "جہاد بالمال" بھی ہے اور اصولی طور پر دشمن کے ساتھ ہر قسم کی جنگ کے لیے اخراجات کی ضرورت ہوتی ہے جسے باایمان اور متقی مسلمانوں اور ان لوگوں سے جمع کیا جانا چاہیئے جو دُنیا سے وابستہ اور دل بستہ نہیں ہیں، زیر نظر آیات در حقیقت اسی چیز کے لیے فکری اور علمی رستہ ہموار کر رہی ہیں۔

بعد کی آیت اکثر لوگوں کی مال و دولت سے محبت اور دلچسپی کی حد بیان کرتے ہوئے کہتی ہے: اگر وہ تم سے مال کا مطالبہ کرے بلکہ اصرار بھی کرے پھر بھی تم بخل کرو گے، بلکہ اس سے بڑھ کر تمھارے کینے اور غصے کو آشکار کرے گا (ان یسئلکموھا فیحفکم تبخلوا ویخرج اضغانکم)۔

"یحفکم"، "احفاء" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے "مطالبے اور سوال میں اصرار کرنا" اور "احفاء" دراصل "حفاء" سے ہے، جس کا معنی ہے ننگے پاؤں چلنا۔ یہ تعبیر ایسے کاموں کے لیے کنایہ ہے جنھیں انجام دینے کے لیے انسان آخری حد تک کوشش کرتا ہے۔ اسی لیے "احفاء شارب" کا معنی مونچھوں کو آخری حد تک منڈوانا ہے۔

"اضغان"، "ضغن" کی جمع ہے، جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں اس کا معنی ہے "سخت کینہ"۔

خلاصۃ الکلام یہ کہ یہ آیت بہت سے لوگوں کی مال اور مالی امور کے ساتھ سخت محبت اور دلچسپی کو ترک کرنے کی ترغیب بھی دے رہی ہے کہ چھوڑ دو ایسی محبت کو کہ اگر خدا بھی تم سے مال طلب کرے تو تمھیں غصہ آجاتا ہے اور کینے کا اظہار کرنے لگتے ہو۔

تو اس طرح اس تازیانۂ ملامت کے ذریعے انسان کی خفتہ رُوح کو بیدار کیا جا رہا ہے تاکہ وہ مال کی غلامی کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکیں اور اپنے آپ کو اس حد تک تبدیل کریں کہ سب کچھ دوست کی راہ میں خرچ کر دیں اور سب کچھ اس

کے لیے نثار کردیں، جس کے بدلے میں اس کے تقوے، رضا اور خوشنودی کو حاصل کرلیا۔

زیر تفسیر آیات میں سے آخری آیت جو سورہ محمدؐ کی بھی آخری آیت ہے اور گذشتہ آیات میں مذکور مادی مسائل اور لوگوں کی دنیا سے دلچسپی اور راہ خدا میں خرچ کرنے کے بارے میں ایک اور تاکید ہے، ارشاد ہوتا ہے: جان لو کہ تم وہی لوگ ہو جو راہ خدا میں خرچ کرنے کے لیے بلائے جاتے ہو تو تم میں سے بعض لوگ تو اس فرمان الٰہی کی اطاعت کرتے ہیں جب کہ بعض اور لوگ بخل کرتے ہیں (ھا انتم ھٰؤلاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللّٰہ فمنکم من یبخل)۔

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس سے پہلی آیات میں تو کہا جا چکا ہے کہ خدا تم سے مال کا مطالبہ نہیں کرتا تو پھر اس آیت میں فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا حکم کیوں کر دیا جا رہا ہے؟

آیت کا دوسرا حصہ خود ہی اس سوال کا جواب دیتا ہے اور پہلے کہتا ہے: جو شخص خرچ کرنے سے بخل کرتا ہے تو وہ خود اپنے ہی لیے بخل کرتا ہے (ومن یبخل فانما یبخل عن نفسہ)۔[1]

کیونکہ اس خرچ کا نتیجہ دنیا میں بھی تمہارے حق میں ہے اور تمہارے فائدے کے لیے ہے۔ کیونکہ طبقاتی فاصلے کم ہو جائیں گے، معاشرے میں امن و امان قائم ہوگا اور عداوت اور کینے کے بجائے پیار و محبت اور صدق و صفا کا دور دورہ ہوگا، یہ ہے تمہارا دنیاوی ثواب اور فائدہ۔

اور آخرت میں بھی وہ تمہیں درہم و دینار کے بدلے میں ایسی نعمتیں عطا فرمائے گا، جس کا انسانی ذہن میں تصور محال ہے اسی لیے تم جس قدر بخل کروگے، خود اپنے ہی ساتھ بخل کروگے۔

دوسرے لفظوں میں یہاں پر انفاق کا ذکر زیادہ تر جہاد کے بارے میں انفاق کے لیے ہے اور "فی سبیل اللہ" کی تعبیر بھی اسی معنی سے مناسبت رکھتی ہے اور واضح سی بات ہے کہ جس قدر بھی جہاد کے امور میں زیادہ امداد کی جائے گی اسی قدر معاشرے کی عزت، استقلال اور وجود کی زیادہ حفاظت کی جا سکے گی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ، خدا غنی اور بے نیاز ہے اور تم سب اس کے محتاج ہو (واللّٰہ الغنی وانتم الفقراء)۔ وہ تمہارے خرچ کرنے سے بھی بے نیاز ہے اور تمہاری اطاعت سے بھی۔ یہ تم ہو کہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اس کے لطف و کرم، رحمت و عنایت اور اس کے اجر و ثواب کے محتاج ہو۔

اصولی طور پر تمام ممکن الوجود اور سوائے ذات خدا کے کل کائنات مجسم ضرورت، فقر اور احتیاج ہے اور غنی بالذات صرف اور صرف خدا ہے۔ باقی سب اپنے اصل وجود میں بھی ہمیشہ اسی کے محتاج ہیں اور لمحہ بہ لمحہ اس کے فیض وجود کے لازوال منبع سے مدد حاصل کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ ایک لمحے کے لیے بھی وہ اپنے فیض کو روک لے تو تمام کائنات

---

[1] "بخل" کا لفظ کبھی تو "عن" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے اور کبھی "علیٰ" کے ساتھ۔ پہلی صورت میں منع اور روکنے کے معنی میں ہوگا اور دوسری صورت میں نقصان پہنچانے کے معنی میں۔

ختم ہو جائے اور عالم ہستی کی عمارت دھڑام سے نیچے آگرے۔ ہو

فــــرور رہز ندقــا لما

آخری جملہ تمام مسلمانوں کے لیے تنبیہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ تم اس عظیم نعمت کی قدر جانو کہ خدا نے تمہیں اپنے مقدس دین کا محافظ قرار دیا ہے تاکہ تم اس کے دین کے حامی اور اس کے رسولؐ کے مددگار رہو۔ اگر تم نے اس عظیم نعمت کی قدر نہ کی "اگر تم نے روگردانی کی تو وہ یہ ذمہ داری کسی اور قوم کے سپرد کرے گا جو تم جیسی نہیں ہوگی"۔ (وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم)۔

یقیناً یہ بوجھ کبھی زمین پر نہیں رکھا جائے گا۔ اگر تم نے اپنے موقف کی اہمیت کو نہ پہچانا اور اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآنہ ہوئے تو خدا ایک اور قوم کو بھیجے گا اور یہ عظیم ذمہ داری اس کے کندھوں پر ڈال دے گا۔ وہ ایسی قوم ہوگی جو ایثار و قربانی، جاں نثاری اور فداکاری، جان و مال خرچ کرنے اور فی سبیل اللہ انفاق کرنے میں تم سے کئی درجے برتر اور بالاتر ہوگی۔

یہ ایک بہت بڑی دھمکی اور تنبیہ ہے جس سے ملتی جلتی اور بار بار تنبیہ سورۂ مائدہ کی ۵۴ ویں اور ۵۴ ویں آیت میں بھی بیان ہو چکی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"یا ایها الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینه فسوف یأتی الله بقوم یحبهم
ویحبونه اذلة علی المؤمنین اعزة علی الکافرین یجاهدون فی
سبیل الله ولا یخافون لومة لائم"

"اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص بھی اپنے دین سے پھر گیا وہ خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا، خدا مستقبل میں ایسی قوم کو لے آئے گا جسے وہ دوست رکھتا ہوگا اور وہ بھی خدا کو دوست رکھتی ہوگی، مومنین کے آگے متواضع اور کافروں کے سامنے ڈٹ جانے والی ہوگی، وہ ایسے لوگ ہوں گے جو راہ خدا میں جہاد کریں گے اور ملامت کرنے والوں کی ملامت سے ہرگز نہیں گھبرائیں گے"۔

یہ بات بھی نہایت قابل توجہ ہے کہ زیر تفسیر آیت کے ذیل میں اکثر مفسرین نے نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد کچھ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ!

"من هؤلاء الذین ذکر الله فی کتابه؟"

"یہ کون لوگ ہیں جن کی طرف خدا نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے؟"

اس دوران میں سلمان بھی آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی ران پر (ایک دوسری روایت کے مطابق ان کے شانے پر) ہاتھ مار کر فرمایا:

هذا وقومه، والذی نفسی بیده لو کان الایمان منوطا بالثریا

لتناولہ رجال من فارس ؛

" یہ اور اس کی قوم مراد ہیں، اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر ایمان ثریا کی بلندیوں پر بھی ہو تو فارس کے رہنے والے کچھ لوگ اسے وہاں سے بھی حاصل کر لیں گے ۔ "

اس حدیث کو اور اس سے ملتی جلتی دوسری احادیث کو اہل سنت کے مشہور محدثین نے بھی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے جیسے محدث بیہقی اور محدث ترمذی وغیرہ شیعہ سنی مشہور مفسرین کو بھی اس سے اتفاق ہے، جیسے مفسر قرطبی، مفسر روح البیان، مفسر مجمع البیان، فخر رازی، مراغی اور ابو الفتوح رازی وغیرہ۔

تفسیر دُرِ منثور کے مفسر نے بھی اس آیت کے ذیل میں اس بارے میں کئی حدیثیں نقل کی ہیں [1]

ایک اور حدیث حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے جو مندرجہ بالا حدیث رسولؐ کے تتمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ امام فرماتے ہیں ؛

" واللہ ابدل بھم خیراً منھم، الموالی ؛

" خدا کی قسم خدا نے اپنے اس وعدے کو پورا فرمایا ہے اور غیر عرب کو جو ان سے کئی گنا بہتر ہیں ان کا جانشین قرار دیا ہے " [2]

اگر پورے غور و فکر اور ہر قسم کے تعصب سے ہٹ کر تاریخ اسلام اور اسلامی علوم کا مطالعہ کریں اور عجمیوں خصوصاً ایرانیوں کے میدان جنگ و جہاد اور علوم اسلامی کی چھان بین اور ترتیب و تدوین کے حصے کو دیکھیں تو اس حدیث کی حقیقت کا اچھی طرح پتہ چل جائے گا۔ اس بارے میں تفصیل کے ساتھ کہنے کی بہت سی باتیں ہیں۔

---

[1] تفسیر درمنثور جلد ۶ ص ۶۷۔

[2] مجمع البیان جلد ۹ ص ۱۱۰۔

خداوندا! اپنے پاک دین کی راہ میں جہاد، ایثار اور فداکاری کے لیے ثابت قدم رکھ۔
بارالٰہا! یہ عظیم اعزاز جو تو نے ہمیں بخشا ہے کہ تیرے دین پاک کے داعی ہوں ہم سے واپس نہ لے۔
پروردگارا! اس وقت جب مشرق و مغرب کے شدید طوفان تیرے پاک دین کے آثار مٹانے کے لیے اُمڈ کر آ رہے ہوئے ہمیں زیادہ سے زیادہ قوت، محکم ایمان، زیادہ ایثار اور زیادہ سے زیادہ خلوص کی دولت سے مالا مال فرما۔

آمین یارب العالمین

❁

جمعۃ المبارک ۱۷ رمضان (روز فتح بدر) ۱۴۰۵ھ کو "سورۂ محمدؐ" اور تفسیر نمونہ کی اکیسویں جلد اپنے اختتام کو پہنچی۔

❁

اس جلد کا اُردو ترجمہ بتاریخ ۱۷ رجب المرجب ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۸ مارچ ۱۹۸۶ء بروز بدھ بوقت ساڑھے سات بجے صبح برمکان سیٹھ نوازش علی صاحب ۸۱ ای ماڈل ٹاؤن لاہور اختتام پذیر ہوا۔
الحمد للہ اولاً و آخراً وصلی اللہ علیٰ محمد و آلہ ابداً سرمداً۔

سید صفدر حسین نجفی

سورۂ فتح

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا

اور

اس کی ۲۹ آیات ہیں

تاریخ شروع
۱۷ رمضان ۱۴۰۵ھ
۱۳۶۴/۳/۱۷ ش

سورۂ فتح کے مطالب

یہ سورت جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے فتح و کامیابی کا پیغام لانے والی ہے، دشمنانِ اسلام پر کامیابی، قطعی اور نظر آنے والی کامیابی، (خواہ وہ کامیابی فتح مکہ کے ساتھ مربوط ہو یا صلح حدیبیہ کے ساتھ یا فتح خیبر سے، یا مطلق طور سے کامیابی)

اس سورہ کے مطالب کو معلوم کرنے کے لیے، ہر چیز سے پہلے ضروری ہے کہ ہم یہ جانیں کہ یہ سورہ حدیبیہ کے واقعہ کے بعد ہجرت کے چھٹے سال نازل ہوئی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ: پیغمبر اسلامؐ نے ہجرت کے چھٹے سال مہاجرین و انصار اور باقی مسلمانوں کو ساتھ لے کر "عمرہ" کے عنوان سے مکہ کی طرف روانہ ہونے کا ارادہ کیا، اور اس سے پہلے وہ مسلمانوں کو بتا چکے تھے کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں اپنے اصحاب و انصار کے ساتھ مسجد الحرام میں داخل ہوا ہوں اور مناسک عمرہ ادا کرنے میں مشغول ہوں۔

مسلمانوں نے "ذی الحلیفہ" میں مدینہ کے قریب احرام باندھا، اور بہت زیادہ اونٹ قربانی کے لیے لے کر چلے۔

پیغمبرؐ کے چلنے کی کیفیت سے اس بات کی اچھی طرح نشاندہی ہو رہی تھی کہ اس عظیم عبادت کو انجام دینے کے علاوہ آپ کا اور کوئی مقصد نہیں ہے، یہاں تک کہ پیغمبرؐ سرزمین "حدیبیہ" میں وارد ہوئے، (حدیبیہ مکہ کے قریب ایک ایسی بستی تھی جو مکہ سے ۲۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر تھی)

لیکن یہاں قریش کو پتہ چل گیا اور انھوں نے پیغمبرؐ کا راستہ روکا اور وہ ان کے مکہ میں وارد ہونے سے مانع ہوئے، اور حقیقت میں انھوں نے ان تمام سنتوں کو جو وہ ماہ حرام میں زائرین خانہ خدا کے امن و امان کے سلسلہ میں ادا کرتے تھے پاؤں تلے روند ڈالا کیونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا، کہ حرمت والے مہینوں میں (منجملہ ماہ ذی قعدہ جس میں پیغمبرؐ عمرہ کا ارادہ رکھتے تھے) خصوصاً حالت احرام میں کسی شخص سے مانع نہیں ہونا چاہیئے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ کے قاتل کو بھی ان دنوں اور ان مراسم میں دیکھ لیتا تو ہرگز اس سے متعرض نہ ہوتا۔

یہاں ایک اہم واقعہ پیش آیا جو پیغمبرؐ اور مشرکین مکہ کے درمیان "صلح حدیبیہ" کے نام سے ایک صلح کی قرارداد کی صورت میں منتہی ہوا، جس کو ہم بعد میں بیان کریں گے، لیکن بہر صورت انہوں نے اس سال پیغمبرؐ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیا، مجبوراً پیغمبرؐ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ اپنے اونٹوں کی اسی جگہ قربانی کریں اور اپنے سر منڈوائیں اور احرام سے باہر نکل آئیں، اور مدینہ کی طرف

لوٹ جائیں۔

یہاں غم و اندوہ کے ایک طوفان نے مسلمانوں کو گھیر لیا، اور ضعیف الایمان لوگوں پر شکوک تردد غالب آگیا۔

جس وقت پیغمبر حدیبیہ سے مدینہ کی طرف آرہے تھے۔ تو آپ کی سواری بوجھل ہوگئی اور چلنے سے رُک گئی، اور اسی حالت میں آپ کا چہرۂ مبارک کسی بظاہر وجہ کے بغیر سرور و شادمانی میں ڈوب گیا، اور فرمایا:

بس ابھی ابھی سورۂ فتح کی آیات مجھ پر نازل ہوئی ہیں [1]

اور یہاں سے اس سورہ پر چھائی ہوئی ایک خاص فضا کامل طور پر نمایاں ہوجاتی ہے،

ایک اجمالی مطالعہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سورہ کے سات حصے ہیں۔

① یہ سورت، فتح کی بشارت سے شروع ہوتی ہے، اور اس کے اختتام کی آیات بھی اسی مسئلہ سے مربوط ہیں اور پیغمبر کے مکہ میں وارد ہونے اور اس میں مناسک عمرہ انجام دینے کے خواب کے پورا ہونے کی تاکید ہے۔

② اس سورت کا دوسرا حصہ "صلح حدیبیہ" "نزول سکینہ" اور مومنین کے دلوں کے لیے تسلی سے مربوط واقعات، اور بیعت رضوان کے مسئلہ کو بیان کرتا ہے۔

③ ایک اور حصہ میں پیغمبر کے مرتبہ، اور ان کے بلند و بالا مقصد کو بیان کیا گیا ہے۔

④ ایک دوسرے حصہ میں منافقوں کی کارشکنیوں، اور میدان جہاد میں ان کے شرکت نہ کرنے کے لیے بیہودہ عذر سے پردہ اُٹھایا گیا ہے۔

⑤ ایک اور حصہ میں منافقین کے کچھ نامناسب تقاضوں کا بیان ہے۔

⑥ اس کے بعد یہ سورہ ان لوگوں کا تعارف کراتا ہے جو میدان جہاد میں شرکت کرنے سے معذور ہیں،

⑦ آخری حصہ میں پیغمبر اسلامؐ کے دین کی راہ کے پیروکاروں کی خصوصیات اور مخصوص صفات کا بیان ہے۔

اس سورہ کی آیات، مجموعی طور پر حد سے زیادہ حساس، و مقصد ساز ہیں اور خاص طور سے ان گوناں گوں حوادث کے مقابلہ میں، جن میں اسلامی معاشرہ الجھا ہوا ہے، آج کے مسلمانوں کے لیے الہام آفرین ہیں۔

سورۂ فتح کی تلاوت کی فضیلت

منابع اسلامی میں اس سورہ کے بارے میں کچھ عجیب روایات نظر آتی ہیں،

ایک حدیث انس سے مروی ہے، وہ کہتا ہے: "جب ہم حدیبیہ" سے واپس آرہے تھے، درحالیکہ مشرکین نے نہ تو ہمیں مکہ میں داخل ہونے دیا تھا اور نہ ہی عمرہ کرنے دیا تھا، تو ہم انتہائی غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے تھے، کہ اچانک خدا نے آیہ

---

[1] تلخیص از تفسیر قمی، مجمع البیان اور فی ظلال۔

"انا فتحنا لك فتحا مبینا" نازل فرمائی۔

پیغمبر اکرم نے فرمایا۔ لقد انزلت علی ایة هی احب الی من الدنیا کلها" مجھ پر ایک آیت نازل ہوئی ہے، جو مجھے تمام دنیا سے زیادہ محبوب ہے" بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ ایک سورہ مجھ پر نازل ہوا ہے۔[1]

"عبداللہ بن مسعود" کہتا ہے: "حدیبیہ سے واپسی کے موقع پر جب پیغمبر پر انا فتحنا ...... " نازل ہوئی تو آپ اس قدر خوش ہوئے کہ خدا ہی جانتا ہے۔[2]

ایک دوسری حدیث میں پیغمبر سے منقول ہوا ہے۔

من قرأها فكانما شهد مع محمد (ص) فتح مكة، وفي رواية اخرى فكانما كان مع من بايع محمداً تحت الشجرة"

"جو شخص اس سورہ کو پڑھے وہ اس شخص کے مانند ہے جو فتح مکہ کے موقع پر پیغمبر کے ساتھ اور ان کے لشکر میں تھا، اور دوسری روایت میں یہ آیا ہے، کہ وہ اس شخص کے مانند ہے جس نے اس درخت کے نیچے جو حدیبیہ میں تھا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کی"۔[3]

اور آخر میں ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے یہ منقول ہے۔

حصنوا اموالكم ونساءكم وما ملكت ايمانكم من التلف بقراءة "انا فتحنا لك" فانه اذا كان ممن يدمن قراءتها نادى مناد يوم القيامة حتى يسمع الخلائق، انت من عبادي المخلصين، الحقوه بالصالحين من عبادي، وادخلوه جنات النعيم، واسقوه من رحيق مختوم بمزاج الكافور!"

"اپنے مالوں، عورتوں، اور جو کچھ تمہاری ملک میں ہے، اُسے انا فتحنا کی قرات سے محفوظ کر لو، جو شخص مسلسل اس کی تلاوت کرے تو قیامت کے دن ایک منادی اس طرح ندا کرے گا کہ اُسے تمام مخلوق سُنے گی: یہ میرے مخلص بندوں میں سے ہے، اسے میرے صالح بندوں کے ساتھ ملا دو، اور بہشت کے نعمتوں بھرے باغات میں اسے داخل کر دو اور بہشتوں کے مخصوص مشروب سے اُسے سیراب کر دو"۔[4]

---

[1] "مجمع البیان"، جلد ۹ صفحہ ۱۰۰

[2] "مجمع البیان" جلد ۹ صفحہ ۱۰۹

[3] "مجمع البیان" جلد ۹ صفحہ ۱۰۰

[4] نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۴۶ بحوالہ ثواب الاعمال۔

یہ بات کہے بغیر ظاہر ہے کہ یہ سب فضیلت وافتخار، غور وفکر اور عمل سے خالی تلاوت سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ تلاوت کا اصل مقصد اپنے عادات واخلاق واعمال کو ان آیات کے مفہوم کے مطابق ڈھالنا ہے۔

سورۂ فتح

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

۱۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ ہم نے تیرے لیے واضح کامیابی فراہم کردی ہے۔

تفسیر

فتح المبین

اس سورہ کی پہلی آیت میں پیغمبر کو ایک عظیم بشارت دی گئی ہے، ایسی بشارت جو بعض روایات کے مطابق پیغمبر کے نزدیک تمام دُنیا سے زیادہ محبوب تھی۔ فرماتا ہے: "ہم نے تجھے آشکار اور نمایاں فتح دی" (اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا)۔

ایسی نمایاں کامیابی، جس کے آثار اسلام کی پیش رفت، اور مسلمانوں کی زندگی میں، مختصر سے عرصہ میں ظاہر ہو گئے، اور طویل مدت تک ظاہر ہوتے رہیں گے، ایسی فتح جو طول تاریخ اسلام میں کم مثال یا بے نظیر تھی۔

یہاں مفسرین کے درمیان ایک عظیم بحث ہوئی ہے کہ اس فتح سے مراد کونسی فتح ہے؟

اکثر مفسرین اس کو اس عظیم کامیابی کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو "صلح حدیبیہ" سے مسلمانوں کو نصیب

ہوئی۔ ؎۱

ایک جماعت نے اسے "فتح مکہ" کے مسئلہ کی طرف بھی اشارہ سمجھا ہے۔ اور بعض دوسروں نے اس سے "فتح خیبر" مراد لی ہے۔

اور بعض نے قدرت منطق، دلائل کی برتری اور آشکار معجزات کے طریقہ سے تمام دشمنوں پر اسلام کی کامیابی سمجھا ہے۔

آخر میں بعض اس کو پیغمبر کے لیے اسرار علوم کے کھلنے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

لیکن ہمارے پاس بہت زیادہ قرائن موجود ہیں جو صلح حدیبیہ کے مسئلہ کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن ان آیات کی تفسیر کے واضح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہر چیز سے پہلے یہاں مختصراً حدیبیہ کی داستان پیش کریں، جو ان کی شان نزول ہے۔

داستان صُلح حدیبیہ

چھٹی ہجری کے ماہ ذی قعدہ میں پیغمبر اکرمؐ عمرہ کے قصد سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے، اور تمام مسلمانوں کو اس سفر میں شرکت کا شوق دلایا، اگرچہ ایک گروہ کنارہ کش ہو گیا، مگر مہاجرین وانصار اور بادیہ نشین اعراب کی ایک کثیر جماعت آپ کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہو گئی۔

یہ جمعیت جو تقریباً ایک ہزار چار سو افراد پر مشتمل تھی، سب کے سب نے لباس احرام پہنا ہوا تھا، اور تلوار کے علاوہ جو مسافروں کا اسلحہ شمار ہوتی تھی، کوئی جنگی ہتھیار اپنے ساتھ نہ لیا تھا۔

جب پیغمبر مکہ کے نزدیک مقام "عسفان" پہنچے تو آپ کو اطلاع ملی کہ قریش نے یہ پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ یہاں تک کہ پیغمبر "حدیبیہ" میں پہنچ گئے (حدیبیہ مکہ سے بیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک بستی ہے، جو ایک کنویں یا درخت کی مناسبت سے اس نام سے موسوم تھی) حضرتؐ نے فرمایا کہ تم سب اسی جگہ رک جاؤ، لوگوں نے عرض کیا کہ یہاں تو کوئی پانی نہیں ہے، پیغمبر نے معجزانہ طور پر اس کنویں سے جو وہاں تھا، اپنے اصحاب کے لیے پانی فراہم کیا۔

اسی مقام پر قریش اور پیغمبرؐ کے درمیان سفراء آتے جاتے رہے تاکہ کسی طرح سے مشکل حل ہو جائے، آخرکار "عروہ ابن مسعود ثقفی" جو ایک ہوشیار آدمی تھا، قریش کی طرف سے پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا، پیغمبرؐ نے فرمایا: میں جنگ کے ارادہ سے نہیں آیا اور میرا مقصد صرف خانۂ خدا کی زیارت ہے، ضمناً عروہ نے اس ملاقات میں پیغمبرؐ کے وضو کرنے کا منظر بھی دیکھا، کہ صحابہ آپ کے وضو کے پانی کا ایک قطرہ بھی زمین پر گرنے نہیں دیتے تھے، جب وہ واپس لوٹا تو اس نے قریش سے کہا: میں قیصر وکسریٰ اور نجاشی کے دربار میں گیا ہوں۔ میں نے کسی سربراہ مملکت کو اس کی قوم کے درمیان اتنا باعظمت نہیں دیکھا، جتنا محمدؐ کی عظمت کو ان کے اصحاب میں دیکھا ہے۔ اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ وہ محمد کو چھوڑ جائیں گے تو یہ بہت بڑی غلطی ہوگی، دیکھ لو تمہارا مقابلہ ایسے ایثار کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ تمہارے لیے

؎۱ یہ تفسیر ابوالفتوح رازی نے، اور آلوسی نے روح المعانی میں، علامہ طباطبائی نے المیزان میں، فی ظلال کے مؤلف نے اپنی تفسیر میں، اور فیض کاشانی نے صافی میں اختیار کی ہے، جبکہ تفسیر تبیان، کشاف، فخر رازی اور بعض دوسرے علماء نے دوسری تفسیر (فتح مکہ) کو ترجیح دی ہے، مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں دونوں قول دوسرے اقوال کے ساتھ شمار کیے ہیں، لیکن فتح مکہ کو پہلا قول ذکر کیا ہے، جس کی ترجیح ان کی نظر میں ہے۔

غور و فکر کا مقام ہے۔

اسی دوران پیغمبرؐ نے عمرؓ سے فرمایا کہ وہ مکہ جائیں، اور اشراف قریش کو اس سفر کے مقصد سے آگاہ کریں، عمرؓ نے کہا کہ قریش مجھ سے شدید دشمنی رکھتے ہیں، لہٰذا مجھے ان سے خطرہ ہے، بہتر یہ ہے کہ عثمان کو اس کام کے لیے بھیجا جائے، عثمان مکہ کی طرف آ گئے، تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ مسلمانوں کے درمیان یہ افواہ پھیل گئی کہ ان کو قتل کر دیا ہے۔ اس موقع پر پیغمبر نے شدت عمل کا ارادہ کیا اور ایک درخت کے نیچے جو وہاں پر موجود تھا، اپنے اصحاب سے بیعت لی، جو "بیعت رضوان" کے نام سے مشہور ہوئی، اور ان کے ساتھ یہ عہد و پیمان کیا کہ آخری سانس تک ڈٹیں گے، لیکن تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ عثمان صحیح و سالم واپس لوٹ آئے اور اُن کے پیچھے پیچھے قریش نے "سہیل بن عمر" کو مصالحت کے لیے پیغمبر کی خدمت میں بھیجا، لیکن تاکید کی کہ اس سال کسی طرح بھی آپ کا مکہ میں ورود ممکن نہیں ہے۔

بہت زیادہ بحث و گفت گو کے بعد صلح کا عہد و پیمان ہوا، جس کی ایک شق یہ تھی کہ مسلمان اس سال عمرہ سے باز رہیں اور آئندہ سال مکہ میں آئیں، اس شرط کے ساتھ کہ تین دن سے زیادہ مکہ میں نہ رہیں، اور مسافرت کے عام ہتھیار کے علاوہ اور کوئی اسلحہ اپنے ساتھ نہ لائیں، اور دوسرے متعدد مواد جن کا دار و مدار ان مسلمانوں کی جان و مال کی امنیت پر تھا، جو مدینہ سے مکہ میں وارد ہوں اور اسی طرح مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان دس سال جنگ نہ کرنے اور مکہ میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے مذہبی فرائض کی انجام دہی بھی اس میں شامل کی گئی تھی۔

یہ پیمان حقیقت میں ہر جہت سے ایک عدم تعرض کا عہد و پیمان تھا، جس نے مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان مسلسل اور بار بار کی جنگوں کو وقتی طور پر ختم کر دیا۔

"صلح کے عہد و پیمان کا متن" اس طرح تھا کہ پیغمبرؐ نے علیؑ کو حکم دیا کہ لکھو:

• بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم": سہیل بن عمرو" نے، جو مشرکین کا نمائندہ تھا، کہا: میں اس قسم کے جملہ سے آشنا نہیں ہوں، لہٰذا بسمک اللّٰھم لکھو!

پیغمبرؐ نے فرمایا: لکھو: "بسمک اللّٰھم"

اس کے بعد فرمایا: لکھو! یہ وہ چیز ہے جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی۔ "سہیل" نے کہا: ہم اگر آپ کو "رسول اللہ" سمجھتے تو آپ سے جنگ نہ کرتے، صرف اپنا اور اپنے والد کا نام لکھیے، پیغمبرؐ نے فرمایا کوئی حرج نہیں لکھو "یہ وہ چیز ہے جس پر محمدؐ بن عبداللہ نے سہل بن عمرو سے صلح کی، کہ دس سال تک دونوں طرف سے جنگ متروک رہے گی تاکہ لوگوں کو امن و امان کی صورت دوبارہ میسر آئے۔

علاوہ ازیں جو شخص قریش میں سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمدؐ کے پاس آئے (اور مسلمان ہو جائے) اسے واپس کر دیں اور جو شخص ان افراد میں سے جو محمد کے پاس ہیں، قریش کی طرف پلٹ جائے تو اس کو واپس لوٹانا ضروری نہیں ہے۔

تمام لوگ آزاد ہیں جو چاہے محمد کے عہد و پیمان میں داخل ہو اور جو چاہے قریش کے عہد و پیمان میں داخل ہو، طرفین اس بات کے پابند ہیں کہ ایک دوسرے سے خیانت نہ کریں اور ایک دوسرے کی جان و مال کو محترم شمار کریں۔

اس کے علاوہ محمدؐ اس سال واپس چلے جائیں اور مکہ میں داخل نہ ہوں، لیکن آئندہ سال ہم تین دن کے لیے مکہ سے باہر چلے جائیں گے اور ان کے اصحاب آجائیں، لیکن تین دن سے زیادہ نہ ٹھہریں، (اور مراسم عمرہ کو انجام دے کر واپس چلے جائیں) اس شرط کے ساتھ کہ سوائے مسافر کے ہتھیار یعنی تلوار کے۔ وہ بھی غلاف میں۔ کوئی اور ہتھیار ساتھ نہ لائیں۔

اس پیمان پر مسلمانوں اور مشرکین کے ایک گروہ نے گواہی دی اور اس عہد نامہ کے کاتب علی بن ابی طالب علیہ السلام تھے۔[1]

مرحوم علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں کچھ اور امور بھی نقل کیے ہیں، منجملہ ان کے یہ کہ:

"اسلام مکہ میں آشکارا ہوگا اور کسی کو کسی مذہب کے انتخاب کرنے پر مجبور نہیں کریں گے، اور مسلمانوں کو اذیت و آزار نہیں پہنچائیں گے"۔[2]

اس موقع پر پیغمبرؐ نے حکم دیا کہ قربانی کے وہ اونٹ جو وہ اپنے ہمراہ لائے تھے، اسی جگہ قربان کریں اور اپنے سروں کو منڈوائیں اور احرام سے باہر نکل آئیں، لیکن یہ بات کچھ مسلمانوں کو سخت ناگوار معلوم ہوئی، کیونکہ عمرہ کے مناسک کی انجام دہی کے بغیر ان کی نظر میں احرام سے باہر نکل آنا ممکن نہیں تھا، لیکن پیغمبرؐ نے ذاتی طور پر خود پیش قدمی کی اور قربانی کے اونٹوں کو نحر کیا اور احرام سے باہر نکل آئے اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ یہ احرام و قربانی کے قانون میں ایک استثناء ہے جو خدا کی طرف سے قرار دیا گیا ہے۔

مسلمانوں نے جب یہ دیکھا تو سر تسلیم خم کر دیا، اور پیغمبرؐ کا حکم کامل طور سے مان لیا، اور وہیں سے مدینہ کی راہ لی، لیکن غم واندوہ کا ایک پہاڑ ان کے دلوں پر بوجھ ڈال رہا تھا، کیونکہ ظاہر میں یہ سارے کا سارا سفر ایک ناکامی اور شکست تھی، لیکن انہیں اس بات کی خبر نہیں تھی کہ صلح حدیبیہ کی داستان کے پیچھے مسلمانوں اور اسلام کے لیے کتنی کامیابیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اسی وقت سورۂ فتح نازل ہوئی اور پیغمبر گرامی اسلام کو فتح عظیم کی بشارت ملی۔[3]

صلح حدیبیہ کے سیاسی اجتماعی اور مذہبی نتائج

ہجرت کے چھٹے سال (صلح حدیبیہ کے وقت) مسلمانوں کی حالت میں اور دو سال بعد کی حالت میں فرق نمایاں تھا جب وہ دس ہزار کے مسلح لشکر کے ساتھ فتح مکہ کے لیے چلے تاکہ مشرکین کو پیمان شکنی کا دندان شکن جواب دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے فوجوں کی معمولی سی جھڑپ کے بغیر ہی مکہ کو فتح کر لیا، اس وقت قریش اپنے اندر مقابلہ کرنے کی معمولی

---

[1] تاریخ طبری جلد ۲ ص ۲۸۱ (کچھ تلخیص کے ساتھ) [2] بحار الانوار جلد ۲۰ ص ۳۵۲۔

[3] سیرۃ ابن ہشام: ج ۳ ص ۳۲۱ - ۳۲۴، "تفسیر مجمع البیان"، "تفسیر فی ظلال"، "کامل ابن اثیر جلد ۲ اور دوسرے مدارک بہت زیادہ تلخیص کے ساتھ۔

سی قدرت بھی نہیں رکھتے تھے۔ ایک اجمالی موازنہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ "صلح حدیبیہ" کا عکس العمل کس قدر وسیع تھا۔

خلاصہ کے طور پر مسلمانوں نے اس صلح سے چند امتیاز اور اہم کامیابیاں حاصل کیں، جنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) عملی طور پر مکہ کے فریب خوردہ لوگوں کو یہ بتا دیا کہ وہ جنگ و جدال کا ارادہ نہیں رکھتے، اور مکہ کے مقدس شہر اور خانۂ خدا کے لیے بہت زیادہ احترام کے قائل ہیں، یہی بات ایک کثیر جماعت کے دلوں کے لیے اسلام کی طرف کشش کا سبب بن گئی۔

(۲) قریش نے پہلی مرتبہ اسلام اور مسلمانوں کو رسمی طور پر تسلیم کیا، یہی وہ چیز تھی جو جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کی حیثیت کو ثابت کرنے کی دلیل بنی۔

(۳) صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان سکون و اطمینان کے ساتھ ہر جگہ آجا سکتے تھے اور ان کا جان و مال محفوظ ہو گیا تھا، اور عملی طور پر مشرکین کے ساتھ قریبی تعلق اور میل جول پیدا ہوا، ایسے تعلقات جس کے نتیجہ میں مشرکین کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ پہچان کے ساتھ ان کی توجہ اسلام کی طرف مائل ہوئی۔

(۴) صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے سارے جزیرۃ العرب میں راستہ کھل گیا، اور پیغمبر کی صلح طلبی کی شہرت نے مختلف اقوام کو۔ جو پیغمبر کی ذات اور اسلام کے متعلق غلط نظریہ رکھتے تھے۔ تجدید نظر پر آمادہ کیا، مو تبلیغاتی نقطۂ نظر سے بہت سے وسیع امکانات و وسائل مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔

(۵) صلح حدیبیہ نے خیبر کو فتح کرنے اور یہودیوں کے اس سرطانی غدہ کو نکال پھینکنے کے لیے، جو بالفعل اور بالقوہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک اہم خطرہ تھا راستہ ہموار کر دیا۔

(۶) اصولی طور پر پیغمبر کی ایک ہزار چار سو افراد کی فوج سے ٹکر لینے سے قریش کی وحشت۔ جن کے پاس کسی قسم کے اہم جنگی ہتھیار بھی نہیں تھے۔ اور شرائط صلح کو قبول کر لینا، اسلام کے طرفداروں کے دلوں کی تقویت، اور مخالفین کی شکست کے لیے۔ جنہوں نے مسلمانوں کو ستایا تھا خود ایک اہم عامل تھا۔

(۷) واقعہ حدیبیہ کے بعد پیغمبر نے بڑے بڑے ملکوں، ایران و روم و حبشہ کے سربراہوں، اور دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کو متعدد خطوط لکھے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دی اور یہ چیز اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ صلح حدیبیہ نے مسلمانوں میں کس قدر خود اعتمادی پیدا کر دی تھی، کہ نہ صرف جزیرہ عرب میں بلکہ اس زمانہ کی بڑی دنیا میں ان کی راہ کو کھول دیا۔

اب ہم آیات کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس سے یہ بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے، کہ واقعاً صلح حدیبیہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک عظیم فتح اور کامیابی تھی، اور یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ قرآن مجید سے فتح مبین کے عنوان سے یاد کرتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے قرائن ہمارے پاس ہیں جو اس تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔

(۱) "فتحنا" کا جملہ فعل ماضی کی صورت میں ہے، یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ امر ان آیات کے نزول کے وقت ہو چکا تھا، جبکہ اس وقت صلح حدیبیہ کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہوئی تھی۔

(۲) ان آیات کے نزول کا زمانہ جس کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے، اور اس سورہ کی دوسری آیات، جو صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں مومنین کی مدح اور منافقین و مشرکین کی مذمت کر رہی ہیں، اس مطلب کے لیے ایک دوسری تائید ہے۔

اس سورہ کی آیت ۲۷ جو پیغمبرؐ کے رؤیائے صادقہ (سچے خواب) کی تاکید کر رہی ہے، وہ یہ کہتی ہے: "یقیناً تم عنقریب مسجد الحرام میں انتہائی امن و سکون کے ساتھ داخل ہوگے اور آخر مناسک عمرہ بجالاؤ گے" یہ اس بات کی ایک شاہد ہے کہ یہ سورہ اور اس کا مضمون حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے کا تھا۔

(۳) بہت سی روایات میں "صلح حدیبیہ" کا "فتح مبین" کے عنوان سے تعارف ہوا ہے، منجملہ ان کے یہ ہے:

تفسیر "جوامع الجوامع" میں آیا ہے کہ جس وقت پیغمبرؐ حدیبیہ سے واپس لوٹے (اور سورۂ فتح نازل ہوئی) تو ایک صحابی نے عرض کیا:

"ماهذا الفتح لقد صدونا عن البيت وصد هدينا"

"یہ کیا فتح ہے کہ ہمیں خانۂ خدا کی زیارت سے بھی روک دیا ہے اور ہماری قربانی میں بھی رکاوٹ ڈال دی"؟!

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"بئس الكلام هذا، بل هو اعظم الفتوح، قد رضى المشركون ان يدفعوكم عن بلادهم بالراح، ويسئلوكم القضية، ورغبوا اليكم فى الامان وقد رأوا منكم ما كرهوا"؛

"تو نے بہت بری بات کہی ہے، بلکہ یہ تو ہماری عظیم ترین فتح ہے کہ مشرکین اس بات پر راضی ہو گئے ہیں کہ تمہیں خشونت آمیز طریقہ سے نکالے بغیر اپنی سرزمین سے دور کریں، اور تمہارے سامنے صلح کی پیش کش کریں اور ان تمام تکالیف اور رنج و غم کے باوجود جو تمہاری طرف سے انھوں نے اٹھائے ہیں، ترک تعرض کے لیے تمہاری طرف مائل ہوئے ہیں"۔[1]

اس کے بعد پیغمبرؐ نے وہ تکالیف جو انھوں نے بدر و احزاب میں جھیلی تھیں انھیں یاد دلائیں، تو مسلمانوں نے تصدیق کی یہ سب سے بڑی فتح تھی اور انھوں نے لاعلمی کی بنا پر یہ فیصلہ کیا تھا۔[2]

"زہری" جو ایک مشہور تابعی ہے، کہتا ہے، کوئی بھی فتح "صلح حدیبیہ" سے زیادہ عظیم نہیں تھی، کیونکہ مشرکین نے مسلمانوں کے ساتھ ارتباط اور تعلق پیدا کیا، اور اسلام ان کے دلوں میں جاں گزیں ہوا، اور تین ہی سال کے عرصہ میں ایک عظیم گروہ اسلام لے آیا اور مسلمانوں میں ان کی وجہ سے اضافہ ہوا۔[3]

---

[1] جوامع الجوامع" (نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۴۰ حدیث ۹ کے مطابق)۔

[2] "تفسیر در المنثور" جلد ۶ صفحہ ۶۸۔

[3] " مذکورہ مدرک صفحہ ۱۰۹۔

ان احادیث میں، ان امتیازات کے ایک گوشہ کی طرف، جو صلح حدیبیہ کی برکت سے مسلمانوں کو نصیب ہوئے اشارہ ہوا ہے۔

صرف ایک ہی حدیث میں امام علی ابن موسیٰ الرضاؑ سے آیا ہے کہ "انا فتحنا" "فتح مکہ" کے بعد نازل ہوئی۔ ؎
لیکن چونکہ "صلح حدیبیہ" دو سال بعد مکہ کی فتح کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید تھی لہٰذا اس حدیث کی توجیہ میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔

یا دوسرے لفظوں میں صلح حدیبیہ مختصر سی مدت میں فتح خیبر کا سبب بنی (جو ہجرت کے ساتویں سال ہوئی) اور اس سے تھوڑا سا آگے فتح مکہ کا سبب بنی، اور دنیا کے تمام علاقوں میں لوگوں کے دلوں میں نفوذ کرنے کے لحاظ سے اسلام کی کامیابی کا سبب ہوئی۔
گویا اس طرح سے چاروں تفاسیر کو جمع کیا جا سکتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ ان سب کا محور اصلی "صلح حدیبیہ" ہی کو قرار دیا جائے۔

؎ نور الثقلین جلد ۵ ص۵۔

۲۔ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ

۳۔ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۞

ترجمہ

۲۔ مقصد یہ تھا کہ خدا تیرے گذشتہ اور آئندہ کے وہ گناہ جن کی وہ تیری طرف نسبت دیتے تھے، بخش دے، اور تجھ پر اپنی نعمت کو تمام کر دے، اور تجھے راہ راست کی طرف ہدایت کرے۔

۳۔ اور شکست ناپذیر کامیابی کو تیرے نصیب کرے۔

تفسیر

فتح مبین کے عظیم نتائج

ان دو آیات میں "فتح مبین" (صلح حدیبیہ، جو گذشتہ آیت میں بیان ہوئی تھی) کے پُر برکت نتائج کے ایک حصہ کی تشریح ہوئی ہے، فرماتا ہے: مقصد یہ تھا کہ خدا تیرے پہلے اور بعد کے گناہ بخش دے۔ اور اپنی نعمت کو تجھ پر تمام کر دے اور تجھے راہ راست کی ہدایت کرے": (ليغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر ويتم نعمته عليك ويهديك صراطا مستقيما)۔

"اور تجھے شکست ناپذیر فتح تک پہنچائے": (وينصرك الله نصرا عزيزا)

اور اس طرح سے خدا نے اپنے پیغمبر کو فتح مبین کے سائے میں چار عظیم نعمتیں عطا فرمائیں: مغفرت، تکمیل نعمت، ہدایت ونصرت۔

چند نکات

① چند اہم سوالات کے جواب

یہاں بہت سے سوالات پیش ہوئے ہیں اور قدیم ترین زمانہ سے لے کر اب تک مفسرین ان سوالات کے جواب دے رہے ہیں۔

خصوصاً پہلی خدائی نعمت "یعنی گذشتہ اور آیندہ کے گناہوں کی مغفرت" کے بارے میں ذیل کے تین سوال پیش ہوئے ہیں۔

① جب کہ پیغمبر مقام عصمت کی بنا پر ہر گناہ سے پاک ہیں تو پھر اس جملہ سے کیا مراد ہے؟

② بالفرض اگر ہم اس اعتراض سے صرف نظر بھی کریں تو "فتح حدیبیہ" اور گناہوں کی آمرزش کے درمیان کون سا ربط ہے۔

③ اگر "ما تاخر" سے مراد آیندہ کے گناہ ہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ جو گناہ ابھی واقع ہی نہیں ہوا اسے معاف کیا جائے؟ کیا یہ آیندہ کے لیے ارتکاب گناہ کی اجازت نہیں ہے؟

مفسرین میں سے ہر ایک نے کسی نہ کسی صورت میں ان اعتراضات کا جواب دیا ہے لیکن جامع ترین جواب اور ان آیات کی دقیق تفسیر کی تہ تک پہنچنے کے لیے ایک بات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اور وہ اہم بات یہ ہے کہ ہم "فتح حدیبیہ" کا آمرزش گناہ، کے مسئلہ کے ساتھ ربط معلوم کریں، کیونکہ اُوپر کے تینوں سوالات کے اصل جواب کی چابی اسی میں چھپی ہوئی ہے۔

تاریخی واقعات اور حوادث پر غور و فکر کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ، جس وقت کوئی سچا مذہب یا مکتب خیال ظاہر ہوتا ہے، اور وہ قائم ہونے کی کوشش کرتا ہے، تو بے ہودہ رسم و رواج کے وفادار۔ جو اپنے وجود کو خطرے میں پاتے ہیں۔ ہر قسم کی تہمت اور ناروا نسبت اس کے سر تھوپتے ہیں، افواہیں پھیلاتے ہیں، جھوٹی باتیں کرتے ہیں، اس کے مختلف نقص گنواتے ہیں اور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ دیکھیں اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

اگر یہ مکتب اپنی پیش رفت کی راہ میں شکست سے دوچار ہو جائے، تو مخالفین کے ہاتھ میں، ناروا نسبتوں کی ایک محکم دستاویز آجاتی ہے، اور وہ چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ ہم نے کہا نہیں تھا کہ اس طرح ہے، ہم کہتے نہیں تھے کہ یہ بات ہے لیکن جب وہ کامیابی سے ہم کنار ہو جائے، اور اپنے پروگراموں کو کٹھن آزمائشوں سے گزرتے ہوئے پورا کرلے، تو تمام ناروا نسبتیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں اور تمام اس طرح کے نعرے "ہم نے نہیں کہا تھا؟" افسوس و ندامت میں بدل جاتے

ہیں: اور اس کی جگہ "ہم نہیں جانتے تھے، ہمیں معلوم نہیں تھا" جیسے فقرے آجاتے ہیں۔

خصوصاً پیغمبر اسلام کے بارے میں یہ ناروا نسبتیں اور خیالی گناہ بہت زیادہ تھے آپ کو جنگ طلب، آگ بھڑکانے والا، سپچھے رسم ورواج کی پرواہ نہ کرنے والا، افہام وتفہیم کے ناقابل، اور اسی قسم کی دوسری باتوں کا مرتکب سمجھتے تھے۔

صلح حدیبیہ نے اچھی طرح سے نشاندہی کردی کہ آپ کا دین۔ دشمنوں کے خیال کے برخلاف۔ ایک ترقی کرنے والا اور خدائی دین ہے، اور آپ کے قرآن کی آیات انسانوں کے نفوس کی تربیت کی ضامن، اور ظلم وستم اور جنگ وخونریزی کو ختم کرنے والی ہیں۔

وہ خانۂ خدا کا احترام کرتے ہیں، بلاوجہ کسی قوم وقبیلہ پر حملہ نہیں کرتے، دلیل کے ساتھ جچی تلی بات کرتے ہیں، اُن کے پیروکار اُن کے عاشق ہیں، وہ واقعاً تمام انسانوں کو ان کے محبوب اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اگر اس کے دشمن جنگ کو اس کے اوپر سوار ہی نہ کردیں، تو وہ صلح اور امن وسلامتی کے طالب ہیں۔

اس طرح سے صلح حدیبیہ نے، وہ تمام الزام جن کی ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد ناروا نسبتیں جن کی اس ماجرے سے پہلے بیان تک کہ وہ گناہ بھی جن کے آپ کی طرف آیندہ نسبت دینے کا امکان تھا، ان سب کو دھو دیا۔ اور چونکہ خدا نے پیغمبر کو یہ کامیابی نصیب فرمائی، لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے ان سب کو دھو دیا۔

نتیجہ اس کا یہ ہے کہ یہ الزامات واقعی الزام نہیں تھے، بلکہ ایسے الزام تھے جو خیالی لوگوں کے افکار میں تھے، جنہیں انہوں نے باور کر لیا تھا، جیسا کہ سورۂ شعراء کی آیت ۱۴ میں موسیٰ علیہ السلام کی داستان میں بیان ہوا ہے کہ موسیٰؑ نے بارگاہِ خدا میں عرض کیا۔

ولھم علی ذنب فاخاف ان یقتلون، "فرعونیوں کا میرے اوپر ایک گناہ ہے، میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے اس گناہ کے جرم میں قتل کردیں گے" حالانکہ آپ کا گناہ بنی اسرائیل کے ایک مظلوم آدمی کی مدد کرنے اور فرعونیوں میں سے ایک ستمگر کی سرکوبی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ نہ صرف گناہ نہیں تھا، بلکہ مظلوم کی حمایت تھی، لیکن فرعونیوں کی نظر میں وہ گناہ شمار ہوتا تھا۔

دوسرے لفظوں میں "ذنب" لغت میں کسی کام کے بُرے آثار اور اس کے پیچھے آنے والے نتائج کے معنی میں ہے، ظہورِ اسلام نے آغاز میں مشرکین کی زندگی کو درہم برہم کرکے رکھ دیا لیکن بعد کی کامیابیاں اس بات کا سبب بن گئیں کہ وہ نتائج فراموشی کے سپرد کردیئے جائیں۔

اگر لوگ ہمارے پرانے اور فرسودہ گھر کو، جو اس وقت ہماری پناہ گاہ کا کام دیتا ہے اور ہم اس سے دل بستگی رکھتے ہیں، خراب کردیں، تو ممکن ہے کہ ہم اس کام کو ان کی خطا اور غلطی کہیں اور اُسے ان کا ایک گناہ سمجھیں، لیکن جب ایک محکم اور آراستہ عمارت اس کی جگہ بنا دی جائے اور ہماری تمام پریشانیاں دُور کردی جائیں، تو پھر ہمارا فیصلہ کلی طور پر بدل جائے گا۔

مشرکین مکہ ہجرت سے پہلے بھی اور ہجرت کے بعد بھی اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں غلط فہم کے خیالات

تصورات رکھتے تھے، بعد والی کامیابیوں نے اُن سب پر خط بطلان کھینچ دیا۔

ہاں! اگر ہم ان گناہوں کی آمرزش کا فتح حدیبیہ کے ساتھ تعلق نظر میں رکھیں تو مطلب مکمل طور پر واضح ہو جائے گا۔ وہ رابطہ جو" لیغفر لك الله" کی "لام" سے معلوم ہوتا ہے اور آیت کے معنی کھولنے کے لیے کلید رمز ہے۔

لیکن جنہوں نے اس نکتہ کی طرف توجہ نہیں کی وہ یہاں پیغمبر کے مقام عصمت کو زیر سوال لے آتے ہیں۔ اور آپ کے لیے (نعوذ باللہ) گناہوں کے قائل ہوئے ہیں۔ جنہیں خدا نے فتح حدیبیہ کے سائے میں بخش دیا ہے یا پھر آیت کا ظاہر کے برخلاف معنی کیا ہے۔

ان میں سے بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد گناہ ہی ہیں۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد وہ گناہ ہیں جن کے لوگ پیغمبر کے بارے میں مرتکب ہوئے تھے، مثلاً اذیت اور تکلیفیں جو صلح حدیبیہ کے بعد ختم ہو گئیں (اس صورت میں ذنب کی مفعول کی طرف اضافت ہوئی نہ کہ فاعل کی طرف)

اور یا اُسے ترک اولیٰ کے معنی میں لیا ہے۔

یا فرضی گناہوں کے معنی سے تفسیر کیا ہے کہ فرض کرو اگر تو آیندہ یا گذشتہ زمانے میں گناہ کا مرتکب ہوا ہوتا تو ہم اُسے بخش دیتے۔

لیکن واضح ہے کہ یہ تکلفات ہیں جن کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ہم انبیاء کی عصمت کو مخدوش کر دیں تو ان کا فلسفۂ وجود ہی ختم ہو جائے گا، کیونکہ پیغمبر کو ہر چیز میں نمونہ ہونا چاہیئے، ایک گناہگار شخص اس مثال کو کیسے پورا کر سکتا ہے۔

علاوہ ازیں وہ خود ایک رہبر ورہنما کا محتاج ہو گا جو اُسے ہدایت کرے۔

اور بہت سی دوسری تفسیریں بھی ہیں، جو ظاہر کے خلاف ہیں، اور ان میں اہم اشکال یہ ہیں، کہ وہ آمرزش گناہ کا ارتباط صلح حدیبیہ کے مسئلہ سے منقطع کر دیتی ہیں،

بہترین تفسیر وہی ہے جس کی طرف اُوپر اشارہ ہوا ہے، جو تینوں سوالات کا یکجا جواب دیتی ہے۔ اور آیت کے جملوں کے ارتباط کو مشخص کرتی ہے۔

یہ سب بحث تو ان چاروں نعمتوں میں سے پہلی نعمت کے بارے میں ہے، جو خدا نے "صلح حدیبیہ" کے سائے میں پیغمبر کو دی تھیں۔

اب باقی رہ گیا پروردگار کی نعمت کی تکمیل، صاف اور مستقیم راستے کی طرف ہدایت، اور شکست ناپذیر خدائی نصرت، تو حدیبیہ کی کامیابی کے بعد یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے، جو کسی پر مخفی رہی ہو، اسلام نے تیزی کے ساتھ وسعت پیدا کی، آمادہ دلوں کو تسخیر کیا، اس کی تعلیمات کی عظمت سب پر آشکار ہوئی، زہریلے پروپیگنڈوں کو ناکارہ کر دیا اور خدا کی نعمت کو کامل کر دیا، اور عظیم کامیابیوں کی طرف راہِ مستقیم کو کس طرح سے ہموار کیا، کہ فتح مکہ کے واقعہ میں لشکر اسلام نے بغیر کسی مزاحمت کے دشمن کا اہم ترین قلعہ فتح کر لیا۔

۲ "ماتقدم" اور "ماتاخر" سے کیا مراد ہے؟

زیرِ بحث آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ خدا فرماتا ہے: فتح مبین کے سایے میں تیرے پہلے گناہ بھی اور آیندہ کے گناہ بھی بخش دیئے ہیں، اس بارے میں کہ متقدم اور متاخر (پہلے اور آیندہ کے) سے کیا مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض نے "ما تقدم" کو آدم و حوا کے عصیان اور ترکِ اولیٰ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، اور "ما تأخر" کو امت کے گناہوں کی طرف۔

بعض دوسروں نے "ماتقدم" کو نبوت سے قبل کے مسائل سے مربوط جانا ہے اور "ماتاخر" کو نبوت سے بعد کے ساتھ مربوط سمجھا ہے
بعض نے "ماتقدم" کو ان گناہوں سے جو "صلح حدیبیہ" سے پہلے ہوئے تھے، اور "ماتأخر" کو اُن سے جو صلح کے بعد ہوئے، مربوط سمجھا ہے۔

لیکن اس تفسیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو ہم نے آیت کے اصل معنیٰ کے بارے میں خاص طور پر "صلح حدیبیہ" کے مسئلہ کے ربط میں بیان کی ہے، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد وہ تمام ناروا نسبتیں اور گناہ ہیں جو وہ اپنے گمان کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف گزشتہ زمانے میں منسوب کرتے رہے تھے یا آیندہ کرتے، اور اگر یہ عظیم کامیابی نصیب نہ ہوئی ہوتی تو وہ ان تمام گناہوں کو قطعی و یقینی خیال کرلیتے، لیکن اس کامیابی کے حصول کے ساتھ گزشتہ ناروا نسبتیں بھی ختم ہوگئیں، اور وہ بھی جن کے بارے میں ممکن تھا کہ آیندہ نسبت دیتے۔

اس تفسیر کا ایک دوسرا شاہد وہ روایت ہے، جو امام علی ابن موسیٰ الرضاؑ سے منقول ہوئی ہے کہ مامون نے جس وقت اس آیت کے متعلق سوال کیا تو امامؑ نے جواب میں فرمایا:

"مشرکین مکہ کے نزدیک کسی شخص کا گناہ رسول اللہؐ سے زیادہ سنگین نہیں تھا، کیونکہ وہ ۳۶۰ بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے، جس وقت پیغمبرؐ نے انہیں توحید کی طرف دعوت دی تو ان پر بہت گراں گزرا، اور انھوں نے کہا: کیا اس نے ہمارے سب خداؤں کو ایک خدا میں تبدیل کر دیا ہے؟ یہ تو ایک عجیب بات ہے . . . . . ہم نے ہرگز اس قسم کی کوئی بات اپنے آباؤ اجداد سے نہیں سُنی، یہ تو ایک بہت بڑا جھوٹ ہے۔

لیکن جس وقت خدا نے (صلح حدیبیہ کے بعد) اپنے پیغمبرؐ کے لیے مکہ فتح کر دیا، تو خدا نے فرمایا، اے محمدؐ ہم نے تیرے لیے فتح مبین فراہم کی ہے تاکہ توحید کی طرف دعوت دینے کی بنا پر مشرکین عرب کے نزدیک جتنے گناہ تو نے پہلے کیے تھے یا آیندہ کرے گا ان سب کو بخش دیا، کیونکہ بعض مشرکین مکہ تو اس دن ایمان لا چکے تھے، اور بعض مکہ سے باہر نکل گئے تھے۔ اور ایمان نہیں لائے تھے، لیکن ان میں اب توحید کا انکار کرنے کی جرأت باقی نہیں رہی تھی، لہٰذا پیغمبرؐ کا گناہ ان کی نظر میں بھی کامیابی کی بنا پر بخشا گیا، جس وقت مامون نے یہ سُنا تو کہا بارک اللہ، اے ابوالحسن!

(نور الثقلین جلد ۵ ص ۵۶)

۴۔ هُوَ الَّذِيٓ اَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ فِيۡ قُلُوۡبِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لِيَزۡدَادُوۡۤا اِيۡمَانًا مَّعَ اِيۡمَانِهِمۡ‌ؕ وَلِلّٰهِ جُنُوۡدُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ۙ‏

ترجمہ

۴۔ وہی تو ہے جس نے مومنین کے دلوں میں سکون واطمینان نازل کیا، تاکہ ان کے ایمان میں مزید ایمان کا اضافہ ہو، اور آسمانوں اور زمین کے لشکر خدا ہی کے لیے ہیں اور خدا دانا و حکیم ہے۔

تفسیر

مومنین کے دلوں پر نزول سکینہ

گذشتہ آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ اتنی عظیم نعمتیں تھیں جو خدا نے فتح مبین (صلح حدیبیہ) کے سایے میں پیغمبر کو عطا فرمائی تھیں، لیکن زیر بحث آیت میں اس عظیم نعمت کے بارے میں بحث کر رہا ہے جو اس نے تمام مومنین کو مرحمت فرمائی ہے، فرماتا ہے: "وہی تو ہے، جس نے مومنین کے دلوں میں سکون واطمینان نازل کیا، تاکہ ان کے ایمان میں مزید ایمان کا اضافہ کرے"۔

(ھو الذی انزل السکینۃ فی قلوب المؤمنین لیزدادوا ایمانا مع ایمانھم)۔

اور سکون واطمینان ان کے دلوں پر نازل کیوں نہ ہو۔ "درآنحالیکہ آسمانوں اور زمین کے لشکر خدا کے لیے ہیں۔ اور خدا دانا و حکیم ہے"۔

(وَلِلّٰہِ جنود السماوات والارض وکان اللہ علیمًا حکیمًا)۔

یہ سکینہ کیا تھا؟

ضروری ہے کہ ہم پھر "صلح حدیبیہ" کی داستان کی طرف لوٹیں اور اپنے آپ کو "صلح حدیبیہ" کی فضا میں اور اس فضا میں جو صلح کے بعد پیدا ہوئی، تصور کریں تاکہ آیت کے مفہوم کی گہرائی سے آشنا ہو سکیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خواب دیکھا تھا " ایک رؤیائے الٰہی و رحمانی " کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مسجد الحرام میں داخل ہو رہے ہیں۔ اور اس کے بعد خانۂ خدا کی زیارت کے عزم کے ساتھ چل پڑے زیادہ تر صحابہ یہی خیال کرتے تھے کہ اس خواب اور رؤیائے صالحہ کی تعبیر اسی سفر میں واقع ہو گی، حالانکہ مقدر میں ایک دوسری چیز تھی یہ بات تو ایک ہوئی۔

دوسری طرف مسلمانوں نے احرام باندھا ہوا تھا، اور وہ قربانی کے جانور اپنے ساتھ لائے تھے، لیکن ان کی توقع کے برخلاف خانۂ خدا کی زیارت کی سعادت تک نصیب نہ ہوئی، اور پیغمبر نے حکم دے دیا کہ مقام حدیبیہ میں ہی قربانی کے اونٹوں کو نحر کر دیں۔ کیونکہ ان کے آداب و سنن قدیمی اور اسلامی احکام و دستور کا بھی یہی تقاضا تھا کہ جب تک مناسک عمرہ کو انجام نہ دے لیں احرام سے باہر نہ نکلیں۔

تیسری طرف حدیبیہ کے صلح نامہ میں کچھ ایسے امور تھے جن کے مطالب کو قبول کرنا بہت ہی دشوار تھا، منجملہ ان کے یہ کہ اگر قریش میں سے کوئی شخص مسلمان ہو جائے اور مدینہ میں پناہ لے لے تو مسلمان اُسے اس کے گھر والوں کے سپرد کر دیں گے، لیکن اس کے برعکس لازم نہیں تھا۔

چوتھی طرف صلح نامہ کی تحریر کے موقع پر قریش اس بات پر تیار نہ ہوئے کہ لفظ "رسول اللہ" محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کے ساتھ لکھا جائے، اور قریش کے نمائندے "سہیل" نے اصرار کر کے اسے حذف کرایا، یہاں تک کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے لکھنے کی بھی موافقت نہ کی، اور وہ یہی اصرار کرتا رہا کہ اس کے بجائے "بسمک اللّٰھم" لکھا جائے، جو اہل مکہ کی عادت اور طریقہ کے مطابق تھا، واضح رہے کہ ان امور میں سے ہر ایک علیٰحدہ علیٰحدہ ایک ناگوار امر تھا، چہ جائیکہ وہ سب کے سب مجموعی طور سے۔ اسی لیے ضعیف الایمان لوگوں کے دل ڈگمگا گئے، یہاں تک کہ جب سورۂ فتح نازل ہوئی تو بعض نے تعجب کے ساتھ پوچھا: کونسی فتح؟!

یہی وہ موقع ہے جب نصرت الٰہی کو مسلمانوں کے شامل حال ہونا چاہیئے تھا، اور سکون و اطمینان ان کے دلوں میں داخل ہوتا تھا، تاکہ کوئی فتور اور کمزوری ان میں پیدا ہوتی تھی، بلکہ " لیزدادوا ایمانًا مع ایمانھم " کے مصداق ان کی قدرت ایمانی میں اضافہ ہونا چاہیئے تھا۔ اوپر والی آیت ایسے حالات میں نازل ہوئی۔

"سکینہ" اصل میں "سکون" کے مادہ سے دلی آرام و اطمینان کے معنی میں ہے، جو ہر قسم کے شک و تردد اور وحشت کو

انسان سے زائل کر دیتا ہے، اور اس کو طوفان حوادث میں ثابت قدم رکھتا ہے۔

ممکن ہے اس سکون میں اعتقادی پہلو ہو۔ اور وہ اعتقاد میں ڈگمگانے سے بچائے، یا اس میں عملی پہلو ہو اس طرح سے کہ وہ انسان کو ثبات قدم، مقاومت اور صبر و شکیبائی بخشے۔ البتہ گذشتہ مباحث کی مناسبت سے اور خود آیت کی تعبیر یا بیان زیادہ تر پہلے معنی کی طرف نظر جاتی ہے، جبکہ سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۴۸ داستان "طالوت" و "جالوت" میں زیادہ تر عملی پہلوؤں پر تکیہ کرتی ہے۔

مفسرین کی ایک جماعت نے "سکینہ" کے لیے کچھ اور معنی بھی ذکر کیے ہیں۔ جن کی بازگشت آخر کار اسی تفسیر کی طرف ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں "سکینہ" کی "ایمان" کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے[1] اور بعض دوسری روایات میں نسیم جنت سے جو ایک خاص صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور مومنین کو سکون و آرام بخشتی ہے۔[2]

جو کچھ بیان ہوا ہے، یہ بھی ان کے لیے ایک تائید ہے، کیونکہ "سکینہ" ایمان کی پیداوار ہے اور نسیم بہشتی کی طرح آرام بخش ہوتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے، کہ "سکینہ" کے بارے میں "انزال" (نازل کرنے) کی تعبیر ہوئی، اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ یہ تعبیر قرآن مجید میں بعض اوقات، ایجاد، وخلقت اور بخشش کے معنی میں آتی ہے اور چونکہ ایک عالی مقام سے ایک پست مقام کی طرف ہے اس لیے اس تعبیر کی خوبی واضح ہے۔

چند نکات

۱۔ بے مثال آرام و سکون

اگر ایمان کا ثمر اور نتیجہ اسی سکون و آرام کے مسئلہ کے سوا اور کچھ نہ ہوتا، تو یہی کافی تھا کہ انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کا استقبال کرے، جبکہ اس میں دوسرے ثمرات و برکات بھی موجود ہیں۔

مومنین اور بے ایمان لوگوں کی حالت کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے، کہ دوسرا گروہ ایک دائمی اضطراب اور پریشانی کی حالت میں بسر کرتا ہے، جب کہ پہلا گروہ بے مثال اطمینان قلب سے بہرہ مند ہے، اور اس کے سامنے ملک ہے۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۱۱۴

[2] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۱۱۴

ہرگز خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا، "ولا یخشون احدًا الّا الله"
(احزاب۔۳۹)

ان کے آہنی ارادے میں اس کی اور اس کی ملامت و سرزنش ہرگز اثر انداز نہیں ہوتی، "ولا یخافون لومة لائم" (مائدہ۔۵۴)

جو کچھ ہاتھ سے چلا جائے اس پر ہرگز غمگین نہیں ہوتے اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے اس سے زیادہ دل بستگی نہیں رکھتے، اور یہ دونوں اصول اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ گذشتہ اور آیندہ کے لحاظ سے ان کا روحی سکون متزلزل نہ ہو، "لکیلا تأسوا علیٰ ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتاکم"
(حدید۔۲۳)

اور بالآخر سخت اور شدید حوادث کے مقابلہ میں ہرگز بھی سست اور کمزور نہیں ہوتے، اور کسی غم کو اپنے پاس بھٹکنے نہیں دیتے۔

گویا مومنین ہمیشہ اپنے دشمن سے برتر رہتے ہیں: "ولا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین"
(آل عمران۔۱۳۹)

مومن میدان حوادث میں خود کو تنہا نہیں سمجھتا، خدا کے لطف و حمایت کے ہاتھ کو ہمیشہ اپنے سر پر محسوس کرتا ہے اور فرشتوں کی مدد و نصرت کو اپنے وجود میں محسوس کرتا ہے۔

جب کہ بے ایمان لوگوں پر چھائی ہوئی بے چینی اور اضطراب ان کی گفتار و رفتار سے۔ خصوصاً جب حوادث کے طوفان چل رہے ہوں پورے طور پر محسوس ہوتا ہے۔

۲ مراتب ایمان کا سلسلہ

ایمان چاہے علم و آگاہی اور معرفت کے معنی میں ہو، اور چاہے حق کے سامنے تسلیم و قبولیت کی روح کے معنی میں، کئی درجے اور سلسلۂ مراتب رکھتا ہے، کیونکہ علم کے کئی درجے ہوتے ہیں اور قبول کرنے اور سر تسلیم خم کرنے کے بھی مختلف مراتب ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ عشق کے لگاؤ اور ایمان سے توأم محبت میں بھی فرق ہوتا ہے زیر بحث آیت جو یہ کہتی ہے کہ: "لیزدادوا ایماناً مع ایمانهم" بھی اسی حقیقت پر ایک تاکید ہے، اسی بنا پر ایک مومن آدمی کو ایمان کے کسی ایک مرحلہ پر ہرگز رکنا نہیں چاہیئے، وہ ہمیشہ خود گری کرتے ہوئے علم اور عمل کے ذریعہ بالاتر درجات کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

"ان الایمان عشر درجات بمنزلة السلم یصعد منه مرقاة

بعد مرقاة،

"ایمان کے دس درجے ہیں، مثل سیڑھی کے، جس کے ایک ایک درجہ پر اُس سے اُوپر جاتے ہیں"۔ [1]

ایک دوسری حدیث میں آپؑ ہی سے منقول ہے:

"خدا نے ایمان کو سات حصوں پر تقسیم کیا ہے، نیکی، صدق، یقین، رضا، وفا، علم اور حلم۔ پھر اسے لوگوں کے درمیان تقسیم کردیا، جو شخص ان تمام ساتوں حصوں کا حامل ہے، وہ کامل و معتمد مؤمن ہے۔ لوگوں میں سے بعض تو ایک حصہ رکھتے ہیں، بعض دو اور بعض تین، یہاں تک کہ بعض سات تک پہنچ جاتے ہیں"

اس کے بعد امامؑ نے مزید فرمایا:

"جو دو حصوں والے کے کندھے پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو اور جو ایک حصہ والے کے کندھے پر نہ رکھو، اور جو بات تین حصوں والے سے مربوط ہے اسے دو حصوں والے کے دوش پر نہ ڈالو کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا بار زیادہ ہو جائے اور وہ زحمت میں جا پڑیں"۔ [2]

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ چیز جو بعض سے نقل کی گئی ہے کہ ایمان میں کمی و زیادتی نہیں ہے، بہت ہی بے بنیاد سی بات ہے کیونکہ نہ تو وہ علمی واقعات کے ساتھ سازگار ہے اور نہ ہی اسلامی روایات کے ساتھ، لگا کھاتی ہے۔

۴۔ سکون کے دو اہم وسیلے

زیر بحث آیت کے ذیل میں ہم نے دو جملے پڑھے ہیں، جن میں سے ہر ایک "سکینہ" اور مؤمنین کے آرام و اطمینان کے عوامل کو بیان کرتا ہے، پہلا تو "وللہ جنود السماوات والارض" (آسمانوں اور زمین کا لشکر خدا کے لیے ہے اور اُسی کے حکم کے ماتحت ہے) کا جملہ ہے۔ اور اس کے بعد دوسرا "وکان اللہ علیماً حکیماً" (خدا علیم و حکیم ہے) کا جملہ ہے۔

پہلا جملہ انسان سے کہتا ہے کہ اگر تو خدا کے ساتھ ہو تو زمین و آسمان کی ساری قوتیں تیرے ساتھ ہیں، اور دوسرا جملہ اس سے یہ کہتا ہے کہ خدا تیرے احتیاجات، مشکلات اور مصیبتوں کو بھی جانتا ہے اور تیری جدوجہد تیری کوششوں اور اطاعت و بندگی سے بھی باخبر ہے اور ان دونوں اصولوں کے ہوتے ہوئے کیسے ممکن ہے کہ انسان کو سکون قلب اور اطمینان خاطر حاصل نہ ہو۔

---

[1] بحار الانوار، جلد ۶۹ ص ۱۶۵۔

[2] "کافی" جلد ۲ باب درجات الایمان۔ حدیث ۱۔

۵۔ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝

۶۔ وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّاۗنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۭ عَلَيْهِمْ دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝

۷۔ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

ترجمہ

۵۔ (اس فتح مبین سے ایک اور) مقصد یہ تھا کہ صاحب ایمان مردوں اور صاحب ایمان عورتوں کو (بہشت کے) باغوں میں داخل کرے، جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، اور وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور ان کے گناہوں کو بخش دے اور یہ خدا کے نزدیک بہت بڑی

کامیابی ہے۔

۶۔ اور (اس کے علاوہ) منافق مردوں اور منافق عورتوں، اور مشرک مردوں، اور مشرک عورتوں کو جو خدا کے بارے میں بُرے بُرے گمان رکھتے ہیں عذاب کرے، اور وہ بُرے حادثات، (جن کے وہ مومنین پر نازل ہونے کے منتظر ہیں) صرف انہی پر نازل ہوں گے، خدا نے ان پر غضب کیا ہے اور انھیں اپنی رحمت سے دُور رکھا ہے، اور جہنم ان کے لیے آمادہ و تیار ہے، اور یہ کتنا بُرا انجام ہے۔

۷۔ آسمانوں اور زمین کے لشکر صرف خدا کے لیے ہیں، اور خدا شکست ناپذیر اور حکیم ہے۔

تفسیر

فتح مبین کا ایک اور نتیجہ

شیعہ اور اہل سنت مفسرین کی ایک جماعت نے نقل کیا ہے، کہ جس وقت اس سورہ کی ابتدائی آیات میں پیغمبر اسلام کو فتح مبین، اتمام نعمت، ہدایت اور نصرت کی بشارت دی گئی، تو بعض مسلمانوں نے جو حوادث "حدیبیہ" سے دل تنگ اور پریشان تھے، عرض کیا،

• ھنیئًا لک یا رسول اللہ! لقد بین اللہ لک ما ذا یفعل بک، فما ذا یفعل بنا؟

فنزلت: "لیدخل المؤمنین والمؤمنات ...."

• اے خدا کے رسول یہ تمام خدائی نعمتیں آپ کو مبارک، خدا نے جو کچھ آپ کو دیا

ہے یاد دے گا اُسے تو اس نے بیان کر دیا ہے، ہمیں وہ کیا دے گا؟ اس موقع پر پہلی زیر بحث آیت نازل ہوئی، اور مومنین کو بشارت دی کہ ان کے لیے بھی بڑا ثواب اور اجر عظیم ہے۔[1]

بہر حال یہ آیات اسی طرح صلح "حدیبیہ" سے مربوط لوگوں کے افکار میں مختلف عمل، اور اس کے وزنی نتائج کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں، اور ہر گروہ کی سرنوشت کو اس عظیم آزمائش کی بھٹی میں مشخص کرتی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے کہ "اس عظیم فتح کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ صاحب ایمان مردوں اور عورتوں کو جنت میں داخل کرے، جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں" (لیدخل المؤمنین والمؤمنات جنات تجری من تحتها الانهار)۔

"وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے، اور یہ عظیم نعمت ہرگز ان سے چھینی نہیں جائے گی" (خالدین فیها)۔

"اس کے علاوہ یہ مقصد بھی تھا کہ" ان کے بُرے اعمال پر پردہ ڈال دے"۔ اور انہیں معاف کر دے" (ویکفر عنهم سیئاتهم)۔

"اور یہ خدا کے نزدیک ایک عظیم کامیابی ہے" (وکان ذالک عند الله فوزاً عظیماً)[2]

اس طرح سے خدا نے ان چار نعمتوں کے مقابلہ میں، جو فتح مبین میں اپنے پیغمبر کو دیں۔ دو عظیم نعمتیں مومنین پر بھی ارزانی فرمائیں، بہشت جاودانی اپنی تمام نعمتوں کے ساتھ، اور عفو و درگزر ان کی لغزشوں سے، یہ اس رُوحانی اطمینان اور سکون کے علاوہ ہے جو انہیں اس دنیا میں عطا فرمایا ہے، اور ان تینوں نعمتوں کا مجموعہ ایک فوز عظیم یعنی بہت بڑی کامیابی ہے، ان لوگوں کے لیے جو اس امتحان کی کٹھالی سے صحیح و سالم باہر نکل آئے۔

لفظ "فوز" جس کا قرآن مجید میں عام طور پر "عظیم" کی صفت کے ساتھ ذکر ہوا ہے، اور بعض اوقات "مبین" اور "کبیر" کے ساتھ بھی آیا ہے، مفردات میں راغب کے قول کے مطابق کامیابی اور خیرات کا سلامتی کے ساتھ حصول ہے۔ اور یہ اُسی صورت میں ہے کہ اس میں آخرت کی نجات بھی ہو، اگرچہ مادی دنیا کی نعمتوں کے کھو بیٹھنے کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔

ایک مشہور روایت کے مطابق جب امیر المومنین علی علیہ السلام کا فرقِ مبارک محراب عبادت میں

---

[1] تفسیر "مراغی" جلد ۲۶ ص ۸۵ و تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۱۰ ص ۳۶ و تفسیر روح المعانی جلد ۲۶ ص۔

[2] اس بیان کے مطابق "لیدخل" اور اسی طرح "یعذب" کا جملہ جو بعد والی آیت میں آئے گا "لیغفر" کے جملہ پر عطف ہے۔ مفسرین کے ایک گروہ نے منجملہ شیخ طوسی نے "تبیان" میں اور "طبرسی" نے "مجمع البیان" میں اور ابوالفتوح رازی نے اپنی تفسیر میں اسی معنی کو انتخاب کیا ہے، جبکہ ایک دوسرے گروہ نے "لیزدادوا ایماناً" پر عطف سمجھا ہے، حالانکہ نہ وہ اوپر والے شان نزول سے ہم آہنگ ہے اور نہ ہی کفار کی سزا اور مجازات کے ساتھ۔

خطا کار زمانہ " عبدالرحمن بن ملجم کی شمشیر سے شگافتہ ہوا تو آپ نے با آواز بلند فرمایا :

فزت ورب الکعبۃ :

" کعبہ کے رب کی قسم میں کامیاب ہوا "

(اور میرے سعادت نامہ پر میرے خون سے دستخط ہو گئے ہیں)

ہاں بعض اوقات پروردگار کے امتحانات ایسے سخت اور طاقت فرسا ہوتے ہیں جو کمزور ایمان والوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں اور ان کے دلوں کو الٹ دیتے ہیں۔ صرف سچے مومنین ہی جو سکینہ اور اطمینان کی نعمت سے بہرہ مند ہوتے ہیں مقابلہ میں ڈٹتے ہیں، اور وہ قیامت میں اس کے ثمرات و نتائج سے بھی بہرہ مند ہوں گے ، اور واقعاً یہ ایک فوز عظیم ہے۔

لیکن اس گروہ کے مقابلہ میں بے ایمان منافقین و مشرکین کا ایک گروہ تھا جن کی سرنوشت کی بعد والی آیت میں اس طرح تصویر کشی ہوئی ہے ، " دوسرا مقصد یہ ہے کہ خدا منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے " (و یعذب المنافقین والمنافقات والمشرکین والمشرکات)۔

" وہی کہ جو خدا کے متعلق برا گمان کرتے تھے " (الظانین باللہ ظن السوء)۔

ہاں ! پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کی مدینہ سے روانگی کے وقت یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ گروہ ہرگز صحیح و سالم مدینہ پلٹ کر نہیں آئے گا ، جیسا کہ اس سورہ کی آیہ ۱۲ میں بیان ہوا ہے۔

" بل ظننتم ان لن ینقلب الرسول والمومنون الی اھلیھم ابدا "

اور مشرکین بھی یہی گمان رکھتے تھے کہ محمد اس تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ ، اور کافی اسلحہ نہ رکھنے کی وجہ سے صحیح و سالم مدینہ کی طرف نہیں لوٹیں گے ، اور اسلام کا ستارہ بہت جلد غروب ہو جائے گا۔

اس کے بعد اس عذاب اور سزا کی وضاحت کرتے ہوئے چار عنوانوں کے تحت اس کی تشریح کرتا ہے۔

فرماتا ہے ، " حوادث اور برے اثرات و نتائج صرف اسی گروہ پر نازل ہوں گے " ؛ (علیھم دائرۃ السوء)۔[1]

" دائرۃ " لغت میں حوادث اور ان رویدادوں کے معنی میں ہے جو انسان کو پیش آتی ہیں ، چاہے وہ اچھی ہوں یا بری ، لیکن یہاں لفظ " سوء " کے ذکر کرنے کی وجہ سے نامطلوب حوادث ہی مراد ہیں۔

" دوسرا یہ کہ خدا نے ان پر غضب کیا ہے " ؛ (و غضب اللہ علیھم)۔

" اور انہیں خدا نے اپنی رحمت سے بھی دور کر دیا ہے " ؛ (و لعنھم)۔

---

[1] " سوء " بروزن " نوح " " صحاح اللغۃ " کے قول کے مطابق مصدری معنی رکھتا ہے ، اور " سوء " بروزن " کور " اسم مصدر کے معنی میں ہے ، لیکن بقول کشاف دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔

"اور آخر میں" ان کے لیے ابھی سے جہنم فراہم کر رکھی ہے۔ اور وہ کیا ہی بُرا انجام ہے۔" (واعدلهم جهنم وساءت مصيرا)۔ ا

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ میدان "حدیبیہ" میں زیادہ تر مسلمان مرد تھے، اور ان کے مقابل میں بھی منافق و مشرک مرد تھے، لیکن اوپر والی آیات میں قرآن نے اس فوزِ عظیم اور اس عذاب الیم میں عورتوں اور مردوں کو مشترک شمار کیا ہے۔ یہ اس بناء پر ہے کہ با ایمان مرد جو میدان جنگ میں حاضر ہوتے ہیں، صاحب ایمان عورتوں کی پشتیبانی کے بغیر اور اسی طرح منافق مرد منافق عورتوں کی ہمکاری کے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اصولی طور پر اسلام مردوں ہی کا دین نہیں ہے، کہ عورتوں کی شخصیت کو نظر انداز کر دے، لہٰذا ہر اس مقام پر جہاں عورتوں کے نام کا نہ ہونا کلام میں انحصاری مفہوم پیدا کرتا ہو وہاں عورتوں کا ذکر صراحت کے ساتھ پیش کرتا ہے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسلام کا تعلق تمام انسانوں سے ہے۔

آخری زیرِ بحث آیت میں ایک مرتبہ پھر خدا کی قدرت کی عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "آسمانوں و زمین کے لشکر اور فوجیں خدا ہی کے لیے ہیں۔ اور خدا عزیز و حکیم ہے۔" (وﷲ جنود السماوات والارض وكان الله عزيزا حكيما)۔

یہ بات ایک مرتبہ اہلِ ایمان کے مقامات اور نعمتوں کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے، اور ایک مرتبہ یہاں منافقین اور مشرکین کے عذاب اور سزاؤں کے ذیل میں آئی ہیں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ وہ خدا جس کے زیرِ فرمان آسمانوں اور زمین کے سارے لشکر ہیں وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے اور اس پر بھی اسے توانائی حاصل ہے۔ جس وقت اس کا دریائے رحمت موجزن ہوتا ہے تو جن میں لیاقت و شائستگی ہوتی ہے، وہ جہاں کہیں بھی ہوں ان کے شامل حال ہوتا ہے، اور جس وقت اس کے قہر و غضب کی آگ شعلہ زن ہو تو پھر کسی مجرم میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ فرار کر سکے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مومنین کے ذکر کے وقت خدا کی "علم و حکمت" کے ساتھ توصیف ہوئی ہے، جو مقام رحمت کے ساتھ مناسب ہے، لیکن منافق و مشرک لوگوں کے لیے خدا کی "قدرت و حکمت" کے ساتھ توصیف ہوئی ہے، جو مقام عذاب کے ساتھ مناسب ہے۔

"آسمانوں اور زمین کے لشکروں" سے کیا مراد ہے؟

یہ لفظ ایک وسیع معنی رکھتا ہے، جو خدا کے فرشتوں کے لشکروں کو بھی شامل ہے، اور "صاعقہ" "زلزلوں" "طوفانوں"، "سیلابوں" "امواج" اور دوسری غیر مرئی طاقتوں کے لشکروں کو بھی، جن سے ہم آگاہی نہیں رکھتے، کیونکہ یہ سب اللہ کے لشکر ہیں اور ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

ا "مصیرا" مختلف حالات کے معنی میں ہے، جس تک انسان یکے بعد دیگرے پہنچتا ہے۔

ایک نکتہ

خدا کے بارے میں سوءِ ظن کون لوگ رکھتے ہیں؟

"سوءِ ظن" کی کبھی تو اپنی طرف نسبت ہوتی ہے، اور کبھی دوسروں کی طرف اور کبھی خدا کی طرف" جیسا کہ "حسن ظن" بھی تین ہی حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔

اپنے متعلق جو سوءِ ظن ہوتا ہے اگر وہ افراط کی حد تک نہ پہنچے تو وہ تکامل وارتقار کی سیڑھی ہے اور وہ اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کی نسبت سخت گیر اور بال کی کھال نکالنے والا بن جائے، اور نیک اعمال سے پیدا ہونے والے عُجب و غرور کو روک دے۔

اسی بنار پر علی علیہ السلام مشہور خطبہ "ہمام" میں پرہیز گاروں کی تعریف و توصیف میں فرماتے ہیں۔

" فهم لانفسهم متهمون، ومن اعمالهم مشفقون، اذا زكى احد منهم خاف مما يقال له، فيقول: انا اعلم بنفسي من غيري وربي اعلم بي مني بنفسي، اللهم لا تؤاخذني بما يقولون، واجعلني افضل مما يظنون، واغفر لي ما لا يعلمون"

" وہ اپنے آپ کو متہم کرتے ہیں، اور اپنے اعمال سے ڈرتے ہیں، جس وقت ان میں سے کسی ایک کا تزکیہ و تعریف کی جائے، تو جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا ہے، اُس سے ڈرتا ہے اور کہتا ہے: میں اپنے بارے میں دوسروں کی نسبت زیادہ آگاہ ہوں اور میرا پروردگار میرے اعمال کو مجھ سے بھی زیادہ جانتا ہے، خداوندا! جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اس پر میرا مؤاخذہ نہ کرنا اور مجھے اس چیز سے، جو وہ میرے بارے میں خیال کرتے ہیں، برتر قرار دے، اور میری جن باتوں کا انھیں علم نہیں ہے وہ مجھے بخش دے۔"

لیکن اگر یہ "سوءِ ظن" لوگوں کے بارے میں ہو تو ممنوع ہے، مگر ایسے مواقع پر جبکہ فساد اور خرابی معاشرے پر غلبہ کرے، تو پھر خوش فہمی ٹھیک نہیں ہے۔ (انشاء اللہ اس کی تشریح و تفصیل سورۂ حجرات کی آیت ۱۲ کے ذیل میں آئے گی)

باقی رہا خدا کے بارے میں "سوءِ ظن" یعنی اس کے وعدہ کے بارے میں، اس کی بے پایاں رحمت و کرم کے بارے میں، تو وہ بہت ہی بُرا اور تباہ کر دینے والا ہے، اور ایمان کی کمزوری کی نشانی، بلکہ بعض اوقات تو ایمان کے نہ ہونے کی علامت ہے۔

قرآن بے ایمان افراد یا ضعیف الایمان لوگوں کے سوء ظن کو خصوصاً اجتماعی سخت قسم کے حوادث اور آزمائش کے طوفانوں کے ظہور کے موقع پر۔ بار بار ذکر کرتا ہے اکہ مومنین ایسے مواقع پر کس طرح پورے حسن ظن کے ساتھ، اور پروردگار کے لطف پر اطمینان کی وجہ سے ثابت قدم رہتے ہیں، لیکن ضعیف اور ناتواں افراد شکایت کرنے لگتے ہیں، جیسا کہ فتح حدیبیہ کی داستان میں منافقین اور ان کے ہم خیال لوگوں نے بھی سوء ظن کیا اور کہا، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے یار وانصار اس سفر میں جا تو رہے ہیں لیکن وہ اس سے واپس نہیں لوٹیں گے۔ گویا انہوں نے خدا کے وعدوں کو فراموش کر دیا، یا اس کے بارے میں بدگمان تھے۔

اس کا ایک واضح نمونہ خصوصیت کے ساتھ جنگ احزاب میں۔ جب کہ مسلمان سخت دباؤ کی حالت میں تھے۔ ظاہر ہوا، خدا نے ایک گروہ کے بُرے گمانوں کی سخت مذمت کی،

• اذ جاءوکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون باللہ الظنونا ھنالک ابتلی المؤمنون وزلزلوا زلزالاً شدیداً،

"وہ وقت یاد کرو جب لشکر احزاب اُوپر کی طرف سے بھی اور نیچے کی طرف سے بھی شہر میں داخل ہو گیا (اور مدینہ کا محاصرہ کر لیا) اور اس وقت کو (یاد کرو) جب شدت وحشت سے آنکھیں خیرہ ہو گئیں، اور جانیں لبوں تک آگئی تھیں، اور تم خدا کے بارے میں بُرے بُرے گمان کر رہے تھے، اس موقع پر مومنین کی آزمائش ہو گئی اور وہ ہل کر رہ گئے۔"

(احزاب: آیت ۱۰-۱۱)

یہاں تک کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۴ میں ایسے گمانوں کو "ظن الجاھلیۃ" (زمانہ جاہلیت کے گمان) کہا ہے۔

بہر حال خدا سے اور اس کے رحمت و کرم اور لطف وعنایت کے وعدہ کے متعلق حسن ظن ایمان کی اہم نشانی، اور نجات وسعادت کے موثر وسائل میں سے ہے۔

یہاں تک کہ رسولِ خدا سے ایک حدیث میں آیا ہے۔

• لیس من عبد یظن باللہ خیراً الا کان عند ظنہ بہ!

"کوئی بندہ خدا کے بارے میں حسن ظن نہیں رکھتا مگر یہ کہ خدا اس کے گمان کے مطابق اس سے سلوک کرتا ہے۔"[1]

ایک دوسری حدیث میں امام علی ابن موسیٰ الرضاؑ سے آیا ہے۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۷، صفحہ ۳۹۴۔

"احسن باللہ الظن، فان اللہ عزوجل یقول انا عند ظن عبدی المؤمن بی، ان خیر فخیر، و ان شر فشر."

"خدا کے ساتھ اپنے ظن و گمان کو اچھا رکھو کیونکہ خداوند عزوجل فرماتا ہے: میں اپنے بندہ مومن کے ظن و گمان کے پاس ہوتا ہوں، اگر وہ میرے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہو تو میں اس سے اچھا سلوک کرتا ہوں اور اگر وہ بُرا گمان رکھتا ہو، تو بُرا سلوک ہوگا۔"[1]

"آخر میں ایک دوسری حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے۔"

"ان حسن الظن باللہ عزوجل ثمن الجنة."

"خدا کے ساتھ حسن ظن رکھنا جنّت کی قیمت ہے۔"[2]

اس سے زیادہ سہل اور آسان قیمت اور کیا ہوگی؟ اور اس سے زیادہ قیمتی مال و متاع اور کونسا ہوگا؟

---

[1]، [2] بحار الانوار جلد ۷۰، صفحہ ۳۶۵۔

۸۔ اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا ۝

۹۔ لِّتُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُعَزِّرُوۡهُ وَتُوَقِّرُوۡهُ ؕ وَتُسَبِّحُوۡهُ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا ۝

۱۰۔ اِنَّ الَّذِيۡنَ يُبَايِعُوۡنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوۡنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوۡقَ اَيۡدِيۡهِمۡ ۚ فَمَنۡ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنۡكُثُ عَلٰى نَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ اَوۡفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيۡهُ اللّٰهَ فَسَيُؤۡتِيۡهِ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ۝

ترجمہ

۸۔ ہم نے تجھے ایک گواہ، بشارت دینے والے اور ڈرانے والے کے عنوان سے بھیجا ہے۔

۹۔ تا کہ تم لوگ خدا اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ، اور اس کا دفاع کرو اور اس کا احترام کرو، اور صبح و شام خدا کی تسبیح کرو۔

۱۰۔ جو لوگ تیری بیعت کرتے ہیں وہ حقیقت میں خدا ہی کی بیعت کرتے ہیں خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے، پس جو شخص بھی پیمان شکنی کرے گا، وہ اپنے ہی نقصان میں پیمان شکنی کرے گا اور جو شخص اس عہد کے لیے جو اس نے خدا سے باندھا ہے، وفا کرے گا تو وہ اسے بہت جلد ایک عظیم اجر عطا کرے گا۔

تفسیر

پیغمبرؐ کی حیثیت کا استحکام اور لوگوں کی اس کے بارے میں ذمہ داریاں

ہم بیان کرچکے ہیں کہ صلح حدیبیہ پر بعض نادانوں نے سخت تنقید کی، یہاں تک کہ پیغمبرؐ کے بارے میں ان کے سامنے ایسی باتیں کی گئیں، جن سے آپ کی بے حرمتی ہوتی تھی، ان باتوں کا مجموعی طور پر تقاضا یہی تھا کہ پیغمبرؐ کی عظمت و مقام اور مرتبہ وحیثیت کے بارے میں دوبارہ تاکید کی جائے۔

لہٰذا پہلی زیر بحث آیت میں پیغمبرؐ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: "ہم نے تجھے ایک گواہ اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے"۔ (انا ارسلناک شاھدًا ومبشرًا ونذیرًا)۔

یہ تین عظیم اوصاف اور تین عمدہ مقامات پیغمبرؐ کے اہم ترین مراتب اور مقامات میں سے ہیں، "گواہ ہونا" "بشیر ہونا" اور "نذیر ہونا" گواہ تمام امت مسلمہ پر، بلکہ ایک معنی کے لحاظ سے تمام امتوں پر گواہ، جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت ۴۱ میں آیا ہے، فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بک علٰی ھٰؤلاء شھیدًا: "اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ان کے اعمال پر گواہ لائیں گے، اور تجھے ان سب گواہوں پر گواہ بنائیں گے"۔

اور سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۵ میں فرماتا ہے: وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ والمؤمنون: "کہہ دے کہ تم عمل کرو، خدا اور اس کا رسول اور مومنین (ائمہ معصوم) تمہارے عمل کو دیکھتے ہیں"۔

اصولی طور پر ہر انسان بہت سے گواہ رکھتا ہے۔

سب سے پہلے تو خداوند عالم ہے جو عالم الغیب والشہادہ ہے، وہ ہمارے تمام اعمال اور ہماری نیتوں تک کو دیکھ رہا ہے۔

اس کے بعد وہ فرشتے ہیں جو انسان کے اعمال کو لکھنے پر مامور ہیں، جیسا کہ سورۂ ق کی آیت ۲۱ میں اشارہ ہوا ہے وجاءت کل نفس معھا سائق وشھید:

اس کے بعد انسانی جسم کے اعضاء وجوارح ہیں، یہاں تک کہ اس کے بدن کی جلد بھی گواہی دے گی،

" یوم تشهد علیهم السنتهم وایدیهم وارجلهم بما کانوا یعملون "

" اس دن ان کی زبانیں، ہاتھ اور پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ "

(نور۔ ۲۴)

" وقالوا لجلودهم لم شهدتم علینا قالوا انطقنا الله الذی انطق کل شیء "

" وہ اپنے بدن کی جلد سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی، تو وہ کہیں گے، وہ خدا جس نے ہر موجود کو قوت گویائی عطا کی ہے، اسی نے ہمیں بھی گویائی دی ہے، تاکہ ہم گواہی دیں۔ "

(حٰم سجدہ۔ ۲۱)

" زمین " بھی گواہوں میں سے ایک گواہ ہے جیسا کہ سورۂ زلزال میں آیا ہے،

" یومئذ تحدث اخبارها "

بعض روایات کے مطابق " زمانہ " بھی اس دن گواہوں کی صف میں ہوگا۔ ایک روایت میں علی علیہ السلام سے منقول ہے۔

" ما من یوم یمر علی بنی آدم الا قال له ذالک الیوم انا یوم جدید وانا علیک شهید، فافعل فی خیرا، واعمل فی خیرا، اشهد لک به یوم القیامة، فانک لن ترانی بعد هذا ابدا "

" کوئی دن آدم کے بیٹے پر نہیں گزرتا مگر یہ کہ وہ اس سے کہتا ہے: میں نیا دن ہوں، میں تیرے بارے میں گواہی دوں گا، تو مجھ میں نیک کام کر اور عمل خیر بجا لا، تاکہ میں قیامت کے دن تیرے فائدے میں گواہی دوں، کیونکہ تو اس کے بعد مجھے کبھی بھی نہیں دیکھے گا "۔[1] [2]

بلاشک خدا کی تنہا گواہی ہی کافی ہے، لیکن گواہوں کا متعدد ہونا مزید اتمام حجت کا باعث بھی ہے اور انسانوں میں زیادہ قوی تربیتی اثر بھی رکھتا ہے۔

بہرحال قرآن مجید نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امور کو۔ جو کہ مسئلہ شہادت و بشارت و نذارت ہیں۔ تین عمدہ اوصاف کے عنوانوں کے ساتھ بیان کیا ہے، تاکہ یہ ان وظائف اور ذمہ داریوں کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہو، جو بعد والی آیت میں بیان ہوئی ہیں۔

بعد والی آیت میں پیغمبر کے گزشتہ بیان کردہ اوصاف کے ایک مقصد اور نتیجہ کے عنوان سے پانچ

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۲

[2] " قیامت کی عدالت کے گواہوں " کے بارے میں ایک بحث ہم نے سورۂ حٰم سجدہ کی آیت ۲۰-۲۱ کے ذیل میں بھی کی ہے۔

اہم احکام بیان ہوئے ہیں، جن سے دو حکم تو خدا کی اطاعت اور اس کی تسبیح و تنزیہ میں ہیں، اور تین احکام مقام پیغمبر کی تعظیم، اور ان کی اطاعت و دفاع کے بارے میں ہیں، فرماتا ہے: "مقصد یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ، اور دشمنوں کے مقابلہ میں اس کا دفاع کرو، اور اس کی عزت و احترام و تکریم کرو اور صبح و شام خدا کی تسبیح و تقدیس کرو" (لتؤمنوا باللہ ورسولہ وتعزروہ وتوقروہ وتسبحوہ بکرۃ واصیلا)۔

"تعزروہ" "تعزیر" کے مادہ سے دراصل "منع" کے معنی میں ہے، اس کے بعد دشمن کے مقابلہ میں ہر قسم کے دفاع اور نصرت و مدد کرنے کرنے پر اطلاق ہونے لگا، بعض سزاؤں کو بھی، جو گناہ سے روکتی ہیں، تعزیر کہا جاتا ہے۔

"توقروہ" "توقیر" کے مادہ سے جس کی اصل "وقر" ہے سنگینی کے معنی میں ہے، اس بنا پر یہاں توقیر تعظیم و تکریم کے معنی میں ہے۔

اس تفسیر کے مطابق ضمیریں جو "تعزروہ" اور "توقروہ" میں آئی ہیں وہ پیغمبر کی ذات کی طرف لوٹتی ہیں۔ اور اس کا مقصد دشمن کے مقابلہ میں آپ کی حمایت اور دفاع کرنا اور آپ کی تعظیم و تکریم کرنا ہے، (اس تفسیر کو شیخ طوسی نے "تبیان" میں اور طبرسی نے "مجمع البیان" میں اور بعض دوسرے علماء نے اختیار کیا ہے۔

لیکن مفسرین کی ایک جماعت[1] کا نظریہ یہ ہے، کہ آیت کی تمام ضمیریں خدا کی طرف لوٹتی ہیں، اور تعزیر و توقیر سے مراد یہاں خدا کے دین کی نصرت و مدد کرنا ہے اور اس کی اور اس کے دین کی تعظیم و تکریم کرنا ہے، اس تفسیر کے اختیار کرنے میں ان کی دلیل آیت میں موجود تمام ضمیروں کا ہم آہنگ ہونا ہے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اولاً: "تعزیر" کا اصلی معنی دشمن کے مقابلہ میں دفاع کرنا اور اُسے روکنا ہے، جو خدا کے بارے میں مجازی صورت کے علاوہ صحیح نہیں ہے، اور اس سے زیادہ اہم آیت کا شان نزول ہے، جو حدیبیہ کے واقعہ کے بعد نازل ہوئی ہے، جبکہ بعض لوگوں نے پیغمبر کے اعلیٰ مقام اور مرتبہ کے سلسلے میں بے حرمتی کی تھی، اور آیت پیغمبر کے سامنے مسلمانوں کو ان کے وظائف اور ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی۔

علاوہ ازیں اس بات کو بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ یہ آیت گذشتہ آیت کے ایک نتیجہ کے عنوان سے ہے، جو پیغمبر کی "شاھد" و "مبشر" و "نذیر" کے عنوان سے تعریف و توصیف کرتی ہے، اور یہ امر ان احکام کے لیے جو بعد والی آیت میں بیان ہوئے ہیں سرزمین ہموار کرتی ہے گویا تمہید کے طور پر ہے۔

---

[1] "زمخشری" نے "کشاف" میں "آلوسی" نے "روح المعانی" میں "فیض کاشانی" نے "صافی" میں اور علامہ طباطبائی نے "المیزان" میں اس تفسیر کو قبول کیا ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں "بیعت رضوان" کے مسئلہ کی طرف ایک مختصر سا اشارہ ہے، جو اسی سورہ کی آیت نمبر ۱۸ میں زیادہ تفصیل کے طور پر آیا ہے۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ مشہور تاریخوں کے مطابق آپ اس خواب کے بعد جو آپ نے دیکھا تھا ۱۴۰۰ افراد کے ساتھ عمرہ انجام دینے کے ارادہ سے مدینہ سے نکلے، لیکن مکہ کے قریب مشرکین نے آپ کو اور آپ کے اصحاب کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کا مصمم ارادہ کر لیا، پیغمبر اور آپ کے اصحاب سرزمین "حدیبیہ" میں ٹھہر گئے اور آپ کے اور قریش کے درمیان سفیروں کا آنا جانا ہوا یہاں تک کہ صلح حدیبیہ کی قرارداد انجام پائی۔

ان امور میں ایک مرتبہ عثمان مامور ہوئے کہ وہ اہل مکہ تک یہ پیغام پہنچائیں کہ آپ جنگ کے ارادہ سے نہیں آئے اور آپ کا ارادہ صرف خانۂ خدا کی زیارت ہے، لیکن مشرکین نے وقتی طور پر عثمان کو روک لیا، اور اسی سبب سے مسلمانوں کے درمیان قتل عثمان کی خبر پھیل گئی، اور اگر اس طرح کی بات صحیح ہوتی تو یہ قریش کی طرف سے اعلان جنگ کی دلیل ہوتی، لہٰذا پیغمبر نے فرمایا کہ جب تک ہم اس قوم سے نمٹ نہ لیں ہم یہاں سے نہیں جائیں گے، اور اس اہم امر پر تاکید کے لیے لوگوں کو دعوت دی کہ آپ سے تجدید بیعت کریں، مسلمان وہاں پر موجود ایک درخت کے نیچے جمع ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کی، کہ ہرگز میدان سے نہیں بھاگیں گے، اور جس حد تک ان میں تاب وتواں ہے، دشمن کے قلع قمع کرنے میں کوششیں کریں گے۔

اس بات کی خبر مشرکین مکہ کے کانوں تک پہنچی تو اس نے ان کے دلوں میں ایک رعب اور وحشت پیدا کر دی اور اسی سبب سے وہ اس ناپسندیدہ صلح کے لیے تیار ہو گئے۔

اس بیعت کو اس بنا پر "بیعت رضوان" کہا جاتا ہے۔

کیونکہ اسی سورہ کی آیت ۱۸ میں آیا ہے:

"لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ"

"خدا مومنین سے — جب وہ اس درخت کے نیچے تیری بیعت کر رہے تھے — راضی ہو گیا۔"

بہرحال قرآن مجید زیر بحث آیت میں کہتا ہے:

"جو لوگ تیری بیعت کرتے ہیں حقیقت میں وہ خدا کی بیعت کرتے ہیں، اور خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے"

(ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم)۔

"بیعت" کسی شخص کی فرمانبرداری اور اطاعت کے لیے عہد و پیمان باندھنے کے معنی میں ہے، اور یہ رسم چلی آرہی تھی کہ جو شخص اطاعت کا عہد و پیمان باندھتا تھا تو وہ اپنا ہاتھ پیشوا اور رہبر کے ہاتھ میں دے دیتا تھا، اور وفاداری کے عہد و پیمان کا اس طریقہ سے اظہار کیا کرتا تھا۔

اور چونکہ "معاملہ اور بیع" میں ہاتھ دیتے تھے، اور معاملہ کی قرارداد باندھتے تھے، اس لیے

"بیعت" کا لفظ ان عہد و پیمان پر اطلاق ہونے لگا، خصوصاً یہ کہ وہ اپنے عہد و پیمان میں گویا اپنی جان کا اس شخص کے ساتھ معاملہ کر رہے ہیں۔

اور یہیں سے " ید اللہ فوق ایدیھم" (خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے) کا معنی واضح ہو جاتا ہے۔ یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر کی بیعت ایک بیعت الٰہی ہے۔ گویا خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر قرار پایا۔ نہ صرف پیغمبر سے بلکہ انھوں نے یہ خدا سے بیعت کی ہے اور اس قسم کے کنایے عربی زبان میں معمولات میں سے ہیں۔

اس بناء پر جن لوگوں نے اس جملہ کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ خدا کی قدرت ان کی قدرت سے مافوق ہے" یا "خدا کی نصرت و مدد لوگوں کی نصرت و مدد سے برتر ہے" اور اسی قسم کی دوسری تفسیریں آیت کے شانِ نزول اور اس کے مفاد سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں، اگرچہ یہ مطلب بذاتِ خود ایک صحیح مطلب ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے، "جو شخص نقضِ عہد اور پیمان شکنی کرے گا، درحقیقت وہ اپنے ہی نقصان میں پیمان شکنی کرے گا اور اپنے عہد و پیمان کو توڑے گا" (فمن نکث فانما ینکث علی نفسہ)۔

اور جو شخص اس عہد و پیمان کے مقابلہ میں جو اس نے خدا کے ساتھ باندھا ہے، وفادار رہے گا اور بیعت کا حق ادا کرے گا تو خدا اُسے اجرِ عظیم دے گا (ومن اوفیٰ بما عاھد علیہ اللہ فسیؤتیہ اجرًا عظیمًا)۔[1]

"نکث" (بروزن مکث) کے مادہ سے کھولنے اور اُلٹا بٹ دینے کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد پیمان شکنی، اور نقضِ عہد کے لیے استعمال ہونے لگا۔[2]

اس آیت میں قرآن مجید تمام بیعت کرنے والوں کو خبردار کر رہا ہے، کہ اگر وہ اپنے عہد و پیمان پر برقرار رہیں تو ان کے لیے اجرِ عظیم ہوگا، لیکن اگر وہ اس کو توڑ دیں، تو اس کا نقصان خود انہیں کو ہوگا وہ یہ خیال نہ کریں کہ وہ خدا کو کوئی نقصان پہنچاتے ہیں، بلکہ معاشرے کی بقاء اور اپنی عظمت و قدرت و قوت یہاں تک کہ پیمان شکنی کی وجہ سے اپنے وجود کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔

ایک حدیث میں امیر المومنین علی علیہ السلام سے روایت ہے:

---

[1] اس بات پر توجہ رکھنی چاہیئے کہ اوپر والی آیت میں "علیہ" خلاف معمول "ھا" کی پیش کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی توجیہ میں اس طرح بیان کیا ہے۔ کہ یہ وہی "ھو" کی "ھا" ہے۔ جو اصل میں مضموم ہے اور "واؤ" کے حذف ہونے کے بعد کبھی مضموم آتی ہے۔ جیسے "لہ" اور "عنہ" اور کبھی اس بناء پر کہ اس کے پہلے "یا" ہے مکسور آتی ہے مثلاً "علیہ" لیکن چونکہ زیر بحث آیت میں اس کے بعد لفظ "اللہ" آیا ہے اس لیے مضموم پڑھی گئی ہے تاکہ اللہ میں جو "لام" ہے۔ اس کی تفخیم کے ساتھ زیادہ سازگار رہو۔

[2] "نکث" نون کی زبر کے ساتھ مصدری معنی رکھتا ہے اور "نکث" نون کی کسرہ کے ساتھ اسم مصدر کے معنی رکھتا ہے۔

"ان فی النار لمدینة یقال لها الحصینة افلا تسئلونی ما فیها؟ فقیل له: ما فیها یا امیر المؤمنین؟ قال فیها ایدی الناکثین!"

"جہنم میں "حصینہ" نامی ایک شہر ہے، کیا تم مجھ سے نہیں پوچھو گے کہ اس شہر میں کیا ہے؟ کسی نے عرض کیا: اے امیر المومنین اس شہر میں کیا ہے؟ فرمایا: پیمان شکنی کرنے والوں اور عہد توڑنے والوں کے ہاتھ ہیں"۔

اس سے واضح ہے کہ عہد شکنی و نقض بیعت اسلام میں کس قدر قبیح ہے[1]

اسلام میں بیعت کا موضوع یہاں تک کہ قبل از اسلام اس کا وجود، اس کی کیفیت اور اس کے بارے میں شرعی احکام ایک طویل بحث چاہتے ہیں جو انشاء اللہ اسی سورہ کی آیت ۱۰ میں آئے گی۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۱۲۹۔

۱۱۔ سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَا أَمْوَالُنَا وَأَهْلُونَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۚ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۚ بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ○

۱۲۔ بَلْ ظَنَنْتُمْ أَنْ لَنْ يَنْقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزُيِّنَ ذَٰلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُورًا ○

۱۳۔ وَمَنْ لَمْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ فَإِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَعِيرًا ○

۱۴۔ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ○

ترجمہ

۱۱۔ عنقریب بادیہ نشین اعراب میں سے پیچھے رہ جانے والے (عذر تراشی کرتے ہوئے) کہیں گے کہ ہمارے اموال اور گھر والوں کی حفاظت نے ہمیں اپنی طرف مشغول رکھا، (اور ہم سفر حدیبیہ میں آپ کے ہمراہ نہ جا سکے) پس

آپ ہمارے لیے طلب مغفرت کیجیے، یہ اپنی زبان سے وہ بات کہہ رہے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے کہہ دے: کون ایسا ہے جو خدا سے تمہیں بچا سکے اگر وہ تمہارے لیے نقصان کا ارادہ کرے، یا کون ہے جو اس نفع کو روک سکے جسے پہنچانے کا وہ ارادہ کرے، اور خدا ان تمام اعمال سے جو تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے۔

۱۲۔ بلکہ تم نے یہ گمان کر لیا تھا کہ پیغمبر اور مومنین ہرگز اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے اور یہ غلط خیال تمہارے دلوں میں زینت پا گیا تھا اور تم نے بدگمانی سے کام لیا اور آخر کار تم ہلاک ہوئے۔

۱۳۔ اور وہ شخص جو خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان نہیں لایا (اس کی سرنوشت دوزخ ہے) کیونکہ ہم نے کافروں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔

۱۴۔ آسمانوں اور زمین کی مالکیت اور حاکمیت خدا ہی کے لیے ہے جسے وہ چاہتا ہے (اور شائستہ دیکھتا ہے) بخش دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے عذاب کرتا ہے، اور خدا غفور و رحیم ہے۔

تفسیر

پیچھے رہ جانے والوں کی عذر تراشی

گزشتہ آیات کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ پیغمبرؐ ایک ہزار چار سو مسلمانوں کے ساتھ مدینہ سے عمرہ کے

ارادہ سے مکّہ کی طرف روانہ ہوئے۔

پیغمبرؐ کی طرف سے بادیہ نشین قبائل میں اعلان ہوا کہ وہ بھی سب کے سب اس سفر میں آپؐ کے ساتھ چلیں لیکن ضعیف الایمان لوگوں کے ایک گروہ نے اس حکم سے روگردانی کی، اور ان کا تجزیہ یہ تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان اس سفر سے صحیح وسالم بچ کر نکل آئیں، حالانکہ کفار قریش پہلے ہی ہیجان واشتعال میں تھے، اور انھوں نے اُحد واحزاب کی جنگیں مدینہ کے قریب مسلمانوں پر ٹھونس دی تھیں، اب جبکہ یہ چھوٹا سا گروہ بغیر ہتھیاروں کے اپنے پاؤں سے چل کر مکّہ کی طرف جارہا ہے، گویا بھڑوں کے چھتہ کے پاس خود پہنچ رہا ہے، تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنے گھروں کی طرف واپس لوٹ آئیں گے؟!

لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمان کامیابی کے ساتھ اور قابل ملاحظہ امتیازات کے ہمراہ جو انھوں نے صلح حدیبیہ کے عہد وپیمان سے حاصل کیے تھے، صحیح وسالم مدینہ کی طرف پلٹ آئے ہیں۔ اور کسی کے نکسیر تک بھی نہیں پھوٹی، تو انھوں نے اپنی عظیم غلطی کا احساس کیا اور پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ کسی طرح کی عذر خواہی کرکے اپنے فعل کی توجیہ کریں، اور پیغمبرؐ سے استغفار کا تقاضا کریں۔

لیکن اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور ان کے اعمال سے پردہ اٹھا دیا اور انھیں رسوا کیا۔

اس طرح سے پہلی آیات میں منافقین اور مشرکین کی سرنوشت کا ذکر کرنے کے بعد، یہاں پیچھے رہ جانے والے ضعیف الایمان لوگوں کی کیفیت کا بیان ہو رہا ہے، تاکہ اس بحث کی کڑیاں مکمل ہو جائیں۔

فرماتا ہے: عنقریب بادیہ نشین اعراب میں سے پیچھے رہ جانے والے عذر تراشی کرتے ہوئے کہیں گے: ہمارے مال ومتاع اور بال بچوں کی حفاظت نے ہمیں اپنی طرف مائل رکھا، اور ہم اس پُر برکت سفر میں آپ کی خدمت میں نہ رہ سکے، اب ہمارے عذر کو قبول کرتے ہوئے ہمارے لیے طلب بخشش کیجیے: (سیقول لک المخلفون من الاعراب شغلتنا اموالنا واھلونا فاستغفرلنا)۔

"وہ اپنی زبان سے ایسی چیز کہہ رہے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے" (یقولون بالسنتھم مالیس فی قلوبھم)

وہ تو اپنی توبہ تک میں بھی مخلص نہیں ہیں۔

لیکن ان سے کہہ دے، خدا کے مقابلہ میں۔ اگر وہ تمھیں نقصان پہنچانا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ وہ تمھارا دفاع کرسکے، اور اگر وہ تمھیں کچھ نفع پہنچانا چاہے تو کس میں طاقت ہے، کہ اُسے روک سکے: (قل فمن یملک لکم من اللّٰہ شیئًا ان اراد بکم ضرًّا او اراد بکم نفعًا)

خدا کے لیے یہ بات کسی طرح بھی مشکل نہیں ہے، کہ تمھیں تمھارے امن وامان کے گھروں میں، بیوی بچوں اور مال ومنال کے پاس، انواع واقسام کی بلاؤں اور مصائب میں گرفتار کردے، اور اس کے لیے یہ بھی کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ دشمنوں کے مرکز میں اور مخالفین کے گروہ میں تمھیں ہر قسم کے گزند سے محفوظ رکھے، یہ تمھاری قدرت خدا کے بارے میں

جہالت اور بے خبری ہے جو تمہاری نظر میں اس قسم کے انکار کو بجا دیتی ہے۔

ہاں! "خدا ان تمام اعمال سے جنہیں تم انجام دیتے ہو باخبر اور آگاہ ہے": (بل کان اللہ بما تعملون خبیرًا)۔

بلکہ وہ تو تمہارے سینوں کے اندر کے اسرار اور تمہاری نیتوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ عذر اور بہانے واقعیت اور حقیقت نہیں رکھتے اور جو اصل حقیقت اور واقعیت ہے، وہ تمہارا شک و تردد، خوف و خطر اور ضعف ایمان ہے، اور یہ عذر تراشیاں خدا سے مخفی نہیں رہتیں، اور یہ ہرگز تمہاری سزا کو نہیں روکیں گی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آیات کے لب و لہجہ سے بھی اور تواریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات پیغمبرؐ کی مدینہ کی طرف بازگشت کے دوران نازل ہوئیں، یعنی اس سے پہلے کہ پیچھے رہ جانے والے آئیں اور عذر تراشی کریں، ان کے کام سے پردہ اٹھا دیا گیا اور انہیں رسوا کر دیا۔

ؕ ؕ ؕ

اس کے بعد مزید وضاحت کے لیے مکمل طور پر پردے ہٹا کر مزید کہتا ہے: "بلکہ تم نے تو یہ گمان کر لیا تھا کہ پیغمبر اور مومنین ہرگز اپنے گھر والوں کی طرف پلٹ کر نہیں آئیں گے": (بل ظننتم ان لن ینقلب الرسول والمؤمنون الی اھلیھم ابدًا)

ہاں! اس تاریخی سفر میں تمہارے شریک نہ ہونے کا سبب اموال اور بیوی بچوں کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ اس کا اصل عامل وہ سوء ظن تھا جو تم خدا کے بارے میں رکھتے تھے، اور اپنے غلط اندازوں کی وجہ سے یہ سوچتے تھے کہ یہ سفر پیغمبر اور مومنین کے ختم ہونے کا سفر ہے اور اس سے کنارہ کشی کرنی چاہیے۔

ہاں! "یہ غلط خیال اور شیطانی وسوسے تمہارے دلوں میں زینت پا چکے تھے" (وزین ذالک فی قلوبکم)۔

"اور یہ تم نے برا گمان کیا" (وظننتم ظن السوء)۔

کیونکہ تم یہ سوچ رہے تھے کہ خدا نے پیغمبر کو اس سفر میں بھیج کر انہیں دشمن کے چنگل میں دے دیا ہے، اور ان کی حمایت نہیں کرے گا۔

"اور انجام کار تم ہلاک ہو گئے": (وکنتم قومًا بورًا)۔

اس سے بدتر ہلاکت اور کیا ہوگی کہ تم اس تاریخی سفر میں شرکت، بیعت رضوان، اور دوسرے افتخارات و اعزازات سے محروم ہو گئے، اور اس کے پیچھے عظیم رسوائی تھی اور آئندہ کے لیے آخرت کا دردناک عذاب ہے، ہاں تمہارے دل مردہ تھے اس لیے تم اس قسم کی صورت احوال میں گرفتار ہوئے۔

چونکہ یہ ضعیف الایمان یا منافق ایسے ڈرپوک، آرام طلب اور طبعاً جنگ اور ہر قسم کے مقابلہ سے بھاگنے والے آدمی

ہیں لہٰذا وہ حوادث کے بارے میں جو بھی تجزیہ وتحلیل کرتے ہیں وہ کسی طرح بھی واقعیت کے مطابق نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود وہ ان کی نظروں میں بہت ہی کشش رکھتی ہے۔

اور اس طرح سے خوف اور عافیت طلبی، اور ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے فرار، برے گمانوں کو ان کی نظر میں حقیقت و واقعیت کے طور پر جگہ دیتے ہیں، وہ تمام چیزوں کے بارے میں بدبین ہی یہاں تک کہ پیغمبر خدا اور خدا کے بارے میں بھی۔

نہج البلاغہ میں "مالک اشتر" کے نام حکم میں یہ آیا ہے:

"ان البخل والجبن والحرص غرائز شتی یجمعها سوء الظن باللہ:

"بخل" بزدلی، اور حرص ایسی مختلف قسم کی مذموم صفات ہیں جو سب کی سب خدا کے بارے میں سوء ظن میں جمع ہیں۔[1]

رُوداد حدیبیہ اور زیر بحث آیات اسی معنی کا ظہور عینی ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں، کہ پروردگار کے بارے میں سوء ظن، کس طرح سے بخل و حرص اور خوف جیسے بُرے صفات کو حاصل کر لیتا ہے۔

⁂

چونکہ اس قسم کی غلط صفات کا سرچشمہ بعض اوقات عدم ایمان ہوتا ہے لہٰذا بعد والی آیت میں کہتا ہے: "جو شخص خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان نہیں لایا اس کی تقدیر جہنم کی آگ ہے، کیونکہ ہم نے کافروں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے" (ومن لم یؤمن باللہ ورسولہ فانا اعتدنا للکافرین سعیرا)۔[2]

⁂

انجام کار آخری زیر بحث آیت میں کفار اور منافقین پر خدا کے عذاب دینے کی قدرت کے اثبات کے لیے فرماتا ہے: "آسمانوں اور زمین کی مالکیت اور حاکمیت خدا کے لیے ہے، جسے چاہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہے عذاب کرتا ہے اور خدا غفور و رحیم ہے" (وللہ ملک السماوات والارض یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء وکان اللہ غفورا رحیما)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہاں مغفرت اور بخشش کے مسئلہ کو عذاب کے مسئلہ پر مقدم رکھا ہے، اور آیت کے آخر میں پھر دوبارہ غفران اور رحمت الٰہی پر تاکید کی گئی ہے، کیونکہ ان تمام دھمکیوں اور ڈراووں کا مقصد تربیت ہے اور مسئلہ تربیت کا تقاضا یہ ہے کہ گنہگاروں اور کافروں تک کے لیے بھی بازگشت کی راہ کھلی ہے، خاص طور پر جبکہ ان منفی اعتراضات اور تنقیدوں میں سے زیادہ کا سرچشمہ جہالت اور بے خبری ہے اور اس قسم کے افراد کے سامنے بخشش کی امید میں اضافہ کرنا

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۵۳۔

[2] آیت کے الفاظ کی روانی کا تقاضا یہ ہے کہ "انا اعتدنا لھم سعیرا" کہا جائے لیکن خاص طور پر ضمیر کو ہٹا کر اس کی بجائے اسم ظاہر یعنی "الکافرین" کہا گیا ہے تاکہ اس خرابی کو بیان کیا جائے جو مسئلہ کفر ہے۔

چاہیئے کہ شاید وہ راہ راست پر آجائیں۔

ایک نکتہ

گناہ کی توجیہ کرنا ایک عام بیماری ہے

گناہ چاہے جتنا بھی سنگین ہو وہ توجیہ گناہ جتنی سنگینی نہیں رکھتا، کیونکہ وہ گنہگار جو گناہ کا معترف ہو وہ اکثر توبہ کی طرف مائل ہوتا ہے، لیکن مصیبت اس وقت شروع ہوتی ہے جب گنہگار اس کی توجیہ کرنے لگ جاتا ہے جو نہ صرف انسان کے سامنے توبہ کے راستے کو بند کر دیتا ہے بلکہ اُسے ہر گناہ کرنے میں اور بھی زیادہ راسخ اور زیادہ جری بنا دیتا ہے۔

یہ توجیہیں بعض اوقات عزت و آبرو کی حفاظت اور لوگوں کے سامنے رسوائی سے بچنے کے لیے ہوتی ہیں، لیکن اس سے بھی بدتر اس وقت ہوتی ہیں جب وجدان کو دھوکہ دینے کے لیے کی جائیں۔

یہ توجیہیں کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے، اس کے مختلف نمونے بشر کی پوری تاریخ میں دیکھے جا سکتے ہیں، کہ تاریخ کے بڑے بڑے بدکار اپنے آپ کو یا دوسروں کو دھوکہ دینے کے لیے کس طرح سے مضحکہ خیز توجیہات پیش کیا کرتے تھے جس سے ہر انسان حیران رہ جاتا ہے۔

قرآن مجید نے جو تربیت اور انسان سازی کا ایک عظیم درس ہے اس بارے میں بہت سے مباحث پیش کیے ہیں جس کا ایک نمونہ تو ہم اوپر والی آیات میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔

اس بحث کی تکمیل کے لیے دوسرے نمونے بھی غور و مطالعہ کے لیے پیش کر دیئے جائیں تو مناسب ہوگا۔

(۱) مشرکین عرب بعض اوقات اپنے شرک کی توجیہ کے لیے اپنے بڑوں کی رسم سے متوسل ہوتے تھے اور کہتے تھے: انا وجدنا اٰباءنا علی امۃ وانا علی اٰثارھم مقتدون: یعنی ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایک طریقے پر پایا اور ہم نے ان کے آثار کو اپنایا ہوا ہے اور ہم انھیں کے آثار کی پیروی کر رہے ہیں۔

"انا وجدنا اٰباءنا علی امۃ وانا علی اٰثارھم مقتدون"

"ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک دین پر پایا ہے اور ہم انھیں کے آثار کی پیروی کر رہے ہیں۔"

(زخرف - ۲۳)

اور بعض اوقات جبر کی ایک قسم کے ساتھ توسل ہوتے ہوئے کہتے تھے،

"لو شاء اللہ ما اشرکنا ولا اٰباؤنا"

"اگر خدا چاہتا تو نہ ہم ہی شرک کرتے اور نہ ہی ہمارے آباؤ اجداد مشرک ہوتے"

(انعام: ۱۴۸)

(۲) اور کبھی کمزور ایمان والے مسلمان جنگ سے فرار کرنے کے لیے پیغمبر کی خدمت میں آتے تھے اور اس عنوان سے میدان کو خالی چھوڑ جاتے تھے کہ ہمارے گھروں کے در و دیوار ٹھیک طرح کے نہیں ہیں لہٰذا ہمیں نقصان کا خطرہ ہے: "ویستأذن فریق منھم النبی یقولون ان بیوتنا عورة وما ھی بعورة ان یریدون الا فرارا" (احزاب - ۱۳) ان میں سے ایک گروہ پیغمبر سے اجازت طلب کرتا اور کہتا ہمارے گھر آسیب پذیر ہیں، حالانکہ وہ آسیب پذیر نہیں تھے، وہ تو صرف فرار کرنا چاہتے تھے۔

(۳) اور کبھی اس بہانہ سے۔ کہ اگر ہم رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے جائیں تو ممکن ہے کہ خوبصورت رومی عورتیں ہمیں فریفتہ کرلیں اور ہم حرام میں مبتلا ہو جائیں، لہٰذا پیغمبر سے جنگ میں شرکت نہ کرنے کی اجازت مانگتے،، ومنھم من یقول ائذن لی ولا تفتنی (توبہ - ۴۹)" ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو رہنے ہی دیں اور گناہ میں نہ ڈالیں"۔

(۴) اور کبھی اس عنوان سے کہ ہمارے اموال اور بیوی بچوں کے خیال نے ہمیں روکے رکھا۔ پیغمبر کے فرمان کی اطاعت سے فرار کرنے جیسے عظیم گناہ کی توجیہ کرتے (آیات زیر بحث)

(۵) شیطان نے بھی ایک غلط قیاس کے ذریعے اپنی صریح نافرمانی کی خدا کے سامنے توجیہ کی اور کہا،" تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے، اور آدم کو مٹی سے! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک زیادہ شریف موجود ایک پست تر موجود کو سجدہ کرے"!: انا خیر منہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین۔ (اعراف - ۱۲)

(۶) زمانہ جاہلیت میں بھی" دختر کشی" جیسے عظیم جرم کی توجیہ کے لیے یہ کیا کرتے تھے کہ ہم اس چیز سے ڈرتے ہیں کہ جنگوں میں ہماری بیٹیاں دشمنوں کے ہاتھ لگ جائیں گی، لہٰذا ہماری غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم نئی پیدا ہونے والی لڑکیوں کو" زندہ" زمین میں دفن کر دیں، اور کبھی یہ کہتے کہ اگر ہماری اولاد زندہ رہ جائے تو ہم ان کی زندگی کی تامین پر قادر نہیں ہیں! (اسراء - ۳۱)

یہاں تک کہ بعض آیات قرآنی سے پتہ چلتا ہے کہ گنہگار اپنے گناہوں کی توجیہ کے لیے قیامت میں بھی ان امور سے تمسک کریں گے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہم نے تو اپنی قوم کے بزرگوں کی پیروی کی تھی اور وہی لوگ تھے جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا، اور ہماری راہنمائی کا ذمہ لیا تھا۔

"ربنا انا اطعنا سادتنا وکبراءنا فاضلونا السبیلا" (احزاب - ۶۷)

خلاصہ یہ ہے کہ توجیہ کرنے کی بلا ایک ایسی مصیبت ہے، جو ہمہ گیر ہے، جس نے لوگوں کے ایک بہت بڑے گروہ کو، خواہ وہ عام ہوں یا خواص، اپنے گھیرے میں لے لیا ہے، اور اس کا عظیم خطرہ یہ ہے کہ یہ گنہگاروں کے سامنے اصلاح کی راہیں بند کر دیتی ہے اور بعض اوقات حقیقتوں اور واقعیتوں کو خود انسان کی نظر میں دگرگوں کر کے دکھانا اس کے

بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے "خوف اور بزدلی" کی "احتیاط" سے اور "حرص" کی "مستقبل کی تامین" سے اور "تھور" کی "قاطعیت" سے اور "ضعف نفس" کی "حیا و شرم" سے اور "بدحالی" کی "زہد" سے اور "ارتکاب حرام" کی "کلاہ شرعی" سے اور "ذمہ داری کے زیر بار جانے سے فرار" کی "موضع کے ثابت نہ ہونے" سے اور اپنی "کمزوریاں اور کوتاہیاں" کی قضا و قدر سے توجیہ کرتے ہیں۔ اور کس قدر دردناک ہے یہ امر کہ انسان اپنے ہاتھ سے راہ نجات کو اپنے سامنے بند کر دے۔

اگرچہ یہ مفاہیم ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔ لیکن اعتراض کی بات یہ ہے کہ وہ اس کو تحریف کر کے اُلٹا نتیجہ نکالتے ہیں معاشروں، خانوادوں اور افراد کو اس رہ گزر سے کتنے عظیم نقصانات پہنچے ہیں؟!

خداوند عالم ہم سب کو اس عظیم اور گھروں کو تباہ کرنے والی بلا اور مصیبت سے محفوظ رکھے! (آمین)

۱۵۔ سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ ۖ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ ۚ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ ۖ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا ۚ بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا ○

۱۶۔ قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ ۖ فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا ۖ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ○

۱۷۔ لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ ۗ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ وَمَنْ يَتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا أَلِيمًا ○

ترجمہ

۱۵۔ جب تم آئندہ چل کر مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے روانہ ہو گے تو

پیچھے رہ جانے والے کہیں گے، ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دیں (تاکہ اس جہاد میں شرکت کریں) وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل دیں، کہہ دو: تمہیں ہرگز ہمارے ساتھ چلنے کی اجازت نہیں ہے، خدا نے پہلے ہی سے یہ کہہ دیا ہے، لیکن عنقریب وہ یہ کہیں گے: تم ہمارے بارے میں حسد کر رہے ہو، لیکن وہ اس بات کو سمجھتے ہی نہیں مگر تھوڑا۔

۱۶۔ اعراب میں سے پیچھے رہ جانے والوں کو کہہ دے: تمہیں عنقریب ایک جنگجو قوم کی طرف جانے کی دعوت دی جائے گی تاکہ تم ان سے جنگ کرو یا وہ اسلام لے آئیں، اگر تم نے اطاعت کی تو خدا تمہیں اچھی جزا دے گا، اور اگر تم نے اسی طرح سے رُوگردانی کی جیسے کہ پہلے بھی روگردانی کر چکے ہو تو وہ تمہیں دردناک عذاب دے گا۔

۱۷۔ "نابینا" "لنگڑے" اور "بیمار" (اگر وہ میدانِ جہاد میں شرکت نہ کریں) کوئی گناہ نہیں ہے، اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، خدا اُسے (بہشت) کے باغات میں داخل کرے گا، جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور جو شخص روگردانی کرے گا تو اُسے دردناک عذاب میں گرفتار کرے گا۔

تفسیر

پیچھے رہ جانے والے آمادہ طلب!

اکثر مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیات فتح خیبر کے بارے میں ہیں، جو صلح حدیبیہ کے بعد اور ہجرت کے ساتویں سال کے شروع میں واقع ہوئی۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ: روایات کے مطابق جس وقت پیغمبرؐ "حدیبیہ" سے پلٹ رہے تھے تو حکم خدا سے آپ نے حدیبیہ میں شرکت کرنے والے مسلمانوں کو "فتح خیبر" کی بشارت دی، اور تصریح فرمائی کہ اس جنگ میں صرف وہی شرکت کریں گے، اور جنگ میں حاصل شدہ مال غنیمت بھی انہیں کے ساتھ مخصوص ہوگا۔ تخلف کرنے والوں کو ان غنائم میں سے کچھ نہ ملے گا۔

لیکن جونہی ان ڈرپوک دنیا پرستوں نے قرائن سے یہ سمجھ لیا کہ پیغمبرؐ اس جنگ میں جو انہیں درپیش ہے یقینی طور پر کامیاب ہوں گے اور سپاہ اسلام کو بہت سا مال غنیمت ہاتھ آئے گا، تو وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میدان خیبر میں شرکت کی اجازت چاہی اور شاید اس عذر کو بھی ساتھ لیا کہ ہم گزشتہ غلطی کی تلافی کرنے، اپنی ذمہ داری کے بوجھ کو ہلکا کرنے، گناہ سے توبہ کرنے اور اسلام و قرآن کی مخلصانہ خدمت کرنے کے لیے یہ چاہتے ہیں کہ ہم میدان جہاد میں آپ کے ساتھ شرکت کریں! وہ اس بات سے غافل تھے کہ قرآنی آیات پہلے ہی نازل ہو چکی تھیں اور ان کے راز کو فاش کر چکی تھیں، جیسا کہ پہلی زیر بحث آیت میں بیان ہوا ہے۔

"جس وقت تم کچھ غنیمت حاصل کرنے کے لیے چلو گے تو اس وقت پیچھے رہ جانے والے کہیں گے، ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیں اور اس جہاد میں شرکت کرنے کا شرف بخشیں! (سیقول المخلفون اذا انطلقتم الی مغانم لتأخذوھا ذرونا نتبعکم)۔

نہ صرف اسی موقع پر بلکہ دوسرے موقعوں پر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ: یہ تن پرور، لالچی، کم تکلیف اٹھانے والے، تر لقموں کے پیچھے تو جاتے تھے، لیکن سخت خطرناک اور دور دراز کے میدانوں سے گریز کرتے تھے، جیسا کہ سورۂ توبہ کی آیت ۴۲ میں بیان ہوا ہے: "جس وقت کوئی غنیمت نزدیک اور سفر سہل اور آسان ہو تو اس وقت تو یہ تیری پیروی کرتے ہیں، لیکن اب جبکہ میدان تبوک کے لیے راستہ دور اور پرمشقت ہے تو روگردانی کر رہے ہیں اور عنقریب وہ قسم کھا کر کہیں گے: کہ اگر ہم میں تاب توان ہوتی تو ہم بھی تمہارے ساتھ چلتے" "لوکان عرضا قریبا وسفرا قاصدا لاتبعوک ولکن بعدت علیھم الشقة وسیحلفون باللہ لو استطعنا لخرجنا معکم"

بہر حال قرآن زیر بحث آیات میں اس منفعت جو اور فرصت طلب گروہ کے جواب میں کہتا ہے" وہ یہ

چاہتے ہیں کہ خدا کے کلام کو بدل دیں" (یریدون ان یبدلوا کلام اللہ)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ان سے کہہ دے "تم ہرگز ہمارے پیچھے نہ آنا" تمہیں اس میدان میں شرکت کرنے کا حق نہیں ہے: (قل لن تتبعونا)۔

یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں۔" یہ تو وہ بات ہے جو خدا نے پہلے سے ہی کہہ دی ہے۔" اور ہمیں تمہارے مستقبل کے بارے میں باخبر کر دیا ہے: (کذالکم قال اللہ من قبل)۔

خدا نے حکم دیا ہے کہ "غنائم خیبر" "اہل حدیبیہ" کے لیے مخصوص ہیں، اور اس چیز میں کوئی بھی ان کے ساتھ شرکت نہ کرے، لیکن یہ بے شرم اور بُرا دعا پیچھے رہ جانے والے پھر بھی میدان سے نہیں ہٹتے اور تمہیں حسد کے ساتھ متہم کرتے ہیں، اور عنقریب وہ یہ کہیں گے، کہ معاملہ اس طرح نہیں ہے بلکہ تم ہم سے حسد کر رہے ہو" ! (فسیقولون بل تحسدوننا)۔

اور اس طرح سے وہ ضمنی طور پر پیغمبر کی بھی تکذیب کرتے ہیں اور "جنگ خیبر" میں انہیں شرکت سے منع کرنے کی اصل حسد کو شمار کرتے ہیں۔

قرآن آخری جملہ میں کہتا ہے، "لیکن وہ کچھ بھی تو نہیں سمجھتے مگر تھوڑا" (بل کانوا لا یفقھون الا قلیلا)۔

ہاں! ان کی تمام بدبختیوں کی اصل، جہالت، نادانی اور بے خبری ہے، جو ہمیشہ ان کے دامن گیر رہی ہے، خدا کے بارے میں جہالت، اور مقام پیغمبر کی عدم معرفت، اور انسانوں کی سرنوشت سے بے خبری اور دُنیا کی دولت و ثروت کے ناپائیدار ہونے کی طرف سے عدم توجہ۔

یہ درست ہے کہ وہ مالی مسائل اور شخصی منافع کے سلسلے میں باہوش، دقیق اور باریک بین تھے، لیکن اس سے بڑھ کر جہالت اور کیا ہوگی کہ انسان تھوڑی سی دولت کے لیے اپنی تمام چیزوں کو بدلے میں دے ڈالے؟!

آخر کار پیغمبر نے۔ تواریخ کی نقل کے مطابق۔ غنائم خیبر صرف اہل حدیبیہ پر تقسیم کیے، یہاں تک کہ ان لوگوں کے لیے بھی جو حدیبیہ میں موجود تھے اور کسی وجہ سے جنگ خیبر میں شریک نہ ہو سکے ان کے لیے بھی ایک حصّہ قرار دیا، البتہ ایسا آدمی صرف ایک ہی تھا، اور وہ "جابر بن عبداللہ" تھا۔[1]

اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے "حدیبیہ" میں پیچھے رہ جانے والوں سے گفتگو میں، بعد والی آیت میں ایک پیش نہاد کرتا ہے اور ان کے سامنے بازگشت کی راہ کو اس طرح سے کھلی رکھتے ہوئے فرماتا ہے:

"بادیہ نشین اعراب میں سے پیچھے رہ جانے والوں سے کہہ دو: عنقریب تمہیں ایک جنگجو اور طاقتور قوم سے

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۳۴۴۔

مقابلہ کے لیے نکلنے اور ان سے جنگ کرنے کی دعوت دی جائے گی یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کرلیں ۔ (قل للمخلفین من الأعراب ستدعون الٰی قوم اولی بأس شدید تقاتلونهم او یسلمون)۔

۔ "اگر تم اطاعت کروگے تو خدا تمہیں نیک اجر دے گا ، اور اگر تم نے روگردانی کی، جس طرح سے پہلے تم نے روگردانی کی تھی، تو خدا تمہیں دردناک عذاب دے گا" (فان تطیعوا یؤتکم الله اجراً حسناً وان تتولوا کما تولیتم من قبل یعذبکم عذاباً الیماً)۔

اگر تم واقعاً اپنے پہلے عمل سے پشیمان ہوگئے ہو اور راحت طلبی اور دنیا پرستی سے ہاتھ اٹھا لیا ہے تو پھر اپنی صداقت کا امتحان ایک دوسرے سخت اور خوفناک میدان میں دو، ورنہ سخت میدانوں سے اجتناب کرنا، اور راحت و آرام اور صرف غنیمت کے لیے لڑائی کے میدانوں میں شرکت کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے ۔ اور یہ چیز تمہارے نفاق ، ضعفِ ایمان ، بزدلی ، اور خوف پر ایک دلیل ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے ان آیات میں بار بار پیچھے رہ جانے والوں (مخلفین) کا تذکرہ کیا ہے اور اصطلاح کے مطابق "ضمیر" کے بجائے "اسم ظاہر" کو استعمال کرتا ہے۔

یہ تعبیر خصوصیت کے ساتھ صیغہ اسم مفعول کی صورت میں آئی ہے یعنی پیچھے چھوڑے ہوئے" یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس وقت صاحب ایمان مسلمانوں نے اس گروہ کی سستی اور بہانہ جوئیوں کا مشاہدہ کیا تو انہیں پیچھے چھوڑتے ہوئے اور ان کی حالت وکیفیت کی پرواہ کیے بغیر میدانِ جہاد کی طرف چل پڑے ۔

لیکن اس بارے میں کہ یہ جو جنگ جو اور طاقت ور قوم جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے ، کونسی جمعیت تھی ؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

"تقاتلونهم او یسلمون" (ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو جائیں)۔ کا جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اہل کتاب نہیں تھے، کیونکہ انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کرسکتے ، بلکہ انہیں اس بات کا اختیار دیا جاتا ہے کہ یا تو وہ اسلام لے آئیں یا اہلِ ذمہ کی شرائط قبول کرتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ صحیح طریقہ سے زندگی گزاریں اور جزیہ دیتے رہیں، صرف مشرکین اور بت پرست ہی ہیں جن سے سوائے اسلام کے کوئی چیز قابل قبول نہیں ۔کیونکہ اسلام بت پرستی کو ایک دین کے طور پر قبول نہیں کرتا اور بت پرستی ترک کرنے کے لیے مجبور کرنا جائز ہے۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ زمانۂ پیغمبرؐ میں واقعہ "حدیبیہ" اور "فتح خیبر" کے بعد مشرکین کے ساتھ اہم جنگ سوائے "فتح مکہ" اور "جنگ حنین" کے اور کوئی نہیں تھی۔

لہٰذا اوپر والی آیت انہیں کی طرف اشارہ ہوسکتی ہے، خصوصاً جنگ حنین جس میں قبیلہ "ہوازن" اور "بنی سعد" کے سخت کوشش اور جنگ جو قسم کے لوگ شریک تھے ۔

لیکن بعض نے جو یہ احتمال دیا ہے کہ یہ "غزوۂ موتہ" کی طرف اشارہ ہے جو رومیوں کے ساتھ انجام پائی تھی، تو یہ بات

بعید نظر آتی ہے کیونکہ وہ تو اہل کتاب تھے۔

اور یہ احتمال کہ اس سے پیغمبرؐ کے بعد کی جنگیں مراد ہیں، جن میں سے "اہل فارس" و "یمامہ" کی جنگیں ہیں، تو یہ بات بہت ہی زیادہ بعید ہے، کیونکہ آیات کا لب ولہجہ یہ بتاتا ہے کہ یہ مسئلہ زمانہ پیغمبرؐ کے ساتھ مربوط ہے، اور ہمارے لیے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اسے زمانہ پیغمبرؐ سے بعد کی جنگوں پر منطبق کریں۔

ظاہراً ایسا ہوتا ہے کہ بعض مفسرین کی فکر ونظر میں کچھ سیاسی اسباب تھے جن کی وجہ سے انھوں نے اس مسئلہ پر زور دیا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ پیغمبرؐ ان سے وعدہ نہیں کرتے کہ تمھاری آئندہ کی جنگوں میں تمھیں کچھ مالِ غنیمت ملے گا، کیونکہ جہاد کا مقصد غنیمت کا حصول نہیں ہے، بلکہ وہ صرف یہ بتانا ہی کافی سمجھتا ہے کہ خدا تمھیں اچھا اجر دے گا اور عام طور پر یہ تعبیر آخرت کے اجر کے بارے میں ہے۔

یہاں پر ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سورۂ توبہ کی آیہ ۸۳ میں ان نامحرموں کو کلی طور پر رد کرتے ہوئے کہتا ہے:

"فقل لن تخرجوا معی ابدًا ولن تقاتلوا معی عدوًّا انکم رضیتم بالقعود اوّل مرّة فاقعدوا مع الخالفین"، "تم ہرگز کسی جنگ میں بھی میرے ساتھ باہر نہیں نکلو گے اور تم میرے ساتھ رہ کر دشمن کے ساتھ جنگ کرنے کے مجاز نہیں ہو، کیونکہ تم پہلی مرتبہ بھی جنگ سے کنارہ کشی پر راضی ہو گئے تھے، اب بھی تم پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ ہی بیٹھے رہو۔

درحالیکہ زیرِ بحث آیت انھیں ایک اور سخت اور خطرناک میدان میں جنگ کی دعوت دے رہی ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ سورۂ توبہ کی آیت تو جنگ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ مربوط ہے، کہ پیغمبرؐ ان سے قطع امید کر چکے تھے اور زیرِ بحث آیت حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے کہ ابھی تک ان کی طرف سے امید منقطع نہیں ہوئی تھی، اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے:

اور چونکہ پیچھے رہ جانے والوں کے درمیان ایسے افراد بھی تھے جو کسی عضو کے ناقص ہونے کی وجہ سے یا بیماری کی بنا پر واقعاً جہاد میں شرکت کی قدرت نہیں رکھتے تھے، لہٰذا ان کا حق یہاں نظر انداز نہیں ہونا چاہیئے، اس لیے آخری زیرِ بحث آیت میں ان کے معذور ہونے کو واضح کرتا ہے۔

خاص طور پر یہ بات جو بعض مفسرین نے نقل کی ہے کہ گذشتہ آیت کے نزول اور پیچھے رہ جانے والوں کو "عذاب الیم" کی دھمکی دینے کے بعد معذوروں اور بیماروں کی ایک جماعت پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: اے خدا کے رسولؐ اس حالت میں ہماری ذمہ داری کیا ہے؟ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی، اور ان کے لیے اس طرح حکم بیان کیا:

"نابینا، لنگڑے اور بیمار پر کوئی گناہ نہیں ہے، اگر وہ میدان جہاد میں شرکت نہ کریں"، (لیس علی الاعمٰی حرج ولا علی الاعرج حرج ولا علی المریض حرج)۔

صرف جہاد ہی نہیں ہے کہ جو قدرت و توانائی کے ساتھ مشروط ہے بلکہ تمام شرعی ذمہ داریاں عمومی شرائط کے ایک

سلسلہ کے ساتھ مشروط ہیں، جن میں سے ایک توانائی اور قدرت ہے اور آیاتِ قرآن میں بارہا اس معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے، سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۶ میں ایک کلیہ کی صورت میں اس طرح بیان ہوا ہے: لایکلف اللہ نفسًا الّا وسعھا: "خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

یہ شرط منقول دلیلوں سے بھی ثابت ہے اور عقلی دلیلوں سے بھی۔

لیکن یہ گروہ اگرچہ میدانِ جہاد میں شرکت سے معاف رکھا گیا ہے، مگر انہیں بھی اپنے مقدور بھر توائے اسلام کو طاقت پہنچانے اور اہدافِ الٰہی کو آگے بڑھانے کے لیے کوشش کرنی چاہیئے، جیساکہ سورۂ توبہ کی آیت ۹۱ میں بیان ہوا ہے: لیس علی الضعفاء ولا علی المرضٰی ولا علی الذین لایجدون ماینفقون حرج اذا نصحوا للّٰہ ورسولہ: "کمزوروں، بیماروں اور ان لوگوں پر جو (جہاد کے لیے) کچھ خرچ کرنے کا بھی ذریعہ نہیں رکھتے، کوئی گناہ نہیں ہے، (کہ وہ میدان میں حاضر نہ ہوں) مگر شرط یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول سے خیر خواہی کریں۔"

یعنی اگر وہ ہاتھ سے کوئی کام انجام دینے پر قادر نہیں ہیں، تو حسبِ مقدور زبان سے تو گریز نہ کریں، اور یہ ایک عمدہ تعبیر ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جو شخص جتنی توانائی رکھتا ہے اتنی فروگذاشت نہ کرے، دوسرے لفظوں میں اگر کوئی محاذِ جنگ میں شرکت نہیں کر سکتا تو کم از کم محاذ کی پشت کو ہی مضبوط کرے۔

اور شاید زیرِ بحث آیت کا آخری جملہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہو، جس میں فرماتا ہے: "جو شخص خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ اس کو بہشت کے اُن باغات میں داخل کرے گا جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، اور جو شخص روگردانی کرے گا اُسے دردناک عذاب میں گرفتار کرے گا"۔ (ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنٰت تجری من تحتھا الانھار ومن یتول یعذبہ عذابًا الیمًا)

یہ احتمال بھی ہے کہ جن مواقع پر کسی حکم میں کوئی استثناء ہوتا ہے تو کچھ لوگ غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو معذوروں کی صف میں کھڑا کر لیتے ہیں، تو قرآن انھیں خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر واقعاً وہ معذور نہ ہوئے تو وہ دردناک عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ معذور ہونے، نابینا، لنگڑے اور سخت بیماروں کا مسئلہ "جہاد" ہی کے لیے مخصوص ہے لیکن "دفاع" کے مسئلہ میں ہر شخص کو مقدور بھر کیانِ اسلام، وطنِ اسلامی اور جان کا دفاع کرنا چاہیئے اور اس سلسلہ میں کوئی استثناء نہیں ہے۔

۱۸۔ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝

۱۹۔ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

ترجمہ

۱۸۔ خدا ان مومنین سے جنہوں نے درخت کے نیچے تیری بیعت کی راضی اور خوش ہوا، خدا اس کو جو (صداقت و ایمان) ان کے دلوں میں چھپا ہوا تھا جانتا تھا، لہٰذا اس نے ان کے دل پر سکون و اطمینان نازل کیا، اور اجر و پاداش کے عنوان سے ایک نزدیکی فتح انھیں نصیب فرمائی۔

۱۹۔ اور بہت سے غنائم جنہیں وہ حاصل کریں گے اور خدا عزیز و حکیم ہے۔

تفسیر

بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والوں سے خدا کی خوشنودی

ہم بیان کر چکے ہیں کہ واقعہ حدیبیہ میں "پیغمبرؐ" اور "قریش" کے درمیان سفیروں کا تبادلہ ہوا تھا، ان میں

سے پیغمبرؐ نے "عثمان بن عفان" کو (جو ابوسفیان کے عزیزوں میں سے تھا، اور یہ رابطہ ظاہراً اس کے انتخاب میں اثر رکھتا تھا) نمائندے کے طور پر مشرکین مکہ اور اشراف قریش کے پاس بھیجا تھا تاکہ وہ انہیں اس حقیقت سے آگاہ کرے کہ مسلمان جنگ کے ارادے سے نہیں آئے، بلکہ ان کا ہدف و مقصد خانہ خدا کی زیارت اور کعبہ کا احترام ہے، لیکن قریش نے وقتی طور پر عثمان کو روک لیا، اور اس کے بعد مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ عثمان مارا گیا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں یہاں سے نہیں ہٹوں گا جب تک اس گروہ سے جنگ نہ کرلوں۔

اس کے بعد آپ اُس درخت کے نیچے تشریف لائے جو وہاں پر موجود تھا، اور لوگوں کے ساتھ تجدید بیعت کی اور ان سے خواہش ظاہر کی کہ مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے میں کوتاہی نہیں کریں گے، اور کوئی شخص میدان جہاد سے فرار نہیں کرے گا۔[1]

اس بیعت کی شہرت مکہ میں پھیل گئی اور قریش سخت دہشت زدہ ہوگئے اور انھوں نے عثمان کو آزاد کردیا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ بیعت "بیعتِ رضوان" (خوشنودیِ خدا کی بیعت) کے عنوان سے مشہور ہوئی اور مشرکین کو لرزہ براندام کردیا اور یہ تاریخ اسلام میں ایک نقطۂ عطف تھا۔

زیر بحث آیات اسی ماجرے کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "خدا ان مومنین سے جنہوں نے درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کی راضی اور خوشنود ہوا" (لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ)۔

اس بیعت کا مقصد توانائیوں کو زیادہ سے زیادہ منظم کرنا، روحانی تقویت، جنگی آمادگی کی تجدید، افکار کی آزمائش اور وفادار دوستوں کی فداکاری کے وزن کو آزمانا تھا۔

اس بیعت نے مسلمانوں کے جسم میں ایک نئی رُوح پھونک دی، چونکہ انھوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا تھا۔ اور صمیم قلب کے ساتھ وفاداری کا اظہار کر رہے تھے۔

خدا نے ان فداکار اور ایثار پیشہ مومنین کو جنہوں نے اس حساس لمحہ میں پیغمبر سے بیعت کی تھی چار عظیم اجر عطا فرمائے جن میں سب سے زیادہ اہم اس کی رضا و خوشنودی تھی، جیسا کہ سورۂ توبہ کی آیت ۷۲ میں بیان ہوا ہے: ورضوان من اللہ اکبر: "اور خدا کی رضا اور خوشنودی بہشت کی سب نعمتوں سے برتر ہے"

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "خدا اس عہد و پیمان کے بارے میں ان کی وفاداری پر آمادگی اور ان کے دلوں میں چھپے ہوئے ایمان اور صداقت کو جانتا تھا، اس لیے ان پر سکون و آرام نازل کیا" (فعلم ما فی قلوبھم فانزل السکینۃ علیھم)۔

ایسا سکون و اطمینان کہ: دشمنوں کے انبوہ کے درمیان، اپنے وطن اور شہر و دیار سے دُور دراز مقام پر، ان کے آمادہ و تیار ہتھیاروں کے درمیان، کافی اسلحہ پاس نہ ہونے کے باوجود (چونکہ زیارت کے لیے آئے تھے نہ کہ جنگ

---

[1] "مجمع البیان" زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

کے لیے کسی قسم کا خوف اور گھبراہٹ محسوس نہ کی، اور مضبوط پہاڑ کی طرح اپنے پاؤں پر کھڑے رہے اور یہ ان کے لیے خدا کی دوسری نعمت تھی۔

اصولی طور پر الطاف خاص اور خدائی امدادیں ایسے اشخاص کے شامل حال ہوتی ہیں جو خلوص نیت اور باطنی صدق و صفا کے حامل ہوں۔

لہٰذا ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

"ان العبد المؤمن الفقیر لیقول یارب ارزقنی حتی افعل کذا و کذا من البر ووجوہ الخیر، فاذا علم اللہ عزوجل ذالک منہ یصدق نیتہ کتب اللہ لہ من الاجر مثل ما یکتب لہ لو عملہ، ان اللہ واسع کریم"؛

"فقیر بندۂ مومن جب کبھی یہ کہتا ہے: خداوندا مجھے توفیق عطا فرما کہ میں ایسے ایسے اچھے اور نیک کام کروں، جب خدا اس کی صدق نیت کو جان لیتا ہے تو وہ اس کے لیے وہی اجر وصلہ لکھ دیتا ہے جو اُسے عمل کرنے کی صورت میں عطا کرتا، کیونکہ خدا وسیع رحمت والا کریم ہے۔" [1]

آیت کے آخر میں تیسری نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اور انہیں اجر کے طور پر قریب کی فتح نصیب کی"، (واثابھم فتحا قریبا)۔

ہاں! یہ فتح جو اکثر مفسرین کے قول کے مطابق فتح خیبر تھی (اگرچہ بعض نے اسے فتح مکہ شمار کیا ہے)، ایثار پیشہ مومنین کے لیے خدا کی تیسری نعمت تھی۔

"قریبا" کی تعبیر اس چیز کی ایک تائید ہے کہ اس سے مراد "فتح خیبر" ہے، کیونکہ یہ فتح ہجرت کے ساتویں سال کی ابتداء میں، حدیبیہ کے واقعہ سے چند ماہ کے فاصلہ پر حاصل ہوئی؛

چوتھی نعمت جو بیعت رضوان کے بعد مسلمانوں کو نصیب ہوئی فراواں مادی غنائم تھے، جیسا کہ بعد والی آیت میں فرماتا ہے:

"اور دوسرا اجر وہ بکثرت غنائم ہیں جو ان کے ہاتھ آئیں گے" (ومغانم کثیرۃ یأخذونھا)۔

ان غنائم میں سے ایک وہی خیبر کے غنائم تھے جو مسلمانوں کو ایک مختصر سے عرصہ میں نصیب ہوئے، اور خیبر کے یہودیوں کی بے حساب ثروت کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ غنائم حد سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔

لیکن غنائم کو خیبر کے غنائم میں محدود کرنے کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔

لہٰذا باقی اسلامی جنگوں کے غنائم بھی جو فتح حدیبیہ کے بعد حاصل ہوتے اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔

اور چونکہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اس وعدہ الٰہی پر مکمل اطمینان رکھیں، آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "خدا

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۷۰، صفحہ ۱۹۹۔

شکست ناپذیر اور حکیم ہے" (وکان اللہ عزیزاً حکیما)۔

اگر تمہیں یہ حکم دیا ہے کہ حدیبیہ کے مقام پر صلح کرلو، تو وہ حکمت کی اساس پر تھا، وہ حکمت کہ وقت کے گزرنے نے اس کے اسرار سے پردہ اٹھا دیا ہے، اور اگر وہ تمہیں فتح قریب اور غنائم کثیرہ کا وعدہ دیتا ہے تو وہ اس بات پر قادر ہے کہ اپنے وعدوں کو عملی جامہ پہنائے۔

اس طرح سے صاحب ایمان اور ایثار پیشہ مسلمانوں نے بیعت رضوان کے سایہ میں، اور ان حساس لمحات میں پیغمبر سے وفاداری کا اعلان کرکے دُنیا و آخرت کی کامیابی حاصل کرلی جب کہ بے خبر اور ضعیف الایمان ڈرپوک منافق حسرت کی آگ میں جلتے رہے۔

ہم اس گفتگو کو امیر المومنین علی علیہ السلام کی گفتگو پر ختم کرتے ہیں، جبکہ آپ صدر اول کے مسلمانوں کی پامردی اور دشمن سے بے نظیر جہاد کے بارے میں بات کرتے ہیں، اور سست و کمزور عنصر مخاطبین کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فلما رأى الله صدقنا انزل بعدونا الكبت، وانزل علينا النصر حتى استقر الاسلام ملقيا جرانه، ومتبوئا اوطانه، ولعمري لو كنا نأتي ما اتيتم، ما قام للدين عمود، ولا اخضر للايمان عود، وايم الله لتحتلبنها دما، ولتتبعنها ندما"!

"جس وقت خدا نے ہمارے صدق و خلوص کو دیکھا تو ذلت و خواری کو دشمن پر اور کامیابی و نصرت کو ہم پر نازل فرمایا، یہاں تک کہ اسلام صفحۂ زمین پر پھیل گیا، اور وسیع علاقے اپنے لیے چن لیے، مجھے میری جان کی قسم ہے کہ اگر ہم مبارزہ میں تمہاری طرح ہوتے تو ہرگز دین کا ستون قائم نہ ہوتا، اور ایمان کے درخت کی شاخ سرسبز نہ ہوتی، اور خدا کی قسم تم دودھ کے بدلے خون دوہو گے اور پشیمان ہوں گے۔[1]

ایک نکتہ

بیعت اور اس کی خصوصیات

بیعت "بیع" کے مادہ سے اصل قرارداد معاملہ کے وقت ہاتھ میں دینے کے معنی میں ہے، اس کے بعد اطاعت کے عہد و پیمان کے لیے ہاتھ میں ہاتھ دینے پر اس کا اطلاق ہونے لگا، اور وہ اس طرح ہوتا تھا کہ جب کوئی کسی سے وفاداری کا اعلان کرنا چاہتا تھا اور اسے رسمی طور پر قبول کرنا اور اس کے فرمان کی اطاعت کرنا چاہتا تھا، تو اس

---

[1] "نہج البلاغہ" خطبہ ۵۰۔

سے بیعت کیا کرتا تھا، اور شاید اس لفظ کا اطلاق اس معنی میں اس وجہ سے ہوتا تھا، کہ دونوں طرف سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ ایک عہد کرتا تھا جو دو معاملہ کرنے والوں کے عہد و پیمان کے مانند ہوتا تھا، بیعت کرنے والا بعض اوقات جان کی حد تک اور کبھی مال و اولاد کی حد تک اس کی اطاعت کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار کرتا تھا، اور بیعت لینے والا بھی اس کی حمایت اور اس کے دفاع کو اپنے ذمہ لیتا تھا۔

ابن خلدون اپنی تاریخ کے مقدمہ میں کہتا ہے، "کانوا اذا بایع الامیر جعل ایدیھم فی یدہ تاکیدًا فاشبہ ذالک فعل البایع والمشتری، جب لوگ کسی امیر سے بیعت کرتے تھے تو تاکید کے لیے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے تھے، اور یہ کام بیچنے اور خریدنے والے کے کام کے مشابہ تھا" [1]

قرائن بتلاتے ہیں کہ بیعت مسلمانوں کی ایجادات میں سے نہیں ہے، بلکہ یہ اسلام سے پہلے عربوں میں ایک رسم کے طور پر رائج تھی، اسی بنا پر آغاز اسلام میں جب قبیلہ "اوس" اور "خزرج" حج کے موقع پر مدینہ سے مکہ آئے تو انہوں نے عقبہ میں پیغمبر اسلام کی بیعت کی تھی مسئلہ بیعت کے سلسلہ میں ان کا یہ عمل ایک جانے پہچانے کام پر عمل تھا، اس کے بعد پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی مختلف مواقع پر مسلمانوں سے تجدید بیعت کی، کہ ان میں سے ایک موقع یہی حدیبیہ میں "بیعت رضوان" کا تھا اور اس سے زیادہ وسیع وہ بیعت تھی جو فتح مکہ کے بعد انجام پائی، جس کی تفصیل انشاء اللہ سورہ ممتحنہ کی تفسیر میں بیان ہوگی۔

باقی رہی "بیعت" کی کیفیت تو وہ کلی طور پر اس طرح سے تھی کہ بیعت کرنے والا اپنا ہاتھ بیعت لینے والے کے ہاتھ پر رکھتا، اور زبان حال یا زبان مقال کے ساتھ اطاعت و وفاداری کا اعلان کرتا، اور بعض اوقات بیعت کے ضمن میں اس کے لیے شرائط و حدود کا قائل ہوتا تھا، مثلاً مال کی حد تک بیعت، یا جان کی حد تک یا ہر چیز کی حد تک، یہاں تک کہ بیوی بچے تک قربان کر دینے کی حد تک،

اور بعض اوقات فرار نہ کرنے کی حد تک اور کبھی موت کی حد تک بیعت ہوتی تھی، (اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں معنی بیعت رضوان کے سلسلے میں تواریخ میں بیان ہوئے ہیں)

پیغمبر اسلام عورتوں کی بیعت کو بھی قبول کرتے تھے، لیکن وہ ہاتھ میں ہاتھ دینے کے طریقہ سے نہیں ہوتی تھی، بلکہ، جیسا کہ تواریخ میں آیا ہے۔ آپ پانی کا ایک بڑا برتن لانے کا حکم فرماتے تھے اور اپنا ہاتھ برتن کی ایک طرف ڈبو دیتے تھے، اور بیعت کرنے والی عورتیں اپنے ہاتھ دوسری طرف ڈبو دیا کرتی تھیں۔

کبھی بیعت کے ضمن میں کسی کام کو انجام دینے یا کچھ کاموں کو ترک کرنے کی شرط کرتے تھے، جیسا کہ پیغمبرؐ نے فتح مکہ کے بعد عورتوں سے بیعت لیتے وقت شرط کی کہ "وہ شرک نہ کریں، اور بے عفتی سے آلودہ نہ ہوں، اور چوری نہ کریں اور اپنے بچوں کو قتل نہ کریں اور دیگر امور" (سورہ ممتحنہ آیہ ۱۲)

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۱۲۴۔

① بیعت کی ماہیت

یہ ایک طرف سے بیعت کرنے والے کی جانب سے اور دوسری طرف بیعت لینے والے کی جانب سے، ایک قسم کی قرارداد اور معاہدہ ہے، اور اس کا مضمون و مطلب بیعت لینے والے کی اطاعت و پیروی اور دفاع و حمایت ہے اور ان شرائط کے مطابق جو اس میں بیان کیے جاتے ہیں، بیعت کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔

آیات قرآنی اور احادیث کے لب ولہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیعت، بیعت کرنے والے کی طرف سے ایک ضروری اور لازمی عہد ہوتا ہے، جس کے مطابق عمل کرنا واجب ہوتا ہے، اور اس بنا پر یہ "اوفوا بالعقود" کے قانون کا کلی طور پر شمول ہے۔ (مائدہ ۱)

اس بنا پر بیعت کرنے والا فسخ کرنے کا حق نہیں رکھتا، لیکن بیعت لینے والا اگر مصلحت دیکھے تو اپنی بیعت اٹھا سکتا ہے اور اُسے فسخ کرسکتا ہے، اور اس صورت میں بیعت کرنے والا اپنے فرض اور عہد سے آزاد ہو جاتا ہے۔[1]

☆ ☆ ☆

② بعض لوگ بیعت کو "انتخابات" کے مشابہ یا اس کی ایک نوع سمجھتے ہیں، حالانکہ "انتخابات" کا مسئلہ ٹھیک اس کے برعکس ہے۔ یعنی اس کی ماہیت منتخب ہونے والے کے لیے ایک قسم کی مسئولیت وظیفہ و ذمہ داری اور مرتبہ و مقام کا عطا کرنا ہے، یا دوسرے لفظوں میں کسی کام کے انجام دینے میں وکیل بنانا ہے، اگرچہ اس انتخاب میں انتخاب کرنے والوں کے لیے بھی کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں، (تمام وکالتوں کی طرح) جب کہ بیعت ایسی چیز نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں، انتخابات مقام کی عطائیگی ہے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ وہ وکالت کے مشابہ ہے، جبکہ بیعت "اطاعت کا عہد" ہے۔

اگرچہ یہ ممکن ہے کہ یہ دونوں بعض باتوں میں ایک دوسرے سے مشابہت پیدا کریں، لیکن یہ شباہت ہرگز ان کے مفہوم و ماہیت کی وحدت کے معنی میں نہیں ہے، اسی لیے بیعت کے سلسلے میں بیعت کرنے والا فسخ کرنے کا حق اور اختیار نہیں رکھتا، جب کہ انتخابات میں بہت سے مواقع پر انتخاب کرنے والے فسخ کرنے کا حق رکھتے ہیں، کہ انتخاب ہونے والے شخص کو سب مل کر اس کے مقام سے معزول کردیں۔ (غور کیجیے)

③ پیغمبرؐ اور ائمہ معصومینؑ کے لیے ۔ جو خدا کی طرف سے منصوب ہوتے ہیں۔ کسی قسم کی بیعت کی ضرورت نہیں ہوتی، یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور امام معصومؑ اور ان کی طرف سے نصب شدہ فرد کی اطاعت واجب ہے،

---

[1] واقعہ کربلا میں ہم پڑھتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام نے شب عاشور خطبہ پڑھا اور اپنے اصحاب کی قدردانی کے اظہار کے ضمن میں اپنی بیعت ان سے اٹھالی، تاکہ وہ جہاں ان کا دل چاہے چلے جائیں (لیکن وہ اسی طرح سے وفادار رہے)، اور فرمایا: فانطلقوا

في حل ليس عليكم مني ذمام:

(کامل ابن اثیر جلد ۴ صفحہ ۵۷)

خواہ کسی نے بیعت کی ہو یا کسی نے بیعت نہ کی ہو۔

دوسرے لفظوں میں نبوت و امامت کا مقام ہی وجوب اطاعت کو لازم و ضروری قرار دیتا ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ (نساء۔ ۵۹)

لیکن یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر پیغمبرؐ نے بارہا اپنے صحابہ سے اور تازہ مسلمانوں سے بیعت کیوں لی جس کے دو نمونے صراحت کے ساتھ قرآن میں آئے ہیں۔ (بیعتِ رضوان تو اسی سورہ میں ہے اور اہل مکہ سے جو بیعت لی اس کی طرف سورۂ ممتحنہ میں اشارہ ہوا ہے)

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ بلاشک و شبہ یہ بیعتیں وفاداری پر ایک قسم کی تاکید تھیں، جو خاص خاص موقعوں پر انجام پائی تھیں، خاص طور پر سخت قسم کے بحرانوں اور حوادث کے مقابلہ کے لیے ان سے استفادہ کیا گیا ہے، تاکہ اس کے سایہ میں لوگوں کے جسموں میں تازہ روح پھونکی جائے، جیسا کہ ہم گذشتہ بحثوں میں بیعت رضوان کے عجیب و غریب اثرات کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔

لیکن وہ بیعتیں جو خلفاء کے لیے لیتے تھے وہ ان کے مقام خلافت کو قبول کرنے کے طور پر ہوتی تھیں، اگرچہ ہمارے عقیدہ کے مطابق پیغمبرؐ کی خلافت کوئی ایسی چیز نہیں جو لوگوں کی بیعت کے طریقہ سے انجام پائے، بلکہ وہ صرف خدا کی طرف سے اور خود پیغمبر یا سابق امام کے ذریعہ منعقد ہوتی ہے۔

اور اسی بنا پر وہ بیعت جو مسلمانوں نے علیؑ یا امام حسنؑ یا امام حسینؑ کی، کی تھی وہ بھی وفاداری پر تاکیدی پہلو رکھتی تھی، اور پیغمبرؐ کی بیعتوں کے ساتھ مشابہت رکھتی تھی۔

٭ ٭ ٭ ٭

(۴) کیا موجودہ حالات میں بھی بیعت ایک اسلامی اصل کے طور پر قابل قبول ہے؟ دوسرے لفظوں میں، کیا آج بھی بیعت کو عام کیا جا سکتا ہے، مثلاً کوئی قوم کسی لائق اور حامل شرائط شرعی فرد کو انتخاب کرے (اور لشکر کے کمانڈر انچیف رئیس قوم یا رئیس حکومت کے عنوان سے) اس کی بیعت کریں، تو کیا اس قسم کی بیعتیں احکام شرعی کی مشمول بیعت ہو سکتی ہے؟

کیونکہ اصطلاح کے مطابق بیعت کے بارے میں قرآن و سنت سے کوئی "عموم" اور "اطلاق" ہمارے پاس نہیں ہے، لہٰذا اس مسئلہ کو عمومیت دینا مشکل نظر آتا ہے۔ اگرچہ "اوفوا بالعقود" والی آیت کے عموم سے استدلال کرنا چنداں بعید نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود جو ابہام بیعت سے مربوط مسائل میں پایا جاتا ہے اس بات سے مانع ہے کہ ہم قطعی اور یقینی طور پر "اوفوا بالعقود" پر تکیہ کریں، خاص طور پر جبکہ ہماری فقہ میں بیعت کے لیے پیغمبرؐ اور امام معصومؑ کے علاوہ کوئی مقام نظر نہیں آتا۔

اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ ولی فقیہ کی نیابت کا مقام ہماری نظر میں ایک ایسا مقام ہے جو ائمہ معصومینؑ کی طرف سے معین ہوا ہے، اور اس کے لیے کسی قسم کی بیعت کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ لوگوں کا ولی فقیہ کی اطاعت و پیروی کرنا اس کے اس مقام سے استفادہ کا امکان اور اصطلاح کے مطابق "بسط ید" دینا ہے۔

لیکن یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ اس کا مقام لوگوں کے اتباع اور پیروی کا مرہون ہو، اور پھر لوگوں کے پیروی کرنے

کا مسئلہ بیعت کے مسئلہ سے کوئی ربط نہیں رکھتا، بلکہ ولایت فقیہ کے بارے میں حکم الٰہی پر عمل کرنا ہے، (غور کیجیے)

⑤ بہر حال "بیعت" مسائل اجرائی سے مربوط ہے، اور اس کا احکام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، یعنی کسی شخص کی بیعت کر لینا ہرگز اسے "تشریع اور قانون وضع کرنے" کا حق نہیں دیتا، بلکہ قوانین کو کتاب سنت سے لینا چاہیئے، اور پھر انہیں جاری کرنا چاہیئے، اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔

⑥ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اور معصوم پیشوا کی بیعت خدا کے لیے ہونی چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں بیعت ایسے امور میں سے ہے جس میں قصد قربت ضروری ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے آیا ہے۔

"ثلاثة لا یکلمهم الله عز وجل یوم القیامة ولا ینظر الیهم ولا یزکیهم ولهم عذاب الیم، رجل بایع اماما لا یبایعه الا للدنیا ان اعطاه ما یرید وفی له، والا کف، ورجل بایع رجلا بسلعته بعد العصر فحلف بالله عز وجل لقد اعطی بها کذا وکذا فصدقه واخذها ولم یعط فیها ما قال، ورجل علی فضل ماء بالفلات یمنعه ابن السبیل"۔

"تین شخص ایسے ہیں جن سے خدا بات نہیں کرے گا، اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، ایک تو وہ شخص جو امام کی بیعت کرے لیکن اس سے اس کا مقصد دنیا کے علاوہ اور کچھ نہ ہو، کہ اگر وہ اس کی مطلوبہ چیز اسے دے دے تو پھر تو وہ اپنی بیعت کو پورا کرے گا، ورنہ علیحدہ ہو جائے گا، اور ایک وہ شخص جو عصر کے وقت کے بعد جنس بیچتا ہے اور قسم کھا کر کہے کہ میں نے یہ جنس اتنی رقم دے کر خریدی ہے، اور مشتری سچ سمجھ کر اسے خرید لیتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں تھا، تیسرا وہ شخص جس کے پاس بیابان میں فالتو پانی موجود ہے، لیکن وہ مسافر کو نہیں دیتا"[1]

عصر کی تعبیر یا تو اس وقت کی شرافت کی وجہ سے ہے اور یا اس بنا پر ہے کہ بہت سے جنس بیچنے والے اس موقع پر اپنی جنس کو جس قیمت پر خریدتے ہیں اسی قیمت پر بیچ دیتے ہیں۔

⑦ بیعت توڑنا گناہان کبیرہ میں سے ہے ایک حدیث میں امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے منقول ہے،

"ثلاثة موبقات: نکث الصفقة وترک السنة وفراق الجماعة"

---

[1] "خصال" باب الثلاثة حدیث ۱۱۔

"تین گناہ ایسے ہیں جو انسان کو ہلاک کر دیتے ہیں، (اور خدا کے شدید عذاب میں اُسے پھینک دیتے ہیں) بیعت توڑنا، سُنت کو ترک کرنا، اور جماعت سے جدائی اور علیحدگی اختیار کرنا"۔[1]

ترکِ سنت ظاہراً ان قوانین کی طرف اشارہ ہے، جو پیغمبرِ اسلام لائے ہیں، اور جماعت سے جدائی کا معنی اس سے اعراض کرنا اور پشت پھیرنا ہے نہ کہ صرف جماعت میں شریک نہ ہونا۔

۸- "بیعت" علی علیہ السلام کے ارشادات میں

نہج البلاغہ کے خطبوں میں بارہا بیعت کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی ہے۔ اور امامؑ نے بارہا اس بیعت کا جو لوگوں نے آپ کی تھی، ذکر کیا ہے۔

ان میں سے ایک موقع پر فرماتے ہیں: اے لوگو! تمہارا مجھ پر ایک حق ہے، اور میرا تم پر ایک حق ہے۔ اب رہا تمہارا حق مجھ پر تو وہ یہ ہے کہ میں تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ رہوں اور تمہارے بیت المال کو تمہارے ہی لیے خرچ کروں، تمہیں تعلیم دوں تاکہ تم جہالت سے نجات پاؤ اور تمہیں تادیب کروں تاکہ تمہیں آگاہی حاصل ہو۔

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

"واما حقی علیکم فالوفاء بالبیعۃ، والنصیحۃ فی المشھد والمغیب، والاجابۃ حین ادعوکم، والطاعۃ حین اٰمرکم"

باقی رہا میرا حق تمہارے اوپر تو وہ یہ ہے کہ اپنی بیعت میں وفادار رہو، اور آشکار و پنہاں خیر خواہی کرو جس وقت تمہیں پکاروں تو لبیک کہو، اور جس وقت تمہیں حکم دوں تو اطاعت کرو۔[2]

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"لم تکن بیعتکم ایای فلتۃ"

تمہاری بیعت مجھ سے بغیر سوچے سمجھے اور اچانک انجام نہیں پائی (تاکہ معمولی سے معمولی شک و تردید بھی میری اطاعت کے بارے میں اختیار کرو)۔[3]

اور اس خطبہ میں جو جنگ "جمل" سے پہلے اور مدینہ سے بصرہ کی طرف جاتے وقت ارشاد فرمایا، لوگوں کو ان کی بیعت پر پائیداری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وبایعنی الناس غیر مستکرھین، ولا مجبرین، بل طائعین مخیرین"

---

[1] بحار الانوار جلد ۶۷ صفحہ ۱۸۵

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۳۴۔

[3] نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۶۔

" لوگوں نے بغیر کسی جبر واکراہ کے اطاعت واختیار کے ساتھ میری بیعت کی تھی" ۔ [1]

اور آخر میں معاویہ کے مقابلہ میں، جس نے امامؑ کی بیعت سے سرتابی کی تھی اور کسی نہ کسی طرح سے اس پر نکتہ چینی کرنا چاہتا تھا۔ فرمایا:

" بایعنی القوم الذین بایعوا ابابکر وعمر وعثمان علی ما بایعوهم علیه، فلم یکن للشاهد ان یختار، ولا للغائب ان یرد "

" انہیں لوگوں نے جنہوں نے ابوبکر وعمر وعثمان کی بیعت کی تھی، میری انہیں شرائط اور کیفیت میں بیعت کی ہے۔ اس بنا پر نہ تو کسی حاضر کو یہ اختیار ہے کہ بیعت کو فسخ کرے اور نہ ہی کسی غائب کو رد کرنے کی اجازت ہے " ۔ [2]

نہج البلاغہ کی بعض عبارتوں سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ " بیعت " ایک بار سے زیادہ نہیں ہوتی، اس میں تجدید نظر نہیں ہو سکتی، اور نہ ہی اس میں فسخ کا اختیار ہوتا ہے اور جو شخص اس سے سرتابی کرے وہ طعنہ زن اور عیب جو شمار ہوتا ہے، اور جو شخص اس کے قبول یا رد کرنے کے بارے میں غور وفکر کرے یا شک وتردد کرے وہ منافق ہے!

" انها بیعة واحدة، لا یثنی فیها النظر، ولا یستأنف فیها الخیار، الخارج منها طاعن، والمروی فیها مداهن! " [3]

ان تعبیرات کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ ان لوگوں کے سامنے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے آپؑ کی امامت منصوصہ پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور بہانہ جوئی کرتے تھے، بیعت کے مسئلہ کے ساتھ جو ان کے نزدیک مسلم تھا استدلال کرتے تھے، تاکہ امامؑ کی اطاعت سے روگردانی کی انہیں گنجائش نہ ہو، اور معاویہ اور اس کے مانند لوگوں کے گوش گزار فرماتے تھے کہ جس طرح وہ خلفاء ثلاثہ کی خلافت کی مشروعیت کا قائل ہے۔ اسی طرح اسے امامؑ کی خلافت کا بھی قائل ہونا چاہیئے، اور ان کے لیے سر تسلیم خم کرنا چاہیئے (بلکہ آپ کی خلافت تو زیادہ مشروع ہے، چونکہ آپ کی بیعت زیادہ وسیع اور عام لوگوں کی رضا ورغبت سے انجام پائی تھی)

اس بنا پر بیعت کے ساتھ استدلال کرنا، امام کے خدا و پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ منصوب ہونے کے مسئلہ، اور بیعت کے تاکیدی ہونے کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتا۔

---

[1] نہج البلاغہ خط نمبر ۱۔

[2] نہج البلاغہ خط نمبر ۶۔

* توجہ رکھنا چاہیئے کہ گذشتہ خلفاء کی بیعت پر اس لیے تکیہ کیا گیا تھا، چونکہ معاویہ انہیں کی طرف سے منصوب ہوا تھا، اور ان کی حمایت کا دم بھرتا تھا لہٰذا جو کچھ خطبہ شقشقیہ میں بیان ہوا ہے اس کے ساتھ منافات نہیں رکھتا۔

[3] نہج البلاغہ خط نمبر ۷۔

لہٰذا اس نہج البلاغہ میں ایک موقع پر امامؑ حدیث ثقلین کے ساتھ جو امامت کے نصوص میں سے ہے۔ اشارہ فرماتے ہیں۔[1]

اور دوسری جگہ مسئلہ وصیت و وراثت کی طرف اشارہ کرتے ہیں[2] (غور کیجیے)

اور اپنی دوسری عبارتوں میں بیعت کے لیے وفاداری کے لازم و ضروری ہونے، اور اس کے دوام اور فسخ و تجدید نظر کے عدم امکان اور تکرار کی احتیاج کے نہ ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے، کہ یہ بھی ایسے مسائل ہیں جو بیعت کے سلسلہ میں قابل قبول ہیں۔

ضمنی طور پر ان سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر بیعت جبر و اکراہ کا پہلو رکھتی ہو یا لوگوں کو غفلت میں رکھنے کی صورت میں انجام پائے تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے بلکہ وہی بیعت قابل قدر ہے جو ارادہ و فکر کی آزادی و اختیار اور مطالعہ کے بعد انجام پائے۔ (پھر بھی غور کیجیے)

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۲۰۰۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۲۔

۲۰۔ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَأْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ

۲۱۔ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا

ترجمہ

۲۰۔ خدا نے بہت سے غنائم کا تمہیں وعدہ دیا ہے، جو تم حاصل کرو گے، لیکن ان میں سے یہ ایک تمہارے لیے زیادہ جلدی فراہم کردی ہے اور لوگوں، (دشمنوں) کے دست ظلم کو تم سے روک دیا تاکہ یہ مومنین کے لیے ایک نشانی ہو اور تمہیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرے۔

۲۱۔ علاوہ ازیں دوسرے غنائم وفتوحات جن پر تمہیں قدرت نہیں ہے۔ لیکن خدا کی قدرت ان پر احاطہ رکھتی ہے، تمہیں عطا کرے گا، اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

صلح حدیبیہ کی مزید برکات

یہ آیات اسی طرح سے "صلح حدیبیہ" سے مربوط مباحث اور اس کے بعد کے واقعات کو بیان کررہی ہیں اور

ان برکات و فوائد کی۔ جو اس رہ گزر سے مسلمانوں کو نصیب ہوئے۔ تشریح کر رہی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے "خدا نے بہت سے غنائم کا تم سے وعدہ کیا ہے، جنھیں تم حاصل کرو گے، لیکن یہ ایک بہت جلدی تمھارے لیے فراہم کر دی ہے" (وعدکم اللہ مغانم کثیرۃ تأخذونھا فعجل لکم ھذہ)۔

آیت کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ یہاں غنائم کثیرہ سے مراد وہ تمام غنائم ہیں جو خدا نے مسلمانوں کو عطا کیے تھے، چاہے تھوڑی مدت میں اور چاہے طویل مدت میں، یہاں تک کہ مفسرین کی ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ وہ غنائم جو دامنِ قیامت تک مسلمانوں کے ہاتھ آتے رہیں گے وہ بھی اس عبارت میں داخل ہیں۔

اور یہ جو وہ کہتا ہے " ان میں سے یہ ایک بہت جلدی تمھارے لیے فراہم کی ہے، اُو غالباً اسے "غنائم خیبر" کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ جو مختصر سے فاصلہ میں فتح حدیبیہ کے بعد فراہم ہوئی۔

لیکن بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ " ھذہ " فتح حدیبیہ کی طرف اشارہ ہے، جو عظیم ترین معنوی فتح تھی۔

اس کے بعد اس ماجرہ میں مسلمانوں کے لیے خدا کے الطاف میں سے ایک دوسرے لطف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: " اور لوگوں کے دست تعدی کو تم سے روک دیا " (وکف ایدی الناس عنکم)۔

یہ ایک بڑا لطف تھا کہ وہ افراد کی کمی اور کافی مقدار میں آلات جنگ کے نہ ہونے کے باوجود وہ بھی وطن سے دور دراز کے علاقہ میں اور دشمن کے عین گڑھ میں حملے سے بچے رہے، اور دشمن کے دل میں اس طرح کا رعب ڈالا کہ جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کا حملہ کرنے سے رُکے رہے۔

مفسرین کی ایک جماعت اس جملہ کو خیبر کے ماجرے کی طرف اشارہ سمجھتی ہے کہ "بنی اسد" اور "بنی غطفان" کے قبائل نے یہ مصمم ارادہ کیا ہوا تھا کہ مسلمانوں کے پیچھے مدینہ پر حملہ کر دیں اور مسلمانوں کے اموال کو لوٹ کر لے جائیں اور ان کی خواتین کو قید کر لیں۔

یا ان دونوں قبیلوں کی ایک جماعت کے مصمم ارادہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ جن کا ارادہ یہ تھا کہ یہودیوں کی مدد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ لیکن خدا نے ان کے دلوں میں رعب اور وحشت ڈال دی اور وہ اپنے ارادہ سے باز آگئے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے، چونکہ بعد کی چند آیات میں ہم اسی تعبیر کو مشاہدہ کرتے ہیں جو اہل مکہ کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے اور ایک تفصیل و تشریح کے مانند ہے، اس مطلب کے لیے جو زیر بحث آیت میں آیا ہے۔ اور قرآن کی روش کے ساتھ جو اجمال و تفصیل کی روش ہے سازگار ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ مشہور روایات کے مطابق ساری کی ساری سورۂ فتح ماجرائے حدیبیہ کے بعد اور پیغمبرؐ کی مکہ سے مدینہ کی طرف بازگشت کی راہ میں نازل ہوئی ہے۔

اس کے بعد اس آیت کو جاری رکھتے ہوئے خدا کی نعمتوں میں سے دو دوسری عظیم نعمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، مقصد یہ تھا کہ یہ واقعات مومنین کے لیے (تیری دعوت کی حقانیت پر) نشانی ہیں، اور خدا تمھیں صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرے " (ولتکون اٰیۃ للمؤمنین ویھدیکم صراطاً مستقیماً)۔

اگرچہ بعض مفسرین "لتکون" کی ضمیر کو "غنائم موعود" کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور بعض دوسرے مسلمانوں کو دشمنوں کے حملے سے محفوظ رکھنے کی طرف، لیکن مناسب یہ ہے کہ یہ ضمیر "صلح حدیبیہ" کے تمام حوادث اور اس کے بعد کے واقعات کی طرف لوٹے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک خدا کی آیتوں میں سے ایک آیت، اور پیغمبر کی صداقت پر ایک دلیل، اور لوگوں کے لیے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کا ایک وسیلہ تھا، اور ان کا ایک حصہ تو پیشین گوئی اور خبرِ غیبی کا پہلو رکھتا تھا اور ان میں سے بعض عام قسم کے حالات واسباب کے ساتھ سازگار نہ تھے اور مجموعی طور سے یہ سب پیغمبر کے معجزات میں سے واضح معجزہ شمار ہوتے تھے۔

❖ ❖ ❖ ❖

بعد والی آیت میں مسلمانوں کو مزید بشارت دیتے ہوئے کہتا ہے:

" خدا نے تمہیں اور دوسری فتوحات اور غنیمتوں کا وعدہ دیا، جن پر تمہیں نہ پہلے قدرت تھی نہ اب ہے، لیکن خدا کی قدرت ان سب پر احاطہ کیے ہوئے ہے، اور خدا ہر چیز پر قادر ہے" (واخریٰ لم تقدروا علیہا قد احاط اللّٰہ بہا وکان اللّٰہ علیٰ کل شیء قدیرًا)۔

اس بارے میں کہ یہ وعدہ کونسی غنیمت اور کونسی کامیابی کی طرف اشارہ ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض تو اسے "فتح مکہ" اور "حنین" کی غنیمتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور بعض ان فتوحات اور غنیمتوں کی طرف، جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اُمت اسلامی کو نصیب ہوئیں۔ (مثل فتح ایران وروم ومصر)

یہ احتمال بھی ہے کہ ان تمام ہی کی طرف اشارہ ہو۔[1]

"لم تقدروا علیہا" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمان اس سے پہلے ہرگز اس قسم کے فتوحات وغنائم کا خیال تک نہ دیتے تھے، لیکن اسلام کی برکت اور خدائی امدادوں کی بنا پر ان میں یہ قدرت پیدا ہوگئی۔

بعض نے اس جملہ سے یہ مطلب نکالا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان پہلے سے ان فتوحات کے بارے میں بحث چلی ہوئی تھی۔ لیکن وہ ان کو انجام دینے کے لیے خود کو ناتواں اور کمزور سمجھتے تھے خصوصًا وہ حدیث جو جنگِ احزاب کے واقعہ میں منقول ہے اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ اس دن جب کہ پیغمبر نے مسلمانوں کو ایران وروم ویمن کی فتح کی بشارت دی تو منافقین نے اس کا مذاق اڑایا۔

"قد احاط اللّٰہ بہا" (خدا نے ان کا احاطہ فرمایا) کا جملہ ان غنائم یا فتوحات پر، پروردگار کی قدرت کے احاطہ کی طرف اشارہ ہے، لیکن بعض نے اسے اس کے احاطۂ علمی کی طرف اشارہ سمجھا ہے، لیکن پہلا معنی آیت کے دوسرے جملوں کے ساتھ زیادہ سازگار ہے۔ البتہ دونوں معانی کو جمع کرنے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے۔

اور آخر میں آیت کا آخری جملہ یعنی "وکان اللّٰہ علیٰ کل شیء قدیرًا" درحقیقت پہلے جملہ کے لیے علت

---

[1] "اخریٰ" "مغانم" کی صفت ہے جو محذوف ہے، اور تقدیر میں "مغانم اخریٰ" ہے، جو منصوب ہے "مغانم کثیرۃ" پر عطف کی بنا پر۔

کے بیان کے طور پر ہے۔ جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی ہر چیز پر قدرت کی بناء پر اس قسم کی فتوحات مسلمانوں کے لیے عجیب نہیں ہیں۔

بہر حال یہ آیت اخبارِ غیبی، اور قرآن مجید کی آئندہ کے بارے میں پیشین گوئیوں میں سے ہے، یہ کامیابیاں تھوڑی سی مدت میں وقوع پذیر ہوئیں، اور ان آیات کی عظمت کو واضح کیا،

ایک نکتہ

جنگِ خیبر کا ماجرا

جب پیغمبرؐ حدیبیہ سے واپس لوٹے تو تمام ماہ ذی الحجہ اور ہجرت کے ساتویں سال کے محرم کا کچھ حصہ مدینہ میں توقف کیا، اس کے بعد اپنے اصحاب میں سے اُن ایک ہزار چار سو افراد کو جنہوں نے حدیبیہ میں شرکت کی تھی ساتھ لے کر خیبر کی طرف روانہ ہوئے، (جہاں اسلام کے برخلاف تحریکوں کا مرکز تھا، اور پیغمبرؐ کسی مناسب فرصت کے لیے گن گن کر دن گذار رہے تھے کہ اس مرکزِ فساد کو ختم کریں)

"غطفان" کے قبیلہ نے شروع میں تو خیبر کے یہودیوں کی حمایت کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن بعد میں ڈر گئے اور اس سے رُک گئے۔

پیغمبرؐ جس وقت "خیبر" کے قلعوں کے نزدیک پہنچے تو آپؐ نے اپنے صحابہ کو رُکنے کا حکم دیا، اس کے بعد آسمان کی طرف سر بلند کیا اور یہ دُعا پڑھی۔

"اللّٰھم رب السماوات وما اظللن، ورب الارضین وما اقللن ....
... نسألك خیر ھذہ القریۃ وخیر اھلھا، ونعوذبك من شرھا وشر اھلھا، وشر ما فیھا۔"

"خداوندا! اے آسمانوں کے پروردگار اور جن پر انھوں نے سایہ ڈالا ہے، اور اے زمینوں کے پروردگار اور جن چیزوں کو انھوں نے اُٹھا رکھا ہے، میں تجھ سے اس آبادی اور اس کے اہل میں جو خیر ہے اس کا طلب گار ہوں، اور تجھ سے اس کے شر اور اس میں رہنے والوں کے شر اور جو کچھ اس میں ہے اس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔

اس کے بعد فرمایا: "بسم اللّٰہ" آگے بڑھو! اور اس طرح سے رات کے وقت "خیبر" کے پاس جا پہنچے؛ اور صبح کے وقت جب اہلِ خیبر" اس ماجرے سے باخبر ہوئے تو خود کو لشکرِ اسلام کے محاصرہ میں دیکھا، اس کے بعد پیغمبرؐ نے یکے بعد دیگرے ان قلعوں کو فتح کیا۔ یہاں تک کہ آخری قلعہ تک، جو سب سے زیادہ مضبوط اور طاقتور

تھا، اور مشہور یہودی کمانڈر "مرحب" اس میں رہتا تھا، پہنچ گئے۔

انہیں دنوں میں ایک سخت قسم کا درد سر، جو کبھی کبھی پیغمبر کو عارض ہوا کرتا تھا، آپؐ کو عارض ہوگیا، اس طرح سے کہ ایک دو دن آپ اپنے خیمہ سے باہر نہ آسکے تو اس موقع پر (مشہور اسلامی تواریخ کے مطابق) حضرت ابوبکر، نے علم سنبھالا اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر یہودیوں کے لشکر پر حملہ آور ہوئے، لیکن کوئی نتیجہ حاصل کیے بغیر واپس پلٹ آئے دوسری دفعہ "حضرت عمرؓ" نے علم اٹھایا، اور مسلمان پہلے دن کی نسبت زیادہ شدت سے لڑے، لیکن بغیر کسی نتیجہ کے واپس پلٹ آئے۔

یہ خبر رسولؐ کے کانوں تک پہنچی تو آپؐ نے فرمایا:

• اما واللہ لاعطینھا غدا رجلا یحب اللہ ورسولہ، ویحبہ اللہ ورسولہ، یاخذھا عنوۃ:

• خدا کی قسم کل یہ علم ایسے مرد کو دوں گا جو خدا اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے، اور خدا اور پیغمبر اس کو دوست رکھتے ہیں، اور وہ اس قلعہ کو طاقت کے زور سے فتح کرے گا۔"

ہر طرف سے گردنیں اٹھنے لگیں کہ اس سے مراد کون شخص ہے؟ کچھ لوگوں کا اندازہ تھا کہ پیغمبرؐ کی مراد علیؑ ہیں، لیکن علیؑ ابھی وہاں موجود نہیں تھے، کیونکہ شدید آشوب چشم انہیں لشکر میں حاضر ہونے سے مانع تھا، لیکن صبح کے وقت علیؑ اونٹ پر سوار ہو کر وارد ہوئے، اور پیغمبرؐ کے خیمہ کے پاس اُترے درحالیکہ آپؑ کی آنکھیں شدت کے ساتھ درد کر رہی تھیں۔

پیغمبرؐ نے فرمایا: میرے نزدیک آؤ! آپ قریب گئے تو آپ نے اپنے دہن مبارک کا لعاب علیؑ کی آنکھوں پر ملا اور اس معجزہ کی برکت سے آپ کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہوگئیں اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم ان کے ہاتھ میں دیا۔

علی علیہ السلام لشکر اسلام کو ساتھ لے کر خیبر کے سب سے بڑے قلعہ کی طرف بڑھے تو یہودیوں میں سے ایک شخص نے قلعہ کے اُوپر سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: "میں علی بن ابی طالب ہوں۔ اس یہودی نے پکار کر کہا۔

اے یہودیو! اب تمہاری شکست کا وقت آن پہنچا ہے! اس وقت اس قلعہ کا کمانڈر مرحب یہودی، علی علیہ السلام سے مقابلہ کے لیے نکلا، اور کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ایک ہی کاری ضرب سے زمین پر گر پڑا۔

مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان شدید جنگ شروع ہوگئی، علی علیہ السلام قلعہ کے دروازے کے قریب آئے، اور ایک قوی اور پُر قدرت حرکت کے ساتھ دروازے کو اکھاڑا اور ایک طرف پھینک دیا، اور اس طرح سے قلعہ کھل گیا اور مسلمان اس میں داخل ہوگئے اور اُسے فتح کرلیا۔

یہودیوں نے اطاعت قبول کر لی، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ اس اطاعت کے عوض ان کی جان بخشی کی جائے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی درخواست کو قبول کر لیا، منقول غنائم اسلامی لشکر کے ہاتھ آئے اور وہاں کی زمینیں اور باغات آپؐ نے یہودیوں کو اس شرط کے ساتھ سپرد کر دیئے کہ اس کی آمدنی کا آدھا حصہ وہ مسلمانوں کو دیا کریں گے۔[1]

---

[1] کامل ابن اثیر (اہل سنت کے مشہور مورخ) جلد ۲ صفحہ ۲۱۹ - ۲۲۱ (کچھ تلخیص کے ساتھ)

۲۲۔ وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ○

۲۳۔ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ○

۲۴۔ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ○

۲۵۔ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۭ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَاۗءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔـوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○

ترجمہ

۲۲۔ اگر کفار (سرزمین حدیبیہ میں) تم سے جنگ کرتے تو بہت جلد بھاگ

کھڑے ہوتے، اور پھر کوئی اپنا ولی اور یار و یاور نہ پاتے۔

۲۳۔ یہ سُنتِ الٰہی ہے جو پہلے بھی یہی تھی، اور تو کبھی بھی سنت الٰہی میں تغیر و تبدیلی نہ پائے گا۔

۲۴۔ وہ وہی تو ہے جس نے ان کا ہاتھ تم سے اور تمھارا ہاتھ اُن سے مکہ میں روک لیا، بعد اس کے کہ تمھیں ان پر فتح یاب کر دیا تھا، اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اُسے دیکھ رہا ہے۔

۲۵۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو کافر ہو گئے ہیں، اور تمھیں مسجد الحرام (کی زیارت) سے روکا ہے، اور تمھاری قربانیوں کے قُربان گاہ کی جگہ تک پہنچنے سے مانع ہُوئے، اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ صاحب ایمان مرد اور عورتیں تمھاری بے خبری میں تمھارے پاؤں تلے روندے جائیں گے، اور اس طرح سے ایک عار اور عیب لاشعوری طور پر تمھیں لگ جائے گا، (تو خدا ہرگز اس جنگ سے مانع نہ ہوتا) مقصد یہ تھا کہ خدا جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے، اور اگر مؤمنین اور کفار (مکہ میں) ایک دوسرے سے جدا اور الگ ہو جاتے، تو ہم کافروں پر دردناک عذاب کرتے۔

تفسیر

اگر حدیبیہ میں جنگ ہو جاتی

یہ آیات اسی طرح سے "حدیبیہ" کے عظیم ماجرے کے کچھ دوسرے پہلوؤں کو بیان کر رہی ہیں، اور اس

سلسلہ میں دو اہم نکتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

پہلا یہ کہ یہ خیال نہ کرو سرزمین "حدیبیہ" میں تمھارے اور مشرکین مکہ کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تو مشرکین جنگ میں بازی لے جاتے، ایسا نہیں ہے، اگر کفار تمھارے ساتھ وہاں جنگ کرتے تو بہت جلدی پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے، اور پھر کوئی ولی و یاور نہ پاتے"۔ (ولو قاتلکم الذین کفروا لولوا الادبار ثم لایجدون ولیا ولانصیرا)۔

☼ ☼ ☼

اور یہ بات صرف تم تک ہی منحصر نہیں ہے، " یہ تو ایک سُنت الٰہی ہے، جو پہلے بھی یہی تھی اور تم سنت الٰہی میں ہرگز تغیر و تبدیلی نہ پاؤ گے" (سنۃ اللہ التی قد خلت من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا)۔

یہ خدا کا ایک دائمی قانون ہے کہ اگر مومنین جہاد کے معاملہ میں کمزوری اور سستی نہ دکھائیں اور پاکیزہ دل اور خالص نیت کے ساتھ دشمنوں سے جنگ کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں، تو خدا انھیں کامیابی عطا کرتا ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات اس امر میں امتحان کے طور پر یا دوسرے مقاصد کے تحت دیر یا جلدی ہو جائے، لیکن آخری کامیابی یقیناً انہیں کے لیے ہوگی۔

لیکن ایسے مواقع پر جیسا کہ میدان "احد" ہوا کہ ایک گروہ نے پیغمبر خدا کے حکم سے سرتابی کی، اور ایک گروہ نے اپنی نیات کو عشق دنیا سے آلودہ کیا، اور غنائم جمع کرنے میں لگ گئے، انجام کار انھیں ایک تلخ شکست کا سامنا کرنا پڑا اور بعد میں بھی معاملہ ایسا ہی ہے۔

دوسرا اہم نکتہ جو یہ آیات خاص طور پر بیان کر رہی ہیں یہ ہے کہ کہیں قریش بیٹھ کر یہ نہ کہنے لگیں، کہ افسوس ہم نے جنگ کیوں نہ کی اور اس چھوٹے سے گروہ کی سرکوبی کیوں نہ کی، افسوس کہ شکار ہمارے گھر میں آیا اور اس سے ہم نے غفلت برتی، افسوس، افسوس۔

ہرگز ایسا نہیں ہے اگرچہ مسلمان ان کی نسبت تھوڑے سے تھے، اور وطن اور امن کی جگہ سے بھی دور تھے، اسلحہ بھی ان کے پاس کافی مقدار میں نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود اگر جنگ چھڑ جاتی تو پھر بھی قوت ایمانی اور نصرت الٰہی کی برکت سے کامیابی انھیں ہی حاصل ہوتی، کیا جنگ "بدر" اور "احزاب" میں ان کی تعداد بہت کم اور دشمن کا ساز و سامان اور لشکر زیادہ نہ تھا؟ ان دونوں مواقع پر دشمن کو کیسے شکست ہوگئی۔

بہر حال اس حقیقت کا بیان مومنین کے دل کی تقویت اور دشمن کے دل کی کمزوری اور منافقین کے "اگر" اور "مگر" کے ختم ہونے کا سبب بن گئی اور اس لیے اس بات کی نشاندہی کر دی کہ ظاہری طور پر حالات کے برابر نہ ہونے کے باوجود اگر جنگ چھڑ جائے تو کامیابی مخلص مومنین ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

دوسرا نکتہ جو ان آیات میں بیان ہوا ہے یہ ہے کہ فرماتا ہے "وہی تو ہے جس نے کفار کے ہاتھ کو مکہ ہی تم سے باز رکھا اور تمہارے ہاتھ کو ان سے، یہ اس وقت ہوا جبکہ تمہیں ان پر کامیابی حاصل ہو گئی تھی، اور خدا وہ سب کچھ جو تم انجام دے رہے ہو دیکھ رہا ہے"۔ (وھو الذی کف ایدیھم عنکم وایدیکم عنھم ببطن مکۃ من بعد ان اظفرکم علیھم وکان اللہ بما تعملون بصیرًا)۔

واقعًا یہ ماجرا "فتح المبین" کا واضح مصداق تھا، وہی تعریف جو قرآن نے اس کے لیے انتخاب کی تھی ایک محدود جمعیت، کافی جنگی سازوسامان کے بغیر دشمن کی سرزمین میں داخل ہو جائے، ایسا دشمن جس نے کئی بار مدینہ پر لشکر کشی کی تھی اور انہیں درہم برہم کرنے کے لیے ایک عجیب کوشش میں لگا ہوا تھا، لیکن اب جبکہ اس نے ان کے شہر و دیار میں قدم رکھ دیا ہے، تو اس طرح سے مرعوب ہوا کہ صلح کی پیش نہاد کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کامیابی کیا ہو گی کہ بغیر اس کے کہ کسی کی نکسیر پھوٹے، دشمن پر اس قسم کی برتری حاصل ہو جائے؟!

اس میں شک نہیں کہ "صلح حدیبیہ" کا ماجرا پورے جزیرہ عرب میں قریش کی شکست اور مسلمانوں کی فتح شمار ہوتا تھا، اور وہ اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ دشمن سے اس کا رعب و دبدبہ ختم کر دیں۔

مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کے لیے ایک "شان نزول" بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ:

مشرکین مکہ نے "حدیبیہ" کے واقعہ میں چالیس افراد کو مسلمانوں پر ضرب لگانے کے لیے مخفی طور پر حملہ کے لیے تیار کیا، لیکن ان کی یہ سازش مسلمانوں کی ہوشیاری سے نقش برآب ہو گئی، اور مسلمان ان سب کو گرفتار کر کے پیغمبرؐ کی خدمت میں لے آئے، اور پیغمبرؐ نے انہیں رہا کر دیا۔

بعض نے ان کی تعداد ۸۰ افراد لکھی ہے، جو تنعیم پہاڑ سے صبح کی نماز کے وقت تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں پر حملہ کریں۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درخت کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تاکہ قریش کے نمائندہ کے ساتھ صلح کے معاہدہ کو ترتیب دیں، اور علیؑ لکھنے میں مصروف تھے، تو جوانانِ مکہ میں سے ۳۰ افراد اسلحہ کے ساتھ آپ پر حملہ آور ہوئے، اور معجزانہ طور پر ان کی یہ سازش بے کار ہو گئی اور وہ سب کے سب گرفتار ہو گئے اور حضرتؐ نے انہیں آزاد کر دیا۔[1]

اس شان نزول کے مطابق من بعد ان اظفرکم علیھم کا جملہ اس گروہ پر کامیابی کی طرف اشارہ ہے، جبکہ سابقہ تفسیر کے مطابق کل لشکر اسلام کی کل مشرکین پر کامیابی مراد ہے اور یہ آیت کے معانی کے ساتھ زیادہ سازگار ہے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۹ صفحہ ۱۲۳۔ اس شان نزول کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ "قرطبی" "ابوالفتوح رازی" "آلوسی" نے "روح المعانی" میں و شیخ طوسی نے "تبیان" میں "مراغی" اور دوسروں نے بھی نقل کیا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مکّہ کے اندر نہ لڑنے پر تکیہ کرتا ہے، یہ تعبیر ممکن ہے دو نکتوں کی طرف اشارہ ہو:

پہلا یہ کہ: "مکّہ" دشمن کی قدرت کا مرکز تھا، اور قاعدے کے مطابق انھیں اس مناسب موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے تھا اور مسلمانوں پر حملہ کر دینا چاہیئے تھا، اور اصطلاح کے مطابق وہ تو مسلمانوں کو آسمان میں ڈھونڈ رہے تھے، جبکہ انھوں نے انہیں اپنی ہی زمین میں پا لیا تھا، تو انھیں آسانی کے ساتھ چھوڑنا نہیں چاہیئے تھا، لیکن خدا نے ان کی قدرت چھین لی۔

دوسرا یہ کہ تھا اور امن کا حرم تھا، اگر اس میں جنگ اور خون ریزی واقع ہو جاتی تو ایک طرف تو حرم کا احترام مخدوش ہو جاتا دوسری طرف مسلمانوں کے لیے عیب و عار کی بات تھی کہ انھوں نے اس مقدس سرزمین کے ستون امن کو درہم برہم کر دیا، للذا پیغمبر اور مسلمانوں پر خدا کی ایک عظیم نعمت یہ تھی کہ اس ماجرے کے دو سال بعد مکّہ "فتح ہو گیا، اور ہوا بھی کسی خون ریزی کے بغیر۔

آخری زیر بحث آیت میں صلح حدیبیہ کے مسئلہ اور اس کے فلسفہ سے مربوط ایک دوسرے نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وہ (تمھارے دشمن) ایسے لوگ ہیں جو کافر ہو گئے ہیں اور انھوں نے تمھیں مسجد حرام کی زیارت سے روک دیا ہے۔ اور تمھاری قربانیوں کی قربان گاہ کے مقام تک پہنچنے میں مانع ہوئے ہیں: (ھم الذین کفروا وصدوکم عن المسجد الحرام والھدی معکوفا ان یبلغ محلہ)۔[1]

ان کا ایک گناہ تو ان کا کفر تھا اور دوسرا گناہ یہ کہ تمھیں انھوں نے مراسم عمرہ اور طواف خانہ خدا سے روک دیا، اور تمھیں قربانی کے اونٹوں کو ان کے محل یعنی مکہ میں قربانی کی اجازت نہ دی، (محل قربانی عمرہ کے لیے مکہ ہے اور حج کے لیے سرزمین منیٰ) حالانکہ خانۂ خدا کو تمام اہل ایمان کے لیے آزاد ہونا چاہیئے اور اس سے روکنا بہت ہی بڑا گناہ ہے، جیسا کہ قرآن ایک دوسری جگہ پر کہتا ہے: "ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیھا اسمہ": (اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو لوگوں کو خدا کی مساجد میں خدا کا نام لینے سے باز رکھے"؟! (بقرہ - ۱۱۴)

ان گناہوں کا تقاضا یہ تھا کہ خدا انہیں تمھارے ہاتھ سے سزا دیتا اور سخت عذاب کرتا۔

لیکن ایسا کیوں نہ کیا؟ آیت کے متن نے اس کی دلیل کو واضح کر دیا ہے فرماتا ہے: "اگر یہ وجہ نہ ہوتی کہ صاحب ایمان مرد اور عورتیں اسی دوران میں تمھاری لاعلمی اور بے خبری میں تمھارے رگڑے میں آکر ہلاک ہو جاتے، اور اس طریقہ سے بغیر اطلاع کے عیب و عار تمھارے دامن گیر ہو جاتا، تو خداوند عالم ہرگز اس جنگ سے مانع نہ ہوتا، اور تمھیں ان پر مسلط کر دیتا تاکہ وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ جائیں۔

(ولولا رجال مؤمنون ونساء مؤمنات لم تعلموھم ان تطئوھم

---

[1] "معکوفا" "معکوف" کے مادہ سے چلنے سے منع کرنے اور ایک محل میں رہنے کے معنی میں ہے۔

فتصیبکم منھم معرۃ بغیر علم)۔ ۱

یہ آیت مسلمان مردوں اور عورتوں کے اس گروہ کی طرف اشارہ ہے، جو اسلام تو لے آیا تھا، لیکن کئی ایک علل و اسباب کی بناء پر وہ ہجرت کرنے پر قادر نہ ہوئے تھے، اور مکہ ہی میں رہ گئے تھے۔

اگر مسلمان مکہ پر حملہ کرتے تو مسلمانوں کے اس کمزور گروہ کی جان مکہ میں خطرے میں پڑ جاتی اور مشرکین کی زبان کھل جاتی اور وہ یہ کہتے کہ لشکرِ اسلام نہ اپنے مخالفین پر رحم کرتا ہے اور نہ ہی اپنے پیروکاروں اور موافقت کرنے والوں پر، اور یہ ایک بہت بڑا عیب اور عار ہوتا۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس عیب سے مراد کفارہ اور قتلِ خطاء کی دیت کا واجب و لازم ہوتا ہے، لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

"معرۃ" "عر" (بروزن شر) کے مادہ سے اور "عر" (بروزن حر) اصل میں کھجلی اور خارش کی بیماری کے معنی میں ہے جو ایک قسم کا جلد کا شدید عارضہ ہے، جو انسان یا حیوانات کو عارض ہوتا ہے اس کے بعد اس کو وسعت دے دی گئی، اور ہر قسم کے زیان و ضرر پر، جو انسان کو پہنچتا ہے، اس کا اطلاق ہوا ہے۔

اس کے بعد اس بات کی تکمیل کے لیے مزید کہتا ہے، "مقصد یہ تھا کہ خدا جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے": (لیدخل اللہ فی رحمتہ من یشاء)۔

ہاں! خدا چاہتا تھا کہ "مکہ" کے کمزور و ناتواں مومنین کو اپنی رحمت کا شمول کرے اور انہیں کوئی صدمہ نہ پہنچے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ "صلح حدیبیہ" سے ایک مقصد یہ تھا کہ مشرکین کا ایک گروہ جو ہدایت کے قابل تھا ان کی ہدایت ہو جائے اور وہ رحمتِ خدا میں داخل ہو جائے۔

"من یشاء" (جسے چاہے) کی تعبیر ان لوگوں کے معنی میں ہے جو شائستگی اور لیاقت رکھتے ہیں، کیونکہ مشیت الٰہی کا سرچشمہ ہمیشہ اس کی حکمت ہوتی ہے اور حکیم بغیر دلیل کے ارادہ نہیں کرتا، اور بغیر حساب کے کوئی کام انجام نہیں دیتا۔

اور آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے "اگر مومنین کی صفیں مکہ میں کفار سے جدا ہو جاتیں، اور مکہ کے مومنین کے ختم ہو جانے کا خوف نہ ہوتا، تو ہم کفار کو دردناک عذاب کی سزا دیتے اور انہیں تمہارے ہاتھ سے سخت سزا دیتے"۔ (لو تزیلوا لعذبنا الذین کفروا منھم عذابا الیما)۔

یہ ٹھیک ہے کہ خدا معجزانہ طور پر اس گروہ کو دوسروں سے جدا کر سکتا تھا، لیکن پروردگار کی سنت، استثنائی موقعوں کے سوا، کاموں کو عادی اسباب سے انجام دینا ہے۔

---

۱ "لولا" کا جواب اور پروائے جملہ میں محذوف ہے، اور تقدیر میں اس طرح تھا: لما کف ایدیکم عنھم۔ یا۔ لو طئتم رقاب المشرکین بنصرنا ایاکم، ہماری نصرت سے تم مشرکین کی گردنیں مروڑ دیتے۔

"تزیلوا" "زوال" کے مادہ سے یہاں جُدا اور متفرق ہونے کے معنی میں ہے۔

متعدد روایات سے جو شیعہ اور اہل سنت کے طرق سے اس آیت کے ذیل میں نقل ہوئی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ صاحب ایمان افراد تھے جو کفار کی صلب میں موجود تھے، خدا نے ان کی وجہ سے کفار کو عذاب نہیں کیا۔

منجملہ ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے۔

کسی نے امامؑ سے سوال کیا، کیا علیؑ دین خدا میں قوی اور با قدرت نہ تھے؟ امامؑ نے فرمایا: ہاں قوی تھے، اس نے عرض کیا، تو پھر ان (بے ایمان اور منافق) اقوام پر مسلط ہو جانے کے باوجود انھیں نابود کیوں نہ کیا؟ اس میں کون سی چیز مانع تھی؟

آپؑ نے فرمایا: قرآن مجید کی ایک آیت!

اس نے سوال کیا، کونسی آیت؟

آپؑ نے فرمایا یہ آیت جس میں خدا فرماتا ہے:

"لو تزیلوا لعذبنا الذین کفروا منھم عذابا الیما"

"اگر وہ جدا ہو جاتے تو ہم کافروں کو دردناک عذاب کرتے"۔

پھر آپؑ نے مزید فرمایا۔

"انہ کان اللہ عزوجل ودائع مومنون فی اصلاب قوم کافرین ومنافقین، ولم یکن علی ع لیقتل الاباء حتی تخرج الودائع! ..... وکذالک قائمنا اھل البیت لن یظھر ابدا حتی تظھر ودائع اللہ عزوجل!

"خدا کی کچھ ایمان والی امانتیں کفار اور منافقین کے صلبوں میں تھیں، اور علیؑ ان آباء کو قتل نہیں کرتے تھے جب تک کہ یہ امانتیں ظاہر نہ ہو لیں ...... اور اسی طرح ہم اہل بیت کے قائم ظاہر نہیں ہوں گے جب تک کہ یہ امانتیں ظاہر نہ ہو جائیں"۔[1]

یعنی خدا جانتا ہے کہ ان کی اولاد میں سے ایک گروہ اپنے ارادہ و اختیار سے ایمان قبول کرے گا اور انہیں کی وجہ سے ان کے باپ دادا کو جلدی کے عذاب سے معاف کیے ہوئے ہے۔

اس معنی کو "قرطبی" نے ایک دوسری عبارت کے ساتھ اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔

اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ اوپر والی آیت مومنین مکہ کے کفار سے اختلاط کے معنی میں بھی ہو اور ان مومنین کے بارے میں بھی ہو جو ان کی صلب میں موجود تھے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۰، دیگر متعدد روایات بھی۔

۲۶۔ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۧ

ترجمہ

۲۶۔ اس وقت کو یاد کرو جب کافر اپنے دلوں میں جاہلیّت کا غصہ اور نخوت رکھتے تھے، اور (اس کے مقابل میں) خدا نے اپنے رسُول اور مومنین پر قرار اور وقار نازل کیا، اور ان کے لیے تقوٰی کو لازم قرار دیا، کیونکہ وہ ہر شخص سے زیادہ شائستہ، لائق اور اس کے حق دار اور اہل تھے اور خدا ہر چیز کو جانتا ہے۔

تفسیر

تعصب اور حمیت جاہلیت، کفّار کے لیے بزرگ ترین سدِ راہ

ان آیات میں پھر حدیبیہ کے ماجرے سے مربوط مسائل بیان کیے جا رہے ہیں اور اس عظیم ماجرے کے دوسرے مناظر کو مجسم کر رہا ہے۔

پہلے کفار کو خدا و پیغمبر پر ایمان لانے اور حق و عدالت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے روکنے والے ایک اہم ترین عامل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "اس وقت کو یاد کرو جب کافر اپنے دلوں میں جاہلیت کا غصہ اور نخوت رکھتے تھے" (اذ جعل الذین کفروا فی قلوبھم الحمیۃ حمیۃ الجاھلیۃ)۔

اور اس کی وجہ سے پیغمبر اور مومنین کے خانۂ خدا میں داخل ہونے، اور عمرہ و قربانی کے مراسم کے انجام دینے سے مانع ہوئے، اور یہ کہا کہ اگر یہ لوگ جنہوں نے میدان جنگ میں ہمارے آباؤ اجداد اور بھائیوں کو قتل کیا ہے، ہماری سرزمین اور ہمارے گھروں میں وارد ہوں اور صحیح و سالم پلٹ جائیں تو عرب ہمارے بارے میں کیا کہیں گے اور ہماری کیا حیثیت اور اعتبار باقی رہ جائے گا؟

یہی کبر و غرور و تعصب اور خشم جاہلی، اس بات تک سے مانع ہوا کہ "حدیبیہ" کے صلح نامہ کی ترتیب و تنظیم کے وقت خدا کا نام "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کی صورت میں لکھا جانا قبول کریں، حالانکہ وہ خود بھی کہتے تھے کہ خانۂ خدا کی زیارت سب کے لیے جائز ہے اور سرزمین مکہ حرم امن ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ کے قاتل کو اس سرزمین میں یا حج و عمرہ کے مراسم میں دیکھتا تھا تو اس سے مزاحم نہ ہوتا تھا۔

انہوں نے اس عمل کے ذریعہ خانہ خدا اور اس کے حرم امن کے احترام کو بھی توڑا، اور اپنے سُنن و آداب کو بھی زیر پا روندا، اور اپنے اور حقیقت کے درمیان ایک ضخیم پردہ بھی کھینچ دیا، اور "جاہلیت کی حمیتوں کے برگ و بار اثرات ایسے ہی ہوتے ہیں۔

• "حمیت" اصل میں "حمی" (بروزن حمد) کے مادہ سے اُس حرارت کے معنی میں ہے، جو آگ یا سورج یا انسانی بدن اور اسی طرح کی دوسری چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی بنا پر "بخار" کی حالت کو "حمیٰ" (بروزن کبریٰ) کہا جاتا ہے، اور غیض و غضب کی حالت کو، اسی طرح نخوت اور "خشم آلود تعصب" کو بھی "حمیت" کہتے ہیں۔

یہ ایسی حالت ہے جو جہالت، کوتاہی فکر اور علمی انحطاط کے زیر اثر خصوصیت کے ساتھ جاہل قوموں میں بہت زیادہ ہوتی ہے اور ان کی بہت سی جنگوں اور خون ریزیوں کا سبب بنتی ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: اس کے مقابلہ میں "خدا نے اپنے رسول اور مومنین پر اپنا اطمینان اور قرار نازل فرمایا" (فانزل اللہ سکینتہ علیٰ رسولہ وعلی المومنین)۔

اس آرام و سکون نے، جو خدا پر ایمان اور اعتقاد اور اس کے لطف سے پیدا ہوا تھا، انہیں ضبط اور نفس پر

۱؎ "جعل" کبھی ایک مفعول لیتا ہے، اور جب اس موقع پر ہوتا ہے جب "ایجاد" کے معنی میں ہو، جیسا کہ زیر بحث آیت میں کہ اس کا فاعل "الذین کفروا" ہے، اور اس کا مفعول "الحمیۃ" ہے، اور یہاں ایجاد سے مراد اس حالت کی حفاظت، اور اس کی پابندی اور لازم بنانا ہے، اور کبھی دو مفعول لیتا ہے، اور وہ اس جگہ ہوتا ہے جہاں ہونے کے معنی میں ہو۔

تسلط کی دعوت دی اور ان کے غصہ کی آگ کو ٹھنڈا کردیا، یہاں تک کہ اپنے بزرگ مقاصد کی حفاظت کے لیے تیار ہو گئے۔
اور "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے جملہ کو ہٹا کر جو کاموں کے شروع کرنے کے لیے اسلام کی نشانی تھا۔ اس کی جگہ "بسمک اللھم" جو عربوں کے ماضی دور کی یادگار تھی، حدیبیہ کے صلح نامہ کے آغاز میں لکھنے پر آمادہ ہو گئے یہاں تک کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محترم نام کے ہمراہ "رسول اللہ" کا لقب حذف کرنے پر بھی تیار ہو گئے اور اس عشق اور دلی تعلق کے برخلاف۔ جو وہ خانہ خدا کی زیارت اور مراسم عمرہ سے رکھتے تھے۔ اسی حدیبیہ سے مدینہ کی طرف لوٹ جانے پر آمادہ ہو گئے اور اپنے قربانی کے اونٹ جو عمرہ کی سنت کے برخلاف اسی جگہ قربان کرکے اور انجام مناسک کے بغیر ہی احرام سے باہر نکل آنے پر تیار ہو گئے۔

ہاں! وہ ضبطِ نفس کرنے، اور ان تمام ناخوشگوار اور خلافِ طبیعت امور کے مقابلہ میں صبر و شکیبائی اختیار کرنے پر آمادہ و تیار ہو گئے، حالانکہ اگر "حمیت جاہلیت" ان پر غالب آجاتی، تو ان میں سے ہر ایک چیز اس سرزمین میں جنگ کی آگ بھڑکانے کے لیے کافی تھی۔

ہاں! جاہلیت کا تمدن، "حمیت" و "تعصب" اور جاہلانہ "غیض و غضب" کی دعوت دیتا ہے، لیکن اسلام کا تہذیب و تمدن "قرار" و "آرام" اور "ضبطِ نفس" کی طرف بلاتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "خدا نے ان کے لیے تقویٰ کو لازم و واجب قرار دے دیا، اور وہ ہر شخص سے زیادہ اس کے حقدار، لائق شائستہ اور اہل تھے": والزمھم کلمة التقوی وکانوا احق بھا و اھلھا)۔

"کلمة" یہاں "روح" کے معنی میں ہے، یعنی خدا نے تقویٰ کی روح ان کے دلوں میں ڈال دی اور ان کے ہمراہ کر دی، جیسا کہ سورۂ نساء کی آیہ ۱۷۱ میں عیسیٰ کے بارے میں آیا ہے:؛ انما المسیح عیسی ابن مریم رسول اللہ وکلمتہ القاھا الی مریم وروح منہ۔ مسیح صرف خدا کے بھیجے ہوئے (رسول) اس کا کلمہ اور اس کی طرف سے ایک روح ہے جسے مریم پر القا فرمایا ہے۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "کلمہ تقویٰ" سے مراد وہ دستور و فرمان ہے، جو خدا نے اس سلسلہ میں مومنین کو دیا ہے۔ لیکن مناسب وہی "روح تقویٰ" ہے جو "تکوینی" پہلو رکھتا ہے اور ایمان و قرار اور احکام خداوندی سے تعلق قلبی کی پیداوار ہے۔

لہٰذا بعض روایات میں جو پیغمبر گرامی اسلامؐ سے نقل ہوئی ہیں، "کلمہ تقویٰ" کی "لا الہ الا اللہ" کے ساتھ [1] اور ایک روایت میں جو امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے: "ایمان" کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے۔ [2]

پیغمبر گرامیؐ کے ایک خطبہ میں یہ آیا ہے:

"نحن کلمة التقوی وسبیل الھدی"؛

---

[1] دُرِ المنثور جلد ۶ ص ۸۰۔

[2] "اصول کافی" مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۷۳

" ہم تقویٰ کا کلمہ اور ہدایت کی راہ ہیں " [1]

اسی معنی کے مشابہ امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے بھی نقل ہوا ہے۔

آپ نے فرمایا :

" نحن کلمة التقوىٰ والعروة الوثقىٰ "

" ہم کلمہ تقویٰ اور خدا کی مضبوط رسی ہیں۔ [2]

یہ بات واضح ہے کہ " نبوت " و " ولایت " پر ایمان لانا، اصل " توحید " اور معرفت خداوندی کی تکمیل کرتا ہے، کیونکہ وہ سب ہستیاں اللہ کی طرف دعوت دینے والی، اور توحید کی منادی کرنے والی ہیں۔

بہرحال مسلمان ان حساس لمحات میں، خشم و عصبانیت اور تعصب و نخوت میں گرفتار نہیں ہوئے، اور وہ درخشاں سرنوشت جو خدا نے ماجرائے حدیبیہ میں ان کے لیے رقم کی تھی، اُسے اُنھوں نے جہالت اور غصہ کی آگ سے نہیں جلایا۔

کیونکہ وہ کہتا ہے " مسلمان تقویٰ کے سب سے زیادہ سزاوار اور لائق تھے، اور اس کے اہل اور حق دار تھے۔"

یہ بات ظاہر و واضح ہے کہ مٹھی بھر بے ہودہ، نادان اور بت پرست جمعیت سے " جاہلیت کی حمیت " کے سوا اور کسی چیز کی توقع نہیں تھی، لیکن ان موحد مسلمانوں سے جو ایک عرصہ سے مکتب قرآن میں تربیت پا چکے تھے، اس قسم کی عادت اور جاہلانہ خلق کی امید نہ تھی۔ ان سے جس چیز کی توقع تھی وہ وہی وقار و تقویٰ اور صبر و قرار تھا جس کا انھوں نے "حدیبیہ" میں اظہار کیا۔ اگرچہ قریب تھا کہ بعض بے صبرے تند مزاج، جو شاید گزشتہ زمانہ کی رسوم و عادات کے عادی تھے، اس سد کو توڑ دیں اور کوئی جھگڑا کھڑا کر دیں، لیکن پیغمبر کا اطمینان اور وقار پانی کی طرح اس آگ پر پڑا، اور اُسے خاموش کر دیا۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے۔ " اور خدا ہر چیز سے آگاہ اور اس کا عالم تھا اور ہے": (وکان اللہ بکل شیء علیما)۔

وہ کفار کی بُری نیتوں کو بھی جانتا ہے، اور سچے مومنین کے دلوں کی پاکیزگی کو بھی، یہاں پر تو وہ اطمینان و تقویٰ کو نازل کرتا ہے اور وہاں جاہلیت کی حمیت کو مسلط کر دیتا ہے کیونکہ خدا ہر قوم و ملت کو ان کی لیاقت و قابلیت کے مطابق ہی اپنے لطف و رحمت کا مشمول قرار دیتا ہے یا اپنے خشم و غضب کا۔

---

[1] خصال صدوق نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۔

[2] خصال صدوق نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۔

ایک نکتہ

حمیت جاہلیت کیا ہے؟

ہم بیان کر چکے ہیں کہ "حمیت" اصل میں "حمی" کے مادہ سے حرارت کے معنی میں ہے، اور اس کے بعد غضب کے معنی میں اور بعد میں نخوت و غضب کی آمیزش رکھنے والے تعصب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

یہ لفظ کبھی تو اسی مذموم معنی میں (جاہلیت کی قید کے ساتھ یا اس کے بغیر) اور بعض اوقات ممدوح اور پسندیدہ معنی میں استعمال ہوتا ہے اور منطقی غیرت اور مثبت اور اصلاحی امور میں ڈٹ جانے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

امیر المومنین علیؑ اپنے سست عنصر اور سرکش ساتھیوں پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"منيت بمن لا يطيع اذا امرت ولا يجيب اذا دعوت ...... اما دين يجمعكم ولا حمية تحمشكم"

"میں ایسے لوگوں میں پھنس گیا ہوں، جنہیں اگر حکم دیتا ہوں تو وہ اطاعت نہیں کرتے، اور اگر دعوت دیتا ہوں تو قبول نہیں کرتے ...... کیا تم دین نہیں رکھتے ہو، جو تمہیں اکٹھا کرے؟ یا ایسی غیرت جو تمہیں غصہ میں لے آئے (اور تمہیں اپنی ذمہ داری پورا کرنے پر آمادہ کردے)[1]

لیکن یہ عام طور پر اسی مذموم معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ امیر المومنین علی علیہ السلام نے خطبہ "قاصعہ" میں بارہا اس معنی میں استعمال کیا ہے اور ابلیس کی مذمت میں جو متکبرین کا پیشوا تھا۔ فرماتے ہیں۔

"صدقه به ابناء الحمية واخوان العصبية وفرسان الكبر والجاهلية"

"اس کی نخوت و حمیت کے بیٹوں اور عصبیت کے بھائیوں اور کبر و جہالت کے مرکب کے سواروں نے تصدیق کی ہے۔"[2]

اسی خطبہ میں ایک دوسری جگہ، جہاں آپ لوگوں کو جاہلیت کے تعصبات سے ڈرا رہے ہیں، فرماتے ہیں:

"فاطفئوا ما كمن فى قلوبكم من نيران العصبية واحقاد

---

[1] خطبہ ۳۹۔

[2] ۱۹۲ (خطبہ قاصعہ)

الجاهلية، فانما تلك الحمية تكون في المسلم من خطرات الشيطان ونخواته ونزعاته ونفثاته!؟

" تعصب کے وہ شرارے اور جاہلیت کے وہ کینے جو تمہارے دلوں میں ہیں انہیں بجھا دو، کیونکہ یہ نخوت وحمیت اور ناروا تعصب مسلمانوں میں شیطان کی نخوت اور وسوسوں میں سے ہے۔" [1]

بہر حال اس میں شک نہیں ہے کہ کسی فرد یا جماعت میں اس قسم کی حالت کا ہونا اُس معاشرے کی پسماندگی اور گراوٹ کا باعث ہے۔ یہ انسان کی عقل وفکر پر سنگین پردے ڈال دیتا ہے اور اُسے صحیح ادراک اور کامل سوجھ بوجھ سے باز رکھتا ہے اور بعض اوقات اس کے تمام مصالح کو برباد فنا کے سپرد کر دیتا ہے۔

اصولی طور پر ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف غلط رسومات اور طریقوں کا منتقل ہونا اسی طرفداری جاہلیت کے منحوس سائے میں صورت پذیر ہوتا ہے، اور انبیاء اور خدائی رہبروں اور پیشواؤں کے مقابلہ میں منحرف اقوام کی مخالفت بھی عام طور پر اسی راستہ سے ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں امام علی بن الحسین علیہ السلام سے بیان ہوا ہے کہ جب آپؑ سے کسی نے "عصبیت" کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا:

" العصبية التي يأثم عليها صاحبها ان يرى الرجل شرار قومه خيرا من خيار قوم آخرين وليس من العصبية ان يحب الرجل قومه ولكن من العصبية ان يعين قومه على الظلم"

" وہ تعصب جو گناہ کا موجب ہے یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اپنی قوم کے بُرے افراد کو دوسری قوم کے نیک اور اچھے افراد سے برتر سمجھے، لیکن اپنی قوم سے محبت کرنا اور انہیں دوست رکھنا تعصب نہیں ہے۔ تعصب یہ ہے کہ ظلم وستم میں ان کی مدد کرے۔" [2]

اس بُری عادت سے لڑنے، اور اس عظیم مہلکہ سے نجات حاصل کرنے کا بہترین راستہ، ہر قوم اور ہر معاشرے کی فکر و ایمان، اور تہذیب وتمدن کی سطح کو اونچا کرنے کے لیے کوشش کرنا ہے۔

درحقیقت قرآن مجید نے اس درد کی دوا اسی زیر بحث آیت میں بیان کی ہے، جہاں

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۲ (خطبہ قاصعہ)

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۲، حدیث ۷۔

وہ اس کے نقطۂ مقابل میں مومنین کے بارے میں بحث کرتا ہے، کہ وہ اطمینان و وقار اور روحِ تقوٰی کے حامل ہیں اور اس بنا پر جہاں ایمان، اطمینان اور تقوٰی ہے، وہاں حمیّت جاہلیت نہیں ہے، اور جہاں حمیّت جاہلیت ہے، وہاں ایمان، اطمینان اور تقوٰی نہیں ہے۔

۲۷۔ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۚ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ○

ترجمہ

۲۷۔ خدا نے جو کچھ اپنے رسول کو خواب کے عالم میں دکھایا وہ سچ تھا، انشاءاللہ تم سب کے سب قطعی طور پر، انتہائی امن وامان کے ساتھ، اس حالت میں کہ تم اپنے سروں کو منڈواتے ہوئے ہوں گے یا اپنے ناخنوں کو کٹواتے ہوئے ہوں گے، مسجد الحرام میں داخل ہوں گے، اور کسی شخص سے تمہیں کوئی خوف و وحشت نہ ہوگی، لیکن خدا کچھ ایسی چیزوں کو جانتا ہے جنہیں تم نہیں جانتے (اور اس تاخیر میں ایک حکمت تھی) اور اس سے پہلے اس نے (تمہارے لیے) ایک قریب کی فتح قرار دی۔

تفسیر

پیغمبرؐ کا سچا خواب

یہ آیت بھی داستان "حدیبیہ" کے ایک اور گوشہ کی تصویر کشی کررہی ہے۔ قصہ یہ تھا:

پیغمبرؐ نے مدینہ میں ایک خواب دیکھا کہ آپ اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کے مناسک ادا کرنے کے لیے مکہ میں داخل ہورہے ہیں اور اس خواب کو صحابہ کے سامنے بیان کردیا، وہ سب کے سب شاد و خوش حال ہوئے لیکن چونکہ ایک جماعت یہ خیال کرتی تھی کہ اس خواب کی تعبیر اسی سال پوری ہوگی، تو جس وقت قریش نے مکہ میں ان کے داخل ہونے کا راستہ حدیبیہ میں ان کے آگے بند کردیا تو وہ شک و تردید میں مبتلا ہوگئے، کہ کیا پیغمبرؐ کا خواب غلط بھی ہوسکتا ہے، کیا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم خانہ خدا کی زیارت سے مشرف ہوں گے؟ پس اس وعدہ کا کیا ہوا؟ اور وہ رحمانی خواب کہاں چلا گیا؟

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سوال کے جواب میں فرمایا، کیا میں نے تمھیں یہ کہا تھا کہ یہ خواب اسی سال پورا ہوگا؟

اوپر والی آیت اسی بارے میں مدینہ کی طرف بازگشت کی راہ میں نازل ہوئی، اور تاکید کی کہ یہ خواب سچا تھا، اور ایسا مسئلہ حتمی و قطعی اور انجام پاجانے والا ہے۔

فرماتا ہے: "خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو خواب میں جو کچھ دکھلایا تھا وہ سچ اور حق تھا": (لقد صدق اللّٰہ رسولہ الرؤیا بالحق)۔[1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "انشاء اللہ تم سب کے سب قطعی طور پر، انتہائی امن و امان کے ساتھ، اس حالت میں کہ تم اپنے سروں کو منڈواتے ہوئے ہوں گے۔ یا اپنے ناخنوں کو کٹوائے ہوئے ہوں گے مسجد الحرام میں داخل ہوں گے۔ اور کسی شخص سے تمھیں کوئی خوف و وحشت نہ ہوگی" (لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللّٰہ اٰمنین محلقین رؤسکم و مقصرین لاتخافون)۔

"لیکن خدا اس چیز کو جانتا ہے جسے تم نہیں جانتے" (فعلم مالم تعلموا)۔

---

[1] "صدق" فعل ماضی ہے۔ جس کے بعض اوقات دو مفعول ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر والی آیت میں "رسولہ" مفعول اول ہے، اور "رؤیا" مفعول دوم ہے، لیکن عام طور پر مفعول دوم "فی" کے واسطے ہوتا ہے، مثلاً "صدقتہ فی حدیثہ" میں نے اس کی گفتگو میں تصدیق کی۔

اس تاخیر میں ایک حکمت تھی" اس سے پہلے ایک قریب کی فتح قرار دے دی" (فجعل من دون ذالک فتحًا قریبًا)۔

اس آیت میں کچھ قابل توجہ نکات

(۱) اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "لقد خلق" میں "لام" "قسم کا لام ہے" اور اس کے آخر "نون" تاکید کے لیے، یہ آئندہ کے بارے میں ایک قطعی و یقینی وعدہ ہے اور انتہائی امن وامان کے ساتھ مراسم عمرہ کے انجام دینے کے بارے میں ایک صریح معجزانہ پیشین گوئی ہے، اور جیسا کہ ہم بیان کریں گے، ٹھیک آئندہ سال اسی ماہ ذی القعدہ میں یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی، اور مسلمانوں نے عمرہ کے مراسم اسی صورت میں انجام دیئے۔

(۲) "ان شاءاللہ" کا جملہ یہاں ممکن ہے بندوں کے لیے ایک قسم کی تعلیم ہو، کہ وہ آئندہ کے بارے میں کچھ کہتے وقت خدا کی مشیت وارادہ پر تکیہ کرنے کو فراموش نہ کریں اور اپنے آپ کو اپنے کاموں میں مستقل اور اس کے لطف سے بے نیاز نہ سمجھیں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایسے افراد کی طرف اشارہ ہو، جو خدا نے اس موفقیت (مستقبل قریب میں خانہ خدا کی زیارت کی توفیق) کے لیے قرار دیئے ہیں، اور وہ توحید، اطمینان اور وقار وتقویٰ پر باقی رہنے کا طریقہ طریقہ ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایسے افراد کی طرف اشارہ ہو، جن کی عمر کی مدت اس دوران میں ختم ہو جائے گی، اور وہ اس زیارت کے انجام دینے پر موفق نہیں ہوں گے اور ان معانی کے درمیان جمع کرنا پورے طور پر ممکن ہے۔

(۳) بہت سے مفسرین کے نظریہ کے مطابق "فتحًا قریبًا" کی تعبیر اسی "صلح حدیبیہ" کی طرف ہی اشارہ ہے، جس کو قرآن نے "فتح مبین" کہا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہی فتح بعد والے سال میں مسجد الحرام میں داخل ہونے کی تمہید تھی۔

جبکہ ایک دوسرا گروہ اسے "فتح خیبر" کی طرف اشارہ سمجھتا ہے۔ البتہ "قریبًا" کا لفظ "فتح خیبر" کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ وہ اس خواب کے پورا ہونے میں بہت کم فاصلہ رکھتا تھا۔

اس کے علاوہ اسی سورہ کی آیت ۱۸ میں جس میں "بیعت رضوان" کا بیان ہے، یہ آیا ہے "فانزل السکینة علیھم واثابھم فتحًا قریبًا"

اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے اور اکثر مفسرین کا نظریہ بھی یہی ہے کہ اس سے مراد "فتح خیبر" ہے، آیت

ہیں موجود قرائن بھی یہی بات حکایت کرتے ہیں، اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ زیر بحث آیت اس کے ہم آہنگ ہوگی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔[1]

تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔[2]

(۴) "محلقین رؤسکم و مقصرین" (درآں حالیکہ سروں کو منڈواتے ہوئے اور ناخن کٹواتے ہوئے ہوگے) کا جملہ مراسم عمرہ کے آداب میں سے ایک کی طرف اشارہ ہے، جسے "تقصیر" کہتے ہیں اور اس کے ذریعہ محرم، احرام سے باہر نکل آتا ہے اور بعض اس آیت کو مسئلہ تقصیر اور احرام سے باہر نکلنے میں "تخییر" کی دلیل سمجھتے ہیں، کیونکہ محرم سر بھی منڈوا سکتا ہے یا اپنے ناخن کٹوا سکتا ہے، ان دونوں کے درمیان جمع قطعاً اور یقیناً واجب نہیں ہے۔

(۵) "فعلم ما لم تعلموا" (خدا ان باتوں کو جانتا تھا، جو تمہیں معلوم نہیں تھیں) کا جملہ ان اہم اسرار کی طرف اشارہ ہے جو "صلح حدیبیہ" میں چھپے ہوئے تھے اور زمانے کے گزرنے کے ساتھ آشکار ہوئے، اسلام کی بنیادیں مضبوط ہوئیں اور اسلام کی شہرت ہر جگہ پھیل گئی، اور مسلمانوں پر جنگ کے طالب ہونے اور اسی طرح کی دوسری تہمتیں ختم ہوگئیں اور مسلمان فارغ البالی کے ساتھ "خیبر" کو فتح کرنے اپنے مبلغین "جزیرۃ العرب" کے اطراف میں بھیجنے، اور پیغمبرؐ اپنے تاریخی خطوط اس زمانہ کی دنیا کے بڑے بڑے صاحبان اقتدار کو ارسال کرنے پر قادر ہوگئے۔ یہ ایسے مطالب تھے جن سے عام لوگ آگاہ ہی نہیں رکھتے تھے اور صرف خدا ہی اس سے آگاہ تھا۔

(۶) ہمارا اس آیت میں مسئلہ "رؤیا" سے سامنا ہوتا ہے، پیغمبرؐ کا وہی رویائے صادقہ جو وحی کی ایک شاخ ہے، اسی کے مشابہ جو ابراہیمؑ اور ان کے فرزند اسماعیلؑ کے ذبح ہونے کے بارے میں آیا ہے۔ (صافات آیہ ۱۰۲)
(رؤیا اور خواب دیکھنے کے بارے میں مزید تشریح جلد نہم میں یوسفؑ کی داستان میں صفحہ ۲۰۵ پر مطالعہ فرمائیں)

(۷) زیر بحث آیت قرآن کے غیبی اخبار میں سے ایک، اور اس کتاب کے آسمانی ہونے کے شواہد میں سے ہے، اور پیغمبر گرامی اسلامؐ کے معجزات میں سے بھی ہے۔ جو اس قاطعیت اور تاکید کے ساتھ مسجد الحرام میں داخل ہونے اور مستقبل قریب میں مراسم عمرہ بجالانے کی خبر دیتی ہے اور اس سے پہلے فتح قریب اور نزدیکی کامیابی کی خبر بھی دیتی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ دونوں پیشین گوئیاں پوری ہوگئیں، فتح خیبر کی داستان آپ پہلے سن چکے ہیں، اب "عمرۃ القضاء" کی داستان بھی سن لیں۔

---

[1] "من دون ذالک" کی تعبیر یا تو "قبل ذالک" کے معنی میں ہے۔ یعنی بعد والے سال میں عمرہ سے پہلے خدا مومنین کو ایک فتح قریب نصیب کرے گا۔ یا "غیر ذالک" کے معنی میں ہے۔ یعنی خانہ خدا کی زیارت کی توفیق کے علاوہ ان کے لیے ایک فتح قریب بھی قرار دے گا۔

[2] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۷۰۔

عمرۃ القضاء

"عمرۃ القضاء" وہی عمرہ ہے جو پیغمبر نے حدیبیہ سے ایک سال بعد یعنی ہجرت کے ساتویں سال کے ماہ ذی القعدہ میں (اس سے ٹھیک ایک سال بعد جب مشرکین نے آپ کو مسجد الحرام میں داخل ہونے سے روکا تھا) اپنے اصحاب کے ساتھ انجام دیا، اور اس کا یہ نام اس وجہ سے ہے، چونکہ یہ حقیقت میں گزشتہ سال کی قضا شمار ہوتا تھا۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ، قرار داد حدیبیہ کی شقوں میں سے ایک شق کے مطابق پروگرام یہ تھا کہ مسلمان آئندہ سال مراسم عمرہ اور خانہ خدا کی زیارت آزادانہ طور پر انجام دیں لیکن تین دن سے زیادہ مکہ میں توقف نہ کریں اور اس مدت میں قریش کے سردار اور مشرکین کے جانے پہچانے افراد شہر سے باہر چلے جائیں گے (تاکہ ایک تو احتمالی ٹکراؤ سے بچ جائیں اور کینہ پروری اور تعصب کی وجہ سے جو لوگ مسلمانوں کی عبادت توحیدی کے منظر کو دیکھنے کا یارا اور قدرت نہیں رکھتے، وہ بھی اسے نہ دیکھیں)

بعض تواریخ میں آیا ہے کہ پیغمبر نے اپنے صحابہ کے ساتھ احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ لے کر چل پڑے اور "ظہران" کے قریب پہنچ گئے اس موقع پر پیغمبر نے اپنے ایک صحابی کو جس کا نام "محمد بن مسلمہ" تھا، عمدہ سواری کے گھوڑوں اور اسلحہ کے ساتھ اپنے آگے بھیج دیا، جب مشرکین نے اس پروگرام کو دیکھا تو وہ سخت خوف زدہ ہوئے اور انھوں نے یہ گمان کر لیا کہ حضرت ان سے جنگ کرنا اور اپنی دس سالہ صلح کی قرار داد کو توڑنا چاہتے ہیں، انھوں نے یہ خبر اہل مکہ تک پہنچا دی لیکن جب پیغمبر مکہ کے قریب پہنچے تو آپ نے حکم دیا کہ تمام تیر اور نیزے اور دوسرے سارے ہتھیار اس سرزمین میں جس کا نام "یاجج" ہے، منتقل کر دیں، اور آپ خود اور آپ کے صحابہ صرف نیام میں رکھی ہوئی تلواروں کے ساتھ مکہ میں وارد ہوئے ہیں۔

اہل مکہ نے جب یہ عمل دیکھا تو بہت خوش ہوئے کہ وعدہ پورا ہو گیا، (گویا پیغمبر کا یہ اقدام مشرکین کے لیے ایک تنبیہ تھا کہ اگر وہ نقض عہد کرنا چاہیں اور مسلمانوں کے خلاف سازش کریں، تو وہ ان کے مقابلہ کی قدرت رکھتے ہیں)

رؤسائے مکہ، مکہ سے باہر چلے گئے، تاکہ ان مناظر کو جوان کے لیے دل خراش تھے نہ دیکھیں، لیکن باقی اہل مکہ مرد، عورتیں اور بچے سب ہی راستوں میں، چھتوں کے اوپر، اور خانہ خدا کے اطراف میں جمع ہو گئے تھے، تاکہ مسلمانوں اور ان کے مراسم عمرہ کو دیکھیں۔

پیغمبر ایک خاص رعب اور دبدبے کے ساتھ مکہ میں وارد ہوئے اور قربانی کے بہت سے اونٹ آپ کے ساتھ تھے، اور آپ نے انتہائی محبت اور ادب کے ساتھ مکہ والوں سے سلوک کیا، اور یہ حکم دیا کہ مسلمان طواف کرتے وقت تیزی کے ساتھ چلیں، اور احرام کو ذرا سا جسم سے ہٹا لیں تاکہ ان کے قوی اور طاقتور اور موٹے تازے شانے آشکار

ہوں" اور یہ منظر مکہ کے لوگوں کی روح اور فکر میں، مسلمانوں کی قدرت و قوت و طاقت کی زندہ دلیل کے طور پر اثر انداز ہو۔
مجموعی طور سے "عمرۃ القضاء" عبادت بھی تھا اور قدرت کی نمائش بھی، یہ کہنا چاہیئے کہ "فتح مکہ" جو بعد والے سال میں حاصل ہوئی، اس کا بیج انہیں دنوں میں بو دیا گیا، اور اسلام کے مقابلہ میں اہل مکہ کے سر تسلیم خم کرنے کے سلسلے میں مکمل طور پر زمین ہموار کر دی۔
یہ وضع و کیفیت قریش کے سرداروں کے لیے اس قدر ناگوار تھی کہ تین دن گزرنے کے بعد کسی کو پیغمبرؐ کی خدمت میں بھیجا کہ قرارداد کے مطابق جتنا جلدی ہو مکہ کو چھوڑ دیجیئے۔
قابل توجہ بات یہ ہے، کہ پیغمبرؐ نے مکہ کی عورتوں میں سے ایک بیوہ عورت کو، جو قریش کے بعض سرداروں کی رشتہ دار تھی، اپنی زوجیت میں لے لیا، تاکہ عربوں کی رسم کے مطابق، اپنے تعلق اور رشتے کو ان سے مستحکم کر کے ان کی عداوت اور مخالفت میں کمی کریں۔
جس وقت پیغمبرؐ نے مکہ سے باہر نکل جانے کی تجویز سنی تو آپ نے فرمایا: میں اس ازدواج کے مراسم کے لیے کھانا کھلانا چاہتا ہوں اور تمہاری بھی دعوت کرنا چاہتا ہوں، یہ ایسا کام تھا کہ اگر یہ انجام پا جاتا، تو ان کے دلوں میں پیغمبرؐ کے ضمن میں ایک مؤثر نقش، چھوڑتا، لیکن انہوں نے قبول نہ کیا اور یہ دعوت رسمی طور پر رد کر دی گئی [1]

---

[1] "مجمع البیان طبری" جلد ۹ صفحہ ۱۲۷
"فی ظلال القرآن" جلد ۷ صفحہ ۵۱۱
اور "تاریخ طبری" جلد ۲ صفحہ ۳۱۰
(اختصار اور خلاصے کے ساتھ)

۲۸۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝

۲۹۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ټ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ټ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰي سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝

ترجمہ

۲۸۔ وہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اُسے تمام دینوں پر غلبہ اور کامیابی دے۔ اور اس بات کے لیے خدا کی گواہی کافی ہے۔

۲۹۔ محمد خدا کے رسول ہیں، اور جو لوگ اُس کے ساتھ ہیں وہ کفار کے مقابلہ میں سخت اور آپس میں مہربان ہیں تو انھیں ہمیشہ رکوع اور سجدے میں دیکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ خدا

کے فضل اور اس کی رضا کو طلب کرتے ہیں، ان کی نشانی ان کے چہرے پہ سجدہ کے اثر سے نمایاں ہے، یہ تعریف و توصیف تو ان کی تورات میں ہے اور انجیل میں ان کی توصیف یہ ہے کہ وہ ایسی زراعت کے مانند ہیں۔ جس نے اپنی کونپلیں نکالی ہیں۔ پھر وہ قوت حاصل کر کے مضبوط اور محکم ہوگئی اور اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی، اور اس قدر نشوونما کی کہ زراعت کرنے والوں کو حیران کر دیا۔ یہ اس بنا پر ہے کہ کافروں کو غصہ دلائے، خدا نے ان میں سے ایسے لوگوں سے جو ایمان اور عمل صالح بجا لائے بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

تفسیر

دشمنوں کے مقابلہ میں سخت گیر اور دوستوں کے لیے مہربان

ان دو آیات میں جو سورہ فتح کی آخری آیات ہیں۔ "فتح المبین" یعنی صلح حدیبیہ" سے مربوط دو دوسرے اہم مسائل کی طرف اشارہ کرتا ہے، جن میں سے ایک تو اسلام کے عالمگیر ہونے کے ساتھ مربوط ہے اور دوسرے میں پیغمبرِ اسلام کے اصحاب کے اوصاف اور ان کی خصوصیات، اور ان کے بارے میں خدائی وعدہ کو بیان کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے "وہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے، تاکہ اُسے تمام دینوں پر غالب کرے اور اس بات کے لیے خدا کی گواہی کافی ہے"۔ (ھو الذی ارسل رسولہ بالھدٰی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ وکفٰی باللہ شھیدًا)۔

یہ خداوند قادر متعال کی جانب سے صریح اور دوٹوک وعدہ ہے۔ اسلام کے تمام دینوں پر غالب ہونے کے بارے میں یعنی اگر خدا نے پیغمبر کے خواب کے ذریعہ تمہیں کامیابی اور فتح کی خبر دی ہے کہ تم انتہائی امن اور امان کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہوگے اور مراسم عمرہ بجا لاؤ گے، اور کسی کی تم سے مزاحمت کرنے کی جراٴت نہ ہوگی علاوہ ازیں اگر خدا تمہیں "فتح قریب" (خیبر کی کامیابی) کی خبر دے رہا ہے تو اس پر تعجب نہ کرو، یہ تو ابتدا ہے

انجام کار اسلام عالمگیر ہو جائے گا اور تمام ادیان پر کامیاب و کامران ہوگا۔

ایسا کیوں نہ ہو، جبکہ رسول خدا کی دعوت کا مطلب ہدایت ہے: (ارسل رسولہ بالھدٰی) اور اس کا دین حق ہے: (ودین الحق) اور ہر غیر جانب دار ناظر اس کی حقانیت کو، اس قرآن کی آیات میں اور اسلام کے انفرادی و اجتماعی اور قضائی و سیاسی احکام اور اسی طرح اس کی اخلاقی و انسانی تعلیمات میں دیکھ سکتا ہے، اور ان دقیق و صریح پیشین گوئیوں سے جو مستقبل کے بارے میں ہیں، اور بالکل ٹھیک واقع ہوئی ہیں۔ اس پیغمبر کے خدا سے ارتباط کو قطعی طور پر جان سکتا ہے۔

ہاں اسلام کی قوی منطق اور اس کے بار آور مطالب کا تقاضا یہی ہے کہ آخر کار وہ تمام شرک آلود مذاہب کا صفایا کر دے گا اور تحریف شدہ آسمانی دینوں کو اپنے سامنے جھکا دے گا۔ اور اپنی عمیق کشش کے ساتھ دلوں کو اس خالص دین کی طرف کھینچ لے گا۔

اس بارے میں کہ اس کامیابی سے "منطقی کامیابی" مراد ہے یا "فوجی و لشکری کامیابی" مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ یہ کامیابی صرف منطقی و استدلالی "کامیابی" ہے اور یہ امر حاصل ہو چکا ہے۔ کیونکہ اسلام منطق اور استدلال کی قدرت کے لحاظ سے تمام موجودہ ادیان پر برتری رکھتا ہے۔

جبکہ ایک دوسری جماعت "کامیابی کو "ظاہری غلبہ" اور غلبہ اقتدار کے معنی میں سمجھتی ہے، اور اس لفظ "یظہر" کا موقع استعمال بھی خارجی غلبہ کی دلیل ہے، اور اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ان بہت سے وسیع علاقوں کے علاوہ جو دنیا کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں اسلام کی قلمرو میں داخل ہیں، اور اس وقت بھی ۴۰ سے زیادہ اسلامی ممالک میں مجموعی طور پر تقریباً ایک ارب افراد پرچم اسلام کے زیر سایہ سانس لے رہے ہیں۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ساری دنیا رسمی طور پر بھی اس پرچم کے نیچے آ جائے گی، اور یہ امر قیام مہدی (ارواحنا لہ الفداء) کے ذریعہ تکمیل کو پہنچے گا۔

جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"لا یبقی علی ظھر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام"۔

"پورے روئے زمین پر کوئی پتھر اور مٹی کا گھر یا اون اور بالوں کا خیمہ باقی نہ رہے گا۔ مگر یہ کہ خدا اسلام کو اس میں داخل کر دے گا۔"[1]

---

[1] تفسیر مجمع البیان" جلد ۵ ص ۲۵۰ "قرطبی" نے بھی اس روایت کو پیغمبر اسلام سے سورۂ نور کی آیہ ۵۵ کے ذیل میں نقل کیا ہے (جلد ۶، صفحہ ۴۶۹۲)

اس سلسلہ میں ہم سورۂ توبہ کی آیہ ۳۳ میں جو اس آیت کے مشابہ ہے ایک تفصیلی بحث کرچکے ہیں۔ [1]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ بعض نے "الھدیٰ" کی تعبیر کو "عقائد" اسلامی کے استحکام کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جبکہ "دین الحق" کو "فروع دین" سے متعلق جانا ہے، لیکن اس تقسیم بندی پر کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے ویسے ظاہر یہ ہے کہ ہدایت و حقانیت اصول میں بھی ہے اور فروع میں بھی۔

اس بارے میں کہ "لیظھرہ" کی ضمیر کا مرجع "اسلام" ہے یا "پیغمبر" مفسرین نے دو احتمال دیئے ہیں۔ لیکن قرائن اچھی طرح گواہی دے رہے ہیں کہ اس سے مراد وہی دینِ حق ہے، کیونکہ جملہ بندی کے لحاظ سے بھی ضمیر کے ساتھ زیادہ نزدیک ہے اور دین کی دین پر کامیابی کے ساتھ بھی مناسبت رکھتا ہے نہ کہ شخص کی دین پر۔

آیت کے بارے میں آخری بات یہ ہے کہ "کفٰی باللہ شھیدًا" کا جملہ اس واقعیت کی طرف اشارہ ہے کہ اس پیشین گوئی کے لیے کسی شاہد اور گواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا شاہد اور گواہ اللہ ہے اور رسولِ خدا کی رسالت بھی کسی دوسرے گواہ کی محتاج نہیں ہے، کیونکہ اس کا گواہ بھی اللہ ہی ہے اور "سہیل بن عمرو" اور اس کے مانند دوسرے لوگ اس بات پر تیار نہ ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کے ساتھ "رسول اللہ" لکھا جائے تو وہ خود اپنا نقصان کرتے ہیں۔ اور اس میں ہمارے لیے کوئی زحمت نہیں " !

آخری آیت میں قرآن پیغمبر کے مخصوص اصحاب و انصار کی اور ان افراد کی جو آپ کے طریقہ پر تھے، تورات وانجیل کی زبان سے ایک بہت ہی واضح تصویر پیش کرتا ہے اور اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے "حدیبیہ" اور دوسرے مراحل میں پامردی دکھائی ہے، ایک فخر اور مباہات کی بات بھی ہے، اور تمام قرون اعصار میں تمام مسلمانوں کے لیے ایک سبق آموز درس بھی ہے۔

ابتدا میں فرماتا ہے: محمد خدا کا بھیجا ہوا رسول ہے": (محمد رسول اللہ)۔

چاہے سہیل بن عمرو جیسی چمگادڑیں اسے پسند کریں یا نہ کریں؟ اور خود کو اس آفتاب عالمتاب سے پنہاں کریں یا نہ کریں؟ خدا نے اس کی رسالت کی گواہی دی ہے اور تمام صاحبان علم وآگاہی بھی اس بات کے گواہ ہیں۔

اس کے بعد آپ کے اصحاب و انصار کی تعریف و توصیف کا آغاز کرتے ہوئے ان کے ظاہر و باطن اوصاف اور عواطف وانکار و اعمال کو پانچ صفات کے ضمن میں بیان کرتا ہے۔" وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں کفار کے مقابلہ میں زیادہ سخت اور محکم ہیں": (والذین معہ اشداء علی الکفار)۔

اور دوسری صفت یہ بیان کرتا ہے: "لیکن آپس میں رحم دل اور مہربان ہیں": (رحماء بینھم)۔

ہاں وہ اپنے بھائیوں، دوستوں اور ہم مذہب افراد کے لیے تو عطوفت و محبت کا مرکز اور خزانہ ہیں اور دشمنوں

---

[1] تفسیر نمونہ کی جلد ۷ ص ۵۰۰، ۴۰۰

کے مقابلہ میں سخت اور جلانے والی آگ اور مضبوط فولادی دیواریں ہیں۔

درحقیقت ان کے عواطف و رجحانات کا خلاصہ یہ "مہر" اور "قہر" ہی ہیں۔ لیکن ان دونوں کا ان کے وجود میں جمع ہونا کوئی تضاد نہیں رکھتا، اور دشمن کے مقابلہ میں ان کا قہر، اور دوستوں کے لیے ان کا مہر و محبت اس بات کا سبب نہیں بنتا کہ وہ راہِ حق و عدالت سے قدم باہر رکھیں تیسری صفت میں جو ان کے اعمال کے بارے میں ہے مزید کہتا ہے۔ تو انھیں ہمیشہ رکوع و سجود کی حالت میں دیکھے گا اور وہ ہر وقت عبادت خدا میں مشغول رہتے ہیں۔ (تراھم رکعا سجدا)

یہ تعبیر خدا کی عبادت و بندگی کو جو اس کے دو اصلی ارکان "رکوع" و "سجود" کے ساتھ بیان ہوئی ہے، ان کی دائمی اور ہمیشہ کی حالت کے طور پر ذکر کرتی ہے، ایسی عبادت، جو حق تعالیٰ کے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے، اور کبر و غرور اور خود خواہی کی ان کے وجود سے نفی کی رمز ہے۔

چوتھی توصیف و تعریف میں جو ان کی پاک اور خالص نیت سے بحث کرتی ہے، فرماتا ہے: "وہ ہمیشہ خدا کے فضل اور اس کی رضا کو طلب کرتے ہیں"، (یبتغون فضلا من اللہ و رضوانا)۔

نہ تو وہ دکھاوے اور ریاکاری کے لیے قدم اٹھاتے ہیں، اور نہ ہی مخلوق خدا سے اجر و پاداش کی توقع رکھتے ہیں۔ بلکہ ان کی نظر صرف اس کی رضا و فضل پر لگی ہوئی ہے، اور تمام زندگی میں ان کے عمل کا محرک صرف یہی امر ہے۔ اور بس۔ یہاں تک کہ "فضل" کی تعبیر یہ بتاتی ہے کہ وہ اپنی کوتاہی کے معترف ہیں، اور اپنے اعمال کو کمتر سمجھتے ہیں کہ ان کے مقابلہ میں خدا کا اجر و پاداش طلب کریں، بلکہ وہ پوری سعی و کوشش کے باوجود پھر بھی یہ کہتے ہیں، خداوندا! اگر تیرا فضل و کرم ہماری مدد و نصرت نہ کرے تو وائے ہے ہم پر۔

پانچویں اور آخری توصیف میں ان کے آراستہ اور نورانی پیکر ظاہر کے بارے میں بحث کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "ان کی نشانی ان کے چہرے میں سجدہ کے اثر سے نمایاں ہے": (سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود)[1]

"سیما" اصل میں علامت و ہیئت کے معنی میں ہے۔ چاہے یہ علامت چہرے میں ہو یا بدن کی کسی دوسری جگہ، اگرچہ فارسی کے روزمرہ کے استعمال میں چہرے کی نشانیوں اور چہرہ کی ظاہری وضع و کیفیت کے لیے بولا جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں ان کا "قیافہ" اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ خدا، حق، قانون اور عدالت کے سامنے ایک خاضع انسان ہیں، نہ صرف ان کے چہرے میں ہی بلکہ ان کے سارے وجود اور زندگی میں یہ علامت منعکس ہوتی ہے۔

---

[1] "سیماھم" مبتدا اور "فی وجوھھم" اس کی خبر ہے اور "من اثر السجود" یا "سیما" کا بیان ہے یا "سیما" کے لئے حال ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ "من" کو "نشویہ" جانیں اور جملہ کا معنی اس طرح ہوگا: ان کی علامت ان کے چہرے میں ہے اور یہ علامت سجود کے اثر سے ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے پیشانی پر سجدہ کے ظاہری اثر یا سجدہ گاہ کی جگہ پر مٹی کے اثر سے تفسیر کی ہے۔ لیکن ظاہراً آیت اس سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتی ہے جو ان مردانِ خدا کے چہرہ کی مکمل طور پر تصویر کشی کرتی ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت قیامت میں ان کے سجدہ گاہ کی طرف اشارہ ہے، جو چودھویں کے چاند کی طرح چمکے گی۔

البتہ ممکن ہے کہ قیامت میں ان کی پیشانی اسی طرح ہو لیکن یہاں آیت دنیاوی زندگی میں ان کی ظاہری وضع و کیفیت کی خبر دے رہی ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق سے بھی آیا ہے کہ آپ نے اس جملہ کی تفسیر میں فرمایا:

هو السهر فی الصلٰوة : "اس سے مراد رات کو نماز پڑھنے کے لیے بیدار رہنا ہے" جس کے آثار دن کے وقت ان کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں۔[1]

البتہ ان معانی کو جمع کرنا پورے طور پر ممکن ہے۔

بہرحال قرآن ان تمام اوصاف کو بیان کرنے کے بعد مزید کہتا ہے: "یہ ان (اصحاب محمدؐ) کی توصیف توارت میں ہے" : (ذالك مثلهم فی التوراة)۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا بیان پہلے سے آچکا ہے، اور ایسی توصیف و تعریف ہے جو ایک عظیم آسمانی کتاب میں ہے، جو ایک ہزار سال سے پہلے نازل ہوئی تھی۔

لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ "والذین معه" (اور وہ جو اس کے ساتھ ہیں) کی تعبیر ایسے افراد کے بارے میں گفتگو کرتی ہے، جو ہر چیز میں پیغمبرؐ کے ساتھ تھے، فکر و نظر میں، عقیدہ و اخلاق میں اور عمل میں، نہ کہ صرف وہ لوگ جو آپؐ کے ساتھ ہم عصر اور ہم زمان تھے، چاہے ان کا طریقہ اور راستہ آپؐ سے جدا ہی کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد ان کی ایک اور آسمانی عظیم کتاب یعنی "انجیل" میں، توصیف کو پیش کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: ان کی توصیف انجیل میں اس زراعت کی طرح ہے، جس نے اپنی کونپلوں کو باہر نکالا ہو، پھر انہیں تقویت دی ہو، یہاں تک کہ وہ مضبوط اور مستحکم ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہے، اور اس قدر نشو و نما کی ہے اور پُر برکت ہوئی ہے کہ زراعت کرنے والوں کو تعجب میں ڈال دیتی ہے۔" (ومثلهم فی الانجیل کزرع اخرج شطئه فازره فاستغلظ فاستوٰی علی سوقه یعجب الزراع)[2]

---

[1] من لا یحضره الفقیه، روضة الواعظین، مطابق نقل تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۰۰۔

[2] اس بارے میں کہ "ومثلهم فی الانجیل" ایک مستقل جملہ ہے اور اصحاب پیغمبرؐ کی ایک الگ توصیف و تعریف کرتا ہے جو اس تعریف کے علاوہ ہے جو توارت میں آئی ہے یا یہ "ذالك مثلهم فی التوراة" کے جملہ پر عطف ہے اس طرح سے کہ دونوں اوصاف کی دونوں آسمانی کتابوں سے خبر دیتا ہے۔ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ لیکن آیت کا ظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں اوصاف الگ الگ ہوں گانہ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

"شطأ" ٹہنی اور چوزے کے معنی میں ہے۔ ایسی ٹہنیاں جو تنے کے نیچے اور جڑوں کے قریب سے باہر نکلتی ہیں۔

"آزر" "موازرة" کے مادہ سے معاونت کے معنی میں ہے۔

"استغلظ" "غلظت" کے مادہ سے سخت اور مستحکم ہونے کے معنی میں ہے۔

"استوٰی علی سوقہ" کے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس قدر مستحکم ہوگیا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہے، (اس بات پر توجہ رکھیے کہ "سوق" "ساق" کی جمع ہے)

"یعجب الزراع" کی تعبیر یعنی وہ اتنی تیزی کے ساتھ اُگی اور اتنی زیادہ ٹہنیاں اور شاخیں نکلیں اور اس کی پیداوار اس حد تک پہنچی کہ خود کسانوں تک کو، جو ہمیشہ ان مسائل سے سروکار رکھتے ہیں، بہت زیادہ حیرت اور تعجب ہو رہا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ دوسری توصیف میں ہی، جو انجیل میں آئی ہے، مومنین اور محمد کے صحابہ کے پانچ عمدہ اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ (کونپل نکالنا، پرورش کے لیے مدد کرنا، محکم ہونا، اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا، حیرت انگیز دکھائی دینے والی نشوونما)

حقیقت میں تورات میں جو اوصاف ان کے لیے بیان ہوئے ہیں وہ ایسے اوصاف ہیں، جو حالات، مقاصد، اعمال اور ظاہری صورت کے لحاظ سے ان کے وجود کے پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔ لیکن وہ اوصاف جو انجیل میں بیان ہوئے ہیں وہ ان کے مختلف پہلوؤں میں ترقی اور نشوونما کو بیان کرتے ہیں (غور کیجیے)

ہاں! وہ ایسے بلند صفات ہیں جو ایک آن کے لیے بھی "حرکت" و عمل سے نہیں رُکتے، وہ ہمیشہ کونپلیں نکالتے رہتے ہیں، وہ کونپلیں پرورش پاتی ہیں۔ اور بارآور ہوتی ہیں۔

وہ اپنے قول و عمل کے ذریعہ اسلام کو دُنیا میں پھیلاتے رہتے ہیں۔ اور روز بروز نئے دستوں کا اسلامی معاشرے میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

ہاں! وہ کبھی بھی بے کار ہو کر نہیں بیٹھتے، اور ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتے رہتے ہیں، عابد ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہد ہیں، اور جہاد کے ساتھ ساتھ عبادت کرتے ہیں، ان کا ظاہر آراستہ ہے اور باطن پیراستہ ہے، ان کے عواطف قوی اور نیتیں پاکیزہ ہیں۔ حق کے دشمنوں کے مقابلہ میں خدا کے غضب کے مظہر ہیں، اور حق کے دوستوں کے ساتھ اس کے لطف و رحمت کو نمایاں کرتے ہیں۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: یہ عالی اوصاف، یہ تیزی کے ساتھ بڑھنے والی نشوونما، اور یہ پربرکت حرکت و ترقی جتنی دوستوں میں شوق اور نشاط پیدا کرتی ہے، اتنا ہی کفار کے لیے غیظ و غضب کا سبب بنتی ہے: "یہاں بنا پر ہے تاکہ کافروں کو غصہ دلائے" (لیغیظ بھم الکفار)[1]

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) طور پر ان دو آسمانی کتابوں میں لکھے ہوئے موجود تھے۔ اس لیے لفظ "مثل" کا تکرار ہوا ہے ورنہ اگر یہ ایک دوسرے پر عطف ہوتے تو صرف ایک مرتبہ یوں کہا جاتا: "ذٰلک مثلھم فی التوراة والانجیل"

[1] "لیغیظ" کے جملہ میں "لام" ہے۔ بہت سے مفسرین اسے "علت کلام" سمجھتے ہیں، اس بنا پر اس جملہ کا مفہوم یہ ہے (حاشیہ صفحہ آئندہ)

اور آیت کے آخر میں فرماتا ہے، "خدا نے ان میں سے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں، اور ساتھ میں عمل صالح انجام دیتے ہیں بخشش اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے": (وعد اللہ الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات منھم مغفرۃ واجرًا عظیمًا)۔

یہ بات واضح ہے کہ وہ اوصاف جو آیت کی ابتدا میں بیان کیے گئے ہیں، ان میں ایمان اور عمل صالح جمع تھا، اس بنار پر ان دو اوصاف کی تکرار ان کے دوام اور ہمیشہ برقرار رہنے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی خدا نے یہ وعدہ صرف اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے اس گروہ سے کیا ہے جو آپؐ کے راستہ اور طریقہ پر باقی رہیں گے، اور ایمان و عمل صالح کو دوام بخشیں گے، ورنہ وہ لوگ جو ایک دن تو اس کے دوستوں اور اصحابؐ انصار کے زمرہ میں شامل تھے۔ اور دوسرے دن آنحضرت سے جدا ہو گئے، اور ان کے برخلاف راستے پر چل پڑے، وہ اس قسم کے وعدہ میں ہرگز شامل نہیں ہیں۔

"منھم" کی تعبیر۔ (اس نکتہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ لفظ "من" ایسے مواقع پر "تبعیض" کے لیے ہوتا ہے اور آیت کا ظاہر بھی یہی معنی دیتا ہے)۔ اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ کے صحابہ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے: ایک گروہ ایمان اور عمل صالح کو جاری رکھے گا، اور حق تعالیٰ کی رحمت واسعہ اور اجرِ عظیم میں شامل ہوگا، لیکن ایک گروہ اس سے الگ ہو کر اس عظیم فیض و برکت سے محروم ہو جائے گا۔

معلوم نہیں مفسرین کا ایک گروہ اس بات پر کیوں اصرار کرتا ہے۔ کہ اوپر والی آیت میں "منھم" کا "من" حتماً بیانیہ ہے۔ حالانکہ بالفرض اگر ہم خلاف ظاہر کے مرتکب بھی ہوں اور "من" کو "بیان" کے لیے ہی لے لیں، تو ان قرائن عقلی کو جو یہاں موجود ہیں، انہیں کیسے ایک طرف کریں گے، کیونکہ کوئی شخص بھی اس بات کا مدعی نہیں ہے کہ پیغمبرؐ کے تمام صحابہ معصوم تھے تو اس صورت میں راہِ ایمان اور عمل صالح پر باقی نہ رہنے کا احتمال ان میں سے ہر ایک کے بارے میں جائے گا تو ان حالات میں یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ بغیر کسی قید و شرط کے اُن سب کو دے دے، عام اس سے کہ وہ ایمان و صلاح کی راہ طے کریں یا آدمی راہ سے پلٹ جائیں اور منحرف ہو جائیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ: "والذین معہ" (وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں) کے جملہ کا مفہوم آپؐ کے پاس بیٹھنا اور آپؐ سے جسمانی مصاحبت نہیں ہے، کیونکہ ایسی مصاحبت تو منافقین بھی رکھتے تھے، بلکہ "معہ" سے مراد قطعی طور پر اصول ایمان اور تقویٰ کے لحاظ سے ہمراہ ہونا ہے۔

اس بنا پر ہم اوپر والی آیت سے پیغمبرؐ کے تمام ہم نشینوں اور معاصرین کے لیے ہرگز ایک حکم کلی کا استفادہ نہیں کر سکتے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ) یہ ہوگا: بیش رفت کی برکت و قدرت خدا نے اصحاب محمدؐ کو نصیب کی ہے تاکہ کفار کو غصہ میں لے آئے۔

چند نکات

۱۔ **تنزیہ صحابہ کی داستان** : اہلِ سُنت کے علمار اور دانشمندوں میں مشہور یہ ہے کہ صحابۂ رسُولؐ اُمت کے تمام دوسرے افراد سے ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں کہ وہ سب کے سب پاک و پاکیزہ ہیں، اور وہ آلودگیوں سے دُور ہیں، اور ہمیں ان میں سے کسی پر تنقید و اعتراض کا حق نہیں ہے، اور انہیں بُرا بھلا کہنا مطلقاً ممنوع ہے، یہاں تک کہ بعض کے قول کے مطابق موجب کُفر ہے، اور اس مقصد کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے قرآن مجید کی کچھ آیات سے استناد کیا ہے، منجملہ ان کے ایک زیرِ بحث آیت ہے جو یہ کہتی ہے کہ: خدا نے اُن میں سے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے عمل صالح انجام دیا ہے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے" اور اسی طرح سورۂ توبہ کی آیہ ۱۰۰ جو مہاجرین و انصار کا ذکر کرنے کے بعد کہتی ہے:

"رضی اللّٰہ عنھم ورضوا عنہ"

"خدا ان سے خوش ہو گیا اور وہ خدا سے خوش ہو گئے"

لیکن اگر ہم اپنے آپ کو پہلے سے کئے ہُوئے فیصلوں سے خالی کر لیں تو ایسے واضح قرائن ہمارے سامنے موجود ہیں جو اس مشہور عقیدہ اور نظریہ کو متزلزل کر دیتے ہیں۔

(۱) سورۂ توبہ میں "رضی اللّٰہ عنھم ورضوا عنہ" کا جُملہ صرف مہاجرین و انصار کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کیونکہ اس آیت میں مہاجرین و انصار کے ساتھ "الذین اتبعوھم باحسان" کا جُملہ بھی موجود ہے، جس کا مفہوم تمام ان افراد کو شامل ہے، جو دامن قیامت تک نیکی میں ان کی پیروی کریں گے۔

جس طرح سے "تابعین" اگر ایک دن خطِ ایمان و احسان میں ہوں اور دوسرے دن کُفر و اساءہ (بدی کرنے) کے خط میں قرار پاتے ہیں تو وہ رضایت الٰہی کے چتر کے نیچے سے نکل جائیں گے، بعینہٖ یہی مطلب "صحابہ" کے بارے میں بھی ہوگا، کیونکہ انہیں بھی سُورۂ فتح کی آخری آیت میں ایمان و عمل صالح کے ساتھ مقید کیا ہے کہ اگر کسی دن یہ صفت اُن سے سلب ہو جائے تو وہ رضایت الٰہی کے دائرہ سے باہر نکل جائیں گے۔

دوسرے لفظوں میں "احسان" کی تعبیر "تابعین" کے لیے بھی ہے، اور "متبوعین" کے بارے میں بھی، اس بنا پر ان دونوں میں سے جو کوئی بھی "خطِ احسان" کو چھوڑ دے گا وہ رضایت خدا میں شامل نہیں رہے گا۔

(۲) روایات اسلامی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگرچہ آنحضرتؐ کی مصاحبت کا اعزاز و امتیاز رکھتے تھے۔ لیکن وہ لوگ جو بعد کے زمانوں میں آئیں گے، اور ایمان راسخ اور عمل صالح سے متصف ہوں گے وہ ایک لحاظ سے صحابہ سے افضل ہیں۔

جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے بیان ہوا ہے، کہ صحابہ نے آپؐ سے عرض کیا:

"نحن اخوانک یارسول اللہ؟ قال: لا انتم اصحابی، واخوانی الذین یأتون بعدی، امنوا بی ولم یرونی، وقال: للعامل منهم اجر خمسین منکم، قالوا بل منهم یارسول اللہ؟ قال: بل منکم! ردوها ثلاثا، ثم قال:

لانکم تجدون علی الخیر اعوانا!"

"یارسول اللہ! کیا ہم آپ کے بھائی ہیں؟ فرمایا نہیں! تم تو میرے اصحاب ہو، لیکن میرے بھائی تو وہ لوگ ہیں جو میرے بعد آئیں گے، اور مجھ پر ایمان لائیں گے حالانکہ انھوں نے مجھے نہیں دیکھا:

اس کے بعد آپؐ نے مزید فرمایا: ان میں سے وہ افراد جو عمل صالح کرنے والے ہوں گے وہ تم میں سے پچاس افراد کا اجر رکھتے ہیں، صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا وہ اپنے میں سے پچاس افراد کا (اجر رکھیں گے) فرمایا نہیں! تم میں سے پچاس افراد کا، اور انھوں نے اس بات کو تین مرتبہ دہرایا، (اور پیغمبر نے تینوں مرتبہ یہی کہا) اس کے بعد آپؐ نے فرمایا، یہ اس بنا پر ہے کہ تمھارے پاس ایسے شرائط و حالات موجود ہیں جو تمھاری اچھے کاموں میں مدد کرتے ہیں۔" [1]

صحیح مسلم میں بھی رسول خدا سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ ایک دن آپؐ نے فرمایا:

"وددت انا قد رأینا اخواننا"

"میں دوست رکھتا ہوں کہ ہم اپنے بھائیوں کو دیکھتے۔"

"قالوا: اولسنا اخوانک یارسول اللہ؟!"

انھوں نے کہا، یارسول اللہ! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟"!

آپؐ نے فرمایا:

"انتم اصحابی واخواننا الذین لم یأتوا بعد:

"تم تو میرے اصحاب ہو لیکن ہمارے بھائی ابھی تک نہیں آئے۔" [2]

عقل و منطق بھی یہی کہتی ہے، کہ دوسرے لوگ جو شب و روز پیغمبرؐ کی دائمی تعلیمات کے سایہ میں نہیں تھے لیکن اس کے باوجود وہ پیغمبرؐ کے صحابہ کے مانند یا ان سے زیادہ ایمان و عمل صالح رکھتے تھے۔ وہ ان سے برتر و افضل ہیں۔

(۳) یہ بات تاریخی طور پر بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ بعض صحابہ کو ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے پیغمبر اکرمؐ کے بعد یا خود پیغمبر کے زمانہ میں ہی غلط راستہ اختیار کر لیا تھا۔

---

[1] "تفسیر روح البیان" جلد ۹ صفحہ ۶۱

[2] "صحیح مسلم" جلد اول کتاب الطہارۃ حدیث ۳۹

ہم ان لوگوں کو جنہوں نے جنگ جمل کی آگ بھڑکائی، اور اتنے سارے مسلمانوں کو قتل کرایا، اور پیغمبرؐ کے برحق خلیفہ کے سامنے تلوار کھینچی، گناہ سے کیسے بری قرار دے سکتے ہیں؟

یا وہ لوگ جو "صفین" و "نہروان" میں اکٹھے ہوئے اور پیغمبرؐ کے وصی و جانشین اور مسلمانوں کے منتخب خلیفہ کے مقابلہ جنگ کھڑی کر دی، اور بے حساب خون بہائے، انھیں رضائے خدا کا مشمول جان لیں، اور یہ کہنے لگیں کہ گناہ و عصیان کا گرد و غبار بھی ان کے دامن پر نہیں بیٹھا۔

اور اس سے بھی عجیب تر ان لوگوں کا عذر ہے جو ان تمام مخالفتوں کو اس عنوان سے کہ وہ "مجتہد" تھے اور "مجتہد" معذور ہے توجیہ کرتے ہیں۔

اگر اس قسم کے عظیم گناہوں کی "اجتہاد" کے ذریعہ توجیہ کی جاسکتی ہو تو پھر کسی قاتل کو ملامت نہیں کی جاسکتی، یا حدود الٰہی کا اس میں اجراء نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ اس نے اجتہاد کیا ہو۔

دوسرے لفظوں میں میدان جمل یا صفین یا نہروان میں دو گروہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں کھڑے ہوگئے ہیں، اور یقینی طور پر وہ دونوں کے دونوں حق پر نہیں تھے، کیونکہ ضدین کا جمع ہونا محال ہے۔ اس حالت میں دونوں کو رضائے خدا کا مشمول کیسے سمجھا جا سکتا ہے، جبکہ یہ مسئلہ کوئی مشکل اور ایسے پیچیدہ مسائل میں سے نہیں تھا، جس کی تشخیص ممکن نہ ہو؟ کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ علیؑ یا تو پیغمبرؐ کی نص کے مطابق اور یا مسلمانوں کے انتخاب کے ذریعہ برحق خلیفہ تھے، اس کے باوجود ان کے خلاف تلوار کھینچی، اس کام کی اجتہاد کے طریقہ سے کیسے توجیہ کی جا سکتی ہے؟!

"اصحاب ردہ" کی شورش کو جو ابوبکر کے زمانہ میں ہوئی اسی طرح اجتہاد سے توجیہ کیوں نہیں کرتے، اور انہیں رسمی و قانونی طور پر مرتد کیوں شمار کرتے ہیں، لیکن "جمل" "صفین" "نہروان" کے شورش کرنے والوں کو ہر قسم کے گناہ سے مبرا سمجھتے ہیں۔

بہر حال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنزیہ اصحاب کا مسئلہ مطلق طور پر ایک سیاسی مسئلہ تھا، ایک گروہ نے پیغمبرؐ کے بعد اپنی حیثیت کی حفاظت کے لیے اس پر تکیہ کیا تاکہ اپنے آپ کو ہر قسم کی تنقید و اعتراض سے بچا لے اور محفوظ کر لے۔ اور یہ ایک ایسا مطلب ہے جو نہ تو عقل کے ساتھ سازگار ہے اور نہ ہی مسلّم اسلامی تاریخوں کے ساتھ، اور یہ ایک ایسا شعر ہے جو ہمیں اپنے قافیہ میں گرفتار کرے گا۔

کیا ہی اچھا ہو کہ ہم صحابہ رسول خدا اور ان لوگوں کا جو ہمیشہ آپؐ کے طریقہ اور راستہ پر چلتے رہے، احترام کرنے کے باوجود ان کے بارے میں معیار حیات، ان کی زندگی میں آغاز سے لے کر انجام تک ان کے عقائد و اعمال کو اسی معیار سے سمجھیں جو معیار کہ ہمیں قرآن سے معلوم ہوا ہے، یعنی وہی معیار کہ جس کے ساتھ پیغمبرؐ اپنے صحابہ کو پرکھتے تھے۔

⁂

۲۔ اسلامی باہمی محبت: اسلامی روایات میں جو آخری آیہ کی تفسیر میں منقول ہوئی ہیں، "رحماء بینھم" کی اصل پر بہت زیادہ تاکید نظر آتی ہے، منجملہ ان کے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے بیان ہوا ہے:

"المسلم اخو المسلم، لا یظلمہ، ولا یخذلہ، ولا یخونہ، ویحق علی المسلم الاجتھاد فی التواصل، والتعاون علی التعاطف، والمواساۃ لاھل الحاجۃ، وتعاطف بعضھم علی بعض، حتی تکونوا کما امرکم اللہ عز وجل، رحماء بینکم متراحمین، مغتمین لما غاب عنکم من امرھم، علی ما مضی علیہ معشر الانصار علی عھد رسول اللہ (ص)":

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس پر ظلم نہیں کرتا، اُسے تنہا نہیں چھوڑتا، اُسے ڈراتا دھمکاتا نہیں، اور ضروری ہے کہ مسلمان حاجت مندوں سے ربط، تعلق، تعاون، محبت اور اُنسیت میں کوشش کرے، اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربان ہو۔ تاکہ ارشادِ خداوندی "رحماء بینھم" کے مطابق ایک دوسرے سے محبت اور پیار کا سلوک رواج پائے، یہاں تک کہ ان کے پیٹھ پیچھے ان کے امور کے بارے میں دل سوزی سے کام لیں۔ جیسا کہ رسول اللہ کے زمانہ میں انصار تھے۔ [1]

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اس آیت کی موثر رہنمائی اور اُن خصوصیات سے، جو سچے مومنین اور رسول اللہ کے صحابہ کی مثال بنتی ہیں، دوری اختیار کرلی ہے۔ اور بعض اوقات تو اس طرح سے ایک دوسرے کے جان لیوا بن جاتے ہیں اور ایسی کینہ پروری اور خونریزی کرتے ہیں، کہ دشمنانِ اسلام کے لیے بھی کبھی ایسی نہ کی ہو گی۔

بعض اوقات کفار کے ساتھ دوستی کا ایسا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ جیسے کہ وہ ایک ہی اصل و نسب کے بھائی ہیں۔

خدا اس رکوع و سجود کا کوئی پتہ ہے، نہ وہ پاکیزہ نیتیں اور "ابتغاء فضل اللہ" (اللہ کے فضل کا طالب ہونا)، اور نہ ہی چہروں پر سجدوں کے وہ آثار نمایاں ہیں، نہ وہ نشوونما، نہ کونپلیں نکالنا، نہ قوی ہونا اور نہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ہم جتنا ان قرآنی اصولوں سے دُور ہوتے ہیں اتنا ہی زیادہ درد و رنج اور ذلت و نکبت میں گرفتار ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی توجہ نہیں کرتے کہ ہمیں یہ ضرب کہاں سے پڑی ہے؟ پھر وہی "جاہلیت کی طرفداریاں" غور و فکر کرنے تجدید نظر اور قرآن کی طرف لوٹنے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں، خدایا ہمیں اس گہری اور خطرناک نیند سے بیدار کردے۔

خداوندا! ہمیں توفیق مرحمت فرما کہ ہم پیغمبر کے سچے اصحاب و انصار کی اخلاقی خصوصیات کو، جو ان آیات میں آئی ہیں۔ اپنے اندر زندہ کریں۔

---

[1] اصولِ کافی "مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۷۷ حدیث ۱۱۔"

بارالٰہا! ہمیں دشمنوں کے مقابلہ میں شدت، دوستوں کے ساتھ محبت، تیرے فرمان کے لیے تسلیم و رضا، تیری خاص عنایات کی طرف توجہ، اور اسلامی معاشرے کو بار ور کرنے کے لیے سعی و کوشش اور اس کو ترقی دینے اور پھیلانے کی توفیق عنایت فرما۔

پروردگارا! ہم تجھ سے فتح مبین کے طلب گار ہیں جس کے سائے میں ہمارا اسلامی معاشرہ حرکت میں آجائے، اور اس عصر اور زمانہ میں جس میں ہر دوسرے وقت سے زیادہ معنویت و روحانیت کی احتیاج و ضرورت ہے، ہم اس دین کی حیات بخش تعلیمات کو لوگوں کے سامنے پیش کریں اور ہر روز نئے دلوں کو اسلام کی تسخیر و اطاعت میں داخل کریں اور دلوں کے ممالک میں سے ایک نیا ملک فتح کریں، (آمین یارب العالمین)

سورۂ فتح کا اختتام

۶، شوال ۱۴۰۵ھ

۱۳۶۴ / ۴ / ۴

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا

اور اس کی ۱۸ آیات ہیں

تاریخ شروع

۶ شوال ۱۴۰۵ھ

۱۳۶۴/۴/۴

اس سورہ میں جس میں اٹھارہ سے زیادہ آیات نہیں ہیں، پیغمبر سے مربوط اور اسلامی معاشرے میں ایک دوسرے سے تعلق کے بارے میں بہت اہم مسائل بیان ہوئے ہیں، اور چونکہ اس میں بہت سے اہم اخلاقی مسائل کو عنوان بنایا گیا ہے لہٰذا اس سورہ کو "سورۂ اخلاق و آداب" بھی کہا جا سکتا ہے۔
اس سورہ کے مختلف حصوں کا مجموعی طور سے کچھ اس طرح خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

پہلا حصہ
آغاز سورہ کی آیات ہیں، جو اسلام کے عظیم ترین پیشوا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے آداب اور ان اصولوں کو بیان کرتی ہیں جن کا مسلمانوں کو آپ کے حضور میں کاربند ہونا چاہیئے:

دوسرا حصہ
اس سورہ کا "اجتماعی اور معاشرتی اخلاق" کے اہم اصول کے ایک سلسلہ پر مشتمل ہے، جن کی پابندی سے اسلامی معاشرہ میں محبت وصفا وامنیت واتحاد کی حفاظت ہوتی ہے اور ان کے برخلاف ان کو فراموش کردینا بدبینی، نفاق پراگندگی اور بدامنی کا سبب بنتا ہے۔

تیسرا حصہ
ایسے احکام ہیں، جو اختلافات اور آپس میں لڑنے کے خلاف مبارزہ کرنے کی کیفیت سے مربوط ہیں، جو بعض اوقات مسلمانوں میں پیدا ہوجاتے ہیں۔

چوتھا حصہ
انسان کی بارگاہِ خدا میں قدروقیمت اور مسئلہ تقویٰ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔

پانچواں حصہ

اس مسئلہ کی تاکید کرتا ہے کہ ایمان صرف زبان سے اقرار کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اعتقاد قلبی کے علاوہ اس کے آثار انسانی اعمال اور اموال اور نفسوں کے ساتھ جہاد کرنے میں بھی آشکار ہونے چاہئیں۔

چھٹا حصہ

اس چیز سے بحث کرتا ہے کہ اسلام وایمان، خدا کا مومنین کے لیے ایک عظیم ہدیہ ہے، لہٰذا بجائے اس کے کہ اس کو قبول کر کے احسان جتلائیں، انھیں تو حد سے زیادہ ممنون و مشکور ہونا چاہیئے کہ وہ اس ہدیہ کے مشمول ہوئے۔

اور آخر میں؛

ساتواں حصہ

جو اس سورہ کا آخری حصہ ہے، تمام عالم ہستی کے پوشیدہ اسرار، اور انسانوں کے اعمال سے خدا کے علم و آگاہی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، جو حقیقت میں ان تمام حصوں کے اجزا کے ضامن کے طور پر آیا ہے، جو اس سورہ میں بیان ہوئے ہیں۔

اس سورہ کا نام سورۂ "حجرات" اس سورہ کی چوتھی آیت کی مناسبت سے ہے، جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور اس کی تفسیر عنقریب بیان ہو گی۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے سلسلہ میں بس یہی کافی ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ منقول ہوا ہے:

"من قرأ سورة الحجرات اعطی من الاجر عشر حسنات بعدد من اطاع الله ومن عصاه"

"جو شخص سورۂ حجرات کو پڑھے گا اُسے ان تمام افراد کی تعداد کے برابر، جنہوں نے خدا کی اطاعت کی ہے، یا نافرمانی کی ہے، دس نیکیاں دی جائیں گی۔

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے۔

" من قرأ سورة الحجرات فی کل لیلة او فی کل یوم، کان من زوار محمد (ص) "

" جو شخص سورۂ حجرات کو ہر رات یا ہر روز پڑھے گا وہ زائرین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے ہوگا۔"

یہ بات واضح ہے کہ یہ تمام حسنات اطاعت کرنے والوں اور معصیت کرنے والوں میں اس صورت میں نموپذیر ہوں گے۔ جب انسان ان دونوں میں سے ہر ایک کے اعمال کو، جو اس سورہ میں منعکس ہوئے ہیں وقت کے ساتھ نظر میں رکھے، ان میں غور و فکر کرے اور اپنے راہ عمل کو اول پر منطبق اور دوسرے سے جدا کرے۔

علاوہ ازیں پیغمبر گرامیؐ کی زیارت سے مشرف ہونا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ جو آداب اس سورہ میں آنحضرتؐ کی شخصیت کے بارے میں آئے ہیں ان پر عمل کرے، کیونکہ تلاوت تو ہر مقام پر عمل کرنے کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ○

۲۔ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَکُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجۡہَرُوۡا لَہٗ بِالۡقَوۡلِ کَجَہۡرِ بَعۡضِکُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ○

۳۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَغُضُّوۡنَ اَصۡوَاتَہُمۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ امۡتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوۡبَہُمۡ لِلتَّقۡوٰی ؕ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ○

۴۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُنَادُوۡنَکَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ○

۵۔ وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ صَبَرُوۡا حَتّٰی تَخۡرُجَ اِلَیۡہِمۡ لَکَانَ خَیۡرًا لَّہُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ اے ایمان لانے والو! خدا اور اس کے رسول سے کسی چیز میں آگے نہ بڑھا کرو، اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، بیشک خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۲۔ اے ایمان لانے والو! تم اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز سے بلند نہ کیا کرو، اور اس کے سامنے اونچے اونچے نہ بولا کرو۔ (اور چیخ و پکار نہ کرو) جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے (زور زور سے) باتیں کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھارے سب اعمال ضائع ہو جائیں اور تمھیں خبر تک نہ ہو۔

۳۔ وہ لوگ جو رسول خدا کے سامنے اپنی آوازیں نیچی رکھتے ہیں، ایسے لوگ ہیں جن کے دلوں کو خدا نے تقویٰ کے لیے خالص کر لیا ہے، ان کے لیے بخشش اور اجر عظیم ہے۔

۴۔ لیکن وہ لوگ جو تمھیں حجروں کے پیچھے سے بلند آواز کے ساتھ پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر سمجھتے نہیں ہیں۔

۵۔ اگر وہ لوگ اتنا صبر کرتے کہ تم خود نکل کر ان کے پاس آجاتے تو ان کے لیے بہتر تھا، اور خدا غفور و رحیم ہے۔

شانِ نزول

مفسرین نے پہلی آیت کے لیے تو بہت سی الگ شان نزول بیان کی ہیں اور بعد والی آیات کے لیے دوسری شان نزول۔

ان میں سے پہلی آیت کے لیے جو شان نزول بیان کی ہیں۔ یہ ہے کہ پیغمبرؐ "خیبر" کی طرف روانہ ہوتے وقت کسی کو "مدینہ" میں اپنی جگہ متعین کرنا چاہتے تھے۔ لیکن عمر نے کسی دوسرے آدمی کو متعین کرنے کی تجویز پیش کی اس پر اُوپر

والی آیت نازل ہوئی اور یہ حکم دیا کہ تم خدا اور پیغمبر سے آگے نہ بڑھا کرو۔ [1]

بعض دوسرے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کے لوگ کبھی کبھی یہ کیا کرتے تھے کہ اگر اس قسم کا معنی ہمارے بارے میں نازل ہوتا تو بہتر تھا، اس پر اوپر والی آیت نازل ہوئی، اور کہا کہ تم خدا اور اس کے پیغمبر سے آگے نہ بڑھا کرو۔ [2]

بعض دوسروں نے یہ کہا ہے: یہ آیت بعض مسلمانوں کے اعمال کی طرف اشارہ ہے۔ جنہوں نے اپنی عبادات کے مراسم میں سے بعض کو وقت سے پہلے انجام دے دیا تھا تو اوپر والی آیت نازل ہوئی، اور انہیں اس قسم کے کاموں سے منع کیا۔ [3]

باقی رہی دوسری آیت تو اس کے بارے میں یہ کہا ہے کہ قبیلہ بنی تمیم کا ایک گروہ اور ان کے اشراف مدینہ میں وارد ہوئے اور جب مسجد نبوی میں داخل ہوئے تو بلند آواز کے ساتھ، ان حجروں کے پیچھے سے، جو پیغمبرؐ کی رہائش گاہ تھے، پکار پکار کر کہا: یا محمد اخرج الینا! ° اے محمد! باہر آ ° !

اس چیخ پکار، اور غیر مودبانہ تعبیروں سے پیغمبر کو دکھ ہوا، جس وقت آپ باہر آئے تو انھوں نے کہا: ہم اس لیے آئے ہیں تاکہ اپنا فخر تجھ پر ظاہر کریں، اجازت دے تاکہ ہمارا "شاعر" اور "خطیب" بنی تمیم کے افتخارات بیان کرے پیغمبرؐ نے اجازت دی۔

پہلے ان کا خطیب کھڑا ہوا، اور قبیلہ بنی تمیم کے خیالی فضائل کی بہت سی باتیں بیان کیں۔

پیغمبرؐ نے ثابت بن قیس سے فرمایا [4] تم ان کا جواب دو، وہ کھڑے ہو گئے اور ان کے جواب میں ایک فصیح و بلیغ خطبہ پیش کیا، جس نے ان کے خطبہ کے اثر کو ختم کر دیا۔

اس کے بعد ان کا "شاعر" کھڑا ہوا، اور اس نے اس قبیلہ کی مدح میں کچھ اشعار کہے، جن کا مشہور مسلمان شاعر "حسان بن ثابت" نے کافی و شافی جواب دیا۔

اس وقت اس قبیلہ کے اشراف میں سے ایک نے جس کا نام "اقرع" تھا، کہا: اس شخص کا خطیب ہمارے خطیب سے زیادہ توانا ہے اور اس کا شاعر ہمارے شاعر سے زیادہ لائق ہے۔ اور ان کی آواز کی طرز بھی ہم سے برتر و بہتر ہے۔

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۹ صفحہ ۶۱۲۱۔

[2] تفسیر قرطبی جلد ۹ صفحہ ۶۱۲۱۔

[3] تفسیر قرطبی جلد ۹ صفحہ ۶۱۲۱۔

[4] ثابت ابن قیس جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و انصار کا مشترکہ خطیب تھا، جیسا کہ حسان حضرتؐ کا خطیب تھا۔ (اسد الغابہ جلد ۱ صفحہ ۲۲۹)

اس موقع پر پیغمبر نے ان کے دلوں کو مائل کرنے کے لیے حکم دیا تو اچھے اچھے ہدیے انھیں دیئے گئے۔ ان تمام باتوں کا ان پر بہت اثر ہوا، اور انھوں نے پیغمبرؐ کی نبوت کا اعتراف کر لیا۔

زیر بحث آیات پیغمبرؐ کے گھر کے پیچھے انھیں کی چیخ پکار کے بارے میں ہیں۔

ایک دوسری شانِ نزول بھی بیان کی گئی ہے جو پہلی آیت سے بھی مربوط ہے، اور بعد والی آیات سے بھی، اور وہ یہ ہے کہ:

ہجرت کے نویں سال جو "عام الوفود" تھا یعنی وہ سال جس میں قبائل کے قسم قسم کے وفود اسلام قبول کرنے یا عہد و پیمان کرنے کے لیے پیغمبرؐ کی خدمت میں آئے)۔ چنانچہ جس وقت "بنی تمیم" کے قبیلہ کے نمائندے پیغمبرؐ کی خدمت میں آئے تو ابوبکر نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تجویز پیش کی کہ "قعقاع" کو (جو ان کے اشراف میں سے ایک تھا) آپ کا امیر بنا دیا جائے اور عمر نے یہ تجویز پیش کی کہ "اقرع بن حابس" کو اسی قبیلہ کا ایک دوسرا آدمی) امیر بنایا جائے۔

اس موقع پر ابوبکر نے عمر سے کہا، کیا تم میری مخالفت کرنا چاہتے ہو؟ عمر نے کہا میرا ہرگز مخالفت کا ارادہ نہیں تھا۔ اس وقت دونوں نے پیغمبرؐ کے سامنے زور زور سے چیخنا چلانا شروع کر دیا جس پر اوپر والی آیات نازل ہوئیں، یعنی نہ تو کاموں میں پیغمبرؐ سے آگے بڑھو اور نہ ہی پیغمبر کے گھر کے سامنے چیخ پکار کرو۔[1]

تفسیر

پیغمبرؐ کی بارگاہ کے آداب

جیسا کہ ہم نے سورہ کے مضامین و مطالب کے بیان میں اشارہ کیا ہے اس سورہ میں اہم اخلاقی مباحث اور انضباطی احکام کا ایک سلسلہ نازل ہوا ہے جس نے اس کو "سورۂ اخلاق" کہلانے کے لائق بنا دیا ہے، اور زیر بحث آیات میں جو اس سورہ کے آغاز میں بیان ہوئی ہیں، ان ہی احکام کے دو حصوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

پہلا خدا و رسول پر کسی چیز میں سبقت نہ کرنا۔

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۹ صفحہ ۶۱۲۱، و تفسیر فی ظلال القرآن جلد ۷ صفحہ ۵۲۲، و سیرۃ ابن ہشام جلد ۴ صفحہ ۲۰۶ سے آگے دکھ فرق کے ساتھ) یہ داستان نقل ہوئی ہے (یہ حدیث صحیح بخاری میں بھی آئی ہے۔ صحیح بخاری جزء ۶ صفحہ ۱۷۲، سورۂ حجرات کی تفسیر میں۔

دوسرا پیغمبر کی بارگاہ میں شور و غوغا اور چیخ و پکار نہ کرنا۔

اس کے بعد فرماتا ہے: "اے ایمان لانے والو! کسی چیز کو خدا و رسول سے مقدم نہ کرو، اور خدا کا تقویٰ اختیار کرو، کیونکہ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے"۔ (یاایھا الذین امنوا لا تقدموا بین یدی الله و رسولہ واتقوا الله ان الله سمیع علیم)۔

خدا اور پیغمبر کے سامنے کسی چیز کو مقدم نہ کرنے سے مراد، کاموں میں ان سے سبقت نہ کرنا ہے، اور خدا و رسولؐ کے حکم کے مقابلہ میں عجلت اور تیزی اختیار نہ کرنا ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے آیت کے مفہوم کو محدود کرنا چاہا ہے کہ اس کو وقت سے پہلے عبادات کو انجام دینے، یا پیغمبرؐ کے گفتگو کرنے سے پہلے بات کرنے، اور اسی قسم کی دوسری چیزوں میں منحصر سمجھیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ آیت ایک وسیع اور کشادہ مفہوم رکھتی ہے اور ہر قسم کے پروگرام میں ہر قسم کی سبقت کرنا شامل ہے۔ [1]

"پیروکاروں" کی "پیشواؤں اور رہبروں" کے سامنے نظم و ضبط کی ذمہ داری، خصوصاً ایک عظیم رہبر الٰہی کے ضمن میں اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ کسی کام میں اور کسی بات اور پروگرام میں ان پر سبقت اور پیش قدمی، اور عجلت اور تیزی نہ کریں۔

البتہ یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ اگر وہ کوئی تجویز سامنے لاتے ہوں یا مشورہ دینا چاہتے ہوں تو وہ بھی رہبر الٰہی کے سامنے پیش نہ کریں۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس سے آگے چل پڑنا مصمم ارادہ کر لینا۔ اور کسی کام کو ان کی تصویب سے پہلے انجام دینا۔

یہاں تک کہ مسائل کے بارے میں بھی ضرورت سے زیادہ سوال و گفتگو نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ یہ بات رہبر پر چھوڑ دینی چاہیئے کہ وہ اپنے موقع و محل پر مسائل کو پیش کرے۔ خصوصاً رہبر معصوم کی صورت میں جو کسی چیز سے غفلت نہیں کرتا، اور اگر کوئی دوسرا شخص اس سے سوال کر رہا ہو تو دوسروں کو پیش قدمی اور سبقت کرتے ہوئے جلدی کر کے سوال کا جواب بھی نہیں دینا چاہیئے۔ حقیقت میں یہ تمام معانی آیت کے مفہوم میں شامل ہیں۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت دوسرے حکم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے:

"اے ایمان لانے والو! تم اپنی آواز کو پیغمبر کی آواز سے بلند نہ کرو اور اس کے سامنے اونچی آواز کے ساتھ بات نہ کرو، اور داد و فریاد اور چیخ پکار نہ کرو، جیسا کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو، کہ

---

[1] "لا تقدموا" فعل متعدی کی صورت میں ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: "لا تقدموا امرا بین یدی الله ورسولہ" کسی کام میں اور اس کے رسول پر سبقت نہ کرو۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہ فعل یہاں فعل لازم کے معنی میں آیا ہے اور اس کا مفہوم "لا تتقدموا بین یدی الله ....." ہے، اللہ کے سامنے ایک دوسرے پر تقدم نہ کرو۔ اگرچہ یہ دونوں تفاسیر اصول ادبی کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ لیکن معنی اور نتیجہ کے لحاظ سے ایک ہیں۔ بہرحال مراد یہ ہے کہ کسی چیز میں خدا اور پیغمبرؐ پر سبقت نہ کرو۔

تمہارے اعمال ختم اور نابود ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو" (یا ایها الذین امنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجهروا له بالقول کجهر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون)۔

پہلا جملہ (لا ترفعوا اصواتکم......) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اپنی آواز کو پیغمبرؐ کی آواز سے اونچی نہ کرو، کیونکہ یہاں کے حضور میں ایک قسم کی بے ادبی ہے، پیغمبرؐ کا تو مقام ہی بلند ہے۔ یہ کام تو ماں باپ اور استاد و معلم کے سامنے بھی ادب و احترام کے خلاف ہے۔

باقی رہا جملہ (لا تجهروا له بالقول....) ممکن ہے یہ اسی پہلے جملہ کے معنی کی ایک تاکید ہو۔ یا کسی نئے مطلب کی طرف اشارہ ہو، اور وہ پیغمبرؐ کو "یا محمد" کے جملہ کے ساتھ خطاب نہ کرنے اور اس کی بجائے "یا رسول اللہ" کہنا ہو۔

البتہ مفسرین کی ایک جماعت نے ان دونوں جملوں کے درمیان فرق کے بارے میں اس طرح کہا ہے، پہلا جملہ تو اس وقت کے بارے میں ہے جب لوگ پیغمبرؐ سے بات کر رہے ہوں، تو ان کی آواز پیغمبرؐ کی آواز سے اونچی نہیں ہونی چاہیئے اور دوسرے جملہ کا تعلق اس موقع سے ہے جب پیغمبرؐ خاموش ہوں اور لوگ آپ کی بارگاہ میں باتیں کر رہے ہوں، تو اس حالت میں بھی ان کی آواز زیادہ بلند نہیں ہونی چاہیئے۔

اس معنی اور سابقہ معنی کو جمع کرنے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے، اور آیت کے شان نزول کے ساتھ بھی سازگار ہے۔ بہرحال آیت کا ظاہر زیادہ تر یہی ہے، کہ وہ دو مختلف مطالب کو بیان کر رہی ہے۔

یہ بات ظاہر اور واضح ہے کہ اگر اس قسم کے اعمال مقام شان نبوت کی توہین کے ارادہ سے ہوں تو موجب کفر ہیں، اور اس کے بغیر ہوں تو ایذا رو گناہ ہیں۔

پہلی صورت میں تو اعمال کے حبط اور نابودی کی علت واضح ہے، کیونکہ کفر علت حبط (نیک عمل کے ثواب کے ختم ہونے) کا باعث ہے۔

اور دوسری صورت میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے، کہ اس قسم کا بُرا عمل بہت سے اعمال کے ثواب کی نابودی کا سبب بن جائے، اور ہم پہلے بھی "حبط" کی بحث میں بیان کر چکے ہیں کہ بعض اعمال کے ثواب کا بعض گناہوں کی وجہ سے نابود ہو جانے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ جیسا کہ اعمال صالح کی وجہ سے بعض گناہوں کے اثر کا نابود ہو جانا بھی قطعی و یقینی ہے، وہ قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں اس معنی پر بہت سے دلائل موجود ہیں، اگرچہ یہ معنی ایک قانون کلی کی صورت میں تمام "حسنات" و "سیئات" میں ثابت نہیں ہوا ہے۔ لیکن بعض اہم "حسنات" اور "سیئات" کے بارے میں بہت سی منقول دلیلیں موجود ہیں، اور عقلی طور پر بھی اس کے برخلاف کوئی دلیل نہیں ہے۔[1]

---

[1] مسئلہ "حبط" کے بارے میں مزید تشریح جلد ۱ ص ۵۰۶ (سورہ بقرہ کی آیہ ۲۱۷ کے ذیل میں) مطالعہ فرمائیں۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ جس وقت اوپر والی آیت نازل ہوئی، تو "ثابت بن قیس" نے (جو پیغمبرؐ کے خطیب تھے اور بلند آواز تھے) کہا، وہ میں تھا جو اپنی آواز کو پیغمبرؐ کی آواز سے بلند کیا کرتا تھا اور آپؐ کے سامنے اونچی آواز سے خطاب کیا کرتا تھا، پس میرے اعمال نابود ہو گئے ہیں، اور میں اہل دوزخ میں سے ہوں۔

یہ مطلب پیغمبرؐ کے کانوں تک پہنچا تو آپؐ نے فرمایا: "ایسا نہیں ہے، وہ اہل بہشت میں سے ہے" (کیونکہ وہ یہ کام مومنین کے لیے خطاب کرتے وقت یا مخالفین کے مقابلہ میں ایک اسلامی وظیفہ و ذمہ داری ادا کرنے کے لیے انجام دیا کرتا تھا) [1]

جیسا کہ عباس بن عبد المطلب نے بھی جنگ "حنین" میں پیغمبرؐ کے حکم سے بلند آواز میں بھاگنے والوں کو واپس لوٹنے کی دعوت دی تھی۔

بعد والی آیت میں، اس موضوع پر مزید تاکید کے لیے، ان لوگوں کے اجر و ثواب کو، جو خدا کے اس دستور پر عمل کرتے ہیں، اور پیغمبرؐ کے سامنے انضباط و ادب کی رعایت کرتے ہیں، اس طرح بیان کرتا ہے، "وہ لوگ جو اپنی آواز پیغمبرؐ کے سامنے دھیمی رکھتے ہیں، ایسے لوگ ہیں، جن کے دلوں کو خدا نے تقویٰ کے لیے خالص اور کشادہ کر دیا ہے اور ان کے لیے مغفرت و عظیم اجر ہے": (ان الذین یغضون اصواتھم عند رسول اللہ اولٰئک الذین امتحن اللہ قلوبھم للتقوٰی لھم مغفرۃ واجر عظیم) [2]

"یغضون" "غض" (بروزن حظ) کے مادہ سے نگاہ یا صدا کو کم کرنے اور کوتاہ کرنے کے معنی میں ہے، اور اس کے مقابلہ میں نگاہ کو خیرہ کرنا اور آواز کو بلند کرنا ہے۔

"امتحن" "امتحان" کے مادہ سے، اصل میں سونے کو پگھلانے اور غیر خالص کو الگ کرنے کے معنی میں ہے اور بعض اوقات چمڑے کو پھیلانے کے معنی میں بھی آیا ہے، لیکن بعد میں آزمائش کے معنی میں استعمال ہونے لگا، جیسا کہ زیر بحث آیت میں ہے ایسی آزمائش جس کا نتیجہ دل کا خلوص اور تقویٰ قبول کرنے کے لیے اس میں وسعت کا پیدا ہونا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ پہلی آیت میں "نبی" کی تعبیر ہوئی ہے اور یہاں "رسول اللہ" کی تعبیر ہے، اور یہ

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۱۳۰۔ یہ حدیث مختصر سے فرق کے ساتھ بہت سے مفسرین و محدثین کے کلمات میں، منجملہ ان کے نور الثقلین، صحیح بخاری، تفسیر فی ظلال القرآن اور مراغی میں، آئی ہے۔

[2] "للتقوٰی" میں "لام" درحقیقت "لام غایت" ہے نہ کہ "لام علت" یعنی ان کے دلوں کو تقویٰ کو قبول کرنے کے لیے خالص اور آمادہ کرتا ہے، کیونکہ اگر دل خالص نہ ہو اور آلودگیوں سے پاک نہ ہو تو پھر حقیقی تقویٰ اس میں جاگزیں نہیں ہو سکتا۔

دونوں باتیں گویا اس نکتہ کی طرف اشارہ ہیں کہ پیغمبر اپنی طرف سے کچھ نہیں رکھتا، وہ خدا کا بھیجا ہوا اور اس کا پیام لانے والا ہے لہٰذا اس کے سامنے سوء ادب خدا کے بارے میں سوء ادب ہے اور اس کے لیے ادب کی رعایت کرنا خدا کیلئے ادب کی رعایت کرنا ہے۔

ضمنی طور پر "مغفرة" کی تعبیر نکرہ کی صورت میں تعظیم واہمیت کے لیے ہے، یعنی خدا انھیں کامل وعظیم مغفرت نصیب کرے گا۔ اور گناہ سے پاک ہونے کے بعد انھیں اجر عظیم عنایت فرمائے گا۔ کیونکہ پہلے تو گناہ سے پاک ہونا پڑتا ہے اس کے بعد خدا کا عظیم اجر حاصل ہوتا ہے۔

بعد والی آیت مزید تاکید کے لیے، ایسے لوگوں کی نادانی اور بے عقلی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جو اس حکم الٰہی کو پس پشت ڈال دیتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے: "جو لوگ تجھے حجروں کے پیچھے سے بلند آواز کے ساتھ پکارتے ہیں ان میں سے اکثر عقل وخرد سے کورے ہیں" (ان الذین ینادونک من وراء الحجرات اکثرھم لا یعقلون)۔

یہ کونسی عقل وخرد ہے کہ انسان خدا کے عظیم ترین سفیر کے سامنے ادب وآداب کی رعایت نہ کرے، اور "بنی تمیم" کے بدوؤں کی طرح، بلند اور غیر مؤدبانہ آواز پیغمبر کے گھر کے پیچھے نکالے اور پکار پکار کر کہے: یا محمد! یا محمد! اخرج الینا، اور پروردگار کی اس مہر وعطوفت کے مرکز کو اس طرح سے ایذا اور آزار پہنچائے۔

اصولی طور پر انسان کی عقل وخرد جتنی بلند ہوتی جاتی ہے اتنا ہی اس کے ادب میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ "قدروں" اور "اقتدار کی ضد" کو بہتر طور پر سمجھنے لگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بے ادبی ہمیشہ بے عقلی کی نشانی ہوتی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں بے ادبی حیوان کا کام ہے اور ادب انسان کا۔

"اکثرھم لا یعقلون" (ان میں سے اکثر سمجھتے نہیں ہیں) کی تعبیر یا تو اس بنا پر ہے کہ "اکثر" بعض اوقات لغت عرب میں "کل اور سب" کے معنی میں بولا جاتا ہے، لیکن احتیاط اور ادب کی رعایت کی بنا پر اس تعبیر کو استعمال کرتے ہیں، تاکہ اگر ایک شخص بھی مستثنیٰ ہوا ہو تو اس کا حق بھی ضائع نہ ہو، گویا خدا اس تعبیر کے ساتھ فرماتا ہے: میں جو تمھارا پروردگار ہوں، اور ہر چیز پر احاطہ علمی رکھتا ہوں، میں بات کرتے وقت آداب کی رعایت کرتا ہوں تو پھر تم کیوں رعایت نہیں کرتے؟

یا یہ کہ واقعاً ان کے درمیان کچھ عقلمند آدمی بھی تھے جو عدم توجہ یا ہمیشہ کی عادت کی بنا پر صدا بلند کرتے تھے۔ قرآن اس طریقہ سے انہیں تنبیہ کر رہا ہے کہ وہ اپنی عقل وخرد کو کام میں لائیں اور ادب کو فراموش نہ کریں۔

"حجرات" "حجرہ" کی جمع ہے یہاں ان متعدد کمروں کی طرف اشارہ ہے جو مسجد نبوی کے پہلو میں آپؐ کی ازواج کے لیے تیار کئے گئے تھے، اور اصل میں "حجر" (بروزن اجر) کے مادہ سے منع کے معنی میں ہے۔ کیونکہ حجرہ دوسرے لوگوں کے لیے انسان کی زندگی کے حریم میں داخل ہونے سے مانع ہے، اور یہاں "وراء" کی تعبیر باہر کے معنی میں ہے چاہے جس طرف سے ہو، کیونکہ پیغمبر کے حجروں کے دروازے مسجد کی طرف کھلتے تھے، اور نادان وجلد باز

لوگ بعض اوقات حجرہ کے دروازے کے سامنے آتے، اور "یا محمدؐ" کہہ کر پکارتے، قرآن انھیں اس کام سے منع کر رہا ہے۔

❊ ❊ ❊

آخری زیر بحث آیت میں اس معنی کی تکمیل کے لیے مزید کہتا ہے:

"اگر وہ صبر سے کام لیتے اور اتنا صبر کرتے کہ تم خود نکل کر اُن کے پاس آجاتے تو ان کے لیے بہتر تھا" (ولو انهم صبروا حتّى تخرج اليهم لكان خيرًا لهم)۔

یہ ٹھیک ہے کہ عجلت اور جلد بازی سے بعض اوقات انسان اپنے مقصد تک جلد تر پہنچ جاتا ہے، لیکن ایسے مقام پر صبر و شکیبائی ہی مایہ رحمت و آمرزش اور اجر عظیم ہے، اور یقیناً یہ اس پر برتری رکھتا ہے۔

اور چونکہ کچھ افراد لاشعوری طور پر پہلے اس قسم کے کام کے مرتکب ہو چکے تھے۔ اور وہ اس خدائی حکم کے نزول کے ساتھ طبعاً و فطرۃً وحشت میں پڑ جاتے، لہٰذا قرآن انھیں یہ خوشخبری دیتا ہے۔ کہ اگر وہ توبہ کرلیں تو وہ بھی خدا کی رحمت میں شامل ہو جائیں گے۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے، "اور خدا غفور و رحیم ہے" (والله غفور رحيم)۔

چند نکات

۱۔ ادب افضل ترین سرمایہ ہے

اسلام میں ہر شخص اور ہر گروہ سے ملاقات میں احترام و ادب سے پیش آنے کی، اور رعایت آداب کے مسئلہ کی بہت زیادہ اہمیت بیان ہوئی ہے، یہاں نمونہ کے طور پر چند احادیث کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الادب حلل مجددة: "ادب کی رعایت زینت کے نئے فاخرہ لباس کی طرح ہے"۔ [1]

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"الادب يغني عن الحسب": "ادب انسان کو اپنے آباؤ اجداد اور بڑوں پر فخر کرنے سے بے نیاز کر دیتا ہے"۔ [2]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

---

[1] نہج البلاغہ، حکمت ۵۔

[2] بحار الانوار، جلد ۷۸، ص ۶۸

"خمس من لم تکن فیه لم یکن فیه کثیر مستمتع

قیل وما هن یابن رسول الله؟

قال: الدین والعقل والحیاء وحسن الخلق وحسن الادب.

"پانچ چیزیں ایسی ہیں کہ وہ جس شخص میں نہ ہوں تو وہ قابل ملاحظہ صفات وامتیازات کا حامل نہ ہوگا۔

عرض کیا گیا: اے فرزندِ رسول اللہ وہ کیا ہیں؟

فرمایا: دین وعقل وحیار وحسن خلق وحسن ادب۔[1]

اس کے علاوہ ایک اور حدیث میں اسی امام سے منقول ہے۔ کہ آپؑ نے فرمایا:

"لا یطمعن ذوا لکبر فی الثناء الحسن ولا الخب فی کثرة الصدیق ولا السیی الادب فی الشرف:

"تکبر کرنے والوں کو لوگوں سے ذکر خیر کی ہرگز توقع نہیں رکھنی چاہیئے، اور نہ ہی دھوکہ باز اور مکار لوگوں کو دوستوں کی کثرت کی امید رکھنی چاہیئے، اور نہ ہی بے ادب لوگوں کو عزت وآبرو اور شرف وبزرگی کی توقع کرنی چاہیئے۔[2]

اسی بنا پر جب ہم اسلام کے عظیم رہنماؤں کی زندگی میں غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ادب سے متعلق دقیق ترین نکات کی اپنے سے چھوٹے افراد تک کے لیے بھی رعایت کرتے تھے۔

اصولی طور پر دین آداب کا ایک مجموعہ ہے۔ خدا کے لیے ادب پیغمبرؐ کے سامنے ادب، ائمہ معصومینؑ کے سامنے ادب استاد ومعلم، ماں باپ اور عالم ودانش مند کے سامنے ادب۔

یہاں تک کہ قرآن مجید کی آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اپنے اس مقام عظمت کے باوجود جب اپنے بندوں سے بات کرتا ہے تو آداب کی پورے طور پر رعایت کرتا ہے۔

جب صورت حال یہ ہو تو پھر خدا اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے لوگوں کی ذمہ داری واضح اور روشن ہے۔

ایک حدیث میں منقول ہے:

"جس وقت سورۂ مومنون کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں، اور انھیں آداب اسلامی کے دستور دے رکھا۔ جن میں سے ایک نماز میں خشوع کا مسئلہ تھا۔ تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو پہلے

---

[1] بحارالانوار، جلد ۷۵، ص ۶۷۔

[2] بحارالانوار، جلد ۷۵، ص ۱۰۔

نماز کے وقت آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتے تھے، پھر کبھی سر نہیں اُٹھایا اور پھر آپؐ ہمیشہ زمین ہی کی طرف نظر رکھتے تھے"۔ [1]

پیغمبر خدا کے بارے میں بھی یہ موضوع اس حد تک اہم ہے کہ قرآن اوپر والی آیات میں صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ پیغمبرؐ کی آواز سے آواز بلند کرنا، اور ان کے سامنے شور و غل مچانا حبطِ اعمال کا موجب اور ثواب کے ختم ہونے کا سبب ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ پیغمبرؐ کے سامنے صرف اس نکتہ کی رعایت ہی کافی نہیں ہے، بلکہ دوسرے ایسے امور بھی جو سوءِ ادب کے لحاظ سے آواز بلند کرنے اور شور و غل مچانے کے مانند ہیں وہ بھی آپ کی بارگاہ میں ممنوع ہیں، اور فقہی اصطلاح میں بیان "القاءِ خصوصیت" اور "تنقیحِ مناط" کرنی چاہیئے۔ اور اس کے اشباہ و نظائر یعنی ملتی جلتی باتوں کو بھی اس سے ملحق کرنا چاہتے۔

سورۂ نور کی آیہ ۶۳ میں بھی یہ بیان ہوا ہے: لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا، مفسرین کی ایک جماعت نے اس کی یوں تفسیر کی ہے: "جس وقت تم پیغمبر کو پکارتے ہو تو ایسے ادب و احترام کے ساتھ اُسے پکارا کرو جو اُس کے لائق ہے، نہ کہ اس طرح سے جیسے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔"

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن اوپر آیات میں پیغمبرؐ کے سامنے ادب کی رعایت کو دل کی پاکیزگی، تقویٰ کو قبول کرنے کی آمادگی کی نشانی، اور بخشش و آمرزش اور اجرِ عظیم کا سبب شمار کرتا ہے، جبکہ بے ادب لوگوں کو بے عقل چوپایوں کے مانند بتاتا ہے۔

یہاں تک کہ بعض مفسرین نے زیرِ بحث آیات کو وسعت دیتے ہوئے یہ تک کہا ہے کہ یہ بات نچلے مراحل و مراتب مثلاً علماء، دانش مندوں اور فکری و اخلاقی رہبروں پر بھی عائد ہوتی ہے اور مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اُن کے سامنے بھی آداب کی رعایت کریں۔

البتہ ائمہ معصومینؑ کے سامنے تو یہ مسئلہ اور بھی زیادہ واضح ہے، یہاں تک کہ ان روایات میں جو اہل بیتؑ کے طریقے سے ہم تک پہنچی ہیں یہ بیان ہوا ہے کہ: جب ایک صحابی جنابت کی حالت میں آپؑ کی خدمت میں آیا تو امامؑ نے بغیر تمہید کے فرمایا:

"اما تعلم انہ لا ینبغی للجنب ان یدخل بیوت الانبیاء؟!"

"کیا تمہیں یہ علم نہیں ہے کہ کسی جنابت والے کے لیے انبیاء کے گھر میں داخل ہونا مناسب نہیں ہے"؟ [2]

اور دوسری روایت میں "ان بیوت الانبیاء واولاد الانبیاء لا یدخلھا الجنب" کی تعبیر ہوئی ہے "جو انبیاء کے گھروں کے لیے بھی ہے اور اولادِ انبیاء کے گھروں کے لیے بھی"

---

[1] تفسیر مجمع البیان، "تفسیر فخر رازی" سورۂ مومنون کی آیہ ۲ کے ذیل میں۔

[2] بحار الانوار جلد ۲۷ ص ۲۵۵۔

مختصر یہ ہے کہ چھوٹوں اور بڑوں کے سامنے ادب کی رعایت کا مسئلہ اسلامی احکام کے ایک اہم حصہ پر مشتمل ہے۔ اگر ہم ان سب پر بحث کرنا چاہیں تو تفسیر آیات کی حد سے باہر ہو جائیں گے، ہم یہاں اس بحث کو امام سجاد علی بن الحسین کی ایک حدیث کے ساتھ، جو رسالہ حقوق میں اُستاد کے سامنے ادب کی رعایت کے بارے میں ہے ختم کرتے ہیں آپ نے فرمایا:

"اس شخص کا حق جو تجھے تعلیم دیتا ہے اور تربیت کرتا ہے یہ ہے کہ تو اس کا احترام کرے، اس کی مجلس کو محترم شمار کرے اس کی باتیں کامل طور سے کان دھر کے سُنے، اس کے رُو برو مؤدب ہو کر بیٹھے، اپنی آواز کو اس کی آواز سے بلند نہ کرے اور جب کوئی اس سے سوال کرے تو جواب دینے میں جلدی نہ کرے، اس کے حضور میں کسی سے باتیں نہ کرے اور اس کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرے، اگر اس کے پیٹھ پیچھے کوئی اسے بُرا بھلا کہے تو اس کا دفاع کرے، اس کے عیوب کو چھپائے اور اس کے فضائل کو آشکار کرے، اس کے دشمنوں کے پاس نہ بیٹھے اور اس کے دوستوں کو دشمن نہ رکھے، جس وقت تو ایسا کرے گا تو خدا کے فرشتے گواہی دیں گے کہ تو اس کے پاس گیا ہے اور خدا کے لیے تو نے اس سے علم حاصل کیا ہے نہ کہ مخلوقِ خدا کے لیے۔" [1]

۲۔ پیغمبرؐ کی قبر کے پاس آواز بلند کرنا

علماء اور مفسرین کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ زیرِ بحث آیات جس طرح پیغمبرؐ کی زندگی میں ان کے پاس آواز بلند کرنے سے منع کرتی ہیں اسی طرح ان کی وفات کے بعد کے زمانہ پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ [2]

اگر ان کی مراد آیت کی عبارتوں کا شمول ہے تو ظاہر آیت رسول اللہ کے زمانہ حیات کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ یہ آیت کہتی ہے کہ اپنی آواز کو آپ کی آواز سے بلند نہ کرو، اور یہ اسی صورت میں ہوگا۔ جب پیغمبرؐ حیات جسمانی رکھتے ہوں اور یہ بات کر رہے ہوں۔

اور اگر اس سے مراد مناط و فلسفۂ حکم ہو، جو اس قسم کے موقع پر ظاہر و واضح ہے، اور اہل عرف اس کا خصوصیت کرتے ہوں، تو پھر تعمیم مذکور بعید نظر نہیں آتی کیونکہ یہ بات تو مسلم ہے کہ یہاں ہدف و مقصد پیغمبرؐ کی ساحت قدس میں ادب و احترام کی رعایت ہے۔ اس بنا پر جب پیغمبرؐ کی قبر کے پاس آواز بلند کرنا ایک قسم کی بے احترامی اور ہتک حرمت ہو تو بلا شک و شبہ یہ بات جائز نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ اذان نماز کی صورت میں ہو، یا تلاوت قرآن یا خطبہ اور اس کے مانند دوسرے بیانات ہوں تو اس قسم کے مواقع پر نہ تو پیغمبر کی زندگی میں یہ بات ممنوع ہے اور نہ ہی وفات

---

[1] "محجۃ البیضاء" جلد ۳ ص ۲۵۰ (باب آداب الصحبۃ المعاشرہ)

[2] "روح المعانی" جلد ۲۶ ص ۱۲۵

کے بعد۔

اصول کافی میں ایک حدیث میں امام باقرؑ سے اُس واقعہ کے بارے میں منقول ہے، جو وفات امام حسن مجتبیٰؑ کے موقع پر اُس ممانعت کے سلسلہ میں، جو حضرت کے جوار پیغمبرؐ میں دفن ہونے کے بارے میں "عائشہ" نے کی تھی، اور اس پر ایک چیخ پکار بلند ہوئی تو امام حسینؑ نے " یا ایھا الذین اٰمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ...... کی آیت سے استدلال کیا اور رسُولؐ خدا سے یہ جملہ نقل فرمایا: ان اللّٰہ حرم من المؤمنین امواتاً ما حرم منھم احیاء: " خدا نے مومنین کے بیے جو کچھ حال حیات میں حرام کیا ہے وہ ان کی موت کے بعد بھی حرام کیا ہے "۔[1]

یہ حدیث آیت کے مفہوم کی عمومیت کی ایک اور گواہ ہے۔

۲۔ ہر چیز میں اور ہر جگہ انضباط اسلامی

مسئلہ مدیریت و فرمانروائی نظم و ضبط کی رعایت کے بغیر کبھی بھی درست نہیں۔ اگر وہ لوگ جو کسی مدیر و رہبر کے ماتحت ہوں خود سرانہ عمل کریں تو تمام کاموں کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ چاہے رہبر کتنا ہی لائق و شائستہ کیوں نہ ہو۔

بہت سی شکستیں اور ناکامیاں اور جو بہت سے گروہوں، جمعیتوں یا لشکروں کو دامن گیر ہوئی ہیں وہ سب اسی راہ گزر سے ہوئی ہیں اور مسلمانوں نے بھی اس دستور سے تخلف کا تلخ مزہ پیغمبرؐ کے زمانہ میں اور اس کے بعد بارہا چکھا ہے جن میں سے سب سے زیادہ واضح جنگ " احد" کی شکست ہے جو ایک تھوڑے سے جنگجو گروہ کی بے قاعدگی کی وجہ سے ہوئی تھی۔

قرآن مجید نے اس حد سے زیادہ اہم مسئلہ کو، اوپر والی آیات میں مختصر سی عبارتوں میں جامع اور پرکشش صورت میں پیش کیا ہے اور کہتا ہے: یا ایھا الذین اٰمنوا لا تقدموا بین یدی اللّٰہ ورسولہ۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، آیت کے مفہوم کی وسعت اس قدر زیادہ ہے کہ وہ ہر قسم کے "تقدم" و "تاخر" اور خود سرانہ گفتار و رفتار کو رہبری کے دستور سے خارج ہو شامل ہے۔

ان حالات میں پیغمبرؐ کی زندگی کی تاریخ میں زیادہ مواقع ایسے نظر آتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے آپؐ کے فرمان پر سبقت کی، یا پیچھے رہ گئے اور آپ کی اطاعت سے رُوگردانی کی، تو شدید ملامت و سرزنش کا محل قرار پائے۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ:

① جس وقت پیغمبرؐ فتح مکہ کے لیے روانہ ہوئے (تو اس وقت ہجرت کے آٹھویں سال کا) ماہ مبارک رمضان تھا

---

[1] اصول کافی مطابق نقل نورالثقلین جلد ۵ ص ۸۰۔

اور بہت زیادہ جمعیت آپ کے ہمراہ تھی، ایک گروہ سوار اور ایک پیادہ تھا جس وقت آپ "کراع الغمیم" کی منزل پہنچے تو آپ کے حکم سے پانی کا برتن لایا گیا، اور حضرت نے اپنا روزہ افطار کیا آپ کے ہمراہیوں نے بھی افطار کیا، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک گروہ نے آپ سے سبقت کی اور افطار کرنے پر تیار نہ ہوا اور اپنے روزے پر قائم رہے، تو پیغمبرؐ نے انھیں "عصاۃ" (یعنی گناہگاروں کا گروہ) نام دیا۔ ؎۱

② دوسرا نمونہ "حجۃ الوداع" کی داستان میں ہجرت کے دسویں سال میں واقع ہوا، پیغمبرؐ نے منادی کو یہ ندا کرنے کا حکم دیا کہ جو شخص قربانی کا جانور اپنے ساتھ نہیں لایا وہ پہلے "عمرہ" بجالائے اور احرام سے خارج ہو جائے، اس کے بعد مراسم حج بجالائے، لیکن جو لوگ قربانی کا جانور ساتھ لائے ہیں (اور ان کا حج، حج افراد ہے) وہ اپنے احرام پر برقرار رہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے مزید فرمایا، اگر میں قربانی کے اونٹ ہمراہ نہ لایا ہوتا، تو میں عمرہ کی تکمیل کرتا اور احرام سے خارج ہو جاتا، لیکن ایک گروہ نے اس حکم کو انجام دینے سے روگردانی کی اور کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پیغمبرؐ تو اپنے احرام پر باقی رہے اور ہم احرام سے خارج ہو جائیں؟ کیا یہ بری بات نہیں ہے کہ ہم مراسم حج کی طرف عمرہ بجالانے کے بعد جائیں جبکہ غسل (جنابت) کے پانی کے قطرات ہم سے گر رہے ہوں۔

پیغمبرؐ اس تخلف اور بے انضباطی سے سخت رنجیدہ ہوئے اور سختی کے ساتھ سرزنش کی ؎۲

③ پیغمبرؐ کی وفات کے قریب لشکر "اسامہ" سے تخلف کی داستان مشہور ہے کہ آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ "اسامہ بن زید" کی کمان میں رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے آمادہ ہوں اور مہاجرین و انصار کے لیے یہ حکم تھا کہ وہ اس لشکر کے ساتھ جائیں۔

شاید آپ کا منشا یہ تھا کہ آپؐ کی رحلت کے وقت وہ مسائل جو امر خلافت میں واقع ہوئے وہ نہ ہوں، یہاں تک کہ آپؐ نے لشکر اسامہ سے تخلف کرنے والوں پر لعنت فرمائی۔ لیکن اس کے باوجود ایک گروہ نے جانے سے روگردانی کی اور بہانہ یہ کیا کہ ہم پیغمبرؐ کو ایسے حالات میں تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔ ؎۳

④ پیغمبر گرامی اسلام کی زندگی کے آخری لمحات میں "قلم دوات" کی داستان بھی مشہور اور ہلا دینے والی ہے، بہتر یہ ہے کہ ہم صحیح مسلم کی اصل عبارت کو یہاں نقل کردیں۔

"لما حضر رسول الله وفی البیت رجال فیھم عمر بن الخطاب

؎۱ اس حدیث کو بہت سے مورخین اور محدثین نے نقل کیا ہے۔ منجملہ وسائل کی جلد ۷، ص ۱۲۵ (ابواب من یصح منه الصوم) (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)

؎۲ "بحار الانوار" جلد ۲۱ ص ۳۰۶ تلخیص کے ساتھ

؎۳ اس ماجرے کو بہت سی کتب تواریخ اسلامی میں لکھا گیا ہے اور یہ تاریخ اسلام کے اہم حوادث میں سے ہے (مزید اطلاع کے لیے المراجعات کے مراجعہ ۹۰ کی طرف رجوع کریں۔

فقال النبی (ص) هلموا اکتب لکم کتاباً لا تضلون بعده، فقال عمر ان رسول اللہ (ص) قد غلب علیہ الوجع و عندکم القرآن، حسبنا کتاب اللہ، فاختلف اهل البیت، فاختصموا، فمنهم من یقول قربوا یکتب لکم رسول اللہ (ص) کتاباً لن تضلوا بعده، و منهم من یقول ما قال عمر، فلما اکثروا اللغو والاختلاف عند رسول اللہ (ص)، قال رسول اللہ قوموا!»

«جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کا وقت قریب آیا تو اس وقت ایک گروہ آپ کے پاس گھر میں موجود تھا جن میں عمر بن الخطاب بھی تھا، پیغمبرؐ نے فرمایا کہ کاغذ لے آؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایسی چیز لکھ جاؤں جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہ ہو گے، عمر نے کہا، بیماری نے پیغمبر پر غلبہ کیا ہے۔ (العیاذ باللہ ناموزوں باتیں کر رہے ہیں) قرآن تمہارے پاس ہے اور یہی خدا کی کتاب ہمارے لیے کافی ہے۔ تو اس وقت گھر میں موجود لوگوں میں اختلاف پڑ گیا۔ بعض نے کہا کہ لے آؤ تاکہ پیغمبرؐ اپنی تحریر لکھ دیں تاکہ تم ہرگز گمراہ نہ ہو، جبکہ بعض دوسرے عمر کی بات کا تکرار کر رہے تھے، جس وقت ناموزوں باتیں اور اختلاف بڑھ گئے، تو پیغمبرؐ نے فرمایا، اٹھ جاؤ، اور مجھ سے دور ہو جاؤ۔[1]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بعینہ یہی حدیث مختصر سے تفاوت اور فرق کے ساتھ بخاری نے بھی اپنی "صحیح" میں نقل کی ہے۔[2]

یہ ماجرا تاریخ اسلام کے اہم حوادث میں سے ہے، جس کے لیے بہت زیادہ تجزیہ اور تحلیل کی ضرورت ہے، اور یہاں اس کی تشریح کا موقع نہیں ہے، لیکن بہرحال یہ واقعہ پیغمبرؐ کے حکم سے خلاف ورزی کے واضح ترین مواقع اور زیر بحث آیت یا ایها الذین امنوا لا تقدموا بین یدی اللہ و رسولہ ، کی مخالفت کے روشن ترین واقعات میں شمار ہوتا ہے۔

اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس اسلامی اور الٰہی نظم و ضبط کی رعایت کے لیے رہبر پر محکم ایمان رکھنے، اور اس کی زندگی کے تمام حالات میں اس کی رہبری کو قبول کرنے اور رہبر کی اطاعت کرتے ہوئے کامل طور پر تسلیم خم کرنے کی ضرورت ہے۔

---

[1] صحیح مسلم جلد ۳۔ کتاب الوصیہ حدیث ۲۲ (ص ۱۲۵۹)

[2] صحیح بخاری جلد ۶ باب مرض النبی و وفاتہ ص ۱۱۔

۶۔ يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ○

۷۔ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ اُولٰۤىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ○

۸۔ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○

ترجمہ

۶۔ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کے بارے میں تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم نادانی کی وجہ سے کسی گروہ کو نقصان پہنچا دو، اور پھر تم اپنے کیے پر پشیمان ہو۔

۷۔ اور تم یہ جان لو کہ خدا کا رسول تمہارے درمیان میں ہے اگر وہ بہت سے امور میں تمہاری اطاعت کرے تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے، لیکن خدا نے تمہارے لیے ایمان کو محبوب قرار دے دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں زینت بخشی ہے، اور (اس کے برعکس) کفر و فسق و گناہ کو تمہارے لیے قابل نفرت قرار دے دیا ہے، (جن لوگوں میں یہ

صفات ہوں) وہی تو ہدایت یافتہ ہیں۔

۸۔ خدا نے اپنی طرف سے تمھیں فضل اور نعمت عطا کی ہے، اور خدا علیم و حکیم ہے۔

شانِ نزول

پہلی زیرِ بحث آیت کی تفسیر میں دو شانِ نزول بیان کی گئی ہیں۔ بعض نے تو جیسے طبرسی نے مجمع البیان میں دونوں کا ذکر کیا ہے، اور بعض نے۔ جیسے "قرطبی" و "نور الثقلین" و "فی ظلال القرآن" صرف ایک ہی پر اکتفا کیا ہے۔

پہلی شانِ نزول جسے اکثر مفسرین نے بیان کیا ہے، یہ ہے کہ: آیہ یا ایھا الذین امنوا ان جاءکم ...... "ولید بن عقبہ" کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جسے پیغمبرؐ نے قبیلۂ "بنی المصطلق" کی زکات جمع کرنے کے لیے بھیجا تھا، جس وقت اہل قبیلہ کو پتہ چلا کہ رسولؐ اللہ کا نمائندہ آرہا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور اس کے استقبال کے لیے دوڑے، لیکن چونکہ ان کے اور ولید کے درمیان زمانہ جاہلیت میں سخت دشمنی تھی، تو اس نے خیال کیا کہ وہ اُسے قتل کرنے کے ارادہ سے آرہے ہیں۔

وہ (اپنے اس گمان کی تحقیق کیے بغیر ہی) پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پلٹ آیا اور عرض کیا، کہ انھوں نے زکات ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے (اور ہم جانتے ہیں کہ زکات ادا کرنے سے انکار حکومت اسلامی کے خلاف ایک طرح کی بغاوت سمجھی جاتی تھی، تو اس بنا پر وہ اس بات کا مدعی تھا کہ وہ مرتد ہو گئے ہیں)۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس پر سخت غصہ آیا اور اُن سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا تو اُوپر والی آیت نازل ہوئی، اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ جس وقت کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو اس کے بارے میں تحقیق کر لیا کرو۔[1]

بعض نے اس پر مزید کہا ہے کہ "ولید" کی طرف سے "قبیلہ بنی المصطلق" کے ارتداد کی خبر دینے کے بعد پیغمبرؐ نے "خالد بن ولید بن مغیرہ" کو قبیلہ "بنی المصطلق" کی طرف بھیجا اور یہ حکم دیا کہ جلد بازی میں کوئی کام نہ کر بیٹھنا "خالد" راتوں رات قبیلہ کے قریب پہنچ گیا، اور اطلاع دینے والے مامورین کو تحقیق کے لیے بھیجا، انھوں نے آکر خبر دی کہ بنی المصطلق مکمل طور پر اسلام کے وفادار ہیں، اور ان کی اذان و نماز کی صدا انھوں نے اپنے کانوں سے سُنی ہے، صبح کے وقت "خالد" خود ان کی طرف گیا اور خبر دینے والوں کی گفتار کی صداقت ملاحظہ کی وہ پیغمبرؐ کی خد

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۹ ص ۱۳۲

میں پلٹ آیا اور ماجرا بیان کیا تو اس وقت اوپر والی آیت نازل ہوئی، اور اس کے ساتھ ہی پیغمبرؐ نے فرمایا: التأنی من اللہ والعجلۃ من الشیطان: "تاخیر و تحقیق کرنا خدا کی طرف سے ہے اور جلد بازی سے کام لینا شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔" [1]

دوسری شان نزول جسے صرف بعض مفسرین نے نقل کیا ہے، یہ ہے کہ یہ آیت "ماریہ" زوجہ پیغمبرؐ (والدہ ابراہیم) کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ کچھ لوگوں نے پیغمبرؐ کی خدمت میں یہ عرض کیا تھا کہ اس کا ایک چچازاد بھائی ہے جو کبھی کبھی اس کے پاس آتا ہے (اور ان دونوں میں غیر مشروع تعلقات ہیں) پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کو بلایا۔ اور فرمایا: اسے میرے بھائی! یہ تلوار لو، اگر تم اس کو ماریہ کے پاس دیکھو تو اُسے قتل کر دو؛

امیر المومنین علی علیہ السلام نے عرض کیا، اے خدا کے رسول کیا میں "گرم کیئے ہوئے سکّے" کی طرح مامور ہوں کہ آپ کے حکم کو عملی جامہ پہناؤں (یا جو کچھ حاضر شخص دیکھتا ہے وہ غائب نہیں دیکھتا) مزید تحقیق کر کے ذمہ داری کو پورا کروں؛

فرمایا: نہیں، بلکہ اسی بنیاد پر کہ حاضر اس چیز کو دیکھتا ہے جسے غائب نہیں دیکھتا۔ عمل کرو۔

علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے تلوار کمر سے باندھی اور اس کی طرف آیا، میں نے دیکھا کہ وہ ماریہ کے پاس ہے، میں نے تلوار کھینچی تو وہ بھاگ کھڑا ہوا اور ایک کھجور کے درخت پر چڑھ گیا، اس کے بعد اس نے اپنے آپ کو اس سے نیچے گرا دیا، اسی دوران اس کا پیراہن (کرتا)، اُوپر کو اُٹھ گیا، تو معلوم ہوا کہ وہ تو اصلاً جنسی عضو رکھتا ہی نہیں، میں پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ماجرے کی تفصیل بیان کی تو پیغمبرؐ نے فرمایا: خدا کا شکر ہے کہ اس نے بدی، آلودگی اور اتہام کو ہمارے دامن سے دُور کر دیا ہے۔ [2]

---

[1] تفسیر قرطبی" جلد ۹ ص ۶۱۳۱

[2] "سکہ" عربی زبان میں اس وسیلہ اور آلہ کے معنی میں ہے جس کے ذریعہ درہم و دینار وغیرہ پر نقش کرتے ہیں، اور اس مقصد کے لیے اُسے آگ میں گرم کرتے ہیں، تاکہ وہ اپنا نقش مکمل طور پر درہم و دینار پر منتقل کر دے، اس تعبیر سے مراد یہ ہے کہ حکم کو بے چون و چرا اور کسی تحقیق کے بغیر اجرا کیا جائے۔

[3] "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۱۳۲۔ تفسیر نور الثقلین میں بھی یہ شان نزول اس سے زیادہ تفصیلی صورت میں بیان ہوئی ہے۔ (جلد ۵ ص ۸۱)

تفسیر

فاسقوں کی خبروں پر اعتنا نہ کرو

گذشتہ آیات میں مسلمانوں اور ان کے پیشوا پیغمبرؐ کے مقابلہ میں وظائف اور ذمہ داریوں کے بارے میں گفتگو تھی، اور اس میں دو اہم احکام بیان ہوئے تھے، ایک خدا اور پیغمبرؐ پر کسی کام میں سبقت نہ کرنا اور دوسرا پیغمبرؐ کی بارگاہ میں گفتگو کرنے اور آپؐ کو آواز دینے کے وقت ادب و احترام کی رعایت کرنا،

زیر بحث آیات اس عظیم رہبر کے سامنے اُمت کے وظائف اور ذمہ داریوں کو جاری رکھتے ہوئے کہتی ہیں، کہ جس وقت تم اس کی خدمت میں خبریں لے کر آؤ تو ان کی بنیاد تحقیق پر ہونی چاہیئے اور اگر کوئی فاسق آدمی کسی چیز کی خبر دے، تو بغیر تحقیق کے اُسے قبول نہ کریں، اور پیغمبرؐ پر اُسے قبول کرنے کے لیے دباؤ نہ ڈالیں۔

پہلے فرماتا ہے: "اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق شخص تمہارے پاس خبر لے کر آئے تو اس کے بارے میں تحقیق کر لیا کرو" (یا ایہا الذین اٰمنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا)۔

اس کے بعد اس کی علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "کہیں ایسا نہ ہو کہ بغیر تحقیق عمل کرنے کی صورت میں کسی گروہ کو نادانی کی وجہ سے نقصان پہنچا دو، اور پھر اپنے کیے پر تمہیں پشیمان ہونا پڑے" (ان تصیبوا قوما بجہالۃ فتصبحوا علٰی ما فعلتم نادمین)۔

جیسا کہ پیغمبرؐ اگر "ولید بن عقبہ" کے کہنے پر عمل کر لیتے اور قبیلہ "بنی المصطلق" کے ساتھ ایک مرتد قوم کی حیثیت سے جنگ کرتے تو بہت دردناک فاجعہ اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا۔ بعد والی آیت کے لب و لہجہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک گروہ اس جنگ کرنے پر اصرار کر رہا تھا، قرآن کہتا ہے یہ کام تمہارے لیے شائستہ نہیں ہے یہ عین جہالت و نادانی ہے اور اس کا انجام ندامت و پشیمانی ہوگا۔

عُلماء علم اصول کے ایک گروہ نے خبر واحد کی حجیت پر اس آیت سے استدلال کیا ہے، کیونکہ آیت یہ کہتی ہے کہ "فاسق" کی خبر میں تحقیق و تلاش لازمی و ضروری ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ شخص "عادل" خبر دے تو اُسے بغیر تحقیق کے قبول کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اس استدلال پر بہت سے اعتراضات ہوئے ہیں، جن میں سے دو زیادہ اہم ہیں، باقی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔

پہلا یہ کہ، اوپر والا استدلال "وصف کے مفہوم کی حجیت" کو قبول کرنے پر موقوف ہے جبکہ مشہور یہ ہے کہ وصف کا مفہوم حجت نہیں ہے۔ [1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

دوسرا یہ کہ ، جو علت آیت کے ذیل میں بیان ہوئی ہے وہ اس قدر وسعت رکھتی ہے کہ "عادل" اور "فاسق" دونوں کی خبر کو شامل ہے
کیونکہ ظنی خبر پر عمل، چاہے وہ جو بھی ہو پشیمانی اور ندامت کا احتمال رکھتا ہے۔

لیکن یہ دونوں اعتراض قابل حل ہیں، کیونکہ مفہوم وصف اور ہر دوسری قید، ایسے موقعوں کے لیے جو اصطلاح کے مطابق، کسی مسئلہ کے قیود اور مقام احتراز کو بیان کرنے کے لیے ہوں، حجت ہوتی ہے، اور اوپر والی آیت میں اس قید (قید فاسق) کا ذکر ظہور عرفی کے مطابق خبر عادل کی حجت کے بیان کے سوا اور کوئی قابل ملاحظہ فائدہ نہیں رکھتا۔

لیکن وہ علت جو آیت کے ذیل میں بیان ہوئی ہے۔ ہر قسم کی ادلہ "ظنیہ" کو شامل نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایسے مواقع کے لیے ہے کہ جہاں عمل جاہلانہ یا سفیہانہ اور احمقانہ ہو، کیونکہ آیت میں "جہالت" کے عنوان پر تکیہ ہوا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ زیادہ تر ادلہ جن پر تمام عقلاء عالم روزمرہ کی زندگی میں تکیہ کرتے ہیں ظنی دلائل ہی ہیں (ظواہر الفاظ، قول شاہد، قول اہل خبرہ، قول ذوالید وغیرہ کے قبیل سے)

معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی بھی بات جاہلانہ اور سفیہانہ شمار نہیں ہوتی، اور اگر وہ کبھی کبھار واقع کے مطابق نہ بھی ہو تو پھر بھی اس میں ندامت کا کوئی مسئلہ پیش نہیں آتا، کیونکہ یہ ایک عمومی راستہ ہے۔

بہر حال ہمارے نظریہ کے مطابق یہ آیت ان محکم آیات میں سے ہے، جو "خبر واحد کی حجیت" پر یہاں تک کہ "موضوعات" میں بھی دلالت کرتی ہے، اور اس سلسلہ میں بہت زیادہ مباحث ہیں، جن کی تشریح و تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ موثق اخبار پر اعتماد کے ذریعہ ہی بشری زندگی کی تاریخ کی بنیاد قائم ہے، اس طرح سے کہ اگر حجیت خبر عادل یا موثق کا مسئلہ انسانی معاشرے میں سے حذف ہو جائے تو بہت سے گذشتہ علمی مواریث، اور انسانی معاشروں سے مربوط اطلاعات، یہاں تک کہ بہت سے ایسے مسائل جن کے ساتھ ہم آج اپنے معاشروں میں تعلق رکھتے ہیں، کلی طور پر حذف ہو جائیں گے، اور نہ صرف انسان پیچھے کی طرف پلٹ جائے گا، بلکہ اس کی موجودہ زندگی کی ترقی کی رفتار بھی رک جائے گی، لہٰذا تمام عقلاء کا اس کی حجیت پر اجماع ہے اور شارع مقدس نے بھی "قولاً" و "عملاً" اس کی تصدیق فرمائی ہے۔

لیکن جتنا ثقہ خبر واحد کی حجیت، زندگی کو سامان بخشتی ہے، اتنا ہی غیر موثق اخبار پر تکیہ کرنا، بہت خطرناک، اور معاشروں کے نظام کے بکھر جانے کا موجب ہے، جو بہت سے مصائب کے پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے، لوگوں کے حقوق اور حیثیت کو خطرے میں ڈال دیتا ہے اور انسان کو بے راہ روی اور انحراف کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور زیر بحث آیت میں قرآن کی عمدہ تعبیر کے مطابق، انجام کار ندامت کا سبب بنتا ہے۔

حاشیہ صفحہ گزشتہ

۱۔ بعض نے گمان کیا ہے کہ یہاں مفہوم شرط کے قبیل میں سے ہے، اور مفہوم شرط حجت ہے، حالانکہ یہ مفہوم شرط کے ساتھ کوئی ارتباط نہیں رکھتا علاوہ ازیں یہاں جملہ شرطیہ موضوع کو بیان کرنے کے لیے ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کے موقعوں پر جملہ شرطیہ بھی مفہوم نہیں رکھتا۔ (غور کیجئے گا)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے، کہ جھوٹی خبریں گھڑنا، اور غیر موثق اخبار پر تکیہ قدیم جبار اور استعماری نظاموں کے حربوں میں سے ایک ہے، جس کے ذریعے وہ ایک جھوٹی فضا پیدا کر کے بے خبر اور ناآگاہ لوگوں کو، فریب اور غفلت میں رکھ کر، انھیں گمراہ کرتے ہیں اور ان کے سرمایہ کو لوٹ لے جاتے ہیں۔

اگر مسلمان وقت کے ساتھ اس خدائی حکم پر جو اس آیت میں وارد ہوا ہے عمل کریں، اور فاسقوں کی خبروں کو بغیر تحقیق و تفتیش کے قبول نہ کریں تو ان عظیم بلاؤں سے بچ جائیں گے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اہم مسئلہ خود خبر پر وثوق و اعتماد کا ہے، البتہ کبھی تو یہ "وثوق" خبر دینے والے کی ذات" پر اعتماد کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے، اور کبھی دوسرے خارجی قرائن کے ذریعے اسی لیے کچھ موقعوں پر باوجود اس کے کہ خبر دینے والا فاسق ہوتا ہے ہم اس کی خبر پر اعتماد پیدا کر لیتے ہیں۔

اس بناء پر یہ وثوق و اعتماد جہاں کہیں سے حاصل ہو۔ چاہے بیان کرنے والے کی عدالت، تقویٰ اور صداقت سے حاصل ہو یا قرائن خارجی سے، وہ ہمارے لیے معتبر ہے، اور عقلاء کی سیرت بھی، جو شریعت اسلامی کی تصدیق کرتی ہے، اسی بنیاد پر قائم ہے۔

اسی بناء پر ہم فقہ اسلامی میں دیکھتے ہیں کہ بہت سے اخبار جن کی سند ضعیف ہے، چونکہ وہ "عمل مشہور" قرار پا چکے ہیں، اور وہ مختلف قرائن کی بناء پر اس خبر کی صحت سے واقف ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہی معیار عمل قرار پایا ہے اور اسی کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔

اس کے برعکس بعض اوقات ایسے اخبار نقل ہوئے ہیں جن کا بیان کرنے والا معتبر شخص ہے، لیکن خارجی قرائن ہمیں اس خبر کی نسبت بدگمان کر دیتے ہیں، یہ وہ منزل ہے کہ ہمارے لیے اس خبر کو چھوڑنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے، اگرچہ اس خبر کے بیان کرنے والا شخص عادل و معتبر ہے۔

اس بناء پر ہر جگہ معیار خود خبر، پر اعتماد ہے، اگرچہ عام طور پر راوی کی عدالت و صداقت اس اعتماد کا ایک وسیلہ و ذریعہ بنتی ہے۔ لیکن یہ کوئی قانون کلی نہیں ہے۔ (غور کیجیے)

بعد والی آیت میں ایک اہم مطلب کی تاکید کے لیے جو گزشتہ آیت میں بیان ہوا تھا، مزید کہتا ہے: "تم یہ جان لو کہ رسول تمھارے درمیان میں ہے، اگر وہ بہت سے امور میں تمھاری اطاعت کرنے لگے، تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے" (واعلموا ان فیکم رسول اللہ لو یطیعکم فی کثیر من الامر لعنتم)۔[1]

---

[1] "لعنتم" "عنت" کے مادہ سے ایسے کام میں پڑنے کے معنی میں ہے کہ انسان جس کے عواقب سے ڈرتا ہے یا ایسا کام ہے جس میں مشقت ہو اور اسی بناء پر جب ٹوٹی ہوئی ہڈی پر دباؤ پڑے اور اس سے درد و تکلیف پیدا ہو، تو اسے "عنت" کہا جاتا ہے۔

یہ جملہ۔ جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے، کہ قبیلہ "بنی المصطلق" کے مرتد ہونے کے بارے میں "ولید" کی خبر دینے کے بعد، ظاہر بین اور سادہ دل مسلمانوں کا ایک گروہ، پیغمبرؐ پر یہ دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ قبیلہ مذکور کے برخلاف جنگ کا اقدام کریں۔

قرآن کہتا ہے، یہ تمہاری خوش بختی ہے کہ خدا کا رسولؐ تمہارے درمیان ہے۔ اور عالم وحی سے اس کا رابطہ برقرار ہے اور جس وقت انحرافی خطا اور راستے تمہارے درمیان پیدا ہو جائیں تو وہ اس طریق سے تمہیں آگاہ کر دیتا ہے۔

لیکن وہ رہبر و رہنما ہے، تمہیں یہ امید اور توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ وہ تمہاری اطاعت کرے اور تم سے حکم احکام لے، وہ تمہارے لیے ہر شخص سے زیادہ مہربان ہے، اپنے افکار اس پر لادنے کے لیے اس پر دباؤ نہ ڈالو، کیونکہ یہ بات تمہارے ہی نقصان میں ہے۔

آیت کے آخر میں مؤمنین پر خدا کی ایک اور عظیم نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "لیکن خدا نے ایمان کو تمہارے لیے محبوب قرار دے دیا ہے اور اُسے تمہارے دلوں میں زینت بخشی ہے"، (ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم)۔

"اور اس کے برعکس کفر و فسق و گناہ کو تمہارے لیے قابلِ نفرت قرار دے دیا ہے" (وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان)۔

درحقیقت یہ تعبیرات قانونِ "لطف" وہ بھی "لطفِ تکوینی" کی طرف ایک لطیف اشارہ ہیں۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ: جس وقت کوئی حکیم کسی کام کو انجام دینا چاہتا ہے تو وہ ہر لحاظ سے اس کے اسباب فراہم کرتا ہے یہ اصل انسانوں کی ہدایت میں بھی پورے طور پر صادق آتی ہے۔

خدا چاہتا ہے کہ تمام انسان۔ کسی جبر کے پروگرام کے تحت قرار پائے بغیر۔ اپنے میل اور رغبت اور قصد و ارادہ سے راہِ حق کو طے کریں۔ اس لیے ایک طرف سے تو رسولوں کو بھیجتا ہے، اور انبیاء کو کتبِ آسمانی کے ساتھ مبعوث فرماتا ہے اور دوسری طرف سے "ایمان" کو انسانوں کے لیے محبوب قرار دیتا ہے۔ حق جوئی اور حق طلبی کے عشق کی آگ ان کے دل و جان کے اندر شعلہ ور کرتا ہے اور کفر و ظلم و نفاق و گناہ سے نفرت و بیزاری کا احساس ان کے دلوں میں پیدا کر دیتا ہے۔

اور اس طرح ہر ایک انسان فطرتاً ایمان و پاکیزگی و تقویٰ کا خواہاں ہے اور کفر و گناہ سے بیزار ہوتا ہے

لیکن یہ بات کامل طور سے ممکن ہے کہ بعد کے مرحلوں میں یہ صاف و شفاف پانی جو آسمانِ خلقت سے انسانوں کے وجود میں ڈالا گیا ہے، آلودہ ماحول میں رہنے کے باعث اپنی صفا کھو بیٹھے اور گناہ، کفر اور عصیان کی نفرت انگیز بدبو حاصل کرے۔

یہ فطری نعمت انسانوں کو رسولِ خدا کی پیروی اور آپ پر تقدم اور سبقت نہ کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

اس نکتہ کی یاد آوری بھی لازم و ضروری ہے کہ اس آیت کا مضمون "مشورت" کے مسئلہ کے ساتھ ہرگز منافی نہیں ہے، کیونکہ "شوریٰ" کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے نظریہ کو بیان کرے، لیکن آخری فیصلہ اور نظریہ خود پیغمبر اکرمؐ کا ہوگا، جیسا کہ شوریٰ والی آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں، شوریٰ ایک جداگانہ مطلب ہے اور اپنے فکر و عقیدہ کو لادنا دوسرا مطلب ہے۔ زیربحث آیت تحمیل فکر کی نفی کرتی ہے نہ کہ مشورت کی۔

اس بارے میں کہ اُوپر والی آیت میں "فسوق" سے کیا مراد ہے؛ بعض نے اس کی تفسیر "کذب اور جھوٹ" کے ساتھ کی ہے لیکن اس کے مفہوم لغوی کی طرف توجہ کرتے ہوئے، اور آیت میں کسی قید کے نہ ہونے کی بنا پر ہر قسم کے گناہ اور اطاعت سے خارج ہونے کو شامل ہے، اس بنا پر اس کے بعد "عصیان" کی تعبیر تاکید کے عنوان سے ہے۔ جیسا کہ "زینہ فی قلوبکم" (اسے تمہارے دلوں میں زینت دی ہے) کا جملہ "حبب الیکم الایمان" (ایمان کو تمہارا محبوب قرار دیا ہے) کے جملہ پر ایک تاکید ہے۔

بعض "فسوق" کو "گناہانِ کبیرہ" کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، جبکہ عصیان کو اس سے عام سمجھتے ہیں، لیکن اس فرق و اختلاف پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

بہرحال آیت کے آخر میں ایک کلی اور عمومی قاعدہ کے طور پر فرماتا ہے: "جن لوگوں میں یہ صفات پائی جاتی ہیں (ایمان ان کی نظر میں محبوب و مزین، اور کفر و فسق و عصیان ان کی نظر میں منفور ہے)۔ وہ ہدایت یافتہ ہیں" (اولٰئک ھم الراشدون) یعنی اگر تم اس موہبت الٰہی (ایمان سے عشق اور کفر و گناہ سے نفرت) کو محفوظ رکھو، اور اس پاکیزگی اور صفائے فطرت کو آلودہ نہ کرو، تو بلاشک و شبہ رشد و ہدایت تمہارے انتظار میں ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ پہلے کے تمام جملے تو مومنین سے خطاب کی صورت میں تھے، لیکن یہ جملہ انہیں غائب کی صورت میں یاد کرتا ہے یہ تعبیر کا فرق ظاہراً اس بنا پر ہے تاکہ اس بات کی نشاندہی کرے کہ یہ حکم اصحابِ پیغمبرؐ کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ ایک ہمہ وقتی اور عمومی حکم ہے کہ جو بھی کوئی جس زمانہ میں بھی اپنی فطرت کی صفائی اور پاکیزگی کو محفوظ رکھے گا وہ اہل نجات و ہدایت ہے۔

آخری زیربحث آیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ یہ ایمان کی محبوبیت اور کفر و عصیان سے نفرت، نوع بشر پر خدا کی عظیم نعمتوں میں سے ہے، فرماتا ہے، "یہ خدا کی طرف سے ایک فضل ہے، اور وہ نعمت ہے جو اس نے تمہیں عطا کی ہے اور خدا دانا و حکیم ہے" (فضلاً من اللّٰہ ونعمۃ واللّٰہ علیم حکیم)۔[1]

اُس کے علم و حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ رشد و سعادت کے عوامل تم میں پیدا کرے، اور اُسے انبیاء کی دعوت کے ساتھ ہم آہنگ اور مکمل کرے اور انجام کار تمہیں منزل تک پہنچا دے۔

---

[1] "فضلاً ونعمۃ" یا تو "مفعول لاجلہ" ہے "حبب الیکم الایمان ..." کے لیے، اور یا یہ "مفعول مطلق" ہے فعل مقدر کے لیے اور تقدیر میں اس طرح تھا، "افضل فضلاً وانعم نعمۃ"۔

ظاہر یہ ہے کہ "فضل" اور "نعمت" دونوں کا ایک ہی واقعیت کی طرف اشارہ ہے، اور وہ وہی نعمتیں ہیں جو خدا کی طرف سے بندوں کو عطا ہوتی ہیں، البتہ "فضل" کا تو اس لحاظ سے اس پر اطلاق ہوتا ہے، چونکہ خدا اس کا محتاج نہیں ہے، اور نعمت اس لحاظ سے ہے کہ بندے اس کے محتاج ہیں، اس بنا پر (فضل اور نعمت) ایک سکہ کے دو رخوں کی طرح ہے۔

بلاشک و شبہ بندوں کی احتیاج کے بارے میں خدا کا علم اور مخلوقات کی پرورش اور ارتقاء کے سلسلہ میں اس کی حکمت اس بات کا تقاضا کرتے ہیں، کہ وہ انہیں یہ عظیم معنوی نعمتیں، یعنی ایمان کو محبوب رکھنا، اور کفر و عصیان سے نفرت کرنا، مرحمت فرمائے۔

چند نکات

۱۔ خدا کی ہدایت اور ارادہ کی آزادی

اوپر والی آیات، اسلام کے نکتہ نظر سے "جبر و اختیار" اور "ہدایت و اضلال" کے بارے میں ایک واضح تصویر پیش کرتی ہیں، کیونکہ یہ اس نکتہ کو بخوبی واضح کرتی ہیں کہ خدا کا کام رشد و ہدایت کے اسباب کا فراہم کرنا ہے۔

ایک طرف تو "رسول اللہ" کو لوگوں کے درمیان قرار دیتا ہے، اور قرآن جو ہدایت و نور کا ایک پروگرام ہے نازل فرماتا فرماتا ہے اور دوسری طرف سے "ایمان سے عشق" اور کفر و عصیان سے "تنفر و بیزاری" زمین تیار کرنے کے انداز میں دل و جان کے اندر قرار دیتا ہے لیکن انجام کار آزادئ ارادہ و اختیار خود انہیں کے سپرد کرتے ہوئے، ان کی ذمہ داریوں کو اس سلسلہ میں شریعت کے طور پر نافذ کرتا ہے۔

اوپر والی آیات کے مطابق ایمان کے ساتھ عشق اور کفر سے نفرت، بغیر کسی استثناء کے، تمام انسانوں کے دل میں موجود ہے اور اگر کچھ لوگوں میں یہ سلسلہ موجود نہیں ہے تو وہ غلط قسم کی تربیتوں اور خود انہیں کے اعمال کی وجہ سے ہے۔ خدا نے کسی بھی شخص کے دل میں "عصیان کی محبت" اور "ایمان سے بغض" خلق نہیں کیا ہے۔

۲۔ رہبری اور اطاعت

یہ آیات ایک بار پھر اس بات کی تاکید کرتی ہیں کہ "خدائی رہبر" کا وجود ایک جمعیت کی نشو و نما اور رشد و ہدایت کے لیے لازمی و ضروری ہے، اس شرط کے ساتھ کہ وہ "مطاع" ہو نہ کہ اپنے پیروکاروں کا "مطیع"۔ اس کے فرمان کو سر آنکھوں پر رکھیں، نہ یہ کہ اس پر اپنے محدود مقاصد و افکار کے لیے دباؤ ڈالیں۔

یہ بات نہ صرف خدائی رہبروں کے بارے میں ثابت ہے، بلکہ "مسئلہ" مدیریت" اور "فرماندہی" میں ہر جگہ یہی امر کارفرما ہونا چاہیئے۔

یہ حکم رہبروں کے استبداد کے معنی میں نہیں ہے اور نہ ہی ترکِ شوریٰ کے لیے ہے، جیسا کہ اُوپر بھی اشارہ ہو چکا ہے۔

۳۔ ایمان "عشق" کی ایک نوع ہے نہ کہ صرف ادراکِ عقل

یہ آیات ضمنی طور پر اس حقیقت کی طرف ایک اشارہ ہیں، کہ ایمان ایک قسم کا شدید خدائی اور معنوی علاقہ اور لگاؤ ہے، اگرچہ اس کی بنیادیں عقلی استدلالات سے قائم ہوتی ہیں۔ اسی لیے امام صادقؑ سے منقول ہے کہ لوگوں نے آنحضرتؑ سے سوال کیا کہ، کیا "حب و بغض" بھی ایمان میں سے ہیں؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا:

"وهل الايمان الا الحب والبغض؟ ! ثم تلا هذه الأية: حبب اليكم الايمان وزينه في قلوبكم وكره اليكم الكفر والفسوق والعصيان اولئك هم الراشدون"

"کیا ایمان حب اور بغض کے علاوہ کوئی اور چیز ہے، پھر امامؑ نے زیر بحث آیت سے استدلال فرمایا جو یہ کہتی ہے کہ: خدا نے تمہارے لیے ایمان کو محبوب قرار دے دیا ہے اور اُسے تمہارے دلوں میں مزین کر دیا ہے، اور کفر وفسق وعصیان کو تمہارے لیے قابلِ نفرت بنا دیا ہے، اور جو لوگ ایسے ہوں وہی ہدایت یافتہ ہیں"۔ [1]

ایک دوسری حدیث میں امام باقرؑ سے اس طرح آیا ہے،:

"وهل الدين الا الحب ؟ !

"کیا دین محبت کے علاوہ کوئی اور چیز ہے"؟ !

اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی چند آیات سے استدلال فرمایا: جن میں سے ایک زیر بحث آیت تھی، اور آخر میں مزید فرمایا:

"الدين هو الحب والحب هو الدين"

"دین محبت ہے اور محبت دین ہے"! [2]

لیکن اس میں شک نہیں ہے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ اسے استدلالی اور منطقی اصولوں سے بھی سیراب و بارور ہونا چاہیئے۔

---

[1] اصول کافی جلد ۲ باب الحب فی اللہ والبغض فی اللہ حدیث ۵۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۸۳، ۸۴۔

۹- وَإِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَإِنْۢ بَغَتْ إِحْدٰىهُمَا عَلَى الْأُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ إِلٰٓى أَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَإِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوْا ۖ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○

۱۰- إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○

ترجمہ

۹۔ جس وقت مؤمنین کے دو گروہ آپس میں نزاع اور جنگ کریں تو ان کے درمیان صلح کرادیا کرو، اور اگر ان میں سے ایک دوسرے پر تجاوز کرے تو جس نے تجاوز کیا ہے تو تم بھی اُس کے ساتھ جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف پلٹ آئے، جب وہ لوٹ آئے (اور صلح کے لیے زمین ہموار ہو جائے) تو ان دونوں کے درمیان عدالت کے مطابق صلح کرادو، اور انصاف سے کام لو، کیونکہ خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

۱۰۔ مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا دو بھائیوں کے درمیان صلح کرادو، اور خدا کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ اس کی رحمت میں شامل ہو جاؤ۔

شانِ نزول

ان آیات کے شانِ نزول میں آیا ہے کہ مدینہ کے دو مشہور قبیلوں (قبیلۂ "اوس" و "خزرج" کے درمیان ایک اختلاف پیدا ہوگیا، اور اس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی جان کے درپے ہوگئے، اور لاٹھیوں اور جوتوں سے ایک دوسرے کو مارنے لگے، (تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور اس قسم کے حادثات سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو راہ بتائی)[1]

بعض نے یہ کہا ہے کہ "انصار" میں سے دو افراد کے درمیان خصومت و اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ میں اپنا حق زبردستی تجھ سے لے لوں گا، کیونکہ میرے قبیلہ کی جمعیت اور تعداد زیادہ ہے اور دوسرے نے یہ کہا کہ فیصلہ کے لیے رسول اللہ کے پاس چلتے ہیں، پہلے شخص نے اسے قبول نہ کیا اور اختلاف بڑھ گیا اور دونوں قبیلوں کے ایک گروہ نے ہاتھوں، جوتیوں اور شمشیر تک سے ایک دوسرے پر حملہ کر دیا، تو اوپر والی آیات نازل ہوئیں

(اور اس قسم کے اختلاف میں مسلمانوں کی ذمہ داری کو واضح کیا)[2]

تفسیر

مؤمنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں

قرآن یہاں ایک کلی اور عمومی قانون کے عنوان سے ہمیشہ اور ہر مقام کے لیے کہتا ہے: "جس وقت مؤمنین کے دو گروہ آپس میں نزاع کریں اور لڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو" (وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینہما)[3]

یہ ٹھیک ہے کہ "اقتتلوا" "قتال" کے مادہ سے جنگ کے معنی میں ہے، لیکن یہاں قرائن اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ ہر قسم کے نزاع اور جھگڑے کو شامل ہے، چاہے وہ جنگ اور لڑائی تک بھی نہ جا پہنچے، بعض شانِ نزول

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۹ صفحہ ۱۳۲

[2] "تفسیر قرطبی" جلد ۹ صفحہ ۶۱۲۰

[3] باوجود اس کے کہ "طائفتان" تثنیہ ہے، لیکن اس کا فعل "اقتتلوا" جمع کی صورت میں آیا ہے، کیونکہ ہر گروہ ایک مجموعہ سے مرکب ہے۔

جو آیت کے لیے نقل ہوئے تھے وہ بھی اس معنی کی تائید کرتے ہیں۔

بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر لڑائی جھگڑے اور نزاع کے لیے زمین ہموار ہو جائے، مثلاً لفظی تکرار اور کھینچا تانی جو خونیں نزاع کا باعث بن جاتے ہیں، واقع ہوں تو وہاں بھی اصلاح کے لیے اقدام کرنا اس آیت کے مطابق ضروری ہے، کیونکہ القاء خصوصیت کے طریقہ سے اس معنی کو اوپر والی آیت سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال تمام مسلمانوں کے لیے ایک حتمی وظیفہ اور ذمہ داری ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑنے جھگڑنے، نزاع اور خونریزی سے روکیں اور خود کو اس سلسلے میں ذمہ دار سمجھیں، نہ کہ بعض بے خبر لوگوں کی طرح تماشائیوں کی صورت میں، بے پرواہی کے ساتھ ان مناظر کے قریب سے گزر جائیں۔

ان مناظر کو دیکھنے کے بعد مومنین کی یہ اوّلین ذمہ داری ہے۔

اس کے بعد دوسری ذمہ داری کو اس طرح بیان کرتا ہے "اور اگر ان دونوں میں سے ایک گروہ دوسرے پر تجاوز اور ظلم و ستم کرے، اور صلح کی تجویز کو تسلیم نہ کرے، تو پھر تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ تم باغی اور ظالم گروہ کے ساتھ جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف لوٹ آئے اور سر تسلیم خم کرے" (فان بغت احداهما على الاخرى فقاتلوا التي تبغى حتى تفيء الى امر الله)۔

واضح ہے کہ اگر باغی اور ظالم گروہ کا خون اس دوران میں بہ جائے تو وہ خود اسی کی گردن پر ہے اور اصطلاح کے مطابق اس کا خون ہدر اور رائیگاں گیا ہے۔ اگرچہ وہ مسلمان ہی ہوں کیونکہ نزاع دو مسلمان گروہوں کے درمیان پیدا ہوئی ہے۔

اس طرح سے اسلام نے ظلم و ستم سے روکنے کو چاہے وہ ظالم کے ساتھ جنگ کرنے کی قیمت پر ختم ہو لازمی و ضروری سمجھا ہے اور عدالت کے اجرا کی قیمت کو مسلمانوں کے خون سے بھی بالا تر جانا ہے اور یہ بات اس صورت میں ہے کہ جب مسئلہ صلح و صفائی کے طریقہ سے حل نہ ہو۔

اس کے بعد تیسرے حکم کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے "اگر ظالم لوگ خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کریں اور صلح کے اسباب فراہم ہو جائیں، تو ان دونوں کے درمیان عدالت کے اصول کے مطابق صلح کرا دو" (فان فاءت فاصلحوا بينهما بالعدل)۔

یعنی صرف ظالم گروہ کی قدرت کو درہم برہم کرنے پر قناعت نہ کرو، بلکہ یہ جنگ صلح کے لیے زمین ہموار کرنے اور نزاع اور لڑائی کے عوامل کو جڑ سے کاٹنے کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہونی چاہیئے، ورنہ تھوڑے سے یا زیادہ زمانہ گزرنے کے ساتھ، ظالم جب بھی اپنے اندر طاقت و قوت محسوس کرے گا تو لڑنے کے لیے دوبارہ کھڑا ہو جائے گا اور نئے سرے سے جھگڑا اور نزاع شروع کر دے گا۔

بعض مفسرین نے "بالعدل" کی تعبیر سے یہ استفادہ کیا ہے کہ اگر ان دونوں گروہوں کے درمیان کوئی حق پامال ہوا ہے، یا کوئی خون گرایا گیا ہے جو لڑائی جھگڑے اور نزاع کے پیدا ہونے کا سبب بنا ہے، تو اس کی بھی اصلاح ہونی چاہیئے ورنہ "اصلاح بالعدل" نہ ہوگی۔[1]

---

[1] "تفسیر المیزان" جلد ۱۸ صفحہ ۳۴۲۔

اور چونکہ گروہی میلانات بعض اوقات افراد کو فیصلہ کرتے وقت "دو متخاصم گروہوں" میں سے ایک کی طرف مائل کر دیتے ہیں اور فیصلہ کرنے والوں کی بے طرفی اور غیر جانب داری کو توڑ دیتے ہیں، اس لیے قرآن چوتھے اور آخری حکم میں مسلمانوں کو تنبیہ کر رہا ہے کہ، "عدل و انصاف سے کام لیں اور ہر قسم کی جانب داری کی نفی کریں، کیونکہ خدا عدالت کرنے والے لوگوں کو دوست رکھتا ہے" (واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین)۔[1]

بعد والی آیت میں اس امر کی تاکید اور اس کی علت بیان کرنے کے لیے مزید کہتا ہے:

"مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں اس لیے تم اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو" (انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم)۔

جس طرح تم اپنے دو نسبی بھائیوں کے درمیان صلح کرانے میں سعی و کوشش کرتے ہو، اسی طرح دو متخاصم مومنین کے درمیان میں صلح کرانے کے لیے سنجیدگی اور دو ٹوک طریقہ سے وارد عمل ہوا کرو۔

کتنی پرکشش اور عمدہ تعبیر ہے کہ تمام مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ان کے درمیان جھگڑے اور نزاع کو دو بھائیوں کے درمیان نزاع کا نام دیا، جسے بہت جلد صلح و صفائی کو اپنی جگہ دینی چاہیئے۔

اور چونکہ اکثر اوقات "روابط" اس قسم کے مسائل میں "ضوابط" کے جانشین بن جاتے ہیں، لہٰذا دوبارہ خبردار کرتے ہوئے آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "خدا کا تقویٰ اختیار کرو، تاکہ اس کی رحمت میں شامل ہو جاؤ" (واتقوا اللہ لعلکم ترحمون)۔

اور اس طرح سے مسلمانوں کی ایک دوسرے کے لیے ایک اہم ترین اجتماعی ذمہ داری اجتماعی عدالت کے تمام پہلوؤں کے ساتھ بوقت اجرار واضح ہو جائے۔

چند نکات

۱۔ باغیوں سے جنگ کرنے کی شرائط

فقہ اسلامی میں کتاب جہاد میں "اہل البغی" سے قتال" کے عنوان سے ایک بحث بیان ہوئی ہے، جن سے مراد

---

[1] "مقسطین" "قسط" کے مادہ سے ہے۔ اور وہ اصل میں عادلانہ حصہ کے معنی میں ہے، اور جس وقت ثلاثی مجرد کے فعل کی صورت میں استعمال ہوتا ہے (قسط بروزن ضرب) تو ظلم کرنے اور دوسرے سے عادلانہ حصہ لینے کے معنی میں ہوتا ہے۔ لیکن جب ثلاثی مزید کی صورت استعمال ہو اور "اقسط" کہا جائے تو عدالت اور ہر شخص کو اس کا عادلانہ حصہ دینے کے معنی میں ہے اس بارے میں کیا عدل و قسط کا ایک ہی معنی ہے یا یہ آپس میں فرق رکھتے ہیں۔ ہم اس کی تشریح جلد (سورۂ اعراف کی آیت ۲۹ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

وہ شکر ہیں، جو امام عادل اور مسلمانوں کے سچے پیشوا کے برخلاف قیام کریں، اور ان کے لیے بہت سے احکام ہیں، جو اس باب میں آئے ہیں۔

لیکن جو بحث اوپر والی آیت میں پیش ہوئی ہے وہ ایک دوسرا معنی رکھتی ہے۔ اور یہ ایسے جھگڑے اور نزاع ہیں، جو مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان رونما ہوتے ہیں جس میں نہ تو امام معصوم کے خلاف قیام ہے اور نہ ہی صالح اور صحیح حکومت اسلامی کے خلاف قیام ہے، اگرچہ بعض فقہا اور مفسرین نے اس آیت سے سابقہ مسئلہ میں بھی استفادہ کرنا چاہا ہے، لیکن "کنز العرفان" میں "فاضل مقداد" کے قول کے مطابق یہ استدلال صحیح نہیں ہے"۔ [۱]

کیونکہ امام معصوم کے خلاف قیام موجب کفر ہے، جب کہ دو مومنین کے درمیان نزاع صرف فسق ہے نہ کہ کفر۔ لہٰذا قرآن مجید نے اوپر والی آیت میں دونوں گروہوں کو مومن اور ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا ہے، اس طرح سے "اہل بغی" یعنی باغیوں کے احکام کو اس قسم کے افراد کے لیے عمومیت نہیں دی جا سکتی۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ فقہ میں اس گروہ کے احکام کے سلسلہ میں ہمیں کوئی بحث نہیں ملی، لیکن جو کچھ اوپر والی آیت سے، دوسرے قرآن کو ساتھ ملا کر، وہ خاص اشارے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ابواب میں آئے ہیں۔ ان سے ذیل کے "احکام" کا استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

الف: مسلمانوں کے متخاصم گروہوں کے درمیان صلح کرانا ایک واجب کفائی امر ہے۔

ب: اس کام کو سرانجام دینے کے لیے ابتدا میں نسبتاً سادہ مراحل سے شروع کرنا چاہیئے، اور اصطلاح کے مطابق "الاسهل فالاسهل" کے قاعدے کی رعایت کرنی چاہیئے، لیکن اگر وہ مفید واقع نہ ہو تو پھر مسلحانہ مبارزہ اور جنگ و قتل بھی جائز بلکہ لازم و ضروری ہے۔

ج: باغیوں اور تجاوز کرنے والوں کے خون جو اس راہ میں گرائے جائیں، اور وہ مال جو اس دوران تلف ہوں وہ ہدر اور رائیگاں ہیں، کیونکہ یہ شرع کے حکم اور ایک واجب وظیفہ کے انجام دینے میں واقع ہوئے ہیں اور اصولاً اس قسم کے موقعوں پر کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

د: گفتگو کے طریقہ سے اصلاح کے مراحل میں حاکم شرع کی اجازت ضروری نہیں ہے، لیکن شدت عمل کے مرحلہ میں، خصوصاً جہاں معاملہ خونریزی پر منتہی ہو، وہاں حکومت اسلامی اور حاکم شرع کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے، مگر ایسے مواقع پر جہاں کسی طرح سے دسترس نہ ہو تو وہاں مومنین عدول اور آگاہ افراد آپس میں صلاح مشورہ کریں گے۔

ھ: اس صورت میں جب کہ باغی اور ظالم گروہ "مصلح گروہ" میں سے کسی کا خون گرائے گا یا کوئی مال تلف کرے گا، تو شریعت کے حکم کے مطابق وہ ضامن ہے اور قتل عمد کی صورت میں حکم قصاص بھی جاری ہوگا، اسی طرح ان مواقع پر جہاں مظلوم گروہ کے خون بہائے گئے ہیں یا مال تلف ہوئے ہیں، وہاں بھی حکم "ضمان" و "قصاص" ثابت ہے اور یہ جو بعض کے کلمات سے معلوم

---

[۱] "کنز العرفان فی فقہ القرآن" "کتاب الجہاد" "باب انواع آخر من الجہاد" جلد ۱ صفحہ ۳۸۶۔

ہوتا ہے کہ صلح کے وقوع کے بعد باغی اور ظالم گروہ ان خونوں اور اموال کے مقابلہ میں جو ہدر گئے ہیں ذمہ دار نہیں ہیں کیونکہ زیر بحث آیت میں اس کی طرف اشارہ نہیں ہوا ہے، درست نہیں ہے کیونکہ آیت ان تمام مطالب کے بیان کے درپے نہیں ہے، بلکہ اس قسم کے امور میں، ان تمام قواعد و اصولوں کی طرف رجوع کرنا ہے، جو قصاص و اتلاف کے ابواب میں بیان ہوئے ہیں۔

و: چونکہ اس جنگ و پیکار کا مقصد ظالم گروہ کو حق کے قبول کرنے پر آمادہ کرنا ہے، لہٰذا اس جنگ میں اسیران جنگ اور "غنائم" کا مسئلہ درپیش نہ ہوگا۔ کیونکہ دونوں گروہ مسلمان ہیں، لیکن جھگڑے کی آگ کو خاموش کرنے کے لیے وقتی طور پر قید کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے لیکن صلح کے بعد فوراً قیدیوں کو آزاد کرنا ہوگا

ز۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے، کہ نزاع اور جھگڑے کے دونوں فریق، باغی اور ظالم ہوتے ہیں، انہوں نے دوسرے قبیلہ کے ایک گروہ کو قتل کیا اور ان کے مالوں کو تلف کیا ہے، اور انھوں نے بھی یہی کام پہلے قبیلہ کے بارے میں انجام دیا ہے، بغیر اس کے کہ دفاع کے لیے مقدار لازم پر قناعت کریں، چاہے ایک ہی مقدار میں دونوں بغاوت و ستم کریں یا ایک زیادہ کرے اور دوسرا کم کرے۔

البتہ اس سلسلہ میں قرآن مجید میں کوئی حکم صراحت کے ساتھ نہیں آیا، لیکن اس کا حکم الغاء خصوصیت کے طریق سے زیر بحث آیت سے معلوم کیا جا سکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا وظیفہ اور ذمہ داری یہ ہے کہ دونوں کے درمیان مصالحت کرائیں اور اگر وہ صلح کے لیے تیار نہ ہوں، تو دونوں کے درمیان جنگ کریں، یہاں تک کہ وہ حکم الٰہی کی طرف لوٹ آئیں، اور وہ احکام جو باغی اور متجاوز کے بارے میں بیان ہوئے ہیں، دونوں کے لیے جاری کیے جائیں۔

اس گفتگو کے آخر میں ہم پھر دوبارہ تاکید کرتے ہیں کہ ان باغیوں کا حکم، ان لوگوں کے حکم سے، جو امام معصوم یا اسلامی عادل حکومت کے خلاف قیام کریں، بالکل الگ ہے اور اس دوسرے گروہ کے لیے زیادہ سخت اور شدید احکام ہیں جو فقہ اسلامی کی "کتاب الجہاد" میں بیان ہوئے ہیں۔

۲۔ اخوت اسلامی کی اہمیت

"انما المؤمنون اخوۃ" کا جملہ جو اوپر والی آیات میں آیا ہے ایک اساسی اور بنیادی اسلامی شعار ہے۔ ایسا شعار جو بہت ہی مضبوط، عمیق، مؤثر اور پُر معنی شعار ہے۔

دوسرے مسلک کے لوگ جب اپنے ہم مسلک لوگوں کے ساتھ زیادہ تعلق اور لگاؤ کا اظہار کرتے ہیں۔

تو وہ انہیں "رفیق" کے عنوان سے یاد کرتے ہیں، لیکن اسلام مسلمانوں کے دوستی کے تعلقات اور رشتہ کی سطح اس قدر اوپر لے گیا ہے، کہ وہ اسے دو انسانوں کے ایک دوسرے کے ساتھ نزدیک ترین تعلق کی صورت میں، اور اس تعلق کو بھی مساوات اور برابری کی بنیاد پر پیش کرتا ہے، اور وہ "دو بھائیوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق ہے"۔

اس اہم اسلامی اصل کی بنا پر مسلمان چاہے جس نسل سے ہوں، یا جس قبیلہ سے، چاہے کوئی سی زبان بولتے ہوں، اور کسی سن و سال کے ہوں، ایک دوسرے سے برادری کا عمیق احساس رکھتے ہیں، چاہے ان میں سے

ایک دُنیا کے مشرق میں رہتا ہو اور دوسرا مغرب میں زندگی بسر کرتا ہو۔

مراسم "حج" میں جب مسلمان، تمام نقاط جہاں اور اطراف عالم سے اس مرکز توحید میں جمع ہوتے ہیں، تو وہاں یہ علاقہ اور لگاؤ، نزدیکی، پیوند اور ہم بستگی پُورے طور پر محسوس ہوتی ہے اور وہ اس اہم اسلامی قانون کے بعینہٖ پورا ہونے کا ایک منظر پیش کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اسلام تمام مسلمانوں کو ایک خاندان سمجھتا ہے اور سب کو ایک دوسرے کے بہن بھائی کہہ کر خطاب کرتا ہے، نہ صرف الفاظ میں اور نعرے کے طور پر، بلکہ عمل میں، اور آپس کی ذمہ داریوں میں سب بہن بھائی ہیں۔

اسلامی روایات میں بھی اس مسئلہ پر بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے، خاص طور پر اس کے عملی پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

ہم ذیل میں چند پُر معنی احادیث آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہے۔

"المسلم اخو المسلم، لایظلمه، ولا یخذله، ولا یسلمه۔"

"مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، وہ ہرگز اس پر ظلم و ستم نہیں کرتا، اس کی مدد سے دستبردار نہیں ہوتا اور اس کو حوادث کے مقابلہ میں تنہا نہیں چھوڑتا۔" [1]

۲۔ ایک اور حدیث میں انہیں جناب سے نقل ہوا ہے۔

"مثل الاخوین مثل الیدین یغسل احدا ھما الاخر"۔

"دو دینی بھائی دونوں ہاتھوں کے مانند ہیں، جن میں سے ہر ایک دوسرے کو دھوتا ہے" (ایک دوسرے کے ساتھ مکمل ہمکاری رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے عیوب کو پاک صاف کرتے ہیں) [2]

۳۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"المؤمن اخو المؤمن، کالجسد الواحد، اذا اشتکی شیئا منه وجد الم ذالک فی سائر جسده، وارواحهما من روح واحدة"۔

"مومن، مومن کا بھائی ہے، اور وہ سب ایک جسم کے اعضاء کے مانند ہیں، اگر ان میں سے کسی ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو دوسرے اعضاء کو قرار نہیں آتا اور ان سب کے ارواح ایک ہی رُوح سے لیے گئے ہیں۔" [3]

---

[1] "المحجۃ البیضاء" جلد ۳ ص ۳۳۲ کتاب آداب الصحبۃ والمعاشرۃ باب ۲۔

[2] وہی مدرک ص ۳۱۹۔

[3] اصول کافی جلد ۲ ص ۱۳۳ (باب اخوۃ المؤمنین بعضھم لبعض حدیث ۳،۴)

۴۔ ایک دوسری حدیث میں اسی امامؑ سے منقول ہے۔

"المؤمن اخو المؤمن عینہ ودلیلہ، لا یخونہ، ولا یظلمہ، ولا یغشہ، ولا یعدہ عدۃ فیخلفہ"

"مومن، مومن کا بھائی ہے، وہ اس کی آنکھ کی مانند ہے اور اس کا رہنما ہے، وہ اس کے ساتھ کبھی خیانت نہیں کرتا اور اس پر ظلم وستم روا نہیں رکھتا، اس سے پھرتا نہیں، اور جو وعدہ اس کے ساتھ کرتا ہے اس سے تخلف نہیں کرتا۔"[1]

حدیث کے معروف اسلامی مآخذوں اور منابع میں، مومن کے اپنے مسلمان بھائی پر حقوق اور مومنین کے ایک دوسرے پر حقوق کے انواع واقسام، ایمانی بھائیوں کے دیدار، مصافحہ، معانقہ اور انہیں یاد کرنے اور ان کے دل کو مسرور اور خوش کرنے، خصوصاً مومنین کی حاجات کو پورا کرنے اور ان امور کی انجام دہی میں سعی وکوشش کرنے، اور ان کے دل سے غم واندوہ کو دُور کرنے اور انہیں کھانا کھلانے، کپڑے پہنانے اور ان کا اکرام واحترام کرنے کے ثواب کے بارے میں بہت زیادہ روایات وارد ہوئی ہیں، جس کے اہم حصوں کو "اصولِ کافی" کے مختلف ابواب میں اور روائی عنوانات کے تحت مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ اس بحث کے آخر میں ہم ایک روایت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو پیغمبر اکرمؐ سے مومن کے اس کے مومن بھائی پر تیس حقوق کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو اس سلسلہ میں جامع ترین روایت ہے۔

قال رسول اللہ (ص): للمسلم علی اخیہ ثلاثون حقا: لا براءۃ منہا الا بالاداء او العفو: یغفر زلتہ، ویرحم عبرتہ، ویستر عورتہ، ویقیل عثرتہ، ویقبل معذرتہ، ویرد غیبتہ، ویدیم نصیحتہ، ویحفظ خلتہ، ویرعی ذمتہ، ویعود مرضہ۔

ویشہد میتہ، ویجیب دعوتہ، ویقبل ہدیتہ، ویکافی صلتہ، ویشکر نعمتہ، ویحسن نصرتہ، ویحفظ حلیلتہ، ویقضی حاجتہ، ویشفع مسألتہ، ویسمت عطستہ۔

ویرشد ضالتہ، ویرد سلامہ، ویطیب کلامہ، ویبر انعامہ، ویصدق اقسامہ، ویوالی ولیہ ولا یعادیہ، وینصرہ ظالماً ومظلوماً: فاما نصرتہ ظالماً فیردہ عن ظلمہ، واما نصرتہ مظلوماً فیعینہ علی اخذ حقہ، ولا یسلمہ ولا یخذلہ، ویحب لہ من الخیر ما یحب

---

[1] اصول کافی جلد ۲ ص ۱۶۶ (باب اخوۃ المؤمنین بعضہم لبعض حدیث ۳، ۴

لنفسہ، ویکرہ لہ من الشر مایکرہ لنفسہ۔

"پیغمبر اسلام نے فرمایا: مسلمان اپنے مسلمان بھائی پر تیس حق رکھتا ہے، جن سے وہ بری الذمہ نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ ان حقوق کو ادا نہ کرے، یا اس کا مسلمان بھائی اس کو معاف کر دے۔

اس کی لغزشوں کو معاف کر دے، اس کی پریشانی میں اس پر مہربانی کرے۔ اس کے رازوں کو پوشیدہ رکھے اس کی غلطیوں کی تلافی کرے، اس کے عذر کو قبول کرے، بدگوئی کرنے والوں سے اس کا دفاع کرے، ہمیشہ اس کا خیر خواہ رہے، اس کی دوستی کی پاسداری کرے۔ اس کے عہد و پیمان کی رعایت کرے حالت بیماری میں اس کی عیادت کرے، اس کی موت کی حالت میں اس کے جنازہ میں حاضر ہو۔

اس کی دعوت کو قبول کرے، اس کے ہدیہ کو قبول کرے اس کے عطیہ کا بدلہ دے، اس کے احسان کا شکریہ ادا کرے اس کی مدد میں کوشش کرے، اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کرے، اس کی حاجت پوری کرے۔ اس کی درخواست کی شفاعت کرے، اور اس کی چھینک پر "یرحمك الله" کہے۔

اس کی گمشدہ چیزوں کی رہنمائی کرے، اس کے سلام کا جواب دے، اس کی گفتگو کو اچھا سمجھے، اس کے انعام کو خوب قرار دے، اس کی قسموں کی تصدیق کرے، اس کے دوست کو دوست رکھے، اور اس کے ساتھ دشمنی نہ کرے، اس کی مدد میں کوشش کرے چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم، ظالم ہونے کی صورت میں اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم کرنے سے روکے، اور مظلوم ہونے کی صورت میں اس کی مدد یہ ہے کہ اس کی اس کا حق حاصل کرنے میں مدد کرے۔

اسے حوادث زمانہ کے مقابلہ میں تنہا نہ چھوڑے، نیکیوں اور اچھائیوں میں سے جن چیزوں کو اپنے لیے پسند کرتا ہے اس کے لیے بھی پسند کرے اور برائیوں میں سے جن چیزوں کو اپنے لیے نہیں چاہتا اس کے لیے بھی نہ چاہے۔ [1]

بہر حال مسلمانوں کے ایک دوسرے پر حقوق میں سے ایک مدد کرنا اور آپس میں اصلاح کرنا ہے، جس طرح سے کہ اوپر والی آیات اور روایات میں آیا ہے (اصلاح ذات البین کے سلسلہ میں ہم جلد ۷ سورۂ انفال کی آیت ۱ صفحہ ۳۸۵ میں ایک اور بحث کر چکے ہیں۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۴، صفحہ ۲۳۶

۱۱۔ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُونُوا۟ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّن نِّسَآءٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا۟ بِٱلْأَلْقَٰبِ ۖ بِئْسَ ٱلِٱسْمُ ٱلْفُسُوقُ بَعْدَ ٱلْإِيمَٰنِ ۚ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ۝

۱۲۔ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱجْتَنِبُوا۟ كَثِيرًا مِّنَ ٱلظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ ٱلظَّنِّ إِثْمٌ ۖ وَلَا تَجَسَّسُوا۟ وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ۝

ترجمہ

۱۱۔ اے ایمان لانے والو! تمہارے مردوں میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کا ٹھٹھا اور مذاق نہ اڑائے، شاید وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ ہی عورتیں، دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، شاید وہ ان سے بہتر ہوں، اور ایک دوسرے کو طعن و تشنیع نہ کرو، اور بُرے اور ناپسند القاب کے ساتھ ایک دوسرے کو یاد نہ

کرو، اور یہ بات تو بہت ہی بُری ہے کہ کسی شخص پر ایمان کے بعد کفر کا نام (الزام) رکھو، اور جو توبہ نہ کریں وہی تو ظالم و ستمگر ہیں۔

۱۲۔ اے ایمان لانے والو! بہت سے گمانوں سے پرہیز کرو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں، اور ہرگز (دوسروں کے کاموں میں) تجسس نہ کرو، اور تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، (یقیناً) تم سب اس چیز سے کراہت رکھتے ہو، خدا کا تقویٰ اختیار کرو، کیونکہ خدا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

شانِ نزول

مفسرین نے ان آیات کے لیے مختلف شان ہائے نزول نقل کیے ہیں، منجملہ اُن کے یہ ہے کہ،

لا یسخر قوم من قوم : کا جملہ "ثابت بن قیس" (پیغمبرؐ کے خطیب) کے بارے میں نازل ہوا ہے، جس کو کانوں سے کم سُنائی دیتا تھا اور جس وقت وہ مسجد میں آتے تھے تو پیغمبرؐ کے نزدیک اس کے لیے جگہ چھوڑ دیتے تھے تاکہ وہ آنحضرتؐ کے ارشادات سُن سکے۔ ایک دن وہ مسجد میں وارد ہوئے تو لوگ نماز سے فارغ ہو چکے تھے اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے، وہ مجمع کو چیرتا ہوا کہتا جا رہا تھا کہ جگہ دو جگہ دو، ! یہاں تک کہ وہ ایک مسلمان کے پاس پہنچ گیا تو اس نے کہا کہ یہیں بیٹھ جا! تو وہ اس کے پیچھے بیٹھ گیا، لیکن بہت غصے ہوا جس وقت فضا روشن ہوئی تو ثابت نے اس مرد سے کہا، تو کون ہے؟ اس نے اپنا نام لیا اور کہا کہ میں فلاں شخص ہوں۔ ثابت نے کہا، کیا فلاں عورت کا بیٹا؟! اور اس کی ماں کا نام، اس بُرے لقب کے ساتھ، جو زمانہ جاہلیت میں لیا کرتے تھے، لیا۔ اس پر وہ شخص شرمندہ ہوا، اور اپنا سر نیچے کر لیا تو یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو اس قسم کے بُرے کاموں سے منع کیا۔

مفسرین نے کہا کہ: "ولا نساء من نساء" جناب امّ سلمہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جن کا بعض ازواج پیغمبرؐ نے مخدومہ کے مخصوص لباس کی وجہ سے جو انھوں نے پہن رکھا تھا، یا اُن کے چھوٹے قد کی وجہ سے مذاق اڑایا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انھیں اس عمل سے روکا۔

اور یہ بھی کہا ہے کہ " ولا یغتب بعضکم بعضاً " کا جملہ اصحاب رسول اللہ میں سے دو افراد کے بارے میں ہے جنہوں نے اپنے ساتھی "سلمان" کی غیبت کی تھی، کیونکہ انھوں نے اُسے پیغمبرؐ کی خدمت میں بھیجا تھا تاکہ وہ انکے لیے کھانا لے آئیں۔ پیغمبرؐ نے "سلمان" کو "اسامہ بن زید" کے پاس جو "بیت المال" کے مسئول تھے، بھیج دیا۔ "اسامہ" نے کہا: اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے تو ان دو افراد نے "اسامہ" کی غیبت کی اور کہا کہ اس نے بخل سے کام لیا ہے۔ اور "سلمان" کے بارے میں کہا: اگر اُسے چاہ سمیحہ (ایک پانی سے بھرے ہوئے کنوئیں) کی طرف بھی بھیجیں تو اس کا پانی بھی نیچے چلا جائے گا: اس کے بعد وہ خود چل پڑے تاکہ اسامہ کے پاس جاکر اپنے کام کے بارے میں جستجو کریں، تو پیغمبرؐ نے فرمایا: مجھے تمہارے مُنہ سے گوشت کھانے کے آثار نظر آرہے ہیں، انھوں نے عرض کیا: اے رسولِ خدا ہم نے تو آج بالکل ہی گوشت نہیں کھایا ہے! آپؐ نے فرمایا: ہاں! تم نے "سلمان" اور "اسامہ" کا گوشت کھایا تھا، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور مسلمانوں کو غیبت کرنے سے منع کیا۔ [1]

استہزاء، بدگمانی، غیبت، تجسس، اور بُرے القاب سے یاد کرنا ممنوع ہے

چونکہ قرآن مجید اس سورہ میں اسلامی معاشرے کو اخلاقی معیاروں کی بنیاد پر تعمیر کرنا چاہتا ہے، لہٰذا مختلف اسلامی گروہوں کے بارے میں نزاع و مخاصمت کی صورت میں مسلمانوں کی ذمہ داریوں کے بارے میں بحث کرنے کے بعد، زیر بحث آیات میں ان کے اختلافات کی جڑوں کے ایک حصّہ کی تشریح کرتا ہے تاکہ ان کے منقطع ہونے سے اختلافات بھی ختم ہو جائیں اور لڑائی جھگڑے اور نزاع کا بھی خاتمہ ہو جائے۔

اوپر والی دونوں آیات میں سے ہر ایک میں اُن امور کے تین تین حصوں کو، جو جنگ اور اختلاف کی آگ کو روشن کرنے کے لیے چنگاری بن سکتے ہیں، صریح اور مُنہ بولتی تعبیروں کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "اے ایمان لانے والو! تمھارے مردوں میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کا ٹھٹا اور مذاق نہ اڑائے" (یا ایھا الذین اٰمنوا لا یسخر قوم من قوم)۔

"کیونکہ شاید وہ لوگ جن کا مذاق اڑایا جارہا ہے، ان سے بہتر ہوں" (عسٰی ان یکونوا خیراً منھم)۔

---

[1] تفسیر "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۱۳۵ "قرطبی" نے بھی اپنی تفسیر میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہی شانِ نزول نقل کی ہے۔

"اسی طرح عورتوں میں سے بھی کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں (ولا نساء من نساء عسٰی ان یکن خیرًا منھن)۔

یہاں مخاطب مومنین ہیں چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں، قرآن سب کو خبردار کرتا ہے، کہ وہ اس بُرے عمل سے پرہیز کریں، کیونکہ استہزاء اور تمسخر کا سرچشمہ، خود کو برتر سمجھنے کا احساس اور کبر و غرور ہے، جو طول تاریخ میں بہت سی خونیں جنگوں کا عامل رہا ہے۔

اور یہ "اپنے آپ کو بڑا سمجھنا" زیادہ تر ظاہری اور مادی اقدار سے پیدا ہوتا ہے، مثلاً فلاں شخص اپنے آپ کو دوسرے سے زیادہ مالدار، زیادہ خوبصورت یا زیادہ معروف قبیلہ میں شمار کرتا ہے۔ اور بعض اوقات یہ خیال، کہ وہ علم و عبادت اور دوسرے معنویات میں فلاں حیثیت سے برتر ہے، اس کو تمسخر اور استہزاء پر آمادہ کرتا ہے، درحالیکہ خدا کے نزدیک قدر و قیمت کا معیار تقویٰ ہے، اور اس کا تعلق نیت اور دل کی پاکیزگی، تواضع، اخلاق اور ادب کے ساتھ ہے۔

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں خدا کے نزدیک فلاں شخص سے برتر ہوں، اسی بناء پر دوسروں کی تحقیر اور اپنے آپ کو برتر سمجھنا، بدترین کاموں میں سے ایک ہے، اور قبیح ترین اخلاقی عیب ہے، جس کا ردعمل، ہوسکتا ہے کہ انسانوں کی ساری زندگی میں آشکار ہو۔

• اس کے بعد دوسرے مرحلہ میں فرماتا ہے: "اور ایک دوسرے کے عیب نہ نکالو اور طعن و تشنیع نہ کرو": (و لا تلمزوا انفسکم)۔

"لا تلمزوا" "لمز" بروزن (طنز) کے مادہ سے، عیب نکالنے اور طعن کرنے کے معنی میں ہے۔ اور بعض نے "ھمز" اور "لمز" کے درمیان اس طرح فرق بیان کیا ہے۔ کہ "لمز" تو لوگوں کے سامنے ان کے عیوب گنوانا ہے اور "ھمز" ان کے پیٹھ پیچھے ان کے عیوب کو بیان کرنا ہے، اور یہ بھی کہا ہے کہ "لمز" تو آنکھ اور اشارہ سے عیب جوئی کرنا ہے، جبکہ "ھمز" زبان سے "عیب جوئی ہے (اس موضوع کے سلسلہ میں مزید تشریح انشاء اللہ سورۂ ھمزہ کی تفسیر میں آئے گی)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن اس آیت میں "انفسکم" کی تعبیر کے ساتھ مومنین کی وحدت اور ایک ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے، کہ تمام مومنین نفس واحد کی طرح ہیں، اگر تم کسی دوسرے کی عیب جوئی کرو تو واقع میں تم نے خود اپنی ہی عیب جوئی کی ہے۔

اور آخر میں تیسرے مرحلہ میں مزید کہتا ہے: "اور ایک دوسرے کو بُرے اور ناپسندیدہ القاب کے ساتھ یاد نہ کرو": (ولا تنابزوا بالالقاب)۔

بہت سے منہ پھٹ اور بے مہار لوگ گذشتہ زمانہ میں بھی اور آج بھی دوسروں کو بُرے القاب سے یاد کرنے پر مصر رہے ہیں اور ہیں، اور اس طریقہ سے ان کی تحقیر کرنے ان کی شخصیت کی سرکوبی کرنے یا بعض اوقات

ان سے انتقام لینے پر اصرار کرتے ہیں اور اگر کسی نے سابقہ زمانہ میں کوئی بُرا کام کر لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے توبہ کر لی، اور وہ مکمل طور پر پاک ہوگیا۔ لیکن اس کے بعد بھی وہ اس کے لیے اسی لقب کو جو اس کی سابقہ وضع کو بیان کرنے والا ہے۔ برقرار رکھتے ہیں۔

اسلام صریح طور پر اس بُرے عمل سے منع کرتا ہے، اور ہر وہ نام اور لقب جو معمولی سے معمولی غیر مطلوب مفہوم رکھتا ہے اور کسی مسلمان کی تحقیر و تذلیل کا سبب بنتا ہے اُسے ممنوع قرار دیتا ہے،

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن "صفیہ" دختر "حیی ابن اخطب" (وہی یہودی عورت جو فتح خیبر کے واقعہ کے بعد مسلمان ہوگئی اور پیغمبر اسلام کی زوجیت میں آئی) ایک دن پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوئی، در آنحالیکہ ان کے آنسو جاری تھے، پیغمبر نے ماجرا پوچھا تو اس نے کہا کہ عائشہ مجھے ملامت کرتی ہے اور کہتی ہے: اے یہودی کی لڑکی،"! تو پیغمبر نے فرمایا تو نے یہ کیوں نہ کہا کہ میرا باپ ہارون ہے، اور میرا چچا موسیٰ ہے، اور میرا شوہر محمدؐ ہے، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [1]

اسی بنا پر آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے، بہت بُری بات ہے یہ کہ تم کسی پر اس کے ایمان لانے کے بعد کفر کا نام رکھو" (بئس الاسم الفسوق بعد الایمان)۔

بعض نے اس جملہ کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خدا مومنین کو اس بات سے منع کر رہا ہے کہ ایمان لانے کے بعد لوگوں کی عیب جوئی کی بنا پر اپنے لیے فسق کے نام کو قبول کرلیں۔

لیکن پہلی تفسیر، صدر آیہ، اور اس شان نزول کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو بیان ہوئی ہے، زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے: "اور وہ لوگ جو توبہ نہ کریں، اور ان اعمال سے دست بردار نہ ہوں، ظالم و ستمگر ہیں" (ومن لم یتب فاولٰئک ھم الظالمون)۔

اس سے بدتر ظلم اور کیا ہوگا کہ انسان اپنی ہمیشہ زبان درازی سے، اور تحقیر اور عیب جوئی سے کسی صاحب ایمان کے دل کو آزار پہنچائے، جو عشق خدا کا مرکز ہے۔ اور ان کی شخصیت اور آبرو کو، جو ان کی زندگی کا سرمایہ ہے ختم کر دے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ دونوں زیر بحث آیات میں سے ہر ایک میں، اسلامی، اجتماعی اخلاق کے مسائل کے سلسلہ میں، تین تین حکم پیش ہوئے ہیں، پہلی آیت کے تین احکام ترتیب کے ساتھ تمسخر نہ کرنا، ترک عیب جوئی اور تنابز بالالقاب تھے، اور دوسری آیت کے تین احکام بالترتیب، بدگمانی سے اجتناب، عیوب کا تجسس اور غیبت ہیں۔

اس آیت میں پہلے فرماتا ہے: "اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، بہت سے گمانوں سے پرہیز کرو، کیونکہ بعض

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۹ صفحہ ۱۳۶۔

گمان گناہ ہیں" (یا ایھا الذین اٰمنوا اجتنبوا کثیرًا من الظن ان بعض الظن اثم)۔
"کثیرًا من الظن" سے مراد بُرے گمان ہیں، جو اچھے گمانوں کی نسبت لوگوں میں زیادہ ہیں، لہٰذا اس کو کثیر کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، ورنہ "حسن ظن اور گمان نیک" نہ صرف یہ کہ ممنوع نہیں ہے، بلکہ مستحسن ہے، جیسا کہ قرآن مجید سورۂ نور کی آیت ۱۲ میں فرماتا ہے: لولا اذ سمعتموہ ظن المؤمنون والمؤمنات بانفسھم خیرًا۔

- "جس وقت تم نے اس ناروا نسبت کو سنا تھا تو با ایمان مردوں اور عورتوں نے اپنی نسبت (اور اس کے لیے جو خود انہیں کی طرح تھا) اچھا گمان کیوں نہ کیا"؟!

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "نہی" "کثیر" گمانوں سے ہوئی ہے، لیکن مقام تعلیل میں کہتا ہے، کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں ممکن ہے تعبیر کا یہ فرق اس وجہ سے ہو کہ بعض بُرے گمان واقع کے مطابق ہوتے ہیں، اور بعض واقع کے مخالف، جو گمان واقع کے خلاف ہوتے ہیں وہ تو مسلّماً گناہ ہیں۔ لہٰذا ان کی "ان بعض الظن اثم" سے تعبیر ہوئی ہے۔ اس بنا پر اسی گناہ کا وجود اس بات کے لیے کافی ہے کہ سب سے پرہیز کرے۔

یہاں یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ بُرا اور اچھا گمان عام طور پر اختیاری نہیں ہوتا، یعنی وہ ایک سلسلۂ مقدمات کے زیرِ اثر جو انسان کے اختیار سے خارج ہیں، ذہن میں منعکس ہوتا ہے، اس بنا پر اس سے کس طرح روکا جا سکتا ہے؟!

۱۔ اس نہی سے مراد، ترتیب آثار سے نہی ہے، یعنی جس وقت کسی مسلمان کے بارے میں تمہارے ذہن میں کوئی بُرا گمان پیدا ہو تو اس کے لیے عمل میں معمولی سے معمولی اعتنا بھی نہ کرو۔ اپنی طرزِ رفتار میں تبدیلی نہ کرو، اور دوسرے سے اپنے سلوک اور معاملات کو نہ بدلو، اس بنا پر جو چیز گناہ ہے وہ بُرے گمان کے مطابق عمل کرنا ہے۔

لہٰذا ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہے

"ثلاث فی المؤمن لا یستحسن، ولہ منھن مخرج، فمخرجہ من سوء الظن ان لا یحققہ":

تین چیزیں ایسی ہیں جن کا وجود مؤمن میں پسندیدہ نہیں ہے، جبکہ اس کے لیے ان سے فرار کی راہ موجود ہے، منجملہ ان کے ایک سوءِ ظن ہے، جس سے راہ فرار یہ ہے کہ اس کو عمل میں نہ لایا جائے۔[1]

۲۔ انسان مختلف مسائل میں غور و فکر کرنے سے، بہت سے مواقع پر بُرے گمان کو اپنے سے دور کر سکتا ہے، اور وہ اس طرح سے کہ ان کو صحت پر محمول کرنے کے راستوں میں غور کرے، اور ان سے صحیح احتمالات کو جو اس پر عمل کے بارے میں موجود ہیں۔ اپنے ذہن میں مجسم کرے، اور آہستہ آہستہ بُرے گمان پر غلبہ حاصل کرے۔

اس بنا پر بدگمانی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ہمیشہ انسان کے اختیار سے خارج ہو۔

---

[1] محجۃ البیضاء جلد ۵، ص ۲۶۹۔

لہٰذا روایات میں بطورِ حکم آیا ہے کہ اپنے بھائی کے اعمال کو جہاں تک ہو سکے بہترین صورت پر محمول کرو، جب تک کہ اس کے خلاف کوئی دلیل قائم نہ ہو جائے اور تیرے مسلمان بھائی سے جو بات صادر ہوگئی ہے اس کے لیے ہرگز بدگمانی نہ کر جب تک تو اسکے لیے نیکی پر محمول کرنے کی گنجائش رکھتا ہے۔

"قال امیر المومنین علیہ السلام ضع امر اخیک علی احسنہ حتی یاتیک ما یقلبک منہ، ولا تظنن بکلمۃ خرجت من اخیک سوءً وانت تجد لہا فی الخیر محملا"۔[1]

بہر حال یہ اسلامی دستور انسانوں کے اجتماعی روابط کے سلسلے میں ایک جامع ترین اور ایک انتہائی جچا تلا حکم ہے، جو معاشرے میں امن وامان کے مسئلہ کو کامل طور سے ضمانت دیتا ہے، جس کی تفصیل نکات کی بحث میں آئے گی۔

پھر بعد والے حکم میں "تجسس سے نہی" کے مسئلہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور ہرگز دوسروں کے کاموں میں تجسس نہ کرو": (ولا تجسسوا)۔

"تجسس" اور "تحسس" دونوں جستجو کرنے کے معنی میں ہیں، لیکن پہلا عام طور پر غیر مطلوب امور میں آتا ہے اور دوسرا عام طور پر امر خیر میں آتا ہے، جیسا کہ یعقوبؑ اپنے بیٹوں کو حکم دیتے ہیں، : (یابنی اذھبوا فتحسسوا من یوسف واخیہ: اے میرے بیٹو جاؤ اور (میرے گمشدہ) یوسف اس کے بھائی کے بارے میں جستجو کرو: (یوسف: ۸۷)

درحقیقت بُرا گمان ایک عامل ہے جستجو کرنے کا، اور جستجو کرنا ایک عامل ہے لوگوں کے رازہائے پنہانی اور اسرار کے کشف کے لیے، اور اسلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ان کے خصوصی راز فاش ہوں۔

دوسرے لفظوں میں اسلام یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی خصوصی زندگی میں ہر لحاظ سے امن وامان میں رہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ اگر یہ اجازت دے دی جائے کہ ہر آدمی دوسروں کے بارے میں جستجو کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے تو لوگوں کی حیثیت اور آبرو تباہ و برباد ہو جائے گی اور ایک جہنم وجود میں آ جائے گی جس میں معاشرے کے تمام افراد معذب ہوں گے۔

البتہ یہ دستور، حکومت اسلامی میں سازشوں سے مبارزہ کرنے کے لیے اطلاعاتی اداروں (سی آئی ڈی) کے وجود کے ساتھ منافی نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی اس معنی میں نہیں ہے، کہ یہ ادارے لوگوں کی خصوصی زندگی میں بھی جستجو کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ جیسا کہ انشاء اللہ اس بارے میں تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

اور آخر میں تیسرے اور آخری دستور میں، جو حقیقت میں پہلے دو پروگراموں کا معلول اور نتیجہ ہے، فرماتا ہے: "تم میں سے کوئی کسی دوسرے کی غیبت نہ کرے" (ولا یغتب بعضکم بعضا)۔

اور اس طرح سے بُرا گمان تو تجسس کا سرچشمہ بنتا ہے اور تجسس، افشائے عیوب اور اسرار پنہانی کا موجب ہوتا

---

[1] "اصول کافی" جلد ۲ باب التہمۃ وسوء الظن حدیث ۳۔ اسی معنی کے مشابہ نہج البلاغہ میں بھی مختصر سے فرق کے ساتھ آیا ہے۔ کلمات قصار کلمہ ۳۶۰۔

ہے اور ان امور سے آگاہی غیبت کا سبب بنتی ہے اور اسلام نے معلول اور علت دونوں سے منع کیا ہے۔

اس کے بعد اس عمل کی قباحت اور بُرائی کو کامل طور سے مجسم کرنے کے لیے اس کو ایک عمدہ مثال میں ڈھال کر کہتا ہے ! "کیا تم میں سے کوئی بھی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے "؟ (ایحب احدکم ان یأکل لحم اخیه میتاً)۔

" یقیناً تم سب اس امر سے کراہت رکھتے ہو " (فکرهتموه)۔

ہاں مسلمان بھائی کی آبرو اس کے بدن کے گوشت کی مانند ہے اور اس آبرو کو غیبت کے ذریعہ ختم کرنا اور پوشیدہ بھید دل وافشا کرنا اس کے بدن کا گوشت کھانے کے مانند ہے۔

اور " مردہ " کی تعبیر اس بناء پر ہے کہ " غیبت " لوگوں کے پیٹھ پیچھے کی جاتی ہے ، جو مُردوں کی طرح اپنے آپ سے دفاع پر قدرت نہیں رکھتے۔

اور یہ ایک ایسا ظلم ہے جو انتہائی بزدلانہ ہے ، کہ جسے انسان اپنے بھائی کے بارے میں روا رکھ سکتا ہے۔

ہاں ! یہ تشبیہ ، غیبت کی حد سے زیادہ بُرائی ، اور اس کے عظیم گناہ کو بیان کرنے والی ہے۔

اسلامی روایات میں بھی جیسا کہ بیان کیا جائے گا " مسئلۂ غیبت " کو حد سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور بہت کم ایسے گناہ ہیں ، جس کی سزا ، اسلام کی نظر میں ، اس قدر سنگین ہو ،

اور چونکہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ ان تینوں گناہوں میں سے بعض سے آلودہ ہوں ، اور وہ ان آیات کے سُننے سے متنبہ اور بیدار ہو جائیں ، اور تلافی کے لیے تیار ہوں ، اس لیے آیت کے آخر میں ان کے لیے راستہ کھلا رکھتے ہوئے فرماتا ہے ، " تقوائے الٰہی اختیار کرو ، اور خدا سے ڈرو ، کیونکہ خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے " (واتقوا الله ان الله تواب رحیم)۔

سب سے پہلے تقویٰ اور خدا سے ڈرنے کی رُوح زندہ ہونی چاہیئے اور اس کے بعد گناہ سے توبہ کی جائے ، تاکہ خدا کا لطف اور اس کی رحمت ان کے شامل حال ہو۔

چند نکات

۱۔ معاشرے میں کامل اور ہر پہلو سے امن وامان

وہ چھ احکام جو اوپر والی دو آیات میں بیان کیے گئے ہیں۔ (تمسخر ، غیبت جوئی ، بُرے القاب ، گمان بد ، تجسس اور غیبت سے نہی) اگر کسی معاشرے میں ان پر کامل طور سے عمل ہو ، تو معاشرے کے تمام افراد کی عزت وآبرو کا ہر لحاظ سے بیمہ ہو جاتا ہے۔ نہ تو کوئی شخص خود کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے دوسروں کو تفریح وتمسخر کا ذریعہ بنا سکتا ہے ، اور نہ ہی وہ کسی کی عیب جوئی کے لیے زبان کھول سکتا ہے اور نہ بُرے القاب کے ساتھ لوگوں کی حرمت وشخصیت کو خراب کرتا ہے۔

نہ اُسے کسی کے بارے میں بُرا گمان کرنے کا حق ہے ۔ نہ وہ افراد بشر کی شخصی زندگی کے بارے میں جستجو میں لگتا ہے ، اور نہ ہی ان کے پوشیدہ عیوب دوسروں کے سامنے فاش کرتا ہے ۔

دوسرے لفظوں میں انسان کے پاس چار سرمائے ہیں ۔ اور ان سب کو اس قانون کے قلعوں کے اندر محفوظ رہنا چاہیئے اور وہ ہیں : جان ، مال ، اور عزت و آبرو ،

اوپر والی آیات اور اسلامی روایات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں ، کہ لوگوں کی آبرو اور حیثیت ، ان کے مال و جان کی طرح ہے ، بلکہ بعض پہلوؤں سے (اُن سے بھی) زیادہ اہم ہے ، !

اسلام یہ چاہتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں کامل طور امن و امان کی حکمرانی ہو ۔ لوگ ایک دوسرے پر نہ صرف عمل میں اور ہاتھ کے ساتھ حملہ نہ کریں ، بلکہ لوگوں کی زبان کے لحاظ سے اور اس سے بھی بڑھ کر فکر اور سوچ کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے امن و امان میں ہوں اور ہر شخص یہ محسوس کرے کہ کوئی دوسرا شخص اپنے افکار میں بھی تہمت کے تیر اس کی طرف نہیں پھینکتا ، اور یہ ایسی بلند ترین سطح کی امنیت ہے ، جو ایک مذہبی اور مومن معاشرے کے سوا کہیں بھی امکان پذیر نہیں ہے ۔

پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں ۔

" ان اللہ حرم من المسلم دمہ ومالہ وعرضہ ، وان یظن بہ السوء ،

" خدا نے مسلمانوں کا خون ، مال اور عزت و آبرو دوسروں پر حرام کردی ہے ، اور اسی طرح یہ بھی کہ اس کے بارے میں بُرا گمان کرے "[1]

بُرا گمان کرنا ، نہ صرف طرف مقابل اور اس کی حیثیت پر صدمہ وارد کرتا ہے ، بلکہ بُرا گمان کرنے والے کے لیے بھی ایک بہت بڑی بلا و مصیبت ہے ، کیونکہ وہ لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے ، اور اجتماعی تعاون سے الگ تھلگ ہو جانے کا سبب بن جاتا ہے ۔

اور یہ فعل ایک ایسی وحشتناک دُنیا اس کے لیے فراہم کرتا ہے ، جو غربت و بے کسی اور تنہائی و گوشہ نشینی سے پُر ہو ۔ جیسا کہ امیر المومنین علی علیہ السلام سے ایک حدیث میں منقول ہوا ہے :

" من لم یحسن ظنہ استوحش من کل احد ،

" جو شخص بُرا گمان رکھتا ہو وہ ہر شخص سے ڈرتا ہے ، اور وحشت رکھتا ہے ۔"[2]

دوسرے لفظوں میں وہ چیز جو انسان کی زندگی کو جانور دل سے جدا کرتی ہے ، اور اسے رونق و حرکت اور تکامل و ارتقا بخشتی ہے ، وہ رُوح تعاون اور سب کا مل جُل کر کام کرنا ہی ہے ۔ اور یہ اسی صُورت میں امکان پذیر ہے ۔ جبکہ

---

[1] " المحجۃ البیضاء " ، جلد ۵ ص ۲۶۸

[2] " غرر الحکم " صفحہ ۶۹۷

لوگوں میں اعتماد اور خوش بینی ہو، درآنحالیکہ بُرا گمان اس اعتماد کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے، اور تعاون کے رشتوں کو توڑ دیتا ہے، اور رُوحِ اجتماعی کو کمزور کر دیتا ہے۔

نہ صرف سوءِ ظن بلکہ تجسس اور غیبت کا مسئلہ بھی اسی طرح کا ہے۔

بدبین افراد ہر چیز سے ڈرتے ہیں، اور ہر شخص سے وحشت رکھتے ہیں، اور ان کی رُوح پر ہمیشہ ایک جانکاہ پریشانی چھائی رہتی ہے، نہ تو وہ کوئی دوست اور مونس و غمخوار پیدا کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے اجتماعی کاموں کے لیے کوئی شریک و ہمکار بنا سکتے ہیں اور نہ پریشانی کے دنوں کے لیے کوئی یار و مددگار۔

اس نکتہ کی طرف توجہ بھی لازم ہے کہ یہاں "ظن" سے مراد ایسے گمان ہیں جن کے لیے کوئی دلیل نہ ہو، اس بنا پر جہاں گمان کا انحصار کسی دلیل یعنی ظن معتبر پر ہو وہ اس گمان سے مستثنیٰ ہے، اس گمان کی طرح، جو دو عادل گواہوں کی شہادت سے حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ تجسس نہ کرو

ہم نے دیکھ لیا کہ قرآن نے اُوپر والی آیت میں تجسس کو پوری صراحت کے ساتھ منع کیا ہے، اور چونکہ اس کے لیے کسی قسم کی کوئی قید و شرط نہیں لگائی، لہٰذا یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے، کہ دوسروں کے کاموں میں جستجو کرنا، اور ان کے بھیدوں کو فاش کرنے کی کوشش کرنا گناہ ہے لیکن وہ قرائن جو آیت کے اندر اور باہر موجود ہیں وہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں، کہ یہ حکم افراد کی شخصی اور خصوصی زندگی سے مربوط ہے، اور اجتماعی زندگی میں بھی اس حد تک، کہ اس سے معاشرے کی سرنوشت میں کوئی اثر نہ پڑتا ہو، یہی حکم صادق ہے۔

لیکن یہ بات واضح اور روشن ہے کہ جہاں اس کا دوسروں کی سرنوشت اور معاشرے کی حالت سے تعلق ہو، تو پھر مسئلہ کی دوسری شکل ہو جاتی ہے، لہٰذا پیغمبرؐ نے کچھ اشخاص اطلاعات جمع کرنے کے لیے مقرر کیے ہوئے تھے، جنہیں "عیون" کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے تاکہ وہ ایسی اطلاعات جو داخل اور خارج میں اسلامی معاشرے سے متعلق ہیں آپؐ کے لیے اکٹھی کریں۔

اسی بنا پر حکومت اسلامی بھی مامورین اطلاعاتی رکھ سکتی ہے یا اطلاعات جمع کرنے کے لیے ایک وسیع ادارہ قائم کر سکتی ہے اور جہاں کہیں معاشرے کے برخلاف سازش کا خوف ہو، یا امن و امان کو خطرے میں ڈالنے یا حکومت اسلامی کو نقصان پہنچانے کا خطرہ ہو، وہاں تجسس کریں، یہاں تک کہ بعض افراد کی خصوصی و داخلی زندگی میں بھی جستجو کریں۔

لیکن یہ امر ہرگز اس اسلامی بنیادی قانون کی حرمت کو توڑنے کے لیے بہانہ نہیں بننا چاہیئے، کہ کچھ لوگ اپنے آپ کو اس بات کا مجاز قرار دے لیں کہ وہ "مسئلہ سازش" اور نقص امن کے بہانہ سے لوگوں کی خصوصی اور شخصی زندگی پر حملہ آور ہوں، ان کا اعمال نامہ کھولیں، ان کے ٹیلیفونوں پر کنٹرول کریں اور وقت بے وقت ان کے گھروں کی تلاشی لیں۔

خلاصہ یہ کہ "تجسس" اور معاشرے کے امن و امان کی حفاظت کے لیے لازمی اطلاعات کے درمیان کی سرحد

بہت ہی دقیق اور ظریف ہے، اور امور اجتماعی کے ادارہ کے ذمہ داروں کو دقت کے ساتھ اس سرحد کی نگرانی کرنا چاہیئے، تاکہ انسانوں کے اسرار کی حرمت، کی حفاظت بھی ہو، اور معاشرے اور حکومت اسلامی کا امن وامان بھی خطرے میں نہ پڑے۔

۳۔ غیبت بہت بڑا گناہ ہے

ہم بیان کر چکے ہیں کہ انسان کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی حیثیت، آبرو اور شخصیت ہے، اور جو چیز اُسے خطرے میں ڈال دے، وہ ایسا ہے، جیسا کہ اس کی جان کو خطرے میں ڈال دیا، بلکہ بعض اوقات شخصیت کو قتل کرنا شخص کو قتل کرنے سے زیادہ اہم شمار ہوتا ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں اس کا گناہ قتل نفس کے گناہ سے بھی زیادہ سخت اور سنگین ہے۔

غیبت کے حرام ہونے کے فلسفوں میں سے ایک فلسفہ یہ ہے، کہ یہ عظیم سرمایہ برباد نہ ہو، اور اشخاص کی حرمت ضائع نہ ہو، اور ان کی حیثیت کو داغدار نہ کرے، یہ ایسی بات ہے جسے اسلام نے بہت ہی زیادہ اہمیت دی ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ "غیبت" بدبینی پیدا کرتی ہے، اجتماعی رشتوں کو کمزور کردیتی ہے۔ اعتماد کے سرمایوں کو ختم کرتی ہے اور تعاون اور مِل جُل کر کام کرنے کی بنیادوں کو متزلزل کردیتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ اسلام مسئلہ وحدت اور جامعہ اسلامی کے اتحاد، تنظیم اور استحکام کو حد سے زیادہ اہمیت دیتا ہے، جو چیز اس وحدت کو مضبوط بناتی ہو، وہ اسلام سے تعلق اور لگاؤ رکھتی ہے، اور جو چیز اس کو کمزور کرے وہ اس کے لیے قابل نفرت ہے، اور غیبت ضعف پہنچانے اور کمزور کرنے کا ایک اہم عامل ہے۔

ان چیزوں سے قطع نظر "غیبت" کینہ وعداوت کا بیج دلوں میں بوتی ہے، اور بعض اوقات خونیں نزاعوں اور قتل وکشتار کا سرچشمہ بنتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر اسلام میں غیبت بزرگ ترین گناہان کبیرہ میں شمار ہوتی ہے تو یہ اس کے انفرادی اور اجتماعی بُرے آثار کی وجہ سے ہے۔

روایات اسلامی میں اس سلسلہ میں بہت ہی ہلا دینے والی تعبیریں دکھائی دیتی ہیں۔ جن کا ایک نمونہ ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

پیغمبر گرامی اسلام نے فرمایا:

"ان الدرهم يصيبه الرجل من الربا اعظم عند الله فى الخطيئة من ست وثلاثين زنية، يزنيها الرجل! واربى الربا عرض الرجل المسلم!"

"وہ درہم جو انسان ربا اور سود کے ذریعہ حاصل کرے، اس کا گناہ خدا کے ہاں چھتیس زناؤں سے بڑھ کر ہے۔ اور ہر ربا سے بالاتر مسلمان کی آبرو ہے" [1]

---

[1] المحجۃ البیضاء، جلد ۵ ص ۲۵۳

یہ موازنہ اس بنا پر ہے، کہ "زنا" خواہ کتنا ہی بُرا ہو، وہ "حق اللہ" کا پہلو رکھتا ہے۔ لیکن سُود خوری، اور اس بدتر غیبت یا کسی اور طریقہ سے آبرو ریزی کرنا "حق الناس" کا پہلو رکھتا ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن پیغمبرؐ نے بلند آواز میں خطبہ پڑھا اور بلند آواز میں فرمایا:

"یامعشر من اٰمن بلسانہ ولم یؤمن بقلبہ! لاتغتابوا المسلمین، ولا تتبعوا عوراتھم، فانہ من تتبع عورۃ اخیہ تتبع اللہ عورتہ، ومن تتبع اللہ عورتہ یفضحہ فی جوف بیتہ!؟

"اے وہ گروہ جو زبان سے تو ایمان لائے ہو۔ لیکن دل سے ایمان نہیں لائے، تم مسلمانوں کی غیبت نہ کیا کرو، اور ان کے پوشیدہ عیبوں کی جستجو نہ کیا کرو، کیونکہ جو شخص اپنے دینی بھائی کے پوشیدہ امور کی جستجو کرے خدا اس کے اسرار اور رازوں کو فاش کر دیتا ہے، اور اُسے خود اسی کے گھر کے اندر رسوا اور ذلیل کر دیتا ہے" [۱]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ خدا نے موسیٰ کو وحی کی:

"من مات تائباً من الغیبۃ فھو اٰخر من یدخل الجنۃ، و من مات مصرًا علیھا فھو اول من یدخل النار"!

"جو شخص اس حالت میں مرے کہ اس نے غیبت سے توبہ کر لی ہو تو وہ آخری شخص ہوگا جو جنت میں داخل ہوگا، اور جو اس حالت میں مرے کہ غیبت پر اصرار رکھتا ہو، تو وہ پہلا شخص ہوگا، جو جہنم میں داخل ہوگا" [۲]

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام سے بھی منقول ہے کہ:

"الغیبۃ اسرع فی دین الرجل المسلم من الاکلۃ فی جوفہ"؛

غیبت کی تاثیر مسلمان کے دین میں اس کے جسم میں جذام کے اثر سے بھی زیادہ تیز ہے" [۳]

یہ تشبیہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ غیبت، جذام کی طرح جو بدن کے گوشت کو کھا جاتا ہے۔ سُرعت کے ساتھ انسان کے ایمان کو تباہ و برباد کر دیتی ہے اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ غیبت کے محرک، حسد، تکبر، بخل، کینہ پروری اور تنگ نظری جیسے قبیح و مذموم صفات ہیں۔ واضح ہو جاتا ہے، کہ غیبت اور اس طرح سے مسلمانوں کی عزت و آبرو کو تباہ کرنا، کیوں انسان کے ایمان کو اس طرح سے برباد کر دیتا ہے (غور کیجئے)

---

[۱] سابقہ مدرک صـ ۲۵۴

[۲] سابقہ مدرک صـ ۲۵۲

[۳] اصول کافی جلد ۲ باب الغیبۃ حدیث نمبر ۱ (آکلہ بروزن قاتلہ ایک قسم کی بیماری ہے جو انسان کے بدن کا گوشت کھا جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں منابع اسلامی میں بہت زیادہ روایات ہیں اور ہم ایک اور حدیث کو بیان کرکے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔
امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

"من روی علی مؤمن روایة یرید بھا شینه، وھدم مروته، لیسقط من اعین الناس، اخرجه الله من ولایته الی ولایة الشیطان، فلا یقبله الشیطان،

"جو شخص کسی مومن کی عیب جوئی اور آبروریزی کے لیے کوئی بات نقل کرے، تاکہ اس کو لوگوں کی نظروں سے گرا دے تو خدا اس کو اپنی ولایت سے نکال کر شیطان کی ولایت میں داخل کر دیتا ہے، لیکن شیطان بھی اس کو قبول نہیں کرتا"۔[1]

یہ تمام تاکیدیں، اور ہلا دینے والی عبارتیں، اس فوق العادہ کی اہمیت کی وجہ سے ہے، جو اسلام میں مومنین کی آبرو اور ان کی اجتماعی حیثیت کی حفاظت کے لیے ہے۔ اور اس مخرب تاثیر کی وجہ سے بھی ہے جو غیبت سے، معاشرت کی وحدت، آپس کے اعتماد اور دلی تعلقات میں پیدا ہوتی ہے اور اس سے بدتر بات یہ ہے کہ غیبت، اجتماعی سطح پر کینہ و عداوت، اور دشمنی ونفاق کی آگ بھڑکانے، اور فحشا ومنکر کی اشاعت کا ایک عامل ہے، کیونکہ جس وقت لوگوں کے پوشیدہ عیوب غیبت کے ذریعہ آشکار ہو جاتے ہیں تو گناہ کی عظمت واہمیت ختم ہو جاتی ہے اور اس میں آلودہ ہو جانا آسان ہو جاتا ہے۔

۴۔ غیبت کا مفہوم

"غیبت"۔ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے۔ یہ ہے، کہ کسی شخص کے پیٹھ پیچھے کوئی بات کہیں، البتہ وہ ایسی بات ہو جو اس کے کسی خاص عیب کو فاش کرے، چاہے وہ عیب جسمانی ہو یا اخلاقی، اس کے اعمال میں ہو یا گفتگو میں، یہاں تک کہ ان امور میں جو اس سے متعلق ہیں، مثلاً لباس، گھر، بیوی اور اولاد وغیرہ۔

اس بنا پر اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے ظاہر وآشکار صفات کو بیان کرے تو وہ غیبت نہیں ہوگی، مگر یہ کہ اس کا مذمت اور عیب جوئی کا ارادہ ہو، تو اس صورت میں وہ حرام ہے، مثلاً یہ کہ مذمت کے طور پر کہے کہ فلاں شخص نابینا، یا کوتاہ قد، یا کالا، یا کوسہ۔ یعنی بے ڈاڑھی مونچھ کا۔

اس طرح سے پوشیدہ عیوب کا ذکر کرنا، چاہے کسی بھی نیت اور ارادہ سے ہو، غیبت اور حرام ہے، اور ظاہر عیوب کا ذکر، اگر مذمت کے ارادے سے ہو تو حرام ہے، چاہے ہم اس کو غیبت کے مفہوم میں داخل سمجھیں یا نہ سمجھیں۔

یہ سب کچھ اس صورت میں ہے، جبکہ یہ صفات واقعاً اس شخص میں موجود ہوں، لیکن اگر ایسی اصلاً اس میں موجود ہی نہ ہو تو وہ "تہمت" کے عنوان میں داخل ہوگی، جس کا گناہ کئی گنا زیادہ شدید اور زیادہ سنگین ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۸ باب ۱۵۷ حدیث ۲ ص ۶۰۸۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔

"الغیبۃ ان تقول فی اخیک ما سترہ اللّٰہ علیہ، واما الامر الظاھر فیہ، مثل الحدۃ والعجلۃ، فلا، والبھتان ان تقول ما لیس فیہ،

"غیبت" یہ ہے کہ تو اپنے مسلمان بھائی کے بارے میں وہ بات کہے، جسے خدا نے پنہاں رکھا ہے، لیکن وہ چیز جو ظاہر ہے، مثلاً سخت مزاجی اور جلد بازی تو وہ غیبت میں داخل نہیں ہے، لیکن بہتان یہ ہے کہ تو ایسی چیز کہے کہ جو اس میں موجود نہ ہو[1]

اور یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ عام عذر جو بعض لوگ غیبت کے بارے میں پیش کرتے ہیں، سننے کے لائق نہیں ہے۔ مثلاً بعض اوقات غیبت کرنے والا یہ کہتا ہے کہ غیبت نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو اس کی صفت ہے، حالانکہ اگر وہ اس کی صفت نہ ہوتی تو پھر تو وہ تہمت ہوتی نہ کہ غیبت۔

یا یہ کہ وہ یہ کہتا ہے کہ یہ تو ایسی بات ہے، جسے میں اس کے سامنے بھی کہتا ہوں، حالانکہ اس کو اس کے سامنے کہنا نہ صرف غیبت کے گناہ میں کوئی کمی نہیں کرتا، بلکہ اس کو ایذا و تکلیف پہنچانے کی بنا پر اس سے بھی زیادہ سنگین گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

۵۔ غیبت کا علاج اور اس سے توبہ

غیبت بہت سے مذموم صفات کے مانند آہستہ آہستہ ایک نفسیاتی بیماری کی شکل اختیار کر لیتی ہے، اس طرح سے کہ غیبت کرنے والا اپنے کام سے لذت اٹھانے لگتا ہے اور اس سے کہ ہمیشہ کسی نہ کسی کی آبرو ریزی کرے، راضی اور خوش ہوتا ہے اور یہ ایک بہت ہی خطرناک اخلاقی مرحلہ ہے۔

یہی وہ موقع ہے، جب غیبت کرنے والے کو ہر چیز سے پہلے غیبت کے اندرونی محرکات کا علاج کرنا چاہیئے، جو اس کی رُوح کی گہرائیوں میں ہیں اور گناہ پر ابھار رہے ہیں، ایسے محرکات جیسے کہ "بخل" و "حسد" و "کینہ پروری" و "عداوت" اور خود کو افضل و برتر سمجھنا ہیں۔

اسے چاہیئے کہ خود سازی کے طریق سے اور ان بُرے صفات کے نتائج بد اور ان کے بُرے ثمرات کے بارے میں غور و فکر کرنے سے، اور اسی طرح ریاضت نفس کے طریقہ سے ان آلودگیوں کو اپنے جان و دل سے دھو ڈالے، تاکہ اپنی زبان کو غیبت کی آلودگی سے باز رکھ سکے۔

اس کے بعد توبہ کے مقام میں آئے، اور چونکہ غیبت "حق الناس" کا پہلو رکھتی ہے، اگر صاحب غیبت تک رسائی ہو اور اس سے کوئی نئی مشکل پیدا نہ ہوتی ہو، تو اس سے عذر خواہی کرے، چاہے وہ سربستہ شکل میں ہی ہو، مثلاً کہے میں بعض

---

[1] اصول کافی جلد ۲ باب الغیبۃ والبہت حدیث ۷۔

اوقات نادانی اور بے خبری میں آپ کی غیبت کر بیٹھا ہوں مجھے معاف کر دو، اور اس سے زیادہ تشریح نہ کرے، تاکہ کہیں تازہ فساد کا سبب نہ بن جائے۔

اور اگر طرفِ مقابل تک دسترس نہیں ہے، یا اُسے پہچانتا نہیں ہے، یا وہ فوت ہو گیا ہے، تو اس کے لیے استغفار کرے اور نیک عمل انجام دے، شاید اس کی برکت سے خداوند متعال اس کو بخش دے، اور طرفِ مقابل کو راضی کرلے۔

۶۔ استثنائی مواقع

غیبت کے بارے میں آخری بات یہ ہے کہ قانون غیبت میں بھی، ہر دوسرے قانون کی طرح کچھ باتیں مستثنیٰ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے، کہ بعض اوقات "مشورہ" کے طور پر مثلاً بیوی یا شوہر کے انتخاب میں، یا کسب و کار وغیرہ میں شریک ہونے کے لیے، کوئی شخص کسی سے سوال کرتا ہے، تو مشورت میں امانت کا جو اسلام کا ایک مسلّم قانون ہے۔ تقاضا یہ ہے کہ اگر طرفِ مقابل میں اُسے کوئی عیب معلوم ہو، تو وہ اُسے بتادے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک مسلمان جال میں پھنس جائے، اور اس قسم کی غیبت جو اس قسم کی نیت سے انجام پائے حرام نہیں ہے۔

اسی طرح ایسے ہی دوسرے موقعوں پر جہاں ایسے اہم مقاصد ہوں، جیسے کاموں میں مشورہ کا مقصد ہوتا ہے، یا کسی حق کو ثابت کرنے کے لیے یا ظلم کے خلاف دادرسی کے لیے صورت پذیر ہو۔

البتہ جو شخص علی الاعلان اور آشکارا گناہ کرتا ہے اور اصطلاح کے مطابق "متجاھر بہ فسق" ہے وہ موضوع غیبت سے خارج ہے اور اگر کوئی اس کے گناہ کو اس کے پیٹھ پیچھے بیان کرے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہیئے کہ یہ حکم اُسی گناہ کے ساتھ مخصوص ہے جس کے بارے میں وہ متجاہر ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ نہ صرف غیبت کرنا حرام ہے بلکہ غیبت کا سننا بھی حرام ہے اور غیبت کی مجلس میں حاضر ہونا بھی حرام کاموں میں سے ہے، بلکہ کچھ روایات کے مطابق تو مسلمانوں پر غیبت کا رد کرنا واجب ہے، یعنی غیبت کے مقابلہ میں دفاع کے لیے کھڑے ہوں، اور اس مسلمان بھائی کا، جس کی حیثیت و شخصیت خطرے میں پڑ گئی ہے، دفاع کریں، اور کتنا زیبا اور خوبصورت ہوگا وہ معاشرہ، جس میں یہ اخلاقی اصول دقیقاً اجرا ہوں۔

۱۳۔ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝

ترجمہ

۱۳۔ اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمھارے قبیلے اور کنبے بنا دیئے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، لیکن تم میں سے زیادہ مکرم و گرامی خدا کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے اور خدا علیم و خبیر ہے۔

تفسیر

تقویٰ بہترین انسانی صفت

گذشتہ آیات میں روئے سخن مومنین کی طرف تھا، اور خطاب "یاایھا الذین امنوا" کی صورت میں تھا، اور متعدد آیات کے ضمن میں، وہ باتیں، جو ایک "مومن معاشرے" کو خطرے سے دوچار کرتی ہیں، بیان کی ہیں، اور ان سے منع کیا ہے۔

جبکہ زیر بحث آیت میں، سارا انسانی معاشرہ مخاطب ہے اور وہ اہم ترین اصل اور بنیاد، جو نظم و ثبات کی ضامن ہے، بیان کرتا ہے۔ اور کاذب اور جھوٹی اقدار کے مقابلہ میں حقیقی انسانی اقدار کی میزان کو مشخص کرتا ہے اور فرماتا ہے۔ "اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھیں شعوب و قبائل قرار دیا ہے۔ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو" (یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی وجعلناکم

شعوبا وقبائل لتعارفوا)۔

لوگوں کی ایک مرد اور ایک عورت سے خلقت سے مراد، وہی انسانوں کے انساب کی آدم و حوا کی طرف بازگشت ہے، اس بنا پر چونکہ وہ سب کے سب ایک ہی جڑ سے ہیں، لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ نسب و قبیلہ کے لحاظ سے ایک دوسرے پر فخر کریں اور اگر خدا نے ہر قبیلہ اور گروہ کے لیے کچھ خصوصیات خلق کی ہیں تو وہ لوگوں کی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کی حفاظت کے لیے ہے، کیونکہ یہ فرق اور تفاوت شناخت اور پہچان کے لیے ہے اور افراد کی پہچان کے بغیر انسانی معاشرے میں کوئی نظم و ضبط قائم نہیں ہو سکتا، کیونکہ اگر وہ سب کے سب یکساں اور ایک دوسرے کے مشابہ اور مانند ہوتے تو سارے انسانی معاشرے کو فتنہ و فساد گھیر لیتا۔

اس بارے میں کہ "شعوب" (جمع "شعب" بروزن صعب، لوگوں کے ایک عظیم گروہ کے معنی میں، اور "قبائل" جمع "قبیلہ" کے درمیان کیا فرق ہے؟ مفسرین نے مختلف احتمال دیئے ہیں۔

ایک جماعت نے تو یہ کہا ہے کہ "شعوب" کا دائرہ "قبائل" کے دائرے سے زیادہ وسیع ہے، جیسا کہ موجودہ زمانہ میں "شعب" کا ایک "ملت و قوم" پر اطلاق ہوتا ہے۔

بعض "شعوب" کو "طوائف عجم" کی طرف اشارہ، اور "قبائل" کو "طوائف عرب" کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

اور آخر میں بعض نے "شعوب" کو انسان کے جغرافیائی منطقوں کی طرف منسوب ہونے کے لحاظ سے، اور "قبائل" کو نسل اور خون کی طرف منسوب ہونے سے متعلق سمجھا ہے۔

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

بہر حال قرآن مجید زمانہ جاہلیت کے بزرگ ترین فخر و مباہات کے سبب، یعنی نسب و قبیلہ پر فخر کو ختم کرنے کے بعد واقعی اور حقیقی انسانی اقدار کے معیار کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے کہ: "تم میں سے زیادہ محرم و گرامی خدا کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے" (ان اکرمکم عند اللہ اتقکم)۔

اس طرح سے تمام ظاہری اور مادی امتیازات پر خط بطلان کھینچتے ہوئے بڑائی کی واقعیت و حقیقت کو مسئلہ تقویٰ و پرہیزگاری اور خوفِ خدا میں قرار دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ خدا کے تقرب اور اس کی ساحت قدس سے نزدیکی کے لیے کوئی امتیاز سوائے تقویٰ کے مؤثر نہیں ہے۔

اور چونکہ تقویٰ ایک روحانی اور باطنی صفت ہے، جسے سب سے پہلے انسان کے دل و جان میں مستقر ہونا چاہیئے اور ممکن ہے کہ اس کے مدعی تو بہت ہوں، مگر اس سے متصف بہت کم ہوں، لہٰذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے۔ "خدا علیم و خبیر ہے" (ان اللہ علیم خبیر)۔

وہ پرہیزگاروں کو اچھی طرح سے پہچانتا ہے، اور ان کے درجہ تقویٰ و خلوص نیت اور ان کی پاکیزگی اور صفائی سے آگاہ ہے ان کو اپنے علم کے مطابق محترم و محترم اور گرامی رکھتا ہے اور اجر و پاداش دیتا ہے، جھوٹے دعویداروں کو بھی پہچانتا ہے اور انھیں سزا اور عذاب دیتا ہے۔

نکتہ

۱- سچی اور جھوٹی قدریں

اس میں شک نہیں کہ ہر انسان فطرتاً اس چیز کا خواہاں ہے کہ وہ ایک صاحب قدر و افتخار ہستی قرار پائے !!
اسی وجہ سے اقدار کو کسب کرنے کے لیے اپنے پورے وجود کے ساتھ کوشش کرتا ہے۔

لیکن اقدار کے معیار کی پہچان تہذیبوں اور تمدنوں کے اختلاف کی وجہ سے کامل طور سے مختلف ہے۔
بعض اوقات جھوٹی قدریں سچی قدروں کی جگہ لے لیتی ہیں۔

کوئی گروہ اپنی واقعی اور حقیقی قدر و قیمت "کسی معروف و معتبر قبیلہ" کے ساتھ انتساب میں سمجھتا ہے، لہٰذا اپنے قبیلہ اور طائفہ کے مقام کی شان کے لیے ہمیشہ ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے، تاکہ اس کو بڑا اور بزرگ بنانے کے طریقہ خود کو اس سے منسوب کرنے کے ذریعہ بڑا کرے۔

خاص طور سے زمانہ جاہلیت کی اقوام کے درمیان انساب و قبائل کے ذریعہ افتخار سب سے زیادہ رائج موہوم افتخار تھا، یہاں تک کہ ہر قبیلہ خود کو "برتر قبیلہ" اور ہر نسل خود کو "والاتر نسل" سمجھتی تھی، افسوس کی بات یہ ہے کہ ابھی تک اس کی تلچھٹ اور بقایاجات بہت سے افراد و اقوام کی روح کی گہرائیوں میں موجود ہیں۔

ایک دوسرا گروہ مال و دولت کے مسئلہ اور کاخ و قصر و خدم و حشم اور ایسی ہی چیزوں کا مالک ہونے کو قدر و قیمت کی نشانی سمجھتا ہے، اور ہمیشہ اسی کے لیے کوشش کرتا رہتا ہے، جبکہ ایک اور جماعت اجتماعی اور سیاسی بلند مقامات کو شخصیت کا معیار سمجھتی ہے۔

اور اسی طرح سے ہر گروہ اپنے مخصوص راستے پر قدم اٹھاتا ہے۔ اور کسی ایک خاص قدر و منزلت سے اپنا دل باندھتا ہے اور اسی کو معیار سمجھتا ہے۔

لیکن چونکہ یہ سب امور، ایسے متزلزل اور ذات سے خارج اور مادی اور جلدی گزر جانے والے امور ہیں، اسلام جیسا ایک آسمانی دین ہرگز ان کی موافقت نہیں کر سکتا، لہٰذا ان سب پر خط بطلان کھینچتے ہوئے، انسان کی واقعی اور حقیقی قدر و قیمت کو اس کی ذاتی صفات، خصوصاً تقویٰ و پرہیزگاری ایفائے عہد اور پاکیزگی میں شمار کرتا ہے، یہاں تک کہ علم و دانش جیسے اہم موضوعات کے لیے بھی ، اگر وہ ایمان و تقویٰ اور اخلاقی قدروں کی راہ میں کام نہ آئیں، کسی اہمیت کا قائل نہیں ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ قرآن ایک ایسے ماحول میں ظاہر ہوا، جہاں "قبیلہ" کی قدر و قیمت تمام قدروں سے زیادہ اہم شمار ہوتی تھی، لیکن یہ خود ساختہ بت ٹوٹ پھوٹ گیا اور انسانوں کو "خون" و "قبیلہ" و "رنگ" و "نژاد" و "نسل" و

"مال" و "مقام" اور مال و دولت کی قید سے آزاد کردیا، اور اسے اپنے آپ کو پانے کے لیے اس کی جان و روح کے اندر اور اس کی بلند صفات میں رہبری کی۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اُن شان ہائے نزول میں، جو اس آیت کے لیے بیان کی گئی ہیں۔ ایسے نکات دکھائی دیتے ہیں جو اس دستورِ الٰہی کی گہرائی کی حکایت کرتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ،

فتح مکہ کے بعد پیغمبر نے حکم دیا کہ اذان کہیں۔ "بلال" نے خانۂ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان کہی تو "عتاب بن اسید" نے جو آنا دیکھے گئے لوگوں میں سے تھا، کہا، میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ میرا باپ دُنیا سے رخصت ہو گیا اور اس نے یہ دن نہ دیکھا اور "حارث بن ہشام" نے بھی کہا، کیا رسول اللہ کو اس کالے کوتے کے علاوہ اور کوئی نہیں ملا؟! (تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور حقیقی اور واقعی قدر و قیمت کا معیار بیان ہوا) [1]

بعض دوسرے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب پیغمبر نے یہ حکم دیا تھا کہ بعض "موالی" کو لوگ بیٹی کا رشتہ دیں (موالی آزاد شدہ غلاموں یا غیر عرب کو کہتے ہیں) تو ان لوگوں نے تعجب کیا اور کہا اے رسولِ خدا، کیا آپ یہ حکم دیتے ہیں کہ ہم اپنی بیٹیاں موالی کو دیں؟! تو یہ آیت نازل ہوئی اور ان بے ہودہ افکار پر خطِ بطلان کھینچا [2]

ایک حدیث میں یہ آیا ہے کہ ایک دن پیغمبر نے مکہ میں لوگوں کے لیے خطبہ پڑھا اور فرمایا،

"یا ایھا الناس ان اللہ قد اذھب عنکم عیبة الجاھلیة، و تعاظمھا باٰبائھا، فالناس رجلان، رجل برتقی کریم علی اللہ، و فاجر شقی ھین علی اللہ، والناس بنو آدم، و خلق اللہ آدم من تراب، قال اللہ تعالیٰ: یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثٰی وجعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ان اللہ علیم خبیر:

اے لوگو! خدا نے جاہلیت کے ننگ و عیب اور آباؤ اجداد اور بزرگوں پر فخر و مباہات کرنے کو ختم کر دیا ہے، لوگوں کے صرف دو گروہ ہیں، نیکو کار صاحبِ تقویٰ اور خدا کے ہاں قدر و قیمت رکھنے والے، یا بدکار و شقی اور بارگاہِ خداوندی میں پست و حقیر سب کے سب لوگ آدم کی اولاد ہیں، اور خدا نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے، اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں اس لیے شعوب و قبائل قرار دیا ہے، تاکہ تمہاری پہچان ہو سکے، خدا کے نزدیک زیادہ مکرم و گرامی وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ پرہیزگار ہے اور خدا دانا اور آگاہ ہے " [3]

---

[1] "روح البیان" جلد ۹ ص ۹۰۔ تفسیر قرطبی میں بھی یہی شان نزول بیان کی گئی ہے جلد ۹ ص ۶۱۶۰۔

[2] سابقہ مدرک۔

[3] "تفسیر قرطبی" جلد ۹ ص ۶۱۶۲

کتاب "آداب النفوس" طبری میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے ایام تشریق کے دوران (جو ذی الحجہ کے ۱۱-۱۲ اور ۱۳ کے دن ہیں) سرزمین منیٰ میں، جبکہ آپؐ ایک اونٹ پر سوار تھے، لوگوں کی طرف رُخ کرکے فرمایا:

"یا ایھا الناس: الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد، الا لا فضل لعربي علی عجمي ولا بعجمي علی عربي، ولا سود علی احمر ولا لاحمر علی اسود، الا بتقوی الا ھل بلغت؟ قالوا نعم! قال لیبلغ الشاھد الغائب"

اے لوگو! جان لو کہ تمہارا خدا ایک ہے، تمہارا باپ بھی ایک ہے نہ تو عرب کو عجم پر کوئی برتری ہے، اور نہ ہی عجم کو عرب پر، نہ کسی کالے کو کسی گورے پر اور نہ ہی کسی گورے کو کسی کالے پر، مگر تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ، کیا میں نے خدا کا حکم تمہیں پہنچا دیا ہے؟ سب نے کہا: ہاں! آپؐ نے فرمایا: یہ بات حاضرین غائبین تک پہنچا دیں۔[1]

ایک اور دوسری حدیث میں بھی مختصر اور پُرمعنی جملوں میں آنحضرتؐ سے یہ منقول ہوا ہے:

"ان اللہ لا ینظر الی احسابکم، ولا الی انسابکم، ولا الی اجسامکم، ولا الی اموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم، فمن کان لہ قلب صالح تحنن اللہ علیہ، وانما انتم بنو ادم واحبکم الیہ اتقاکم"

خدا تمہارے گھرانے اور نسب کی وضع وکیفیت کو نہیں دیکھتا، نہ تمہارے جسموں کی طرف نہ تمہارے مال ومنال کی طرف، لیکن وہ تو تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔ جو شخص صالح اور نیک دل رکھتا ہے تو خدا اس پر لطف ومحبت کرتا ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محبوب وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔[2]

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ان وسیع بکثرت اور پُربار تعلیمات کے باوجود اب بھی مسلمانوں کے درمیان کچھ لوگ "نسل" و "خون" اور "زبان" کے مسئلہ پر تکیہ کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ان چیزوں کی وحدت کو اخوت اسلامی اور وحدت دینی پر مقدم سمجھتے ہیں اور انھوں نے زمانہ جاہلیت کی عصبیت کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔ اور اگرچہ ان پر اس راستے میں سخت مصائب اٹھانے پڑے ہیں، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ بیدار ہونا ہی نہیں چاہتے اور نہ ہی اسلام کے حکم کی طرف لوٹنا

---

[1][2] مدرک سابق صفحہ ۱۶۲، اس روایت میں "احمر" کی تعبیر سُرخ جلد کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ گندم گوں کے معنی میں ہے، کیونکہ زیادہ تر لوگ اس ماحول میں اسی قسم کے تھے، اتفاقاً لفظ "احمر" روایات میں خود گندم پر بھی اطلاق ہوا ہے۔

چاہتے ہیں خداوند عالم سب لوگوں کو جاہلیت کے تعصبات کے شر سے محفوظ رکھے۔

اسلام نے "جاہلیت کی عصبیت" سے - جو جس شکل و صورت میں ہو - مبارزہ کیا ہے - تاکہ پورے عالم کے مسلمانوں کو، چاہے وہ جس نسل و قوم و قبیلہ سے ہوں ایک پرچم کے نیچے جمع کرے، نہ کہ قومیت و نسل کے پرچم تلے اور نہ ہی کسی دوسرے پرچم کے نیچے، کیونکہ اسلام ہرگز اس قسم کے تنگ، محدود نظریات کو قبول نہیں کرتا اور ان سب کو موہوم اور بے بنیاد شمار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے جاہلیت کی عصبیت کے بارے میں فرمایا،

"دعوها فانها معتنة"

"اسے چھوڑ دو - یہ بدبودار اور متعفن چیز ہے"[1]

لیکن اس متعفن اور بدبودار فکر کو بہت سے ایسے لوگ جو ظاہراً اپنے آپ کو مسلمان شمار کرتے ہیں، اور قرآن اور اخوتِ اسلامی کا دم بھرتے ہیں، اب تک گلے کیوں لگائے ہوئے ہیں؟ کیا انھیں معلوم نہیں ہے!

کتنا زیبا اور خوبصورت ہوگا وہ معاشرہ جو اسلامی قدروں کے معیار "ان اکرمکم عند الله اتقاکم" کی بنیاد پر تعمیر ہوگا، اور نسل، مال، دولت، اور جغرافیائی منطقوں اور طبقوں کی جھوٹی قدریں ختم ہو جائیں گی، ہاں، تقوائے الٰہی، اندرونی مسئولیت کا احساس، خواہشات کے مقابلہ میں قیام، راستی، درستی، پاکی، حق و عدالت کا پابند ہونا، صرف یہی چیزیں انسانی قدروں کا معیار ہیں۔ نہ کہ ان کی غیر، اگرچہ موجودہ معاشروں کے پریشان حال بازار میں یہ اصل قدریں بھلا دی گئی ہیں اور جھوٹی قدروں نے ان کی جگہ لے لی ہے۔

زمانہ جاہلیت کی قدروں کے نظام میں جو آباؤ اجداد، مال و دولت اور اولاد پر فخر کرنے کے محور پر چکر لگاتا تھا، ایک مٹھی بھر چور اور ڈاکو پرورش پاتے تھے، لیکن اس نظام کے بدل جانے سے اور "ان اکرمکم عند الله اتقاکم" کی بلند و بالا اصل کے اختیار سے، سلمان و ابوذر و عمار یاسر و مقداد جیسے انسان، اصل ہوئے۔

انسانی معاشروں کے انقلاب میں اہم چیز ان کی قدروں کے نظام کا انقلاب ہے اور اس اصل اصیل اسلامی کا احیاء ہے، ہم اس گفتگو کو پیغمبر گرامی اسلام کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ جس میں آپؐ نے فرمایا:

كلكم بنو آدم، وآدم خلق من تراب، ولينتهين قوم يفخرون بآبائهم او ليكونن اهون على الله من الجعلان،

"تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے ہیں، آباؤ اجداد کے ذریعہ ایک دوسرے پر فخر کرنے سے پرہیز کرو، ورنہ تم خدا کے نزدیک ان حشرات اور کیڑے مکوڑوں سے، جو گندگی میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں، زیادہ حقیر اور پست ہو جاؤ گے"[2]

---

[1] "صحیح مسلم" (مطابق نقل فی ظلال جلد ۷، ص ۵۳۰)۔

[2] "فی ظلال" جلد ۷، ص ۵۳۰۔

۲۔ تقویٰ کی حقیقت

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قرآن نے تقویٰ کو عظیم ترین امتیاز قرار دیا ہے اور صرف اسی کو انسانوں کی قدر و منزلت کے ناپنے کا معیار سمجھا ہے۔

ایک دوسری جگہ تقویٰ کو بہترین زادراہ اور توشہ شمار کیا ہے اور کہتا ہے " وتزودوا فان خیر الزاد التقوٰی "

(بقرہ - ۱۹۷)

ایک اور جگہ تقویٰ کے لباس کو انسان کے لیے بہترین لباس شمار کرتا ہے: " ولباس التقوٰی ذالک خیر "

(اعراف - ۲۶)

متعدد آیات میں انبیاء کی دعوت کے ابتدائی اصولوں میں سے ایک کو " تقویٰ " کہا ہے، اور آخر میں ایک اور جگہ اس موضوع کی اہمیت کو اس حد تک اوپر لے گیا ہے کہ خدا کو " اصل تقویٰ " شمار کرتے ہوئے کہتا ہے: " ھو اھل التقوٰی و اھل المغفرۃ " (مدثر - ۵۶)

قرآن تقویٰ کو نورِ الٰہی سمجھتا ہے کہ جہاں وہ راسخ ہو جائے علم و دانش کی تخلیق کرتا ہے: " واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ "

(بقرہ - ۲۸۲)

اور " نیکی " و " تقویٰ " کو ایک دوسرے کا قرین شمار کرتا ہے: " وتعاونوا علی البر والتقوٰی " (مائدہ - ۲)

اور عدالت کو تقویٰ " کا قرین کہتا ہے: " اعدلوا ھو اقرب للتقوٰی " (مائدہ - ۸)

اب دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس عظیم معنوی سرمایہ اور اس عظیم ترین انسانی افتخار یعنی تقویٰ کی ان تمام امتیازات کے ساتھ حقیقت کیا ہے؟

قرآن نے کچھ ایسے اشارے بیان کیے ہیں جو تقویٰ کی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں، متعدد آیات میں " تقویٰ " کی جگہ " قلب " کو شمار کیا ہے، ان میں ایک جگہ کہتا ہے:

" اولئک الذین امتحن اللہ قلوبھم للتقوٰی ": وہ لوگ جو رسولِ خدا کے سامنے اپنی آوازیں دھیمی رکھتے ہیں اور ادب کی رعایت کرتے ہیں، وہ ایسے لوگ ہیں جن کے دلوں کا تقویٰ کے قبول کرنے کے لیے خدا نے امتحان لے لیا ہے۔

(حجرات - ۳)

قرآن نے تقویٰ کو " فجور " کا مقابل قرار دیا ہے جیسا کہ سورۂ شمس کی آیہ ۸ میں بیان ہوا: " فالھمھا فجورھا و تقواھا ": خدا نے انسان کو پیدا کیا، اور اس کو فجور اور تقویٰ کی راہ دکھا دی۔

قرآن ہر اس عمل کو، جس نے روحِ اخلاص و ایمان یعنی نیک و پاکیزہ نیت سے سرچشمہ حاصل کیا ہو، تقویٰ کی بنیاد پر شمار کرتا ہے جیسا کہ سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۸ میں مسجد " قبا " کے بارے جس کے مقابلہ میں مسجد ضرار بنائی گئی تھی۔ فرمایا ہے:

" لمسجد اسس علی التقوٰی من اول یوم احق ان تقوم فیہ ": " وہ مسجد جو پہلے دن سے ہی تقویٰ کی بنیاد

پر بنی ہے، زیادہ حق رکھتی ہے کہ تو اسی میں نماز پڑھے "

ان آیات کے مجموعہ سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ " تقویٰ " وہی مسئولیت اور ذمہ داری کا احساس ہے، جو دل میں ایمان کے راسخ ہو جانے کے بعد انسانی وجود پر حکومت کرتا ہے اور اس کو "فسق و فجور" اور گناہ سے باز رکھتا ہے اور نیکی و پاکی و عدالت کی طرف دعوت دیتا ہے، انسان کے اعمال کو خالص اور اس کی فکر و نیت کو آلودگیوں سے صاف کرتا ہے۔

جب ہم اس لفظ کی لغوی اصل و بنیاد کی طرف لوٹتے ہیں، تو پھر بھی ہم اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں، کیونکہ تقویٰ " وقایۃ " سے کسی چیز کی حفاظت و نگہداری میں کوشش کرنے کے معنی میں ہے اور اس قسم کے مواقع پر مراد، روح و جان کی ہر قسم کی آلودگی سے حفاظت اور ایسے امور میں جن میں خدا کی رضا ہو اپنی قوتوں کو ایک مرکز پر لانا ہے۔

بعض بزرگوں نے تقویٰ کے لیے تین مراحل بیان کیے۔

۱۔ صحیح اعتقادات کی تحصیل کے ذریعہ عذاب جاودانی سے نفس کو محفوظ رکھنا۔

۲۔ ہر قسم کے گناہ سے پرہیز کرنا چاہے وہ ترک واجب ہو یا فعل معصیت۔

۳۔ اپنے آپ کو ہر اس چیز سے بچانا جو انسان کے دل کو اپنی طرف مشغول رکھتی ہے، اور حق سے منحرف کرتی ہے، اور یہ خواص بلکہ خاص الخاص لوگوں کا تقویٰ ہے۔[1]

امیر المومنین علی علیہ السلام نے (نہج البلاغہ) میں تقویٰ کے سلسلہ میں کئی منہ بولتی اور زندہ تعبیریں بیان فرمائی ہیں۔ اور تقویٰ ان مسائل میں سے ہے جس میں حضرت کے بہت سے خطبوں، خطوط اور کلمات قصار میں تکیہ ہوا ہے۔

ایک جگہ تقویٰ کا گناہ اور آلودگی سے موازنہ کرتے ہوئے اس طرح فرماتے ہیں:

" الا وان الخطايا خيل شمس حمل عليها اهلها، وخلعت لجمها، فتقحمت بهم في النار؛ الا وان التقوى مطايا ذلل حمل عليها اهلها، واعطوا ازمتها فاوردتهم الجنة ":

" جان لو کہ گناہ سرکش سواریوں کے مانند ہیں، جن پر گنہگار سوار ہوتے ہیں اور جن کی لگامیں ٹوٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور وہ ان کو قعر جہنم میں لے جا کر سر کے بل پٹک دیتی ہیں لیکن تقویٰ ایسی آرام دہ اور سبک رفتار سواری ہے جن کے مالک ان پر سوار ہوتے ہیں، تو ان کی لگامیں ہاتھ میں لیے ہوتے ہیں، اور وہ انھیں بہشت کے وسط میں لے جا کر داخل کر دیتی ہے "[2]

اس لطیف تشبیہ کے مطابق، تقویٰ وہی اپنے آپ کو بچائے، نفس پر کنٹرول کرنے، اور شہوات پر تسلط کی حالت ہے۔ درحالیکہ تقویٰ کا نہ ہونا، سرکش شہوات کے مقابلہ میں سر تسلیم خم ہونا، اور ان پر ہر قسم کے کنٹرول کا ختم ہو جانا ہے۔

ایک اور دوسری جگہ فرماتے ہیں،

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۰ صفحہ ۱۳۶۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۶۔

" اعلموا عباد الله ان التقوی دار حصن عزیز، والفجور دار حصن ذلیل، لا یمنع اھلہ، ولا یحرز من لجأ الیہ، الا وبالتقوی تقطع حمۃ الخطایا"

"اے بندگانِ خدا، جان لو کہ تقویٰ ایک مستحکم اور شکست ناپذیر قلعہ ہے، لیکن فسق و فجور اور گناہ ایک کمزور اور بے دفاع حصار ہے، جو اپنے اہل کو آفات و بلیات سے نجات نہیں دیتا، اور جو شخص اس کی پناہ لے گا وہ امان میں نہیں ہے۔ جان لو کہ انسان صرف تقویٰ کے ذریعہ ہی گناہ کی گزند سے بچ سکتا ہے" [1]

ایک اور مقام پر مزید فرماتے ہیں۔

" فاعتصموا بتقوی اللہ فان لھا حبلاً وثیقاً عروتہ ومعقلاً منیعاً ذروتہ"

" تقوائے الٰہی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو کیونکہ وہ ایک محکم رشتہ اور عروۃ الوثقیٰ ہے، اور ایک قابلِ اطمینان پناہ گاہ ہے" [2]

ان تعبیرات کے مجموعہ سے تقویٰ کی حقیقت اور رُوح اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

یہ نکتہ بھی یاد آوری کے لائق ہے کہ تقویٰ ایمان کے درخت کا پھل ہے، اور اسی بنا پر اس عظیم سرمائے کو حاصل کرنے کے لیے ایمان کی بنیادوں کو محکم بنانا چاہیئے۔

البتہ اطاعت پر عمل درآمد اور گناہ سے پرہیز، اور اخلاقی پروگراموں پر توجہ تقویٰ کو نفس میں راسخ کرتی ہے اور اس کا نتیجہ انسان کی رُوح اور جان میں نورِ یقین اور ایمان شہودی کا پیدا ہونا ہے اور نور "تقویٰ" جتنا بڑھتا جاتا ہے، اتنا ہی نور "یقین" بھی زیادہ ہوتا جاتا ہے، لہٰذا ہم اسلامی روایات میں دیکھتے ہیں کہ "تقویٰ" کو "ایمان" سے ایک درجہ بلند، اور "یقین" سے ایک درجہ نیچے شمار کیا جاتا ہے۔

امام علی بن موسیٰ رضاؑ فرماتے ہیں،

"الایمان فوق الاسلام بدرجۃ، والتقوی فوق الایمان بدرجۃ، والیقین فوق التقوی بدرجۃ، وما قسم فی الناس شیء اقل من الیقین"

"ایمان اسلام سے ایک درجہ بلند ہے، اور تقویٰ ایمان سے ایک درجہ اُونچا ہے اور یقین تقویٰ سے ایک درجہ اونچا ہے اور لوگوں کے درمیان کوئی چیز "یقین" جتنی کم تقسیم نہیں ہوئی" [3]

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۷۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۰۔

[3] بحار الانوار جلد ۷۰ ص ۱۳۶۔

ہم اس بحث کو ان معروف اشعار کے ساتھ، جو تقویٰ کی حقیقت کو ایک مثال کے ضمن میں واضح کرتے ہیں، ختم کرتے ہیں۔

خل الذنوب صغیرها ‏ ‏ وکبیرها فهو التقی

واصنع کماش فوق ارض ‏ ‏ الشوك یحذر ما یری

لا تحقرن صغیرة ‏ ‏ ان الجبال من الحصی

- تمام چھوٹے بڑے گناہوں کو چھوڑ دے، بس تقویٰ یہی ہے۔"
- اور اس شخص کی مانند ہو جا جو کسی خارزار زمین سے گزر رہا ہے، اور اپنے لباس اور دامن کو اس طرح سمیٹتا ہے کہ کہیں اس میں کانٹا نہ چبھ جائے، اور ہمیشہ اپنے اطراف پر نظر رکھتا ہے۔"
- ہرگز کسی گناہ کو چھوٹا نہ سمجھنا، کیونکہ بڑے بڑے پہاڑ چھوٹی چھوٹی سنگریزوں سے مل کر ہی بنتے ہیں۔"

۱۴۔ قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ لٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَ لَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ وَ اِنۡ تُطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ لَا یَلِتۡکُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِکُمۡ شَیۡئًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝

۱۵۔ اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ثُمَّ لَمۡ یَرۡتَابُوۡا وَ جٰہَدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ۝

ترجمہ

۱۴۔ بادیہ نشیں عربوں نے کہا، ہم ایمان لائے ہیں، کہہ دے! تم ایمان نہیں لائے ہو لیکن تم یہ کہو کہ ہم اسلام لے آئے، اور ابھی تک ایمان تو تمھارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا، اگر تم خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کروگے تو وہ تمھارے اعمال کی پوری پوری جزا دے گا، بیشک خدا غفور و رحیم ہے۔

۱۵۔ واقعی مومن تو صرف وہی لوگ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور پھر انہوں نے کبھی شک نہیں کیا اور اپنی جان اور مالوں کے ساتھ انھوں نے راہِ خدا میں جہاد کیا ہے اور وہی سچے ہیں۔

شانِ نزول

بہت سے مفسرین نے اس آیت کے لیے ایک شانِ نزول بیان کی ہے، جس کا خلاصہ اس طرح ہے،

قبیلۂ بنی اسد کا ایک گروہ، قحط اور خشک سالی کے ایک سال میں، مدینہ میں وارد ہوا، اور انھوں نے پیغمبرؐ سے کچھ مدد حاصل کرنے کے لیے زبان پر شہادتین جاری کیں، اور پیغمبرؐ سے کہا کہ عرب کے دوسرے قبائل نے سواریوں پر سوار ہو کر آپؐ سے جنگ کی لیکن ہم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آپؐ کے پاس آئے ہیں اور ہم نے آپؐ سے کوئی جنگ نہیں کی، دراصل وہ اس طریقہ سے یہ چاہتے تھے کہ پیغمبرؐ پر احسان جتائیں، اس موقع پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں، اور انہیں بتایا کہ ان کا اسلام ظاہری ہے اور ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں نہیں ہے، علاوہ ازیں اگر وہ ایمان لائے بھی ہیں تو انہیں پیغمبرؐ پر کوئی منت اور احسان نہیں رکھنا چاہیے بلکہ خدا نے ان پر احسان کیا ہے کہ انہیں ہدایت کی ہے)[1]

[illegible] شان نزول کا محدود ہونا دوسرے تمام مواقع کی طرح آیت کے مفہوم کی عمومیت کے لیے ہرگز مانع نہیں ہے۔

تفسیر

"اسلام" اور "ایمان" کا فرق

گذشتہ آیات میں انسانوں کی قدر و قیمت کے معیار یعنی تقویٰ کے بارے میں گفتگو تھی، اور چونکہ "تقویٰ" ایمان کے [illegible] جو دل و جان کی گہرائیوں میں [illegible] حقیقت [illegible] ایمان کی حقیقت کو پیش کرتے ہوئے اس طرح بیان ہوا:

بادیہ نشین عرب نے کہا: "ہم ایمان لائے ہیں، ان سے کہہ دے: تم ایمان نہیں لائے ہو، بلکہ یہ کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں، لیکن ایمان تو ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا" (قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم)

اس آیت کے مطابق "اسلام" اور "ایمان" میں فرق یہ ہے کہ "اسلام" ایک ظاہری قانونی شکل رکھتا ہے۔ اور جو شخص زبان پر شہادتین جاری کرتا ہے [illegible] مسلمانوں [illegible] شامل ہو جاتا ہے، اور اس پر اسلام کے احکام جاری ہو جاتے ہیں۔

لیکن ایمان ایک واقعی اور باطنی امر ہے، اور اس کی جگہ انسان کا دل ہے، نہ کہ اس کی زبان اور اس کا ظاہر۔

ممکن ہے "اسلام" مختلف محرکات سے ہو، یہاں تک کہ مادی محرکات اور شخصی منافع، لیکن "ایمان" حتمی طور پر معنوی محرکات سے علم و آگاہی سے غذا حاصل کرتا ہے، اور وہی ہے کہ جس کی شاخوں پر تقویٰ کا حیات بخش پھل ظاہر ہوتا ہے۔

یہ وہی چیز ہے جو پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے ایک واضح اور ناطق عبارت میں منقول ہوئی ہے:

الاسلام علانیة، والایمان فی القلب،

"اسلام ایک آشکار اور ظاہری چیز ہے، لیکن ایمان کی جگہ دل ہے۔"[2]

---

[1] "تفسیر المیزان" [illegible]
[2] مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۱۳۸۔

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

"الاسلام یحقن به الدم وتؤدی به الامانة وتستحل به الفروج والثواب علی الایمان"

"اسلام کے ساتھ انسان کا خون محفوظ، اس کی امانت کا ادا کرنا ضروری، اور اس سے شادی بیاہ حلال ہوتا ہے لیکن ثواب ایمان پر ملتا ہے۔" [1]

نیز اسی دلیل کی بنا پر بعض روایات میں اسلام کا مفہوم اقرار لفظی میں منحصر سمجھا گیا ہے جبکہ ایمان کو عمل کے ساتھ اقرار کی صورت میں متعارف کرایا گیا ہے: "الایمان اقرار وعمل والاسلام اقرار بلا عمل" [2]

یہی معنی ایک دوسری تعبیر میں "اسلام اور ایمان" کی بحث میں بیان ہوئے ہیں، جو فضیل بن یسار کہتا ہے کہ میں نے امام صادقؑ سے سنا ہے آپؑ نے فرمایا:

"ان الایمان یشارک الاسلام ولا یشارکه الاسلام، ان الایمان ما وقر فی القلوب، والاسلام ما علیه المناکح والمواریث وحقن الدماء"

"ایمان تو اسلام کے ساتھ شریک ہے لیکن اسلام ایمان کے ساتھ شریک نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں ہر مومن مسلمان ہے لیکن ہر مسلمان مومن نہیں ہے۔ ایمان وہ ہے جو دل میں ساکن ہو لیکن اسلام ایک ایسی چیز ہے جس کے مطابق نکاح، میراث اور خون کی حفاظت کے قوانین جاری ہوتے ہیں۔" [3]

لیکن مفہوم کا یہ فرق اس صورت میں ہے جب یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے مقابلہ میں قرار پائیں، لیکن جب الگ الگ بیان کیے جائیں تو ممکن ہے کہ اسلام اسی چیز پر بولا جائے جس پر ایمان کا اطلاق ہوتا ہے یعنی یہ دونوں الفاظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

اس کے بعد زیر بحث آیت میں مزید ارشاد ہوتا ہے، "اگر تم خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہارے اعمال کا ثواب کامل طور پر عطا کرے گا اور تمہارے اعمال کی جزا میں کمی نہیں کی جائے گی" (وان تطیعوا الله ورسوله لا یلتکم من اعمالکم شیئا)۔

"کیونکہ خدا غفور و رحیم ہے" (ان الله غفور رحیم)۔

"لا یلتکم" "لیت" (بروزن ریب) کے مادہ سے حق کو کم کرنے کے معنی میں ہے۔ [4]

---

[1] "کافی" جلد ۲ "باب ان الاسلام یحقن به الدم" حدیث ۱۔

[2] "کافی" جلد ۲ "باب ان الاسلام یحقن به الدم" حدیث ۲۔

[3] اصول کافی جلد ۲ "باب ان الایمان یشرک الاسلام" حدیث ۳۔

[4] اس بنا پر مذکورہ فعل اجوف یائی ہے۔ اگر "ولت" (مثال واوی) کا مادہ بھی اسی معنی میں آتا ہے۔

آخری جملے حقیقت میں ایک مُسلّم قرآنی اصل کی طرف اشارہ ہیں، کہ اعمال کے قبول ہونے کی شرط "ایمان" ہے، کہتا ہے، اگر تم خدا اور رسُول پر قلبی ایمان رکھتے ہو، جس کی نشانی خدا اور اس کے رسُول کے فرمان کی اطاعت ہے تو تمھارے اعمال کی قدر کی جائے گی، اور خدا تمھاری چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی قبول کرے گا، اور ان کا اجر دے گا، یہاں تک کہ اس ایمان کی برکت سے وہ تمھارے گناہوں کو بخش دے گا، کیونکہ وہ غفور و رحیم ہے۔

اور چونکہ اس امر باطن یعنی ایمان کا حصول کوئی آسان کام نہیں ہے، لہٰذا بعد والی آیت میں اس کی نشانیاں پیش کرتا ہے، ایسی نشانیاں جو مومن کو مسلم سے، اور سچے کو جھوٹے سے، اور پیغمبر کی دعوت کو عاشقانہ طور پر قبول کرنے والوں کو، جان کی حفاظت یا مالِ دنیا کے حصول کی خاطر ایمان کا اظہار کرنے والوں سے، اچھی طرح سے جدا کر دیتی ہیں۔ فرماتا ہے:

"واقعی مومنین وہ لوگ ہیں جو خدا اور اس کے رسُول پر ایمان لائے ہیں، اس کے بعد انھوں نے کبھی کوئی شک و شبہ نہیں کیا اور اپنے اموال اور نفسوں کے ساتھ راہِ خدا میں جہاد کیا ہے" (انما المؤمنون الذین اٰمنوا باللّٰہ ورسولہ ثم لم یرتابوا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللّٰہ)۔

ہاں! ایمان کی سب سے پہلی نشانی، اسلام کی راہ میں شک و شبہ اور دو دلی نہ کرنا ہے، دوسری نشانی اموال کے ساتھ جہاد کرنا، اور تیسری نشانی جو سب سے زیادہ افضل ہے اور برتر ہے، نفسوں (جانوں) کے ساتھ جہاد کرنا ہے۔

اس طرح اسلام نے واضح ترین نشانیاں بیان کر دی ہیں، قیام و ثبات قدم، اور شک و تردید ایک طرف سے، اور مال و جان کی قربانی دوسری طرف سے۔

کیسے ممکن ہے کہ ایمان دل میں راسخ نہ ہو، جبکہ انسان محبوب کی راہ میں مال و جان کے خرچ کرنے سے مضائقہ نہیں کرتا۔

لہٰذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "اسی قسم کے لوگ راست گو ہیں، اور ایمان کی رُوح ان کے وجود میں موجزن ہے" (اولٰئک ھم الصادقون)۔

اس معیار کو، جسے قرآن نے "سچے مومنین" اور "اسلام کا اظہار کرنے والے" جھوٹوں کی شناخت کے لیے بیان کیا ہے، قبیلہ "بنی اسد" کے فقراء میں منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ ہر زمانہ کے لیے واقعی مومنین کو جھوٹے دعویداروں سے جدا کرنے کے لیے، اور ان لوگوں کے دعووں کی قدر و قیمت کی نشاندہی کرنے کے لیے، جو ہر جگہ اسلام کا دم بھرتے ہیں، اور اپنے آپ کو پیغمبر کا طلب گار سمجھتے ہیں، لیکن ان کے عمل میں معمولی سے معمولی نشانی بھی ایمان و اسلام کی نظر نہیں آتی۔

ان کے مقابلہ میں ایسے لوگ ہیں جو نہ صرف کوئی دعویٰ نہیں رکھتے، بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو کم تر شمار کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ایثار و قربانی کے میدان میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔

اور اگر ہم اس قرآنی معیار کو واقعی مومنین کی جانچ کے لیے استعمال کریں تو معلوم نہیں لاکھوں کروڑوں مدعیان اسلام کے انبوہ کے درمیان میں سے کس قدر واقعی مومن نکلیں، اور کس قدر ظاہری مسلمان؟!

۱۶۔ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○

۱۷۔ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

۱۸۔ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۶۔ کہہ دے کیا تم خدا کو اپنے ایمان سے باخبر کر رہے ہو، حالانکہ وہ ان تمام چیزوں کو، جو آسمانوں اور زمین میں ہیں جانتا ہے، اور خدا ہر چیز سے آگاہ ہے۔

۱۷۔ وہ تجھ پر یہ احسان جتا رہے ہیں، کہ وہ اسلام لے آئے ہیں کہہ دے، تم اپنے اسلام کا مجھ پر احسان نہ جتلاؤ، بلکہ یہ تو خدا نے تم پر احسان کیا ہے کہ تمھیں ایمان کی طرف ہدایت کی ہے، اگر تم (ایمان کے دعوے میں) سچے ہو۔

۱۸۔ خدا آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہے، اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو، اس کو بھی دیکھ رہا ہے۔

شانِ نزول

مفسرین کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ گزشتہ آیات کے نزول کے بعد بدو عربوں کا ایک گروہ پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا اور

قسم کھا کر کہنے لگے کہ وہ ایمان کے دعوے میں سچے ہیں، اور ان کا ظاہر و باطن ایک ہے، اس پر پہلی زیر بحث آیت نازل ہوئی.
اور انھیں آگاہ کیا کہ قسم کھانے کی ضرورت نہیں [illegible] کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔

تفسیر

مسلمان ہونے کا احسان مت جتلاؤ

[illegible] اچھے مسلمانوں کی [illegible] بات ہوئی تھی [illegible] اسلام کا دعویٰ رکھنے والی جماعت کا اصرار یہ تھا کہ ایمان کی حقیقت ان کے دل میں مستقر ہے. قرآن ان کے لیے بھی اور ان تمام افراد کے لیے بھی جو انہی جیسے ہیں یہ اعلان کر رہا ہے، کہ اصرار کرنے اور قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے [illegible] ایمان و کفر کے مسئلہ میں تمہارا اس خدا کے ساتھ واسطہ ہے جو ہر چیز سے باخبر ہے، خصوصاً اس آیت میں عتاب آمیز لہجہ میں کہتا ہے، "ان سے کہہ دے، کیا تم خدا کو اپنے ایمان سے باخبر کرنا چاہتے ہو، وہ ان تمام چیزوں کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، جانتا ہے" (قل اتعلمون الله بدینکم والله یعلم ما فی السماوات وما فی الارض)۔

[illegible] والله بکل شیء علیم۔

اس کی ذات مقدس عین علم ہے، اور اس کا علم اس کی عین ذات ہے، اور اسی بنا پر اس کا علم ازلی و ابدی ہے۔

اس کی پاک ذات ہر جگہ حاضر و موجود ہے "اور تمہاری شہ رگ سے زیادہ قریب ہے" "وہ تو انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے" ان حالات میں تمہارے بیان کی ضرورت نہیں ہے. وہ چھوٹی اور بڑی [illegible] کو اچھی طرح جانتا ہے اور ان کی دل و جان کی گہرائیوں سے واقف ہے، یہاں تک کہ ان کے ایمان کی شدت و ضعف کے درجات بھی جو بعض اوقات خود ان سے بھی پوشیدہ ہوتے ہیں، اس کے نزدیک واضح و روشن ہیں، ان حالات میں خدا کو اپنے ایمان سے باخبر کرنے پر اصرار کیوں کرتے ہو؟

اس کے بعد پھر دوبارہ بدوعربوں کی گفتگو کی طرف لوٹتا ہے جو اپنے اسلام لانے کو پیغمبر پر احسان جتانے کے لیے کہتے تھے: "ہم تو آپ کے پاس تسلیم کے دروازے سے آئے ہیں، جبکہ بہت سے قبائل عرب جنگ کے دروازے سے آئے ہیں۔"

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: "وہ تجھ پر احسان جتلاتے ہیں کہ وہ اسلام لائے ہیں (یمنون علیک ان

۱۔ "مجمع البیان"، "المیزان"، "روح البیان" و "تفسیر قرطبی"۔

اسی طرح عبادات واطاعات میں سے ہر ایک تکامل وارتقار کی طرف ایک قدم ہے ، یہ قلب کو صفا بخشتا ہے ، شہوات پر کنٹرول کرتا ہے ، رُوح اخلاص کو تقویت دیتا ہے ، اور اسلامی معاشرے کو وحدت اتحاد ، قوت اور عظمت عطا کرتا ہے۔

ان میں سے ہر ایک ، ایک عظیم تربیتی کلاس ہے ، اور ایک اصلاحی درس ہے۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں انسان پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ ہر صبح شام نعمت ایمان کا شکر بجالائے ، اور ہر نماز اور ہر عبادت کے بعد سر سجدہ میں رکھے ، اور خدا کی اس ساری توفیق پر شکر ادا کرے۔

اگر خدا پر ایمان اور اس کی اطاعت کے بارے میں انسان کی نظر اور سوچ اس قسم کی ہو تو پھر نہ صرف یہ کہ وہ اپنے آپ کو طلبگار نہیں سمجھتا ، بلکہ ہمیشہ خدا و پیغمبر کا "مدیون" (مقروض) اور خود کو احسانوں تلے دبا ہوا محسوس کرتا ہے۔

عبادات کو عاشقانہ انجام دیتا ہے ، اور اس کی اطاعت کی راہ میں نہ صرف پاؤں کے ساتھ بلکہ سر کے بل دوڑتا ہے اور اگر خدا اس کے اس عمل کی کوئی جزا دیتا ہے تو وہ اس کو بھی اس کا ایک دوسرا لطف و کرم سمجھتا ہے ، ورنہ نیک کاموں کے انجام دینے کا فائدہ تو خود انسان ہی کی طرف لوٹتا ہے ۔ اور درحقیقت اس توفیق کے ساتھ ساتھ خدا کی طرف سے اس کے قرضوں کی میزان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

اس بنار پر اس کی ہدایت لطف ہے ، اور اس کے پیغمبر کی دعوت ایک اور لطف ہے ، اور اطاعت وفرمانبرداری کی توفیق ایک مزید لطف ، اور اجر و ثواب ایک اور لطف بالائے لطف ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں ، جو سورہ "حجرات" کا اختتام ہے ، دوبارہ اسی چیز کی جو گذشتہ آیت میں آئی ہے ، تاکید کرتا ہے ، اور فرماتا ہے : " خدا آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہے اور جو عمل بھی تم انجام دیتے ہو ، انہیں دیکھتا ہے "

(ان الله یعلم غیب السماوات والارض والله بصیر بما تعملون)۔

تم اس بات پر اصرار نہ کرو کہ تم حتمی اور یقینی طور پر مومن ہو ، اور قسم کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ، وہ تمہارے دل کے زاویوں اور گوشوں کی خبر رکھتا ہے ، اور جو کچھ اس میں گزرتا ہے ، وہ اس سے مکمل طور پر آگاہ ہے ، وہ زمین کی گہرائیوں اور اعماق کے اسرار اور آسمانوں کے غیوب سے آگاہ ہے ، اس بنار پر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے دلوں کے اندر سے بے خبر ہو؟

خداوندا ! تو نے ہم پر احسان کیا ہے ، اور ہمارے دل میں ایمان کا نور روشن کیا ہے ، تجھے ہدایت کی عظیم نعمت کی قسم ، ہمیں اس راستہ پر ثابت قدم رکھ ، اور تکامل وارتقار کی راہ میں ہماری رہبری فرما۔

خداوندا ! تو ہمارے دل کی گہرائیوں سے آگاہ ہے ، ہماری نیتوں کو اچھی طرح جانتا ہے ، ہمارے عیوب کو اپنے بندوں سے پوشیدہ رکھ ، اور اپنے فضل و کرم سے ہماری اصلاح فرما۔

بار الٰہا ! ہمیں توفیق اور ایسی قدرت عطا فرما کہ ہم ان عظیم اخلاقی قدروں کو جو تو نے اس پر عظمت سورہ میں بیان فرمائی ہیں ، اپنے وجود کے اندر زندہ کریں ، اور ان کے احترام کی پاسداری کریں۔

آمین یا رب العالمین۔

سورۂ حجرات کا اختتام

اول محرم سال ۱۴۰۶ ھ

۲۶/ ۶/ ۶۴

اختتام ترجمہ ۱۴۰۶ ہجری

۶، ماہ مبارک رمضان بوقت بارہ بجے دوپہر بر مکان حقیر قم المقدسہ کوئی جمشیدی محل سلطان محمد شریف، جمہوری اسلامی ایران۔

احقر

سید صفدر حسین نجفی

دوم محرم الحرام ۱۴۰۶

سورۂ "ق"
کے
مطالب و مضامین

اس سورہ کے مباحث کا محور مسئلہ "معاد" ہے، اور تقریباً اس کی تمام آیات اسی محور کے گرد گھومتی ہیں، اور اس میں دوسرے مسائل ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔

معاد سے مربوط مسائل میں امور ذیل بیان کیے گئے ہیں۔

۱۔ کفار کی طرف سے معاد سے انکار اور تعجب (معاد جسمانی سے)۔

۲۔ مسئلہ معاد پر نظام آفرینش کی طرف توجہ دلانے کے طریق سے استدلال، خصوصاً مردہ زمینوں کا بارش کے نزول کے ذریعہ زندہ ہونا۔

۳۔ [illegible] کی خلقت کی طرف توجہ دلانے کے طریقے سے استدلال۔

۴۔ "یوم الحساب" کے لیے ثبت اعمال کے مسئلہ کی طرف اشارہ اور اس کے لیے اقوال۔

۵۔ موت سے مربوط مسائل، اور اس جہان سے دوسرے گھر کی طرف انتقال،

۶۔ روزِ قیامت کے حوادث کا ایک گوشہ، اور جنت و دوزخ کے اوصاف۔

۷۔ اختتام جہان کے ہلا دینے والے حوادث کی طرف اشارہ، جو دوسرے جہان کے لیے ایک سرآغاز ہیں۔

اس کے ضمن میں گذشتہ اقوام کی وضع و کیفیت ان کی دردناک اور شوم سرنوشت کی طرف مختصر اور مؤثر اشارے ہیں۔ (جیسے قوم فرعون، عاد، لوط، شعیب اور تبع کی سرنوشت) نیز خدا کی طرف توجہ اور اس کے ذکر کے سلسلہ میں پیغمبر اسلام کو کچھ احکام دیے گئے ہیں، اور سورہ کے آغاز اور اختتام پر عظمت قرآن کے بارے میں ایک مختصر سا اشارہ کیا گیا ہے۔

سورہ "ق" کی تلاوت کی فضیلت

روایات اسلامی سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اس سورہ کو بہت اہمیت دیتے تھے، یہاں تک کہ ہر جمعہ کے دن نماز

جمعہ کے خطبہ میں اس کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔[1]

ایک اور حدیث میں آیا ہے، کہ آپؐ ہر عید اور ہر جمعہ کے دن اس کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔[2]

یہ سب کچھ اس بنا پر ہے کہ جمعہ اور عید کا دن، انسانوں کی بیداری اور آگاہی کا دن ہے، یہ پہلی فطرت کی طرف لوٹنے، اور خدا اور یوم الحساب کی طرف توجہ کرنے کا دن ہے، اور چونکہ اس سورہ کی آیات مسئلہ معاد، موت اور قیامت کے حوادث کو بہت ہی مؤثر طریقہ سے بیان کرتی ہیں، علاوہ ازیں مسائل پر غور و فکر کرنا انسانوں کی بیداری اور تربیت میں عمیق اور گہری تاثیر رکھتا ہے، لہٰذا آنحضرتؐ اس پر خاص توجہ فرماتے تھے۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے اس طرح نقل ہوا ہے:

من قرأ سورة "ق" هون الله عليه تارات الموت وسكراته،

"جو شخص سورۂ "ق" کی تلاوت کرے گا، خداوند عالم اس پر موت کی مشکلات اور سکرات کو آسان کر دے گا"۔[3]

نیز ایک حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے:[4]

"من ادمن فی فرائضه ونوافله سورة "ق" وسع الله فی رزقه واعطاه کتابه بيمينه وحاسبه حسابا يسيرا"

"جو شخص ہمیشہ واجب اور مستحب نمازوں میں سورہ ق کی تلاوت کرتا رہے گا، خدا اس کی روزی میں وسعت پیدا کر دے گا اور اس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دے گا۔ اور قیامت میں اس کا حساب کتاب آسان کر دے گا"۔[4]

یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے، کہ یہ سب افتخار و فضیلت صرف الفاظ کے پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ الفاظ کا پڑھنا تو افکار و نظریات کے بیدار ہونے کا وسیلہ ہے اور وہ عمل صالح اور سورہ کے مطالب کے ساتھ ہم آہنگی کا ایک ذریعہ بھی ہے۔

---

[1] "تفسیر قرطبی" جلد ۹ ص ۶۱۱۸۔

[2] "تفسیر فی ظلال" جلد ۷ ص ۵۴۷۔

[3] "تفسیر مجمع البیان" جلد ۹ ص ۱۴۰

[4] "تفسیر مجمع البیان" جلد ۹ ص ۱۴۰۔

سورۂ ق

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

۱- قٓ ۚ وَالۡقُرۡاٰنِ الۡمَجِيۡدِ ○

۲- بَلۡ عَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَهُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡهُمۡ فَقَالَ الۡكٰفِرُوۡنَ هٰذَا شَىۡءٌ عَجِيۡبٌ ○

۳- ءَاِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجۡعٌۢ بَعِيۡدٌ ○

۴- قَدۡ عَلِمۡنَا مَا تَنۡقُصُ الۡاَرۡضُ مِنۡهُمۡ ۚ وَعِنۡدَنَا كِتٰبٌ حَفِيۡظٌ ○

۵- بَلۡ كَذَّبُوۡا بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ فَهُمۡ فِىۡۤ اَمۡرٍ مَّرِيۡجٍ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ ق، قرآن مجید کی قسم۔

۲۔ انھوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ انہیں کے درمیان میں سے ایک ڈرانے والا پیغمبر آیا ہے، اور کافروں نے یہ کہا: یہ تو ایک عجب چیز ہے۔

۳۔ کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہو جائیں گے، تو دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ یہ بازگشت تو بہت ہی بعید ہے۔

۴۔ لیکن ہم جانتے ہیں جو کچھ زمین ان کے بدن میں سے کم کرتی ہے اور ہمارے پاس

وہ کتاب ہے جس میں ہر چیز محفوظ ہے۔

۵۔ جب حق ان کے پاس آیا تو انھوں نے اس کی تکذیب کی، لہٰذا وہ اپنے پراگندہ کام میں حیران و متحیر ہیں۔

تفسیر

ہٹ دھرم منکرین اپنے کام میں سرگرداں ہیں

یہاں پر ہمیں اس سورہ کی ابتدا میں پھر بعض حروف مقطعہ کا سامنا ہے اور وہ حرف "ق" ہے، اور — جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں — حروف مقطعہ کی ایک قابل توجہ تفسیر یہ ہے

کہ قرآن اپنی عظمت کے باوجود "الف" "با" جیسے ایک عام مادہ سے بنا ہے، اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے، کہ قرآن مجید کا ایجاد کرنے والا اور نازل کرنے والا بے انتہا علم و قدرت کا مالک ہے، جس نے ان عام اور سادہ آلات سے اس قسم کی اعلیٰ ترکیب تخلیق کی ہے۔

البتہ "حروف مقطعات" کے لیے اور دوسری تفسیریں بھی ہیں، جن کا آپ سورۂ "بقرہ"، "آل عمران"، "اعراف" اور "حٰم" کے سوروں کی ابتدا میں مطالعہ کر سکتے ہیں۔

بعض مفسرین نے "ق" کو خدا کے بعض اسمار کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ (جیسے "قادر" و "قیوم")

بہت سی تفسیروں میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ "ق" ایک بہت بڑے پہاڑ کا نام ہے جو پورے کرۂ ارض کو محیط ہے۔ اب یہ بات کہ یہ کونسا پہاڑ ہے جو کرۂ زمین یا سارے جہان کا احاطہ کیے ہوئے ہے؟ اور اس سے کیا مراد ہے؟ یہاں اس پر بحث کا مقام نہیں ہے۔ اس جگہ ہم جس چیز کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ: یہاں "ق" کا "کوہ قاف" کی طرف اشارہ بہت بعید نظر آتا ہے، کیونکہ نہ صرف یہ کہ یہ بات اس سورہ کے مباحث کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی، بلکہ یہاں حرف "ق" ان تمام دوسرے حروف مقطعہ کی طرح ہے جو قرآن کی سورتوں کے ابتدا میں آئے ہیں، علاوہ ازیں اگر اس سے مراد "کوہ قاف" ہوتا، تو اسے "واؤ" قسم کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا۔ "والطور" وغیرہ کی طرح سے، اور ایک لفظ کو ذکر کرنا بغیر مبتدا و خبر کے یا واؤ قسم کے کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر تمام قرآنوں کا "رسم الخط" یہ ہے کہ "ق" مفرد صورت میں لکھا ہوا ہے، حالانکہ "کوہ قاف" کو "قاف" کی صورت میں لکھتے ہیں۔

منجملہ ان امور کے، جو اس بات کی گواہی دیتے ہیں، کہ حروف مقطعات میں سے اس حرف کا ذکر، قرآن کی عظمت کے بیان کے لیے ہے یہ ہے کہ اس کے بعد بلا فاصلہ قرآن مجید کی قسم کھاتے ہوئے فرماتا ہے:۔

"قسم ہے قرآن مجید کی" (والقرآن المجید)۔

مجید: مجد کے مادہ سے: وسیع شرافت کے معنی میں ہے، اور چونکہ قرآن بے انتہا عظمت و شرافت رکھتا ہے لہٰذا اس کے لیے لفظ "مجید" ہر لحاظ سے سزاوار ہے۔ اس کا ظاہر زیبا اور خوبصورت ہے، اس کے مضامین و مطالب عظیم ہیں۔ اس کے احکام اعلیٰ ہیں اور اس کے پروگرام تربیتی اور حیات بخش ہیں۔

اس بارے میں کہ یہ قسم کس مقصد کے لیے ذکر ہوئی ہے اور اصطلاح کے مطابق "مقسم لہ" کیا ہے؟ مفسرین نے بہت سے احتمالات دیئے ہیں لیکن بعد والی آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جوابِ قسم وہی پیغمبر اسلامؐ کی "نبوت" یا موت کے بعد انسانوں کا دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا اور معاد کا مسئلہ ہے[1]

اس کے بعد کفار و مشرکین عرب کے چند بے بنیاد اعتراضات کو بیان کرتے ہوئے، ان میں سے دو اعتراضات کی طرف اشارہ کرتا ہے:

پہلے کہتا ہے: "بلکہ انھوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ ایک ڈرانے والا پیغمبر خود انھیں میں سے آیا ہے، کافروں نے کہا، یہ تو ایک عجیب چیز ہے" (بل عجبوا ان جاءهم منذر منهم فقال الكافرون هٰذا شيء عجيب)۔

یہ ایک ایسا اعتراض ہے کہ قرآن نے بار بار اس کی طرف اور اس کے جواب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس کو بار بار دہرانا، اور اس کی تکرار اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ کفار کے اصل اور بنیادی اعتراضات میں سے تھا، جس کا وہ ہمیشہ تکرار کرتے تھے۔ نہ صرف پیغمبر اسلامؐ پر بلکہ تمام پیغمبروں پر ان کا یہی اعتراض تھا، کبھی کہتے: "ان انتم الا بشر مثلنا تريدون ان تصدونا عما كان يعبد آباؤنا: "تم تو ہم ہی جیسے انسان ہو اور یہ چاہتے ہو کہ ہمیں اس چیز سے جس کی ہمارے آباؤ اجداد پرستش کیا کرتے تھے، باز رکھو" (ابراہیم - ۱۰)

اور کبھی کہتے: "ما هٰذا الا بشر مثلكم يأكل مما تأكلون منه ويشرب مما تشربون: یہ تو تمہاری طرح ہی ایک بشر ہے، جو تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے، اور جو تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔"

(مومنون - ۳۳)

اور کبھی اس بات کا اضافہ کرتے: "لولا انزل اليه ملك فيكون معه نذيرًا: اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ نازل ہوا تاکہ وہ اس کے ساتھ مل کر ڈراتا؟"!

(فرقان - ۷)

---

[1] اور تقدیر میں اس طرح ہے: والقرآن المجيد انك رسول الله۔ یا - ان البعث حق۔

لیکن یہ سب حق کو تسلیم نہ کرنے کے لیے بہانے تھے۔

قرآن زیر بحث آیت میں اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیتا، کیونکہ وہ اس کا بارہا جواب دے چکا ہے، کہ اگر بفرض ہم کسی فرشتے کو بھی بھیج دیتے تو اس کو بھی بشر کی صورت میں بھیجتے، یعنی انسان کا رہبر و رہنما صرف انسان ہی ہو سکتا ہے، تاکہ وہ اس کے تمام دردوں، حاجتوں، میلانوں، خواہشوں اور مسائل زندگی سے باخبر ہو اور دوسری طرف سے عملی پہلوؤں سے وہ ان کے لیے نمونہ بن سکے اور وہ یہ نہ کہنے پائیں کہ اگر وہ ہمارا ہم جنس ہوتا تو کبھی بھی پاک و پاکیزہ نہ رہ سکتا، کیونکہ

قاضی ار با ما نشیند بر فشاند دست را
محتسب گر می خورد معذور دارد مست را

اگر قاضی ہمارے ساتھ بیٹھتا تو اپنے ہاتھ کو جھاڑتا رہتا، محتسب اگر شراب پی لیتا تو مست کو معذور سمجھتا۔

لہٰذا اس کے پروگرام صرف اسی کے لیے مفید ہیں نہ کہ نوع بشر کے لیے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس اعتراض کے بعد اور یہ کہ وہ کس طرح نوع بشر سے ہے؟ انہیں ایک دوسرا اعتراض جو پیغمبرؐ کی دعوت کے مضمون پر تھا، وہ ایک ایسے مسئلہ پر تھا جو ان کے لیے ہر لحاظ سے عجیب و غریب تھا، وہ کہتے تھے: "جب ہم مر جائیں گے اور خاک ہو جائیں گے تو کیا پھر زندہ ہو جائیں گے، جیسا کہ وہ کہتا ہے۔ یہ بازگشت تو ایک بعید بات ہے"

(ءاذا متنا وكنا ترابا ذالك رجع بعيد) [1]

بہر حال وہ دوبارہ زندہ ہو جانے کو عقل سے دور ایک مسئلہ خیال کرتے تھے، بلکہ بعض اوقات تو اسے محال سمجھتے تھے، اور اس کے ادعا کو کہنے والے کے جنون کی دلیل قرار دیتے تھے، جیسا کہ سورۂ سبا کی آیت ۷ میں بیان ہوا ہے: وقال الذين كفروا هل ندلكم على رجل ينبئكم اذا مزقتم كل ممزق انكم لفي خلق جديد افترى على الله كذبا ام به جنة، "کافروں نے کہا، آؤ ہم تمہیں ایک ایسا آدمی دکھائیں جو یہ کہتا ہے کہ جب ہم کامل طور سے منتشر اور پراگندہ ہو جائیں گے تو پھر دوبارہ نئے سرے سے زندہ ہو کر لوٹ آئیں گے، کیا اس نے خدا پر بہتان باندھا ہے؟ یا اُسے جنون ہو گیا ہے"؟!

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

صرف یہی ایک مقام نہیں ہے کہ جہاں انھوں نے پیغمبر اسلامؐ پر یہ اعتراض کیا، بلکہ انھوں نے بارہا ہی کہا، اور بارہا اس کا جواب سنا اور پھر ہٹ دھرمی کرتے ہوئے اس کا تکرار کیا،

بہر حال قرآن مجید یہاں چند ایک طریق سے اس کا جواب دیتا ہے۔

سب سے پہلے خدا کے غیر متناہی علم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم جانتے ہیں جو کچھ زمین ان کے

---

[1] "اذا" کا جواب محذوف ہے اور وہ بعد والے جملے سے سمجھ میں آتا ہے، اور تقدیر میں اس طرح ہے: ءاذا متنا وكنا ترابا نرجع ونعود حيا ذالك رجع بعيد"

بدن میں سے کم کرے گی اور ہمارے پاس ایک ایسی کتاب ہے جس میں ہر چیز محفوظ ہے۔ (قد علمنا ما تنقص الارض منھم وعندنا کتاب حفیظ)۔

اگر تمہارا اعتراض اس بنا پر ہے کہ انسان کی ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی، اور اس کا گوشت مٹی ہو جائے گا، اور وہ زمین میں مل جائے گا اور اس کے ذرات، بخارات اور گیسوں میں تبدیل ہو کر، ہوا میں پھیل جائیں گے، تو انہیں کون اکٹھا کرسکتا ہے؟ اور اصلاً کون ایسا ہے جو ان سے باخبر ہو؟

تو اس کا جواب معلوم ہے، وہی خدا جس کا علم تمام اشیاء کا احاطہ کیے ہوئے ہے، وہ ان تمام ذرات کو پہچانتا ہے اور بوقت ضرورت وہ ان سب کو اسی طرح سے جمع کرے گا جس طرح مٹی کے ایک ٹیلے کے درمیان سے مقناطیس کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ لوہے کے بکھرے ہوئے ذرات کو جمع کیا جا سکتا ہے، ہر انسان کے پراگندہ ذرات کی جمع آوری خدا کے لیے اس سے بھی زیادہ آسان ہے۔

اور اگر ان کا اعتراض یہ ہے کہ انسان کے اعمال کا حساب کتاب معاد و قیامت کے لیے کون محفوظ رکھے گا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب لوح محفوظ میں ثبت ہیں اور اصولی طور پر کوئی چیز اس عالم میں گم نہیں ہوتی یہاں تک کہ تمہارے اعمال بھی باقی رہتے ہیں۔ اگرچہ ان کی شکل بدل جاتی ہے۔

"کتاب حفیظ" اس کتاب کے معنی میں ہے جو تمام انسانوں اور ان کے غیر کے اعمال کی محافظ ہے، اور یہ لوح محفوظ کی طرف اشارہ ہے، جس کی تشریح و تفصیل ہم سورۂ رعد کی آیت ۳۹ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں۔ (جلد ۵ تفسیر نمونہ)

اس کے بعد دوسرے جواب کی طرف رخ کرتا ہے جو زیادہ تر نفسیاتی پہلو رکھتا ہے، کہتا ہے، "لیکن جب حق ان کے پاس آیا تو انھوں نے اس کی تکذیب کی" (بل کذبوا بالحق لما جاءھم)۔

یعنی وہ جان بوجھ کر حق کا انکار کرتے ہیں، ورنہ حق کے چہرے پر کوئی گرد و غبار نہیں ہے، اور جیسا کہ بعد والی آیات میں آئے گا۔ وہ اسی دنیا میں خود اپنی آنکھوں سے بار بار معاد کا منظر دیکھتے ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کرتے۔

لہٰذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے، "چونکہ وہ جھٹلانے پر تلے ہوئے ہیں، لہٰذا ہمیشہ الٹی سیدھی ہانکتے ہیں، خود اپنے کام میں حیران ہیں اور الٹے پلٹے کاموں میں گرفتار ہیں" (فھم فی امر مریج)۔

کبھی وہ پیغمبر کو مجنون کہتے ہیں، کبھی کاہن اور کبھی شاعر۔

کبھی کہتے ہیں: اس کی باتیں "اساطیر الاولین" گزشتہ لوگوں کی کہانیاں ہیں۔

کبھی کہتے ہیں: "کوئی بشر اسے تعلیم دیتا ہے"۔

کبھی اس کے کلمات کے نفوذ و اثر کو "جادو" کی ایک قسم کہتے ہیں اور کبھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم بھی اس کے مانند آیات لا سکتے ہیں یہ الٹی سیدھی باتیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ انھوں نے حق کو پہچان تو لیا ہے، لیکن بہانہ بازی میں لگے ہوئے ہیں اس لیے ایک بات پر نہیں ٹکتے۔

"مریج" "مرج" کے مادہ سے (جو مرج کے وزن پر ہے) "مختلط، مشوش اور مشتبہ" امر کے معنی میں ہے، اور اسی لیے اس زمین کو جس میں مختلف قسم کی بکثرت گھاس اگی ہوئی ہو۔ "مرج" (چراگاہ) کہا جاتا ہے۔

۶۔ اَفَلَمْ يَنظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ○

۷۔ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ○

۸۔ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ○

۹۔ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ○

۱۰۔ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ○

۱۱۔ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ○

ترجمہ

۶۔ کیا انھوں نے آسمان کی طرف جو ان کے سر کے اوپر ہے نگاہ نہیں کی کہ ہم نے اس کو کس طرح سے بنایا ہے، اور کس طرح سے ستاروں کے ذریعہ اسے سجایا ہے، اور اس میں کسی قسم کا شگاف اور غیر موزونی نہیں ہے۔

۷۔ اور ہم نے ہی زمین کو پھیلایا ہے، اور اس میں بڑے بڑے پہاڑ قائم کیے ہیں، اور ہر قسم کی لہلہاتی ہوئی گھاس اس میں اُگا دی ہے۔

۸۔ تاکہ ہر توبہ کرنے والے بندے کے لیے بصیرت اور بیداری کا وسیلہ اور ذریعہ ہو۔

۹ اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی نازل کیا ۔ اور اس کے ذریعہ باغات اور ان دانوں کو اگایا جنہیں کاٹ کر تیار کیا جاتا ہے ۔

۱۰ اور بلند قامت کھجوروں کے درخت ، جن کے پھل ایک دوسرے پر تہ بہ تہ لگے ہوئے ہوتے ہیں

۱۱ یہ سب کچھ بندوں کو روزی دینے کے لیے ، اور ہم نے بارش کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کیا ہے ، ہاں ! مُردوں کو زندہ کرنا بھی اسی طرح ہے ۔

تفسیر

ایک لمحہ کے لیے آسمان کی طرف دیکھو

یہ آیات ، اسی طرح سے " معاد کے دلائل " کو پیش کر رہی ہیں ، کبھی " حق تعالیٰ کی غیر متناہی قدرت کے " طریقہ سے اور کبھی " اس دنیا میں معاد کے مناظر سے وجود سے مدد لیتی ہیں ،

سب سے پہلے منکرین کو ، آسمانوں کی خلقت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتا ہے ، " کیا انھوں نے اپنے سر کے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا ، کہ ہم نے اسے کس طرح سے بنایا ہے ، جس میں کوئی ستون اور پائے نہیں ہیں ۔ اور کس طرح سے ہم نے اُسے ستاروں کے ذریعہ سے سجایا ہے جبکہ اس میں کوئی شگاف اور غیر موزونیت نہیں ہے " (افلم ینظروا الی السماء فوقھم کیف بنیناھا وزیناھا ومالھا من فروج)۔

یہاں دیکھنے سے مراد غور و فکر اور سوچ بچار کے ساتھ دیکھنا ہے جو انسان کو اس وسیع و عریض آسمان اور اس کے عجائبات کے خالق کی عظیم قدرت سے آشنا کرتا ہے ، جو خیرہ کرنے والی عظمت بھی رکھتا ہے اور بہت زیادہ زیبائیاں بھی اور استحکام و نظم و حساب بھی ۔

ومالھا من فروج (اس میں کوئی شگاف نہیں ہے) کا جملہ یا تو نقص و عیب اور غیر موزونیت کے نہ ہونے کے معنی میں ہے ۔

جیسا کہ بعض مفسرین نے بیان کیا ہے ـــــ یا خاص طور پر اس آسمان میں شگاف نہ ہونے کے معنی میں ہے جو اطراف

زمین کو احاطہ کیے ہوئے ہے اور جسے فضائے زمین کہا جاتا ہے، اور قرآن کے قول کے مطابق وہ (ایک محفوظ چھت) ہے (انبیاء ۳۲) جو ان آسمانی پتھروں کو، جو مسلسل اور تیزی کے ساتھ زمین کی طرف آتے ہیں، روکے ہوئے ہے اور سطح زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی انھیں جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، اور اسی طرح نقصان دہ کیہانی شعاعوں سے بھی بچاتی ہے۔

ورنہ ستاروں کی جگہ کے معنی میں جو آسمان ہے، وہ تو ایک خالی فضا ہے، جس میں یہ سیارے اور کُرے تیر رہے ہیں۔

یہاں ایک تیسرا احتمال بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اوپر والا جملہ "ایتھر" کے نظریہ کی طرف اشارہ ہو، اس نظریہ کے مطابق تمام عالم ہستی اور ستاروں کا درمیانی فاصلہ ایک بے رنگ و بے وزن "ایتھر" نامی مادہ سے پُر ہے، جو نور و روشنی کی لہروں کو اٹھائے ہوئے ہے اور اُسے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتا ہے، اس نظریہ کے مطابق تمام عالم ہستی میں کوئی شگاف یا سوراخ نہیں ہے۔ اور ثوابت اور سیارے "ایتھر" کے اندر تیر رہے ہیں۔

البتہ یہ تینوں تفاسیر ایک دوسرے کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتیں، اگرچہ تیسری تعبیر جس کا تکیہ "ایتھر" کے مفروضے پر ہے قابلِ اعتماد نہیں ہے، کیونکہ "ایتھر" کا موضوع ماہرین کی نظر میں ابھی تک قطعی و یقینی طور پر ثابت نہیں ہوا ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭

اس کے بعد زمین کی خلقت کی عظمت کو پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے، "اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس میں بڑے بڑے پہاڑ قائم کیے، اور اس میں طرح طرح اور قسم قسم کی ہری بھری لہلہاتی ہوئی گھاس اگائی" (والارض مددناها والقينا فيها رواسي وانبتنا فيها من كل زوج بهيج)۔

ہاں زمین کی پیدائش ایک طرف، اس کا پھیلاؤ (پانی کے نیچے سے باہر آنا) دوسری طرف، پہاڑوں کا پیدا ہونا، جن کی جڑیں ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں، اور وہ زرہ کی طرح زمین کو اندرونی اور بیرونی دباؤ سے اور چاند اور سورج کی کشش سے پیدا ہونے والے مد و جزر سے محفوظ رکھتے ہیں، تیسری طرف انواع و اقسام کے گھاس ان تمام عجائب اور خوبصورتیوں کے ساتھ، چوتھی طرف، یہ سب کے سب اس کی بے پایاں قدرت کی دلیل ہیں۔[1]

"من كل زوج" کی تعبیر عالم گیاہ و نباتات میں مسئلہ زوجیت کی طرف اشارہ ہے، جو ان آیات کے نزول کے موقع پر ہرگز ایک اصل کلی کے عنوان سے ظاہر نہیں ہوا تھا، اور علم و دانش بشر نے کئی صدیوں کے بعد اس کے رُخ سے پردہ اٹھایا ہے، اور یا یہ گھاس اور نباتات کے مختلف اصناف و انواع کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ عالم گیاہ و نباتات میں زیادہ فوق العادہ اور حیرت انگیز تنوع پایا جاتا ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں نتیجہ نکالتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے ان سب کو ان بندوں کی بصیرت اور بیداری کے لیے خلق

---

[1] ہم پہاڑوں کی خلقت کے بارے میں، اسی طرح زمین کے بچھانے اور پھیلانے کے سلسلہ میں اور عالم گیاہ کی زوجیت کے متعلق تفصیلی بحث سورۂ رعد کی آیت ۳ کے ذیل میں جلد ۱۰ ص ..... سے آگے بیان کر چکے ہیں۔

کیا ہے، جو یہ چاہتے ہیں کہ ہماری طرف لوٹ آئیں اور حق کو پالیں (تبصرة وذکرٰی لکل عبد منیب)۔[1]

ہاں! وہ ذات، جو آسمانوں کو اتنا عظیم اور خوبصورت، اور زمین کو اتنا پُرنعمت و جمال و نظم و حساب کے ساتھ پیدا کرنے پر قدرت رکھتی ہے، تو وہ مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر کیوں قادر نہ ہوگی، اور قیامت کیوں برپا نہ کرسکے گی؟ کیا یہ عظیم خیرہ کر دینے والی قدرت امکانِ معاد پر واضح دلیل نہیں ہے!

بعد والی آیت میں ایک دوسرے استدلال کی بنیاد رکھتے ہوئے کہتا ہے: "اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی نازل کیا ہے، اور اس کے ذریعہ باغات اور ان دانوں کو اگاتے ہیں، جنہیں کاٹا جاتا ہے" (ونزلنا من السماء ماء مبارکًا فانبتنا بہ جنات وحب الحصید)۔

"جنات" یہاں پھل دار باغات کی طرف اشارہ ہے، اور "حب الحصید" (ایسے دانے جن کو کاٹ کر تیار کیا جاتا) ایسے دانوں کی طرف اشارہ ہے، جیسے جو، گندم، اور ان کے مانند دوسرے غلے جن سے انسانوں کی غذا کے اصلی مواد کو تیار کیا جاتا ہے۔

⁂

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور اسی طرح کھجور کے ایسے بلند قامت درخت جن کے پھل اوپر نیچے سلے ہوئے ہوتے ہیں" (والنخل باسقات لھا طلع نضید)۔

"باسقات" جمع ہے "باسقہ" کی جو مرتفع اور بلند کے معنی میں ہے، اور "طلع" کھجور کے درخت کے پھل پر جب وہ ظاہر ہونے لگتا ہے بولا جاتا ہے،

اور "نضید" کا معنی متراکم اور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں، خصوصاً کھجور کے درخت کے خوشے جس وقت غلاف کے اندر ہوتے ہیں تو پورے طور پر ایک دوسرے پر سوار اور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور جس وقت غلاف سے باہر آتے ہیں تو بہت ہی تعجب خیز ہوتے ہیں۔

آخر میں کہتا ہے: "ہم نے ان سب کو بندوں کو روزی دینے کے لیے خلق کیا ہے، اور بارش کے ان حیات بخش قطرات سے ہم نے مردہ زمینوں کو زندگی بخشی ہے، ہاں! مردوں کا زندہ ہونا اور ان کا قبروں سے باہر نکلنا بھی اسی طرح ہے" (رزقًا للعباد واحیینا بہ بلدة میتًا کذالک الخروج)۔[2]

اور اس طرح سے وہ بندوں پر اپنی عظیم نعمتوں کی یاد آوری کے ضمن میں اس کی شناخت کی راہ میں، ان کی شکر گزاری

---

[1] "تبصرة" "مفعول لہ" بھی ہو سکتا ہے اور "مفعول مطلق" بھی لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے "ذکرٰی" بھی اسی پر عطف ہے اور وہی معنی دیتا ہے۔

[2] دوسری آیات میں بھی اس سلسلہ میں بحث ہو چکی ہے۔ (اسی تفسیر کی جلد ۱۰ سورۂ فاطر کی آیت ۹ کے ذیل میں جلد میں سورۂ یٰس کی آخری آیات کے ذیل میں رجوع فرمائیں۔

کی حس کو تحریک کرتے ہوئے، انھیں یاد دلاتا ہے کہ تم معاد کا نمونہ ہر سال اپنی آنکھوں کے سامنے اسی جہان میں دیکھتے ہو۔ کہ مردہ و خشک زمینیں جو ہر قسم کے آثار زندگی سے خالی ہوتی ہیں، بارش کے قطروں کے نزول کے زیر اثر حرکت میں آجاتی ہیں اور قیامت کا شور وغل برپا کر دیتی ہیں اور ہر گوشہ و کنار سے گھاس اُگنے لگتی ہے اور "وحدہ لا شریک لہ" کہتی ہے۔

یہ عظیم جنبش اور عالم نباتات و گیاہ میں حیات و زندگی کی طرف حرکت اس واقعیت کو بیان کرتی ہے کہ آفریدگار عالم مردہ موجودات کو دوبارہ زندگی عطا کر سکتا ہے، کیونکہ کسی چیز کا واقع ہونا، اس کے "امکان" کی سب سے قوی دلیل ہے۔

۱۲۔ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّأَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُودُ ۝

۱۳۔ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَإِخْوَانُ لُوطٍ ۝

۱۴۔ وَّأَصْحٰبُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۚ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيدِ ۝

۱۵۔ أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ۚ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ۝

ترجمہ

۱۲۔ اُن سے پہلے قوم نوح اور اصحاب الرس (وہ قوم جو یمامہ میں رہتی تھی، اور اُن کی طرف ایک پیغمبر آیا تھا، جس کا نام حنظلہ تھا) اور قوم ثمود نے بھی (اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی تھی۔

۱۳۔ اور اسی طرح قوم عاد اور فرعون اور قوم لوط۔

۱۴۔ اور اصحاب الایکہ (قوم شعیب) اور قوم تبع (جو سرزمین یمن میں رہتی تھی) ان میں سے ہر ایک نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کی تکذیب کی، اور عذاب کا وعدہ ان کے بارے میں پورا ہو کر رہا۔

۱۵۔ کیا ہم پہلی خلقت سے عاجز آگئے ہیں۔ (کہ معاد کی خلقت پر قادر نہ ہوں) لیکن وہ (ان تمام واضح و روشن دلائل کے باوجود) پھر بھی نئی خلقت میں شک و تردید رکھتے ہیں۔

تفسیر

صرف تم ہی نہیں ہو جس کا دشمن سے مقابلہ ہے؟

یہ آیات اسی طرح معاد وقیامت سے مربوط مباحث کو مختلف طریقوں سے بیان کر رہی ہیں۔

پہلے پیغمبرؐ کی دل داری کے لیے فرماتا ہے، "صرف تو ہی نہیں ہے کہ اس کافر گروہ نے تیری تکذیب کی ہے، اور تیری دعوت کے مطالب کو جھٹلایا ہے خصوصاً معاد کے بارے میں" ان سے پہلے قوم نوح اور اصحاب الرس اور قوم ثمود نے بھی اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی تھی" (کذبت قبلھم قوم نوح و اصحاب الرس وثمود)۔

"قوم ثمود" وہی خدا کے عظیم پیغمبر صالحؑ کی قوم ہے، جو حجاز کے شمال میں "حجر" کی سرزمین میں رہتی تھی، اور "اصحاب الرس" کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بہت سو کا نظریہ، یہ ہے کہ وہ ایک قبیلہ تھا جو سرزمین یمامہ میں رہتا تھا اور ان کے پیغمبر کا نام حنظلہ تھا، انہوں نے اس کی تکذیب کی اور آخر کار اُسے کنویں میں پھینک دیا (اس بات پر توجہ رہے کہ "رس" کا ایک معنی کنواں ہے) اور اس کا دوسرا معنی وہ مختصر اثر ہے جو کسی چیز کا باقی رہ جائے، کیونکہ اس قوم کے بہت کم اثرات تاریخ میں باقی رہ گئے ہیں)

بعض دوسرے اُسے شعیب کی قوم سمجھتے ہیں، کیونکہ ان کے پانی کے بہت زیادہ کنویں تھے، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "اصحاب الایکہ" جو بعد والی آیت میں آیا ہے وہ اس قوم شعیب کی طرف اشارہ ہے، لہٰذا اس احتمال کی نفی ہو جاتی ہے۔

بعض انہیں قوم ثمود کے بقایا میں سے جانتے ہیں، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ زیر بحث آیات میں "ثمود" جداگانہ طور پر آیا ہے۔ لہٰذا یہ معنی بھی بعید نظر آتا ہے۔ اس بنا پر مناسب وہی پہلی تفسیر ہے، جس کی مفسرین کے درمیان عام شہرت ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "طائفہ عاد، قوم فرعون اور لوطؑ کے بھائیوں نے بھی" (وعاد و فرعون و اخوان لوط)۔

لوطؑ کے بھائیوں سے مراد وہی قوم لوطؑ ہے، کیونکہ قرآن نے ان عظیم پیغمبروں کو بھائی کے عنوان سے یاد کیا ہے۔

"اور اصحاب الایکہ اور قوم تبع نے بھی"۔ (واصحاب الایکۃ وقوم تبع)۔

"ایکہ" بہت زیادہ اور گھنے درختوں کے معنوں میں ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں جنگل کے مشابہ ہے، اور

اصحاب الایکہ قوم شعیب کا ایک گروہ ہے، جو شہر "مدین" کے علاوہ کسی اور جگہ رہتا تھا، کسی ایسے شہر میں جس میں بہت زیادہ درخت تھے۔[1]

اور "قوم تبع" سے مراد یمن کے لوگوں کا ایک گروہ ہے "تبع" یمن کے بادشاہوں کا لقب ہے، کیونکہ لوگ ان کی اتباع اور پیروی کیا کرتے تھے، اور یہاں پر قرآن کی ظاہری تعبیر اور ایک اور دوسری آیت میں (۳۷۔ دخان) یمن کا ایک خاص بادشاہ ہے جس کا نام بعض روایات میں "اسعد ابوکرب" ذکر ہوا ہے، اور ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ وہ ایک مومن آدمی تھا، اور لوگوں کو انبیاء کی دعوت کی پیروی کی طرف بلاتا تھا، اگرچہ لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔[2]

اس کے بعد ان آٹھوں اقوام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے "ان میں سے ہر ایک نے خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کی تکذیب کی اور ان کے بارے میں خدا کے عذاب کا وعدہ پورا ہو کر رہا" (کل کذب الرسل فحق وعید)۔

یہ جو کہتا ہے: انہوں نے "خدا کے رسولوں" کی تکذیب کی۔ حالانکہ ہر ایک نے صرف اپنے پیغمبر کی تکذیب کی، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو عمل ان سے سرزد ہوا وہ مجموعی طور پر تمام انبیاء کی تکذیب تھی، اگرچہ ہر ایک نے ایک ایک پیغمبر کی تکذیب کی تھی۔

اور یا یہ اس وجہ سے ہے کہ ایک پیغمبر کی تکذیب بقیہ کی تکذیب بھی شمار ہوتی ہے، کیونکہ سب کی دعوت کا مطلب اور مفہوم ایک ہی ہے۔

بہرحال ان اقوام نے اپنے پیغمبروں کی بھی تکذیب کی اور مسئلہ توحید و معاد کی بھی، اور انجام کار دردناک عذاب میں گرفتار ہوئے۔ بعض طوفان میں گرفتار ہوئے، بعض سیلاب میں بعض دوسرے صاعقہ اور آسمانی بجلی میں، بعض زلزلہ میں، یا ان کے علاوہ دوسری چیزوں میں، اور انجام کار انہوں نے تکذیب کا تلخ پھل چکھا۔

لہٰذا تم مطمئن رہو اگر یہ کافر قوم بھی جو تمہارے مقابلہ میں کھڑی ہے اسی حالت میں رہی تو ان کی سرنوشت بھی ان سے بہتر نہیں ہوگی۔

اس کے بعد امکان قیامت کے دلائل میں سے ایک اور کو ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا ہم پہلی خلقت سے تھک ہار کر عاجز آ گئے ہیں کہ اب دوسری خلقت اور قیامت پر قدرت حاصل نہ ہو؟" (افعیینا بالخلق الاول)۔[3]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: انھیں پہلی پیدائش کے بارے میں تو کوئی شک نہیں ہے، کیونکہ وہ خدا کو ہی انسانوں کا خالق سمجھتے ہیں "لیکن وہ ان واضح دلائل کے باوجود نئی پیدائش اور قیامت کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں" (بل ھم فی لبس من خلق جدید)۔

درحقیقت وہ خواہشات نفسانی، تعصب اور ہٹ دھرمی کی بنا پر تناقض میں گرفتار ہیں، ایک طرف تو یہ سمجھتے ہیں

---

[1] مزید وضاحت کے لیے جلد ۶ سورۂ حجر کی آیت ۷۸ اور جلد ۸ اور سورۂ شعراء کی آیت ۱۷۶ کی طرف رجوع کریں۔

[2] قوم تبع کے بارے میں مزید تشریح کے لیے جلد ۱۲ (سورۂ دخان کی آیت ۳۷ کے ذیل میں) مطالعہ کریں۔

[3] اوپر والے جملہ میں ایک محذوف ہے، اور تقدیر یوں اس طرح ہے: افعیینا بالخلق الاول حتی نعجز عن الثانی: کیا ہم پہلی خلقت سے عاجز تھے کہ دوسری سے عاجز ہوں گے؟

کہ خدا نے ہی انسانوں کو خلق کیا ہے اور انھیں سب کو مٹی سے پیدا کیا ہے. لیکن دوسری طرف جب انسانوں کی مٹی سے جدید خلقت کے مسئلہ تک پہنچتے ہیں، تو اس کو عجیب و غریب اور باور نہ ہونے والا مسئلہ شمار کرتے ہیں، حالانکہ دونوں ایک ہی جیسے ہیں: "وحکم الامثال فی مایجوز و فی مالا یجوز واحد"۔

اس طرح سے ان آیات میں اور گذشتہ آیات میں چار مختلف طریقوں سے مسئلہ معاد پر استدلال کرتا ہے، "علم خدا کے طریق سے اس کی قدرت کے طریقے سے، اس کے بعد عالم گیاہ میں معاد کے مناظر کی تکرار کے طریقہ سے اور انجام کار پہلی خلقت کی طرف توجہ کرنے کے طریقے سے۔

اور جب ہم معاد کے سلسلہ میں قرآن کی دوسری آیات کی طرف توجہ کرتے ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہی دلائل دوسرے دلائل کے اضافہ کے ساتھ الگ الگ مختلف آیات میں آئے ہیں اور قرآن نے اپنی طاقتور منطق اور پرکشش، سادہ، آسان اور قاطع تعبیروں کے ساتھ منکرین کے سامنے معاد جسمانی کے مسئلہ کو بہترین طریقہ پر ثابت کیا ہے، کہ اگر وہ اپنے آپ کو پہلے سے کیے ہوئے فیصلوں تعصب، ہٹ دھرمی، اور اندھی تقلید سے بچا لیتے تو وہ بہت جلد اس واقعیت کو تسلیم کر لیتے، اور یہ جان لیتے کہ قیامت و معاد کوئی پیچیدہ چیز نہیں ہے۔

۱۶۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚۖ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ○

۱۷۔ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ○

۱۸۔ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ○

ترجمہ

۱۶۔ ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے، اور ہم اس کے نفس کے وسوسوں کو جانتے ہیں، اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔

۱۷۔ اس وقت کو یاد کرو جب انسان کے ساتھ رہنے والے دونوں فرشتے دائیں اور بائیں طرف سے، اس کے اعمال کو لکھتے ہیں۔

۱۸ انسان کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا، مگر اس کے پاس ہی ایک نگران فرشتہ اپنے کام کو انجام دینے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔

تفسیر

تمھاری چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی وہ لکھتے ہیں

ان آیات میں معاد سے مربوط مسائل کے ایک اور حصّہ کو بیان کیا جارہا ہے۔ اور وہ روزِ حساب کے لیے انسانوں کے اعمال کے ثبت و ضبط کا مسئلہ ہے۔

سب سے پہلے خدا کے لئے تقدیر اور انسانوں پر اس کے علمی احاطہ کی بات کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم نے انسان کو خلق کیا ہے اور ہم اس کے نفس کے وسوسوں کو جانتے ہیں" (ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس بہ نفسہ)۔

"توسوس" "وسوسہ" کے مادہ سے مفردات میں راغب کے کہنے کے مطابق ایسے غیر مطلوب افکار کے معنی میں ہے جو انسان کے دل میں گزرتے ہیں، اور اس کی اصل لفظ "وسواس" سے لی گئی ہے، جو آلات زینت کی صدا اور اسی طرح مخفی پیغام و صدا کے معنی میں ہے۔

یہاں پر اس سے مراد یہ ہے کہ جب خدا دل میں گزرنے والے خیالوں اور ان جلدی گزر جانے والے وسوسوں سے جو اس کی فکر سے گزرتے ہیں، آگاہ ہے، تو وہ یقینی طور پر ان کے تمام عقائد و اعمال و گفتار سے بھی باخبر ہے۔ اور روز حساب کے لیے سب کے حساب و کتاب پر نظر رکھتا ہے۔

"ولقد خلقنا الانسان" کا جملہ ممکن ہے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو، کہ خالق بشر سے محال ہے کہ وہ اس کے وجود کے جزئیات سے بے خبر ہو، اور وہ خلقت بھی ایسی جو ہمیشہ کے لیے جاری ہے، کیونکہ خدا کی طرف سے ممکنات تک فیض وجود پہنچتا رہتا ہے، کہ اگر ایک لحہ کے لیے بھی ہمارا رابطہ اس سے منقطع ہو جائے تو ہم سب ختم ہو جائیں، جیسا کہ سورج کی روشنی اس منبع فیض بخش یعنی کرۂ آفتاب سے لحہ بہ لحہ جدا ہوتی اور فضا میں پھیلتی رہتی ہے، (بلکہ ــ جیسا کہ ہم بیان کریں گے، ہمارا اس کی ذات مقدس کے ساتھ ارتباط اس سے بھی زیادہ بالاتر ہے)

ہاں! وہ خالق ہے، اور اس کی خلقت دائم و مستمر، اور ہم تمام حالات میں اس کے وجود کے ساتھ وابستہ ہیں، ان حالات میں کس طرح ممکن ہے کہ وہ ہمارے ظاہر و باطن سے بے خبر ہو۔

اور آیت کے ذیل میں اس مطلب کو زیادہ واضح کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: "ہم تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں" (ونحن اقرب الیہ من حبل الورید)

کتنی عمدہ و بلا دینے والی تعبیر ہے، ہماری حیات جسمانی اس رگ کے ساتھ وابستہ ہے جو ہمیشہ خون کو ایک طرف سے ہمارے دل میں داخل کرتی ہے، اور دوسری طرف سے خارج کرتی ہے اور تمام اعضاء تک پہنچاتی ہے۔ اگر ایک لحہ کے لیے بھی اس کے عمل میں وقفہ آجائے تو فوراً موت واقع ہو جائے۔

خدا تو ہمارے دل کی رگ سے بھی زیادہ ہمارے نزدیک ہے۔

یہ وہی چیز ہے کہ دوسری جگہ کہتا ہے: "واعلموا ان اللہ یحول بین المرء وقلبہ وانہ الیہ تحشرون": "جان لو کہ خدا انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور تم سب ہی قیامت میں اس کے پاس جمع ہو جاؤ گے" (انفال-۲۴)

البتہ یہ سب کی سب تشبیہ ہیں اور خدا کا قرب اس سے بھی برتر و بالاتر ہے، اگرچہ محسوسات میں اس سے زیادہ بہتر مثال نہیں مل سکتی۔

خدا کے اس احاطہ علمی اور اس کے قبضہ قدرت میں ہونے کی صورت میں، ہماری ذمہ داری واضح و روشن ہے، نہ تو ہمارے اعمال و گفتار ہی اس سے پنہاں ہیں، اور نہ ہی افکار و نیات اور نہ وہ وسوسے تک جو ہمارے دل میں گزرتے ہیں۔

اس واقعیت کی طرف توجہ، انسان کو بیدار کرتی ہے، اور دادگاہ عدل الٰہی میں، اس کی سنگین بازپرس، اور دقیق اعمال نامے سے اُسے آشنا کرتی ہے اور ایک بے خبر اور لاپرواہ انسان سے اُسے ایک ہوشیار صحیح راستہ پر، قابل اعتماد اور با تقویٰ انسان بناتی ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن "ابوحنیفہ" نے امام صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے آپ کے فرزند "موسیٰؑ" کو دیکھا ہے، وہ نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ ان کے سامنے سے گزر رہے تھے، اور وہ انھیں منع نہیں کرتے تھے، حالانکہ یہ کام درست نہیں ہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا، میرے بیٹے "موسیٰ" کو بلاؤ حضرت کو بلایا گیا، تو امام صادقؑ نے ابوحنیفہ کی بات اپنے بیٹے سے بیان کی، آپؑ نے جواب میں فرمایا، اے بابا جان:

"ان الذی کنت اصلی لہ کان اقرب الی منھم، یقول اللہ عزوجل و نحن اقرب الیہ من حبل الورید!"

"میں جس کی نماز پڑھ رہا تھا، وہ ان کی نسبت مجھ سے زیادہ قریب تھا، جیسا کہ خداوند متعال فرماتا ہے: ہم انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں، امام صادقؑ نے انھیں اپنی آغوش میں لیا اور فرمایا:

"بابی انت و امی یا مستودع الاسرار!"

"میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں، اے وہ کہ اسرار الٰہی جس کے دل میں ودیعت کئے گئے ہیں"۔[1]

مفسرین اور ارباب لغت نے "ورید" کے معنی کے سلسلہ میں گوناگوں تفاسیر بیان کی ہیں، ایک گروہ کا نظریہ تو یہ ہے کہ ورید وہی رگ ہے کہ جو انسان کے دل یا جگر کے ساتھ ملی ہوئی ہے، اور بعض اُسے ان تمام رگوں کے معنی میں سمجھتے ہیں جو تن کے بدن سے گزرتی ہیں، جبکہ بعض دوسروں نے اس کی رگ گردن کے ساتھ تفسیر کی ہے، اور کبھی اس کو "وریدان" کہتے ہیں، یعنی گردن کی دونوں رگیں۔

لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے، خصوصاً سورۂ انفال کی آیت ۲۴ کی طرف توجہ رکھتے ہوئے، جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

ضمنی طور پر یہ لفظ "ورید" اصل میں لفظ "ورود" سے جو پانی کی تلاش میں جانے کے معنی میں ہے، لیا گیا ہے اور چونکہ خون اس رگ کے ذریعہ دل میں داخل ہوتا ہے، یا دوسرے اعضاء میں وارد ہوتا ہے، لہٰذا اس کو "ورید" کہا جاتا ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہیئے، کہ موجودہ زمانہ کی متداول اصطلاح "ورید" اور "شریان" سے مختلف اصطلاح

---

[1] نورالثقلین جلد ۵ صفحہ ۱۰۱۔

وہ رگیں جو خون کو تمام اعضاء سے دل کی طرف لے جاتی ہیں، اور وہ رگیں جو خون کو دل سے اعضاء کی طرف پہنچاتی ہیں، علم زیست شناسی کے ساتھ مخصوص اصطلاح ہے، اور وہ اس لفظ کے لغوی معنی کے ساتھ کوئی ربط نہیں رکھتی۔

٭ ٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے، "اس وقت کو یاد کرو، جب وہ دونوں فرشتے، جو انسان کی دائیں اور بائیں طرف نگرانی پر مامور ہیں، اس کے اعمال کو ضبط تحریر میں لاتے ہیں" (اذ یتلقی المتلقیان عن الیمین وعن الشمال قعید)۔[1]

یعنی انسان کے ظاہر و باطن پر خداوند عالم کے احاطہ علمی کے علاوہ دو فرشتے بھی اس کے اعمال کے حساب و کتاب کی حفاظت اور نگہداری پر مامور ہیں، جو اس کی دائیں اور بائیں طرف سے نگرانی کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے ہیں، اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے جدا نہیں ہوتے، تاکہ اس طریقہ سے زیادہ سے زیادہ اتمام حجت ہو، اور حساب اعمال کی نگہداشت کے مسئلہ پر ایک تاکید ہو۔

"تلقی" دریافت، اخذ اور ضبط کے معنی میں ہے، اور "متلقیان" دو فرشتے ہیں جو انسانوں کے اعمال کو رقم کرنے پر مامور ہیں۔

"قعید" "قعود" کے مادہ سے بیٹھنے والے کے معنی میں ہے۔[2] اور یہاں مراد مامور اور نگران ہے، دوسرے لفظوں میں آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ دو فرشتے انسان کی دائیں اور بائیں طرف بیٹھے ہیں، کیونکہ انسان کبھی بیٹھا ہوتا ہے اور کبھی چل رہا ہوتا ہے، بلکہ یہ تعبیر اس بات کے لیے کنایہ ہے کہ وہ دونوں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے ہیں اور اس کے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ وہ دونوں انسان کے دائیں بائیں شانے پر یا دائیں بائیں والے اصول پر ہمیشہ بیٹھے رہتے ہیں اور اس کے اعمال کو ثبت کرتے ہیں، اور بعض غیر معروف روایات میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

(بحار الانوار جلد ۵۹ ص ۱۸۶ روایت ۳۲)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ روایات اسلامی میں آیا ہے کہ دائیں طرف کا فرشتہ تو نیکیوں کو لکھتا ہے اور بائیں طرف کا فرشتہ

---

[1] "اذ" "اذ یتلقی المتلقیان" کے جملہ میں ظرف ہے اور وہ ایک فعل محذوف سے متعلق ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے "اذکروا اذ یتلقی المتلقیان"، اس معنی کو مفسرین کی ایک جماعت نے قبول کیا ہے، لیکن ایک گروہ اس کو "اقرب" سے متعلق سمجھتا ہے۔ جو کہ اس سے پہلی آیت میں آیا ہے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔ کیونکہ "ونحن اقرب الیہ من حبل الورید" اور اسی طرح "اذ یتلقی المتلقیان" کا جملہ اپنے استقلال کو محفوظ رکھتا ہے اور ایک دوسرے کو مقید نہیں کرتا، علاوہ ازیں دوسری تفسیر میں صدر و ذیل کا تناسب چنداں واضح نظر نہیں آتا۔

[2] "قعید" مفرد ہے جبکہ "متلقیان" تثنیہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت میں [illegible] اور تقدیر میں [illegible] طرح ہے "اذ یتلقی المتلقیان عن الیمین قعید وعن الشمال قعید" ان میں سے ایک [illegible] دوسرے کے قرینہ سے محذوف ہے۔

برائیوں کو لکھتا ہے اور پہلا فرشتہ دوسرے کا حاکم ہے ، جس وقت انسان کسی نیک کام کو انجام دیتا ہے تو دائیں طرف کا فرشتہ اس سے دس گنا لکھ لیتا ہے ، اور جب بُرا عمل اس سے سرزد ہوتا ہے اور بائیں طرف کا فرشتہ اُسے لکھنا چاہتا ہے ، تو پہلا فرشتہ اس سے کہتا ہے ، " جلدی نہ کرو" لہٰذا وہ اس کے لکھنے میں سات گھنٹے کی تاخیر کر دیتا ہے ۔ چنانچہ اگر مرتکب پشیمان ہو گیا اور اس نے توبہ کر لی تو پھر فرشتہ کوئی چیز نہیں لکھتا ، اور اگر اس نے توبہ نہ کی تو پھر اس کے لیے صرف ایک ہی گناہ لکھتا ہے ۔ [1]

روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مومن انسان کے مرنے کے بعد وہ فرشتے کہتے ہیں پروردگارا ! تو نے اپنے بندہ کی رُوح قبض کر لی ہے ، اب ہماری ماموریت کہاں ہے ؟

خدا فرماتا ہے : میرا آسمان میرے فرشتوں سے پُر ہے ، جو ہمیشہ میری عبادت کرتے ہیں ، اور زمین بھی مطیع و فرمانبردار مخلوق سے پُر ہے ، تم میرے بندے کی قبر کی طرف جاؤ اور وہاں تسبیح و تکبیر و تہلیل کہو ، اور اُسے قیامت کے دن تک میرے بندے کی نیکیوں میں لکھو ۔ [2]

ایک اور دوسری روایت میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا :

جو مسلمان بیمار ہو جاتا ہے ، خدا اس کے اعمال کے محافظ فرشتوں سے کہتا ہے ، جب تک وہ بیمار ہے ، وہ اعمال جو وہ صحت کی حالت میں انجام دیا کرتا تھا ، اس کے لیے لکھتے رہو ، اس کے بعد پیغمبرؐ نے فرمایا :

" من مرض او سافر کتب اللہ تعالیٰ لہ ما کان یعمل صحیحًا مقیمًا "

" جو شخص بیمار ہو جائے یا سفر میں ہو تو خدا وہی (نیک) اعمال جو وہ حالت صحت میں اور حالتِ قیام میں انجام دیا کرتا تھا اس کے لیے لکھتا ہے ۔ [3]

اور یہ سب کے سب الطاف خداوندی کی وسعت کی طرف پُر معنی اشارے ہیں ۔

آخری زیر بحث آیت میں پھر ثبت اعمال کرنے والے فرشتوں کے مسئلہ پر تکیہ کرتے ہوئے کہتا ہے : انسان کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا مگر یہ کہ اس کے پاس ایک نگرانی کرنے والا فرشتہ اپنی ماموریت کی انجام دہی کے آمادہ ہے ، (ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید) ۔ [4]

گزشتہ آیت میں انسان کے تمام اعمال رقم ہونے کے بارے میں گفتگو تھی ، اور اس آیت میں خاص طور پر اس کے الفاظ اور باتوں پر بھی تکیہ کیا گیا ہے ، اور یہ اس حد سے زیادہ اہمیت اور نقش مؤثر کی بنا پر ہے ، جو انسانوں کی زندگی میں ان

---

[1] " مجمع البیان " ج ۹ ص ۱۴۴ ۔

[2] سابقہ مدرک

[3] " روح المعانی " جلد ۲۶ ۔ ص ۱۷۹ ۔ و زیر بحث آیات کے ذیل میں یہی مضمون کتاب " کافی " میں امام صادقؑ سے بھی نقل ہوا ہے ۔

(بحار الانوار جلد ۵۹ ص ، ۱۸ روایت ۳۴ ۔ ۳۵)

[4] " لدیہ " کی ضمیر " قول " کی طرف لوٹتی ہے یہ احتمال بھی ہے کہ کہنے والے کی طرف لوٹے ، لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے ۔

کی گفتار کو حاصل ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات ایک ہی جملہ اجتماعی راستے کو خیر یا شر کی طرف موڑ دیتا ہے۔

اور اس بناء پر بھی کہ بہت سے لوگ اپنی باتوں کو اپنے اعمال کا جز نہیں سمجھتے، اور وہ اپنے آپ کو بات کرنے میں آزاد خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ انسان کے موثر ترین اور خطرناک ترین اعمال اُس کی باتیں ہی ہوتی ہیں۔

اس بناء پر اس آیت کا ذکر گزشتہ آیت کے بعد، عام کے بعد خاص کے ذکر کے قبیل سے ہے۔

رقیب "مراقب اور نگران کے معنی میں ہے اور" عتید" اس شخص کے معنی میں ہے، جو کسی کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہو، لہٰذا اس گھوڑے کو جو دوڑنے کے لیے تیار ہو" فرس عتید" کہتے ہیں اور جو شخص کسی چیز کو ذخیرہ، اور اس کی حفاظت کرتا ہے اسے بھی "عتید" کہا جاتا ہے (مادہ "عتاد" بروزن جہاد ہے ذخیرہ کرنے کے معنی میں ہے)

اکثر مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ"رقیب" و"عتید" وہی دو فرشتے ہیں جنہیں گزشتہ آیت میں" متلقیان" کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، دائیں طرف کے فرشتے کا نام "رقیب" ہے اور بائیں طرف کے فرشتے کا نام "عتید" اگرچہ زیر بحث آیت میں اس مطلب کی صراحت نہیں ہے لیکن مجموع آیات کے ملاحظہ سے اس قسم کی تفسیر بعید نظر نہیں آتی۔

اس بارے میں کہ یہ دونوں فرشتے کونسی باتوں کو لکھتے ہیں، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ وہ سب کچھ لکھتے ہیں، یہاں تک کہ اس نالہ و فریاد کو بھی جو سر درد رکھنے والا سر درد کے موقع پر کرتا ہے، جب کہ بعض دوسروں کا نظریہ یہ ہے کہ صرف خیر و شر، واجب و مستحب یا حرام و مکروہ الفاظ لکھتے ہیں، اور مباحات کے ساتھ انہیں کوئی سروکار نہیں ہے، لیکن آیت کی تعبیر کی عمومیت بتاتی ہے کہ انسان کے تمام الفاظ و گفتار ثبت ہوتی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"ان المؤمنین اذا قعدا یتحدثان قالت الحفظة بعضها لبعض اعتزلوا بنا، فلعل لهما سرًّا وقد ستر الله علیهما!"

"جب دو مومن ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے ہیں اور خصوصی باتیں کرنے لگتے ہیں، تو محافظ اعمال فرشتے ایک دوسرے سے کہتے ہیں، ہمیں ایک طرف ہو جانا چاہیئے شاید ان کے درمیان کوئی ایسا راز ہو جسے خدا نے مستور رکھا ہو"

راوی کہتا ہے: کیا خدا یہ نہیں فرماتا: ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید "انسان کوئی بات نہیں کرتا مگر یہ کہ نگران فرشتہ اور ثبت اعمال کے لیے آمادہ فرشتہ اس کے پاس حاضر ہے"؟

امامؑ نے فرمایا:

"ان کانت الحفظة لا تسمع فان عالم السر یسمع ویری"

"اگر محافظین ان کی باتوں کو نہیں سنتے تو وہ خدا جو اسرار سے باخبر ہے وہ تو سنتا اور دیکھتا ہے"[1]

---

[1] "اصول کافی" مطابق نقل "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۱۱۰۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوندِ عالم مومن کے اکرام و احترام کے لیے اس کی بعض باتوں کو جو خاص راز کا پہلو رکھتی ہیں ان فرشتوں سے پوشیدہ رکھتا ہے، لیکن وہ خود ان تمام اسرار کا محافظ ہے۔

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رات کے فرشتے دن کے فرشتوں کے علاوہ ہیں۔ جیسا کہ سورۂ اسراء کی آیت ۷۸ میں ہم اس چیز کو پیش کر چکے ہیں [1]

ایک نکتہ

دوست مجھ سے بھی زیادہ میرے نزدیک ہے

بعض فلاسفہ کہتے ہیں، "جس طرح شدّت بُعد پوشیدگی کا موجب ہے اسی طرح شدّت قرب بھی پوشیدگی کا موجب ہے"، مثلاً اگر سورج ہم سے بہت دور ہو جائے تو وہ دکھائی نہیں دے گا۔ اور اگر ہم اس سے بہت زیادہ نزدیک ہو جائیں، تو اس کی روشنی اتنی خیرہ کرنے والی ہے، کہ پھر بھی ہم اس کو دیکھنے پر قادر نہیں ہیں۔

اور درحقیقت خدا کی ذات پاک بھی اسی طرح کی ہے، "یا من هو اختفی لفرط نوره" اے وہ کہ جو شدت نورانیت کی وجہ سے ہماری نگاہ سے پوشیدہ ہوا ہے"!

زیرِ بحث آیات میں بھی بندوں سے خدا کی حد سے زیادہ نزدیکی ایک عمدہ تشبیہ کے ضمن میں بیان ہوئی ہے، کہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی ہم سے زیادہ نزدیک ہے۔

یہ نزدیکی، ہماری اس سے زیادہ شدید وابستگی سے سرچشمہ حاصل کرتی ہے۔

یہاں تک کہ اس قسم کی تشبیہیں بھی، کہ تمام عالم جسم ہے اور وہ روح عالم ہے۔ تمام عالم شعاع کی مانند ہے اور وہ قرص آفتاب ہے۔ یہ سب اس قرب کے رابطہ کو بیان نہیں کر سکتیں، اور بہترین تعبیر وہی ہے، جو امیرالمومنین ؑ نے (نہج البلاغہ کے پہلے خطبہ میں)، بیان فرمائی ہے:

"مع کل شیء لا بمقارنة وغیر کل شیء لا بمزایلة"

"وہ تمام موجودات کے ساتھ ہے، لیکن اس طرح نہیں کہ ان کے قرین ہو، اور تمام موجودات سے جدا ہے لیکن اس طرح نہیں کہ ان سے الگ ہو"

فلاسفہ کی ایک جماعت نے اس حد سے زیادہ قرب کے بیان کے لئے ایک اور تشبیہ بیان کی ہے، انھوں نے خدا کی ذات کو "اسم" کے معنی سے اور باقی موجودات کو "حرف" کے معنی سے تشبیہ دی ہے۔

---

[1] جلد ۱۲ ص (سورہ اسراء کی آیہ ۷۸ کے ذیل میں) رجوع کریں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جس وقت ہم یہ کہتے ہیں (کعبہ کی طرف رُخ کرو) "رو بہ کعبہ کن" تو لفظ "بہ" کا اکیلا کوئی مفہوم نہیں ہے، جب تک اس کے ساتھ لفظ "کعبہ" کا اضافہ نہ ہو، وہ گونگا، مبہم اور ناقابل فہم ہے، اس بنا پر کسی حرف کا اکیلے کوئی معنی نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ کسی "اسم" معنی کے ہمراہ نہ ہو۔

تمام موجودات عالم کی ہستی بھی اسی طرح ہے، کہ اس کی ذات کے ساتھ وابستگی اور پیوند کے بغیر نہ اصلاً اس کا کوئی مفہوم ہے اور نہ ہی اس کے لیے کوئی وجود و بقا ہے، اور یہ چیز خدا کے بندوں کے ساتھ انتہائی قرب اور بندوں کے خدا کے ساتھ انتہائی قرب کی نشاندہی کرتی ہے، اگرچہ بے خبر اس معنی سے غافل ہیں۔

دوست نزدیک تر از من بہ من است ۔۔۔ ویں عجب تر کہ من از وی دورم

چکنم با کہ تواں گفت کہ دوست ۔۔۔ در کنار من و من مہجورم!

"میرا دوست مجھ سے خود مجھ سے بھی زیادہ نزدیک ہے، لیکن زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ میں پھر بھی اس سے دور ہوں، میں کیا کروں اور کس سے کہہ سکتا ہوں کہ دوست تو میرے پہلو میں ہے۔ لیکن میں پھر بھی ہجر و فراق میں ہوں۔"

۱۹۔ وَجَآءَتۡ سَكۡرَةُ الۡمَوۡتِ بِالۡحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنۡتَ مِنۡهُ تَحِيۡدُ ○

۲۰۔ وَنُفِخَ فِى الصُّوۡرِ ؕ ذٰلِكَ يَوۡمُ الۡوَعِيۡدِ ○

۲۱۔ وَجَآءَتۡ كُلُّ نَفۡسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيۡدٌ ○

۲۲۔ لَقَدۡ كُنۡتَ فِىۡ غَفۡلَةٍ مِّنۡ هٰذَا فَكَشَفۡنَا عَنۡكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الۡيَوۡمَ حَدِيۡدٌ ○

ترجمہ

۱۹۔ اور انجام کار سکرات موت حق کے ساتھ پہنچ جائے گی، (اور انسان سے کہا جائے گا) یہ وہی چیز ہے کہ جس سے تو بھاگا کرتا تھا۔

۲۰۔ اور صور پھونکا جائے گا، وہی دن تو وحشت ناک وعدہ کے پورا ہونے کا دن ہے۔

۲۱۔ اور ہر انسان محشر میں وارد ہوگا، جب کہ ایک ہانکنے والا اور ایک گواہ اس کے ساتھ ساتھ ہوگا۔

۲۲۔ (اس کو خطاب ہوگا) تو اس منظر (اور عظیم دادگاہ) سے غافل تھا، اور ہم نے تیری آنکھ سے پردہ ہٹا دیا ہے اور آج تیری نظر بہت تیز ہوگئی ہے۔

تفسیر

قیامت اور تیز بین آنکھیں

ان آیات میں "معاد" سے مربوط مسائل میں سے کچھ اور دوسرے مناظر کو پیش کیا گیا ہے، "موت" کا منظر "نفخ صور"

کا منظر اور محشر میں حاضر ہونے کا، منظر۔

پہلے فرماتا ہے: "آخر کار سکرات موت حق کے ساتھ پہنچ جائے گی" (وجاءت سکرة الموت بالحق)۔

"سکرة الموت" مستی سے مشابہ ایک حالت ہے جو موت کے مقدمات کے ظاہر ہونے کے اثر میں حد سے زیادہ ہیجان و انقلاب کی صورت میں انسان کو عارض ہوتی ہے، اور بعض اوقات اس کی عقل پر بھی غالب آجاتی ہے، اور اس کو اضطراب اور ایک شدید بے آرامی میں ڈبو دیتی ہے۔

ایسا کیوں نہ ہو، درحالیکہ موت ایک اہم انتقالی مرحلہ ہے جس میں انسان کو اس جہاں سے جس میں اس نے سالہا سال تک رہنے کی عادت ڈالی تھی، اپنے تمام رشتوں اور تعلقات کو چھوڑنا پڑے گا، اور اسے اس عالم میں قدم رکھنا ہوگا جو اس کے لیے کاملاً نیا اور اسرار آمیز ہے، خاص طور پر یہ بات کہ انسان موت کے وقت ایک نیا ادراک اور نئی نگاہ پیدا کر لیتا ہے اس جہاں کی بے ثباتی کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے، اور موت کے بعد کے حوادث کو بھی کم و بیش دیکھ رہا ہوتا ہے، یہ وہ منزل ہے کہ ایک عظیم وحشت اس کو سر سے پاؤں تک گھیر لیتی ہے، اور مستی کے مشابہ ایک حالت اس کو عارض ہو جاتی ہے، لیکن وہ "مست" نہیں ہوتا۔[1]

یہاں تک کہ انبیاء اور مردان خدا بھی جو موت کے وقت کامل اطمینان اور آرام کی حالت میں ہوتے ہیں، اس انتقالی لمحہ کی شدتوں اور مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں، جیسا کہ پیغمبرؐ کے حالات میں آیا ہے کہ اپنی عمر مبارک کے آخری لمحات میں اپنا ہاتھ ایک پانی کے برتن میں ڈالتے تھے اور اپنے منہ پر پھیرتے تھے، اور "لا الٰہ الا اللّٰہ" کہتے تھے اور فرماتے تھے:

"ان للموت سکرات" "موت کے لیے سکرات ہے"۔[2]

علیؑ موت کے لمحہ اور اس کی سکرات کی ایک بہت ہی عمدہ تصویر کھینچتے ہیں، فرماتے ہیں۔

اجتمعت علیھم سکرة الموت وحسرة الفوت، ففترت لھا اطرافھم وتغیرت لھا الوانھم، ثم ازداد الموت فیھم ولوجا فحیل بین احدھم وبین منطقہ، وانہ لبین اھلہ ینظر ببصرہ ویسمع باذنہ، علی صحة من عقلہ، وبقاء من لبہ، یفکر فیم افنی عمرہ؟ وفیم اذھب دھرہ؟ ویتذکر اموالا جمعھا اغمض فی مطالبھا واخذھا من مصرحاتھا، ومشتبھاتھا قد لزمتہ تبعات جمعھا، واشرف علی فراقھا، تبقی لمن ورائہ ینعمون فیھا ویتمتعون بھا!

---

[1] "سکر" (بروزن فکر) اصل میں پانی کی راہ کو مسدود کرنے کے معنی میں ہے اور سکر (بروزن شکر) مسدود مقام و محل کے معنی میں آیا ہے، اور چونکہ مستی کی حالت میں گویا انسان اور اس کی عقل کے درمیان ایک سد پیدا ہو جاتی ہے، لہٰذا اس کو "سکر" (بروزن شکر) کہا جاتا ہے۔

[2] "روح البیان" جلد ۹ ص ۱۱۸۔

سکرات موت۔ اپنے پاس کی ہر چیز کو کھو دینے کی حسرت کے ساتھ۔ ان پر ہجوم کرتی ہے، ان کے بدن کے اعضا سست ہو جاتے ہیں، ان کے چہروں کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ موت ان میں نفوذ کرنے لگتی ہے، ان کے اور ان کی زبان کے درمیان جدائی ڈال دیتی ہے، حالانکہ وہ اپنے گھر والوں کے درمیان ہے، اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہوتا ہے اور اپنے کان سے سُن رہا ہوتا ہے، اور اس کی عقل و ہوش صحیح و سالم ہوتے ہیں، لیکن وہ بات نہیں کر سکتا۔

اس حالت میں وہ سوچتا ہے کہ اس نے اپنی عمر کس راستے میں فنا کی؟ اور اپنا زمانہ کس راستے میں ختم کیا؟ اس دولت و ثروت کی یاد اُسے ستاتی ہے، جس کے جمع کرنے میں اس نے چشم پوشی سے کام لیا تھا، اور حلال و حرام اور مشکوک و مشتبہ اکٹھا کرتا رہا تھا، اور اس کے جمع کرنے کے نتائج اور ذمہ داری اپنے کندھے پر لے گا، حالانکہ اُن سے جدائی اور فراق کا وقت آن پہنچا ہے، اور وہ پسماندگان کے ہاتھوں میں چلا جائے گا، وہ تو اس سے متنعم ہوں گے اور فائدہ اٹھائیں گے۔ لیکن اس کا حساب و کتاب اور اس کے لیے جوابدہی اس کے ذمہ ہوگی۔ [1]

اور دُنیائے انسانیت کا یہ عظیم معلم ایک دوسری جگہ خبردار کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

"انکم لو قد عاینتم ما قد عاین من مات منکم لجزعتم و وھلتم وسمعتم واطعتم ولکن محجوب عنکم ما قد عاینوا وقریب ما یطرح الحجاب": [2]

اگر وہی چیز جس کا تمہارے مُردوں نے مشاہدہ کیا ہے، تم بھی دیکھ لیتے، تو گھبرا جاتے، اور ڈر جاتے، حق کی باتوں کو سنتے اور اطاعت کرتے، لیکن انہوں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ تم سے مستور ہے اور عنقریب پردے ہٹ جائیں گے اور تم بھی اس کا مشاہدہ کرو گے۔ (لیکن افسوس ......)

اس کے بعد قرآن اس گفتگو کو جاری رکھتا ہے، "اس شخص کو جو سکرات موت کی حالت میں ہے، کہا جائے گا، یہ وہی چیز ہے جسے تو پسند نہیں کرتا تھا اور اس سے بھاگتا تھا" (ذالک ما کنت منہ تحید)۔ [3]

ہاں موت ایک ایسی حقیقت ہے، جس سے اکثر لوگ بھاگتے ہیں، کیونکہ وہ اس کو "فنا" سمجھتے ہیں نہ کہ عالم "بقاء" کا ایک دریچہ یا ان شدید رشتوں اور تعلقات کی وجہ سے جو وہ دُنیا اور مادی نعمتوں کے ساتھ رکھتے ہیں اور ان سے دل نہیں ہٹا سکتے یا اپنے نامہ اعمال کے سیاہ ہونے کی وجہ سے!

جو کچھ بھی ہے، وہ اس سے بھاگتے ہیں، لیکن کیا فائدہ، کیونکہ یہ ایک ایسی سرنوشت ہے جو سب کے انتظار میں ہے، اور ایک ایسا اونٹ ہے جو ہر گھر کے دروازے پر بیٹھا ہے، اور کسی میں اس سے بھاگنے کی طاقت نہیں ہے، آخر کار سب

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۔

[2] "نہج البلاغہ" خطبہ ۲۰۔

[3] "تحید" حید بروزن صید کے مادہ سے۔

کے سب موت کے منہ میں چلے جائیں گے، اور ان سے کہا جائے گا، یہ وہی چیز ہے، جس سے تم بھاگتے تھے!!

اس بات کا کہنے والا ممکن ہے خدا ہو یا فرشتے یا وجدان بیدار یا سب کے سب۔

اس حقیقت کو قرآن دوسری آیات میں بھی دل نشین کراتا ہے۔ سورۂ نساء کی آیت ۷۸، میں فرماتا ہے، "اینما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدۃ"، "تم جہاں کہیں بھی ہوں گے موت تمہیں وہیں آئے گی چاہے تم مضبوط قلعوں میں ہی کیوں نہ ہو۔

بعض اوقات مغرور انسان ان تمام عینی حقائق اور واقعیتوں کو آنکھ سے دیکھنے کے باوجود خود خواہی اور حب دنیا کی وجہ سے بالکل ہی بھلا دیتا ہے یہاں تک کہ وہ قسم کھانے لگتا ہے کہ میں تو عمر جاودانی رکھتا ہوں، جیسا کہ قرآن کہتا ہے، "اولم تکونوا اقسمتم من قبل مالکم من زوال"؛ کیا تم ہی نہیں تھے، جو پہلے یہ قسم کھایا کرتے تھے، کہ تمہارے لیے ہرگز فنا و زوال نہیں ہے"! (ابراہیم-۴۴)

لیکن چاہے وہ قسم کھائے یا نہ کھائے، وہ یقین کرے یا نہ کرے، موت ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر شخص کو دامن گیر ہوگی اور اس سے راہِ فرار نہیں ہے۔

اس کے بعد نفخ صور کے مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے، "صور پھونکا جائے گا، اور وہ دن وحشتناک وعدوں کے پورا ہونے کا دن ہے" (ونفخ فی الصور ذالک یوم الوعید)۔

"نفخ صور" سے مراد یہی "دوسرا نفخ" ہے، کیونکہ- جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ دو مرتبہ "صور" پھونکا جائے گا، پہلا نفخہ جسے "نفخہ" "فزع" یا "صعق" کہتے ہیں، وہ نفخہ ہے جو اس عالم کے اختتام پر صورت پذیر ہوگا، اور تمام انسان اس کے سننے سے مر جائیں گے اور عالم دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا، اور دوسرا نفخہ جو "قیام" و "جمع" و "حضور" کا نفخہ ہے، وہ نفخہ ہے جو قیامت کے آغاز میں انجام پائے گا، جس سے تمام انسان زندہ ہو جائیں گے اور اپنی قبروں سے نکل کر حساب و کتاب کے لیے عدل الٰہی کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔

"نفخ" اصل میں پھونکنے کے معنی میں ہے، اور "نفخہ" ایک بار پھونکنے" کے معنی میں ہے، اور "صور" "شیپور (بگل) کے معنی میں ہے، جس کے ذریعہ عام طور پر فوجیوں کو جمع ہونے، یا حاضر ہونے، یا آرام کرنے یا سونے کے لیے احکام دیتے ہیں، اور "صور اسرافیل" کے بارے میں اس کا استعمال ایک قسم کا کنایہ اور تشبیہ ہے جس کی تفصیل جلد ۱۱ (سورۂ زمر کی آیہ ۶۸) کے ذیل میں آئی ہے۔

بہر حال آیت کے ذیل میں (ذالک یوم الوعید) "آج عذاب کے وعدہ کا دن ہے" کے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ "نفخہ صور" سے مراد یہاں وہی دوسرا نفخہ اور قیامت ہے۔

بعد والی آیت میں محشر میں ورود کے وقت انسانوں کی کیفیت کو اس طرح بیان کرتا ہے: "اس دن ہر انسان، (خواہ نیک ہو یا بد) عرصہ محشر میں اس حال میں وارد ہوگا کہ اس کے ساتھ ایک تو ہنکانے والا ہوگا اور ایک گواہ ہوگا" (وجاءت کل نفس معها سائق وشهید)۔

"سائق" اُسے دادگاہ عدل الٰہی کی طرف ہانک کرلے جائے گا۔ اور"شہید" اس کے اعمال پر گواہی دے گا۔

ٹھیک اس جہان کی عدالتوں کی طرح کہ حکومت کا مامور شخص متہم کے ساتھ ہوتا ہے، اور اس کے اعمال کا شاہد گواہی دیتا ہے۔

بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ"سائق" وہ شخص ہے جو نیکوکاروں کو ہنکا کر جنت کی طرف لے جائے گا۔ اور بدکاروں کو جہنم کی طرف، لیکن لفظ"شہید" (شاہد وگواہ) کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلا معنی یعنی عدل الٰہی کی دادگاہ وعدالت کی طرف ہنکانا زیادہ مناسب ہے۔

اس بارے میں کہ ہنکانے والا اور شاہد فرشتوں میں سے ہے یا ان کے علاوہ کوئی اور؟ طرح طرح کی تفسیریں کی گئی ہیں۔

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ"سائق" نیکیاں لکھنے والا فرشتہ ہے۔ اور"شہید" سیئات (برائیاں) لکھنے والا فرشتہ ہے۔ اس طرح سے وہ ایسے فرشتے ہیں جن کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

ایک روایت سے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ"سائق" موت کا فرشتہ ہے اور"شہید" پیغمبر اسلامؐ ہیں، لیکن یہ روایت آیات کے لب ولہجہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے ضعیف نظر آتی ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ"سائق" وہ فرشتہ ہے، جو ہر انسان کو ہنکاتا ہے اور شہید انسان کا عمل ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ"سائق" تو فرشتہ ہے اور"شہید" انسان کے بدن کے اعضاء ہیں، یا اس کا وہ نامۂ اعمال ہے جو اس کی گردن میں لٹکایا جائے گا۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ"سائق" اور"شہید" ایک ہی فرشتہ ہے اور ان دونوں کا ایک دوسرے پر عطف ان دو صفات کی مغائرت کی وجہ سے ہے، یعنی اس کے ساتھ ایک فرشتہ ہے جو اس کو دادگاہ عدل الٰہی کی طرف ہنکاتا بھی ہے اور اس کے اعمال پر گواہ بھی ہے۔

لیکن ان میں سے اکثر تفاسیر ظاہر آیت کے خلاف ہیں اور آیت کا ظاہر— جیسا کہ اکثر مفسرین نے بھی یہی سمجھا ہے یہ ہے کہ دو فرشتے ہر انسان کے ساتھ آئیں گے، ایک اس کو چلائے گا اور دوسرا اس کے اعمال کی گواہی دیگا۔

یہ بات کہے بغیر واضح ہے، کہ بعض فرشتوں کی گواہی، قیامت کے میدان میں دوسرے گواہوں کے موجود ہونے کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتی، مثلاً ایسے گواہ جیسے انبیاء، اعضائے بدن، نامۂ اعمال، اور وہ زمان ومکان جن میں گناہ انجام پایا ہے بہر حال پہلا فرشتہ حقیقت میں"فرار" سے مانع ہے، اور دوسرا فرشتہ"انکار" سے مانع ہے۔ اور اس طرح سے ہر انسان اس دن اپنے اعمال میں گرفتار ہوگا، اور ان کی جزا وسزا سے گریز کی کوئی راہ نہ ہوگی۔

ؑ ؑ ؑ

یہاں مجرموں کو یا تمام انسانوں کو خطاب ہوگا کہ"تو اس عظیم دادگاہ سے غافل تھا، اور اب ہم نے تیری آنکھ سے

پردہ ہٹا دیا ہے۔ آج تیری آنکھ اور نظر تیز ہوگئی ہے"۔ (لقد کنت فی غفلۃ من ھٰذا فکشفنا عنک غطائک فبصرک الیوم حدید)۔

ہاں! مادی دُنیا کے پردے، امیدیں، آرزوئیں، دُنیا کے ساتھ عشق اور لگاؤ، بیوی اور اولاد، مال و مقام، سرکش ہوا و ہوس، بغض و حسد، تعصب، جہالت اور ہٹ دھرمی تجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ آج کے دن کے لیے اسی زمانہ سے دیکھتا، جبکہ معاد و قیامت کی نشانیاں واضح تھیں، اور اس کے دلائل روشن و آشکار!

آج غفلت کا گرد و غبار بیٹھ گیا ہے، جہالت، تعصب اور ہٹ دھرمی کے پردے ہٹ گئے ہیں، خواہشات امیدوں اور آرزوؤں کے پردے چاک ہوگئے ہیں، یہاں تک کہ جو پردۂ غیب میں مستور تھا وہ سب ظاہر ہوگیا ہے، چونکہ آج کا دن "یوم البروز" ہے، اور "یوم الشہود" اور "یوم تبلی السرائر" ہے۔

اسی بنا پر آج تیری نظر تیز ہوگئی ہے، اور تو حقائق کو اچھی طرح سے درک کر سکتا ہے۔

ہاں! حقیقت کا چہرہ پوشیدہ نہیں ہے، اور جمال یار پر پردہ نہیں ہے، لیکن راستہ کے غبار کو ہٹانا چاہیئے تاکہ اس کا دیدار کیا جاسکے۔

جمال یار ندارد حجاب و پردہ ولے — غبار رہ بنشان تا نظر توانی کرد

لیکن طبیعت کے کنویں میں ڈوب جانا، اور انواع و اقسام کے حجابوں میں گرفتار رہنا انسان کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ حقائق کو اچھی طرح سے دیکھ سکے، لیکن وہ دن جس میں تمام تعلقات اور رشتے ختم ہو جائیں گے تو انسان طبعی طور پر ایک نیا ادراک اور نئی نگاہ پیدا کرے گا، اور اصولی طور پر قیامت کا دن حقائق کے ظہور اور آشکار ہونے کا دن ہے۔

یہاں تک کہ اس جہان میں بھی ان لوگوں کے لیے جو ان حجابوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا سکتے ہیں، اور اپنے آپ کو شہوات کی قید کے پنجہ سے رہائی دلا سکتے ہیں، ایسا ادراک و نظر پیدا ہو جاتا ہے، جس سے دنیا والے محروم ہیں۔

اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ "حدید" اصل میں "لوہے" کے معنی میں ہے، اور تیز چاقو یا تیز تلوار کے معنی میں بھی ہے، اس کے بعد اس کا تیز بینی اور تیز فہمی پر اطلاق ہونے لگا، جیسا کہ "برندہ" (کاٹنے والی تلوار اور چھری کی صفت ہے) لیکن فارسی زبان میں زبانِ گویا اور نطق فصیح پر بھی برندہ کا اطلاق ہوتا ہے، اور یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ "بصر" سے مراد یہاں ظاہری آنکھ نہیں ہے، بلکہ وہی عقل اور دل کی آنکھ ہے۔

علی علیہ السلام روئے زمین میں خدا کی حجتوں کے بارے میں اس طرح فرماتے ہیں:

"ھجم بھم العلم علی حقیقۃ البصیرۃ، وباشروا روح الیقین، و استلانوا ما استعورہ المترفون، وانسوا بما استوحش منہ الجاھلون، وصحبوا الدنیا بابدان ارواحھا معلقۃ بالمحل الاعلیٰ، اولئک خلفاء اللہ فی ارضہ والدعاۃ الی دینہ"

"علم و دانش نے حقیقت بصیرت کے ساتھ ان کا رُخ کیا ہے اور روح یقین کو انھوں نے لمس کیا ہے،

جس چیز کو دنیا پرست مشکل شمار کرتے ہیں، وہ ان کے لیے آسان ہے، اور جس چیز سے جاہل لوگ وحشت رکھتے ہیں اس سے اُن کو اُنس ہے، وہ اس دنیا میں ایسے بدنوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں، جن کے ارواح عالم بالا سے پیوستہ ہیں، وہ زمین میں خدا کے خلفاء ہیں اور خدا کے دین کی طرف دعوت دینے والے ہیں"۔[1]

چند نکات

۱۔ موت کی حقیقت

عام طور پر لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ موت ایک عدمی امر ہے اور وہ فنا کے معنی میں ہے، لیکن یہ نتیجہ ہرگز اس معنی کے ساتھ موافق نہیں ہے جو قرآن مجید میں بیان ہوا ہے، اور جس کی طرف دلائل عقلی رہنمائی کرتے ہیں۔

"موت" قرآن کی نظر سے ایک امر وجودی ہے، ایک جہان سے دوسرے جہان کی طرف ایک انتقال اور عبور ہے اسی لیے قرآن کی بہت سی آیات میں موت "کو "توفی" سے تعبیر کیا گیا ہے، جو واپس لینے اور فرشتوں کے ذریعہ رُوح کو بدن سے حاصل کرنے کے معنی میں ہے۔

اوپر والی آیات "وجاءت سکرة الموت بالحق": "موت کے شدائد حق کے ساتھ انسان کے پاس آتے ہیں"، کی تعبیر بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے[2] بعض آیات میں موت کو صراحت کے ساتھ خدا کی مخلوق شمار کیا ہے، الذی خلق الموت والحیٰوۃ: (ملک۔۲)

اسلامی روایات میں موت کی حقیقت کے بارے میں مختلف تعبیریں آئی ہیں۔

ایک حدیث میں منقول ہوا ہے کہ علی بن الحسین امام سجاد علیہ السلام سے لوگوں نے سوال کیا: "ما الموت؟" موت کیا چیز ہے؟

آپؑ نے جواب میں فرمایا:

"للمؤمن كنزع ثياب وسخة قملة، وفك قيود، واغلال ثقيلة، والاستبدال بافخر الثياب، واطيبها روائح، واوطى المراكب وانس المنازل۔

---

[1] نہج البلاغہ "کلمات قصار" کلمہ ۱۹۳۔

[2] اس بارے میں کہ "بالحق" میں "با" کے کیا معنی ہیں؟ مفسرین نے مختلف احتمال دیئے ہیں، بعض نے اس کو "با تعدیہ" لیا ہے اور حق کو موت کے معنی میں جس سے اس جملہ کا معنی یہ ہوگا، سکرات موت اس مطلب کو جو ایک حقیقت ہے۔ یعنی موت۔ کو ساتھ لاتے ہیں، اور کبھی اس کو "ملابست کے معنی میں" لیتے ہیں یعنی سکرات موت حق کے ساتھ آپہنچے ہیں۔

" وللکافر کخلع ثیاب فاخرۃ، والنقل من منازل انیسۃ، و والاستبدال باوسخ الثیاب واخشنھا واوحش المنازل، واعظم العذاب"!

" مومن کے لیے تو ایسا ہے جیسے کہ میلا کچیلا جوؤں سے پُر لباس اتار پھینکنا، اور بھاری طوق و زنجیر کھولنا، اور اس کو بہترین لباس، بہترین خوشبوؤں کے عطروں، اور تیز رفتار سواریوں اور بہترین منزلوں سے بدل لینا، اور کافر کے لیے ایسا ہے جیسے کہ فاخرہ لباس کو اتارنا اور مانوس منازل سے منتقل ہو کر میلے کچیلے اور سخت ترین لباس کو تبدیل کرنا، اور وحشت ناک ترین منازل اور بزرگ ترین عذاب میں منتقل ہو جانا"!

امام محمد بن علیؑ سے بھی یہی سوال ہوا تھا تو آپؑ نے فرمایا:

" ھو النوم الذی یأتیکم کل لیلۃ الا انہ طویل مدتہ، لا ینتبہ منہ الا یوم القیامۃ"

" موت وہی نیند ہے جو ہر رات تمھیں آتی ہے، مگر یہ کہ اس کی مدت طولانی ہے اور انسان اس سے قیامت کے دن تک بیدار نہیں ہوتا۔[1]

ہم نے برزخ سے مربوط مباحث میں بیان کیا ہے، کہ برزخ میں اشخاص کی حالت مختلف ہے، بعض جیسے سوئے ہوئے ہیں، اور بعض (شہدائے راہ خدا اور قوی الایمان مومنین کی مانند) طرح طرح کی نعمتوں میں غرق ہوں گے، جابر اور اشقیاء کی جماعت عذاب میں گرفتار ہوگی۔

امام حسین بن علی سید الشہداء علیہ السلام نے بھی کربلا میں عاشور کے دن اور جنگ کے شدت اختیار کرنے کے وقت موت کے بارے میں ایک لطیف تعبیر اپنے اصحاب سے بیان فرمائی تھی:

" صبرًا بنی الکرام: فما الموت الا قنطرۃ تعبر بکم عن البؤس والضراء الی الجنان الواسعۃ، والنعیم الدائمۃ، فایکم یکرہ ان ینتقل من سجن الی قصر، وما ھو لاعدائکم الا کمن ینتقل من قصر الی سجن وعذاب، ان ابی حدثنی عن رسول اللہ (ص) ان الدنیا سجن المؤمن وجنۃ الکافر، والموت جسر ھؤلاء الی جنانھم، وجسر ھؤلاء الی جحیمھم"

" صبر کرو! اے کریم اور بزرگوار لوگوں کے بیٹو! موت تو صرف ایک پل ہے جو تمھیں تکلیفوں اور ناراحتیوں اور

---

[1] بحار الانوار جلد ۶ ص ۱۵۵ (ظاہراً امام محمد بن علی سے مراد نویں امام امام جواد (ع) ہیں۔

رنج و الم سے بہشت کے وسیع باغات اور جاودانی نعمتوں کی طرف منتقل کردیتی ہے، تم میں سے کون ایسا ہے، جو زندان سے قصر میں منتقل ہونے سے تکلیف میں ہو، لیکن تمھارے دشمنوں کی مثال اس شخص کی مانند ہے جسے قصر سے زندان اور عذاب کی طرف منتقل کریں۔ میرے باپ نے رسولِ خدا سے نقل فرمایا کہ دنیا مومن کے لیے زندان ہے اور کافر کے لیے بہشت اور موت ان کے لیے تو جنت کے باغات کے لیے ایک پل ہے اور ان کے لیے جہنم کا پل ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں منقول ہوا ہے کہ: امام موسیٰ بن جعفرؑ ایک ایسے شخص کے پاس گئے جو سکرات موت میں مبتلا تھا، اور کسی شخص کو جواب نہیں دیتا تھا، لوگوں نے عرض کیا، اے فرزند رسول (ص)، ہمارا دل چاہتا ہے کہ آپ موت کی حقیقت کی ہمارے لیے تشریح فرمایئے اور ہمیں بتایئے کہ ہمارا بیمار اب کس حالت میں ہے؟

آپ نے فرمایا: "موت تصفیہ کا ایک ذریعہ ہے۔" جو مومنین کو گناہ سے پاک کرتی ہے، اور اس جہاں کی آخری تکلیف اور ناراحتی ہے اور ان کے گناہوں کا آخری کفارہ ہے؛ جب کہ کافروں کو ان کی نعمتوں سے جدا کرتی ہے، اور وہ آخری لذت ہے جو انہیں پہنچتی ہے اور ان کے اچھے کام کا جو کبھی کبھار انجام دیا کرتے تھے۔ آخری اجر ہے، باقی رہا تمھارا یہ شخص جو حالتِ احتضار میں ہے تو وہ کلی طور پر گناہوں سے پاک ہو چکا ہے اور معاصی سے خارج ہو چکا ہے، اور خالص ہو گیا ہے جس طرح سے کہ میلا کچیلا لباس دھونے سے پاک صاف ہو جاتا ہے اور اس نے ابھی سے یہ شائستگی اور لیاقت پیدا کر لی ہے کہ وہ ہمیشہ کے گھر میں ہم اہل بیت کی معاشرت میں رہے۔"[2]

۞ ۞ ۞

۲۔ سکرات موت

اوپر والی آیت میں "سکرات موت" کے بارے میں گفتگو تھی، اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ "سکرات" "سکرۃ" کی جمع ہے، اور اور وہ اس حالت کے معنی میں ہے، جو شدت حادثہ کے زیر اثر مستی کے مشابہ انسان کو عارض ہوتی ہے اور اس کو سخت مضطر کر دیتی ہے لیکن وہ مستی نہیں ہوتی،

یہ ٹھیک ہے کہ موت مومنین کے لیے ایک وسیع تر اور مواہب الٰہیہ سے پُر جہان کی طرف انتقال کا آغاز ہے۔ لیکن اس کے باوجود انتقال کی یہ حالت کسی بھی انسان کے لیے آسان نہیں ہے، کیونکہ روح سالہا سال سے اس بدن کے ساتھ خوگر رہی ہے اور اس کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔

اسی لیے جب امام صادق علیہ السلام سے یہ سوال کرتے ہیں کہ جب روح بدن سے خارج ہوتی ہے تو انسان تکلیف

---

[1] معانی الاخبار ص ۲۸۹ باب معنی الموت حدیث ۳۔

[2] معانی الاخبار ص ۲۸۹ باب معنی الموت۔

کیوں محسوس کرتا ہے تو آپؑ نے فرمایا: لانه نمى عليها البدن: "اس بنا پر کہ بدن کی نشو ونما اسی کے ساتھ ہوئی ہے"[۱]
یہ ٹھیک اس طرح ہے کہ ایک فاسد دانت کو منہ سے نکال دیں تو یقیناً اس کے بعد سکون و آرام ہوتا ہے۔ لیکن جدائی کا لمحہ
دردناک ہوتا ہے۔

بعض اسلامی روایات میں آیا ہے کہ تین دن انسان کے لیے وحشتناک ہوتے ہیں: ایک وہ دن جس میں وہ پیدا ہوا اور اس
نا آشنا عالم کو دیکھتا ہے، اور ایک وہ دن جس میں وہ مرتا ہے، اور موت کے بعد والے عالم کا مشاہدہ کرتا ہے، اور ایک وہ دن جس میں وہ
عرصہ محشر میں وارد ہوگا، اور ایسے احکام دیکھے گا جو دنیا میں نہیں تھے، اسی لیے خداوند عالم یحییٰ بن زکریا کے بارے میں فرماتا ہے:
"وسلام عليه يوم ولد ويوم يموت ويوم يبعث حيًّا" اور عیسیٰ بن مریم کی زبانی بھی اس کے مشابہ
گفتگو کو نقل کرتا ہے، اور ان دو پیغمبروں کو ان تین دنوں میں اپنی عنایت کا مشمول قرار دیتا ہے۔[۲]

لیکن یہ مسلم ہے کہ جو لوگ اس دنیا کے ساتھ خاص علاقہ رکھتے ہیں، اس سے ان کا انتقال بہت ہی زیادہ سخت ہے، اور اس
سے دل کو توڑنا جس کے ساتھ ان کو لگاؤ ہے زیادہ مشکل ہے، علاوہ ازیں جو لوگ زیادہ گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں، سکرات
موت ان کے لیے زیادہ شدید اور زیادہ دردناک ہے۔

۳۔ موت حق ہے

نہ صرف زیر بحث آیات میں "سکرات موت" کا "حق" کے ساتھ تعارف ہوا ہے، بلکہ دوسری متعدد آیات میں موت کو
حق کہا گیا ہے۔ سورۂ حجر کی آیہ ۹۹ میں آیا ہے: واعبد ربك حتى يأتيك اليقين: "اپنے پروردگار کی عبادت
کرتے رہیں یہاں تک کہ "یقین" (موت) تیرے پاس آجائے۔ (سورۂ مدثر کی آیہ ۴۷ میں بھی اس کے مشابہ تعبیر نظر آتی ہے)

یہ سب کچھ اس بنا پر ہے کہ انسان ہر چیز کا تو انکار کر سکتا ہے۔ لیکن اس واقعیت کا انکار نہیں کر سکتا، کہ انجام کار موت ہم
سب کے گھروں کا دروازہ کھٹکھٹائے گی اور سب کو اپنے ساتھ لے جائے گی۔

موت کی حقانیت کی طرف توجہ، تمام انسانوں کے لیے تنبیہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر طریقہ پر غور و فکر اور سوچ
بچار کریں، اور اس راستہ سے کہ جو ان کے آگے ہے باخبر ہوں اور اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کریں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے: ایک شخص عمر کے پاس آیا اور کہا: میں فتنہ کو دوست رکھتا ہوں،

---

[۱] "بحار"، جلد ۶، ص ۱۵۸۔

[۲] وہی مدرک (کچھ تلخیص کے ساتھ)، یحییٰ (ع) کے بارے میں سورۂ مریم کی آیہ ۱۵ میں آیا: "وسلام عليه يوم ولد ويوم يموت ويوم يبعث حيًّا" اور حضرت مسیح کے بارے میں اسی سورہ کی آیت ۳۳ میں آیا ہے۔ "والسلام علىّ يوم ولدت ويوم اموت ويوم ابعث حيًّا" مجھ پر سلام ہو جس دن پیدا ہوا اور جس دن مروں گا اور جس دن زندہ ہو کر ... اٹھایا جاؤں گا۔

اور حق سے بیزار ہوں، اور اس چیز کی گواہی دیتا ہوں جسے کبھی نہیں دیکھا۔ عمر نے اس کو قید کر دیا، یہ بات علیؑ کے کانوں تک پہنچی آپ نے فرمایا: اے عمر! اس شخص کو قید کرنا ظلم ہے، اور تو ایک ستم کا مرتکب ہوا ہے۔ اس نے کہا کیوں؟ آپ نے فرمایا کیونکہ وہ اپنے مال اور اولاد کو دوست رکھتا ہے، جنھیں خدا نے قرآن کی ایک آیت میں "فتنہ" سے تعبیر کیا ہے،

"انما اموالکم و اولادکم فتنة"[1] وہ موت سے بیزار ہے اور قرآن میں اسے "حق" سے تعبیر کیا گیا ہے "وجاءت سکرة الموت بالحق"[2] وہ خدا کی یکتائی کی شہادت دیتا ہے جس کو اس نے کبھی نہیں دیکھا۔ اس مقام پر عمر نے کہا: لولا علی لهلك عمر، "اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔"[3]

---

[1] تغابن - ۱۵-

[2] ق - ۱۹-

[3] "تفسیر روح البیان" جلد ۹ صفحہ ۱۱۸-

۲۳- وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ؕ

۲۴- اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ۙ

۲۵- مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ۙ

۲۶- الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ۝

۲۷- قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ ۝

۲۸- قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ۝

۲۹- مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۧ

۳۰- يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ۝

ترجمہ

۲۳- اس کا ہمنشین فرشتہ کہتا ہے، یہ اس کا نامہ اعمال ہے، جو میرے پاس حاضر اور تیار ہے۔

۲۴- (خدا حکم دے گا) جہنم میں ڈال دو، ہر کافر متکبر اور ہٹ دھرم کو۔

۲۵- وہ شخص جو شدت کے ساتھ خیر سے مانع ہے، متجاوز ہے، اور شک میں پڑا ہوا ہے (یہاں تک کہ دوسروں کو بھی شک میں ڈالتا ہے)

۲۶- وہ شخص کہ جس نے خدا کے ساتھ دوسرا معبود قرار دے دیا ہے (ہاں) اُسے شدید عذاب میں ڈال دو۔

۲۷۔ اور شیاطین میں سے اس کا ہمنشین کہے گا ، پروردگارا ! میں نے اُسے سرکشی کے لیے نہیں اُبھارا تھا ، لیکن وہ خود ہی دور دراز کی گمراہی میں تھا۔

۲۸۔ خدا کہے گا ، میرے پاس جدال و مخاصمت نہ کرو ، میں نے تو پہلے ہی تم پر اتمام حجت کر دیا ہے۔

۲۹۔ میرا کلام تغیر ناپذیر ہے ، اور میں کبھی بھی اپنے بندوں پر ستم نہیں کروں گا۔

۳۰۔ اس دن کو یاد کرو ، جب ہم جہنم سے کہیں گے ، کیا تو پُر ہو گئی ؟ اور وہ کہے کیا اس سے کچھ زیادہ بھی ہے۔

تفسیر

فرشتوں اور شیاطین میں سے انسان کے ہمنشین

ان آیات میں پھر معاد و قیامت کے ایک اور منظر کی تصویر کشی ہوئی ہے ، ایک ایسا ہلا دینے والا منظر کہ انسان کا قرین فرشتہ اس کے اعمال اور کرتوتوں کو کھول کر رکھ دے گا ، اور اس کی سزا کے لیے خدا کا حکم صادر ہو جائے گا۔

پہلے فرماتا ہے : "اس کا قرین کہے گا یہ اس کا اعمال نامہ ہے ، جو میرے پاس حاضر اور تیار ہے" اور وہ اس کے تمام چھوٹے بڑے کاموں سے جو اس نے ساری عمر میں کیے ہیں پردہ اُٹھا دے گا ، (وقال قرینه هذا ما لدی عتید)۔

اس سلسلے میں کہ یہاں "قرین" سے کون مراد ہے ؟ مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے۔ لیکن اکثر نے اس بات کو قبول کیا ہے کہ اس سے مراد وہ فرشتہ ہے جو دُنیا میں انسان کے ہمراہ تھا ، اور اس کے اعمال کو ضبط کرنے پر مامور تھا اور وہ دادگاہ عدل الٰہی میں گواہی دے گا۔

گذشتہ آیات جو یہ کہتی تھیں کہ جو شخص بھی عرصۂ محشر میں وارد ہوگا ، اس کے ساتھ ایک "سائق" اور "شہید" ہوگا۔ وہ بھی اس معنی پر گواہ ہے ، علاوہ ازیں اس آیت اور اس کی بعد والی آیت کا لب و لہجہ بھی اس معنی کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ (غور کیجیے)

لیکن بعض نے کہا ہے کہ "قرین" سے مراد یہاں "شیطان" ہے کیونکہ قرآن کی بہت سی آیات میں یہ لفظ اس شیطان کے لیے جو مجرموں کا ہمنشین ہے اطلاق ہوا ہے۔ اس تفسیر کی بنا پر آیت کا معنی اس طرح ہوگا، "اس کا ہمنشین شیطان کہے گا: میں نے اس مجرم کو جہنم کے لیے آمادہ کیا ہے، اور انتہائی کوشش جو میں کر سکتا تھا وہ میں نے اس کام میں صرف کی ہے"۔

لیکن یہ معنی نہ صرف گذشتہ آیات سے، اور اس آیت سے جو اس آیت کے بعد بلا فاصلہ آئی ہے۔ مناسب نہیں ہے، بلکہ شیطان کا انسانوں کے گمراہ کرنے کے گناہ سے خود کو بری کہنا، جو بعد کی چند آیات میں آئے گا۔ اس کے ساتھ بھی سازگار نہیں ہے، کیونکہ اس تفسیر کے مطابق شیطان مجرموں کے اغوا کرنے میں اپنی ذمہ داری کا اعتراف کر رہا ہے، جبکہ آگے آنے والی آیات میں یہ آیا ہے، "قال قرینه ربنا ما اطغیته ولکن کان فی ضلال بعید"؛ "اس کا قرین کہے گا: میں نے اُسے سرکشی کے لیے نہیں اُبھارا تھا، لیکن وہ خود ہی دور دراز کی گمراہی میں تھا"۔ اور یہ پورے طور پر اس کے ساتھ تضاد رکھتی ہے۔

یہاں ایک تیسری تفسیر بھی بیان ہوئی ہے جو سب سے زیادہ بعید نظر آتی ہے، اور کوئی بھی قرینہ اس پر گواہی نہیں دیتا، اور وہ یہ ہے کہ قرین سے مراد انسان کے دوست و احباب اور ہمنشین ہیں۔

اس کے بعد خدا جنت اعمال پر مامور دو فرشتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: "جہنم میں ڈال دو ہر متکبر خود خواہ اور ہٹ دھرم کافر کو" (القیا فی جهنم کل کفار عنید)۔

"عنید" "عناد" کے مادہ سے تکبر، خود پسندی اور حق کو تسلیم نہ کرنے کے معنی میں ہے۔

اس بارے میں کہ یہ دو افراد جو اس گفتگو کے مخاطب ہیں کون ہیں؟ پھر طرح طرح کی تفسیریں بیان کی گئی ہیں، ایک گروہ نے اوپر والی تفسیر کو انتخاب کیا ہے، جبکہ بعض نے خازنان جہنم (وہ دو نفر جو جہنم پر مامور ہیں) کو مخاطب سمجھا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ہو سکتا ہے مخاطب صرف ایک ہی شخص ہو، وہی شہید و گواہ جو مجرم کے ہمراہ عرصۂ محشر میں وارد ہوگا، اور جس کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے، اور فعل کو تاکید کے لیے تثنیہ لایا گیا ہے۔ گویا دو مرتبہ تکرار کرتا ہے۔ "الق" "الق" پھینک دے، پھینک دے"..... اور مخاطب واحد کے لیے تثنیہ کا استعمال عربی زبان میں موجود ہے۔ لیکن یہ تفسیر بہت ہی بعید نظر آتی ہے، اور پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔

بعد والی آیت میں ان "کفار عنید" کی چند قبیح اور مذموم صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ شخص شدت کے ساتھ خیر سے مانع ہے، متجاوز ہے اور شک و تردید میں گرفتار ہے، بلکہ دوسروں کو بھی شک میں ڈالتا ہے" (مناع للخیر معتد مریب)۔

"مناع" چونکہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ لہٰذا اس شخص پر بولا جاتا ہے جو کسی چیز سے بہت زیادہ منع کرے۔ اس بنا پر "مناع للخیر" وہ شخص ہے جو ہر صورت میں ہر کار خیر کا مخالف ہو۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ آیت " ولید بن مغیرہ" کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ وہ اپنے بھتیجوں سے کہتا تھا، جو شخص تم میں سے اسلام قبول کرے گا تو میں جب تک زندہ ہوں اس کی مدد نہیں کروں گا " ۔ لہ

" معتد" متجاوز کے معنی میں ہے، چاہے وہ دوسرے لوگوں کے حقوق میں متجاوز ہو، یا احکام الٰہی کی حدود سے تجاوز کرے۔

" مریب" " ریب " کے مادہ سے اس شخص کے معنی میں ہے، جو شک میں پڑا ہوا ہو۔ ایسا شک جو بدبینی کے ساتھ ہو، یا جو دوسروں کو اپنی گفتار و عمل کے ساتھ شک میں ڈالتا ہے، اور ان کی گمراہی کا باعث بنتا ہے۔

٭ ٭ ٭

اس گروہ عنید کے اوصاف کو جاری رکھتے ہوئے بعد والی آیت میں پھر مزید کہتا ہے: " وہی شخص جس نے خدا کے ساتھ دوسرا معبود قرار دیا ہے، اور اس نے شرک اور دوگانگی کی راہ اختیار کرلی ہے " (الذی جعل مع اللہ الٰھًا اٰخر)۔

ہاں " اس قسم کے شخص کو عذاب شدید میں ڈال دو " (فالقیاہ فی العذاب الشدید)۔

ان چند آیات میں اس دوزخی گروہ کی چھ صفات بیان ہوئی ہیں، جن میں سے پانچ پہلی حقیقت میں ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں، اور چھٹی ان تمام اوصاف کی اصل جڑ کی ترجمان ہے۔ کیونکہ :

" کفار " اس شخص کے معنی میں ہے جو کفر میں بہت زیادہ اصرار کرتا ہے۔

اور یہ عناد پر منتہی ہوتا ہے۔

شخص معاند بھی منع خیرات پر اصرار کرتا ہے اور اس قسم کا آدمی طبعاً و فطرتاً دوسروں کے حقوق اور حدود الٰہی پر تجاوز کرتا ہے۔

افراد متجاوز یہ اصرار کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی شک میں ڈال دیں اور ان سے ایمان کو سلب کرلیں۔

اس طرح سے پانچوں صفتیں " کفار" و " عنید" و " مناع للخیر" و " معتد" اور " مریب" ایک دوسرے کے ساتھ نہ ٹوٹنے والا رشتہ رکھتی ہیں، گویا ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں لہ

چھٹی صفت یعنی " الذی جعل مع اللہ الٰھًا اٰخر " میں ان تمام انحرافات کی اصل جڑ بنیاد جو شرک ہے بیان ہوئی ہے، کیونکہ وقت کے ساتھ واضح ہوجاتا ہے کہ شرک ان تمام بدبختیوں کا عامل ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

بعد والی آیت اس کافر ہٹ دھرم گروہ کی سرنوشت کے ایک دوسرے ماجرے سے پردہ اٹھاتی ہے، اور وہ قیامت میں ان کا شیطان کے ساتھ مخاصمہ، جھگڑا اور بحث ہے، وہ تو اپنے تمام گناہ اغوا کرنے والے شیطانوں کی گردن میں

لہ روح المعانی، جلد ۲۶ ص ۱۶۰۔

لہ المیزان، جلد ۱۸ صفحہ ۳۸۰۔

ڈالتے ہیں۔" لیکن اس کا قرینِ شیطان کہے گا: پروردگارا! میں نے اسے طغیان اور سرکشی کے لیے آمادہ نہیں کیا تھا۔ اور اسے جبراً اس راستہ پر نہیں لایا تھا، اس نے خود ہی اپنے میل وارادہ سے اس راستہ کو اختیار کیا ہے۔ اور وہی دُور دراز کی گمراہی میں تھا" (قال قرینہ ربنا ما اطغیتہ ولکن کان فی ضلال بعید)۔

یہ تعبیر اسی چیز کے مشابہ ہے جو سُورۂ ابراہیم کی آیہ ۲۲ میں آئی ہے، کہ شیطان اپنی برأت کے لیے کہے گا: وما کان لی علیکم من سلطان الا ان دعوتکم فاستجبتم لی فلا تلوموني ولوموا انفسکم: "میرا تم پر کسی قسم کا کوئی تسلط نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمھیں دعوت دی تو تم نے اُسے قبول کر لیا، اس بنا پر مجھے سرزنش نہ کرو، بلکہ اپنے آپ کو سرزنش کرو"

البتہ شیطان یہ نہیں چاہتا کہ انسان کے اغوا کرنے میں اپنے نقش واثر کا کلی طور پر انکار کردے، بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس بات کو ثابت کرے کہ اس میں کوئی جبر واکراہ نہیں تھا، اور انسان نے اپنے میل ورغبت سے اس کے وسوسوں کو قبول کیا ہے، اس بنا پر" لاغوینھم اجمعین" "میں ان تمام کو گمراہ کرکے چھوڑوں گا" (ص ۸۲) والی آیت کے ساتھ کوئی تضاد نہیں ہے۔

⁂

اگرچہ ان آیات میں صرف شیطان کے دفاع کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور شیطان پر کفار کے اعتراض کے بارے میں کوئی گفتگو نظر نہیں آتی، لیکن قرآن کی باقی آیات اور بعد والی آیت کے قرینہ سے طرفین کی گفتگو اجمالی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ وہ قیامت میں ایک دوسرے کے ساتھ کھینچا تانی اور بحث مباحثہ کریں گے، کیونکہ بعد والی آیت میں آیا ہے: "خدا فرماتا ہے: میرے پاس جدال ومخاصمت نہ کرو، میں نے پہلے سے تم پر اتمام حجت کر دیا ہے" اور تمھیں اس منحوس سرنوشت سے باخبر کر دیا ہے" (قال لا تختصموا لدی وقد قدمت الیکم بالوعید)[1]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک طرف تو میں نے شیطان سے کہا ہے: اذھب فمن تبعک منھم فان جھنم جزاؤکم جزاءً موفوراً: "جا! ان میں سے جو کوئی بھی تیری اتباع کرے گا، توتم سب کی وافر سزا جہنم ہے" (اسراء ۶۳)

اور دوسری طرف سے انسانوں کو بھی خبردار کر دیا ہے: لاملئن جھنم منک وممن تبعک منھم اجمعین "یقیناً میں جہنم کو تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے پُر کر دوں گا" (ص ۸۵)

یہ تہدیدیں اور وعیدیں قرآن کی دوسری آیات میں بھی آئی ہیں اور وہ سب اس بات کی ترجمانی کرتی ہیں کہ خدا نے انسانوں پر بھی اور شیاطین پر بھی اتمام حجت کر دیا تھا، اور انھیں گمراہ کرنے اور گمراہ ہونے سے ڈرایا تھا۔

اس کے بعد اور زیادہ تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: "میری بات تغیر ناپذیر ہے، اور میرے کسی کلام میں تبدیلی نہیں ہوتی، اور

---

[1] "لدی" "یبدل" سے متعلق ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ قول سے متعلق ہونا چاہیئے لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

میں ہرگز اپنے بندوں پر ظلم نہیں کروں گا" (ما یبدل القول لدی وما انا بظلام للعبید)[1]

یہاں "قول" سے مراد وہی تہدیدیں اور وعیدیں ہیں، جن کی طرف خدا نے مختلف آیات میں اشارہ کیا ہے، اور ان کے کچھ نمونے ہم نے اُوپر پیش کیے ہیں۔

• "ظلام" کی تعبیر "صیغہ مبالغہ" کی شکل میں (بہت ظلم کرنے والا) جبکہ خدا معمولی سے معمولی ظلم بھی نہیں کرتا، ممکن ہے یہاں بات کی طرف اشارہ ہو کہ خدا کا مقام علم و قدرت و عدل اس قسم کا ہے کہ اگر وہ کوئی چھوٹا سا ظلم بھی کسی پر کرے تو وہ بہت بڑا اور زیادہ ہوگا، اور "ظلام" کا مصداق ہوگا، اسی بنا پر وہ ہر قسم کے ظلم سے دُور ہے۔

یا افراد و مصادیق کی طرف ناظر ہے، کیونکہ اگر وہ کسی بندے پر کوئی چھوٹا سا ظلم بھی کرے تو اس کے مشابہ افراد بہت ہیں اور مجموعی طور پر بہت سا ظلم ہو جائے گا۔

بہر حال یہ تعبیر بندوں کے اختیار اور ارادے کی آزادی کی دلیل ہے، نہ تو شیطان مجبور ہے کہ شیطنت کرے اور نہ ہی کفار مجبور ہیں کہ راہ کفر و عناد اور راہ شیطان کو اختیار کریں، اور نہ ہی کسی شخص کے لیے اس کے قصد و ارادہ سے باہر قطعی سرنوشت مقرر ہوئی ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے، کہ وہ کیسے فرماتا ہے: میری بات تغیر ناپذیر ہے، جبکہ بعض لوگ اس کے عفو و درگزر اور بخشش کے مشمول ہوتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے، کہ عفو و بخشش بھی حساب شدہ پروگرام کے مطابق ہی ہوتی ہے، اور اس بات کی فرع ہے کہ انسان نے کوئی ایسا کام انجام دیا ہو، جس سے وہ مجرم ہونے کے ساتھ ساتھ عفو و بخشش کی قابلیت اور شائستگی بھی رکھتا ہو اور یہ بات خود خدا کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے، کہ وہ لوگ جو عفو و بخشش کے لائق ہیں انھیں اپنی عفو کا مشمول قرار دے اور یہ بات بھی تغیر ناپذیر ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

آخری زیر بحث آیت میں حوادث قیامت کے ایک مختصر اور ہلا دینے والے حصّہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

"اس وقت کو یاد کرو جب ہم جہنم سے کہیں گے، کیا تو پُر ہو گئی؟ اور وہ جواب میں کہے گی: کیا اس سے زیادہ بھی کچھ موجود ہے" (یوم نقول لجہنم ھل امتلأت وتقول ھل من مزید)[2]

اس سلسلے میں کہ "ھل من مزید" سے کیا مراد ہے؟ دو تفاسیر کی گئی ہیں، پہلی یہ کہ یہ استفہام انکاری ہے،

---

[1] "لدی" "یبدل" سے متعلق ہے، بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "قول" سے متعلق ہونا چاہیئے، لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

[2] اس بارے میں کہ یہاں "یوم" کس سے متعلق ہے؟ تین نظریئے پائے جاتے ہیں، پہلا یہ کہ "اذکروا" محذوف سے متعلق ہے اور اس کا مخاطب تمام انسان ہیں، دوسرا یہ کہ "یبدل" سے متعلق ہے اور تیسرا یہ کہ "ظلام" سے متعلق ہے، جو اس سے پہلے والی آیت میں آیا ہے، لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

یعنی جہنم کہے گی: اس سے زیادہ کا امکان نہیں ہے، تو اس طرح سے یہ سورہ سجدہ کی آیت ۱۳ کے ساتھ جو یہ کہتی ہے: "لاملئن جهنم من الجنة والناس اجمعين" "میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ دوزخ کو جنوں اور انسانوں سے پُر کر دوں گا" کامل طور سے ہم آہنگ ہے، اور اس معنی پر ایک تاکید ہے کہ اس دن تہدید الٰہی کامل طور سے پوری ہو جائے گی اور دوزخ کافروں اور مجرموں سے بھر جائے گی۔

دوسرا یہ کہ اس جملہ سے مراد اور زیادہ کی طلب ہے، یعنی "کیا اور افراد بھی ایسے ہوں گے۔ جو دوزخ میں آئیں گے؟" اور اصولی طور پر ہر چیز کی فطرت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی ہم جنس کی تلاش میں رہتی ہے اور کبھی سیر نہیں ہوتی۔ نہ بہشت نیکو کاروں سے اور نہ ہی دوزخ بدکاروں سے۔

لیکن یہ سوال باقی رہ جاتا ہے۔ کہ اس بات کا مفہوم تو یہ ہے کہ دوزخ ابھی تک پُر نہیں ہوئی اور یہ چیز اوپر والی آیت (سورۂ سجدہ۔ آیہ ۱۳) سے جو یہ کہتی ہے: "ہم دوزخ کو جنوں اور انسانوں سے پُر کر دیں گے": سازگار نہیں ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیئے کہ زیادتی کا مطالبہ پُر نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ "اولاً" ممکن ہے۔ کوئی ظرف مثلاً غذا سے پُر ہو، پھر بھی کوئی تمنا کرے کہ اس کے اُوپر اور ڈالا جائے کہ وہ چھلکنے لگے: "ثانیاً" یہ تقاضا ممکن ہے دوزخیوں پر مکان کے تنگ ہونے اور زیادہ دردناک عذاب کے تقاضا کے معنی میں ہو: یا وسعت پانے اور اس کے بعد بہت سے افراد کو اپنے اندر قبول کرنے کی تمنا مراد ہو۔

بہرحال یہ آیت اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ دوزخی بہت زیادہ ہیں اور دوزخ ایک ہولناک اور وحشتناک منظر رکھتی ہے اور خدا کی تہدید واقعی اور یقینی ہے، اور ایسی ہے کہ اس کے بارے میں غور و فکر کرنا ہر انسان کو لرزہ بر اندام کر دیتا ہے، اور اس کو خبردار کرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان افراد میں سے ایک تو ہو، اور یہی فکر اُسے چھوٹے بڑے گناہوں سے کنٹرول کر سکتی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ دوزخ جس میں کچھ بھی شعور نہیں ہے، کیسے اس سے خطاب کیا جاتا ہے اور وہ جواب دیتی ہے؟

اس سوال کے تین جواب ہیں۔

پہلا یہ کہ یہ ایک قسم کی تشبیہ اور زبان حال کا بیان ہے۔ یعنی خدا "تکوینی" زبان میں جہنم سے سوال کرے گا: اور وہ بھی "زبان حال" سے جواب دے گی اور اس تعبیر کی نظیر مختلف زبانوں میں فراواں ہے۔

دوسرا یہ کہ آخرت کا گھر حیاۃ و زندگی واقعی کا گھر ہے۔ یہاں تک کہ بہشت اور جہنم جیسی موجودات بھی ایک قسم کی حیات اور ادراک و شعور رکھتی ہوں گی، بہشت شدت سے مومنین کی مشتاق ہوگی اور دوزخ شدت کے ساتھ مجرموں کے انتظار میں ہوگی۔

وہ مقام جہاں انسان کے بدن کے اعضاء کلام اور گفتگو کرنے لگیں گے۔ اور شہادت اور گواہی دیں گے وہاں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ بہشت و دوزخ اس طرح ہوں۔

بلکہ بعض کے نظریہ کے مطابق اس دُنیا کے تمام ذرات بھی ایک قسم کا ادراک و شعور رکھتے ہیں، اسی لیے وہ خدا کی

حمد و تسبیح کرتے ہیں اور ان کی یہ تسبیح و حمد قرآن کی مختلف آیات میں بیان ہوئی ہے۔ [1]

دوسرا یہ کہ مخاطب دوزخ پر مامور اور اس کے خازن ہیں اور وہی ہیں جو جواب دیں گے۔

یہ سب تفسیریں قابل قبول ہیں اگرچہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۶ ..... (سورہ اسراء کی آیت ۴۴ کے ذیل میں رجوع کریں)

۳۱- وَاُزۡلِفَتِ الۡجَنَّةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ غَيۡرَ بَعِيۡدٍ ○

۳۲- هٰذَا مَا تُوۡعَدُوۡنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيۡظٍ ○

۳۳- مَنۡ خَشِىَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَيۡبِ وَجَآءَ بِقَلۡبٍ مُّنِيۡبِ ○

۳۴- ادۡخُلُوۡهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوۡمُ الۡخُلُوۡدِ ○

۳۵- لَهُمۡ مَّا يَشَآءُوۡنَ فِيۡهَا وَلَدَيۡنَا مَزِيۡدٌ ○

۳۶- وَكَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ هُمۡ اَشَدُّ مِنۡهُمۡ بَطۡشًا فَنَقَّبُوۡا فِى الۡبِلَادِ ؕ هَلۡ مِنۡ مَّحِيۡصٍ ○

۳۷- اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَذِكۡرٰى لِمَنۡ كَانَ لَهٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَى السَّمۡعَ وَهُوَ شَهِيۡدٌ ○

ترجمہ

۳۱- (اس دن) بہشت پرہیز گاروں کے نزدیک ہو جائے گی، اوران میں کوئی فاصلہ نہیں ہوگا۔

۳۲- یہ وہ چیز ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، اور (یہ وعدہ) ان لوگوں سے بھی ہے جو خدا کی طرف لوٹتے ہیں، اور اس کے عہد پیمان اور احکام کی حفاظت کرتے ہیں۔

۳۳- وہ شخص جو خدائے رحمٰن سے پوشیدہ طور سے ڈرے، اور توبہ و انابہ سے پُر

دل کے ساتھ اس کے حضور میں حاضر ہو۔

۳۴۔ (ان سے کہیں گے) سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ، آج کا دن ہمیشگی کا دن ہے۔

۳۵۔ جو کچھ وہ چاہیں گے وہاں ان کے لیے موجود ہوگا، اور ہمارے پاس دوسری مزید نعمتیں بھی ہیں (جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں گی۔

۳۶۔ کتنی ہی بہت سی ایسی اقوام ہیں، جنہیں ہم نے اُن سے پہلے ہلاک کیا ہے، ایسی اقوام جو اُن سے زیادہ طاقتور تھیں اور شہروں اور (ملکوں) کو انھوں نے فتح کیا تھا، کیا فرار کی کوئی جگہ ہے؟

۳۷۔ یہ اس شخص کے لیے، جو عقل رکھتا ہے، یا کان دھر کے سنتا ہے اور دل سے حاضر ہے، ایک تذکرا اور نصیحت ہے۔

تفسیر

اے مجرمو! فرار کی کوئی راہ نہیں ہے!

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس سورہ کے مباحث عام طور پر مسئلہ معاد اور اس سے مربوط امور کے محور کے گرد چکر لگاتے ہیں، اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گذشتہ آیات میں ہٹ دھرم کفار کے جہنم میں پھینکنے، اور ان کے شدت عذاب کی کیفیت، اور ان صفات کے متعلق جو انھیں دوزخ کی طرف کھینچ لے گئے تھے، گفتگو تھی، زیر بحث آیات میں ایک اور منظر کی تصویر کشی کرتا ہے، کامل احترام کے ساتھ پرہیزگاروں کے جنت میں داخل ہونے کا منظر، اور بہشت کی انواع و اقسام کی نعمتوں اور ان صفات کی طرف اشارہ جو انسان کو بہشتیوں کی صف میں قرار دیتی ہیں، تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ کرنے سے حقائق زیادہ واضح اور روشن ہو جائیں۔

پہلے فرماتا ہے: "اس دن بہشت پرہیزگاروں کے نزدیک ہو جائے گی اور ان سے اس کا کوئی فاصلہ نہیں ہوگا

(وازلفت الجنۃ للمتقین غیر بعید)۔

" ازلفت " " زلفیٰ " (بروزن کبریٰ) کے مادہ سے قرب و نزدیکی کے معنی میں ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ نہیں کہتا کہ پرہیزگاروں کو جنت کے قریب کریں گے، بلکہ یہ کہتا ہے کہ جنت کو ان کے قریب کریں گے! یہ ایک ایسا مطلب ہے، جو اس دُنیا کے حالات کو مدنظر رکھتے ہُوئے قابل تصور نہیں ہے، لیکن اس بنا پر کہ دارِ آخرت کے اصول کچھ ایسے ہیں جو اس جہان کے حالات سے بہت مختلف ہیں، اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ خدا پرہیزگار مومنین کے انتہائی اکرام و احترام کی بنا پر بجائے اس کے کہ انھیں جنت کی طرف لے جائے، جنت کو ان کی طرف لے آئے گا۔

سُورۂ شعراء کی آیت ۹۰ و ۹۱ میں آیا ہے، وازلفت الجنۃ للمتقین وبرزت الجحیم للغاوین:
اس دن جنت پرہیزگاروں کے قریب کر دی جائے گی، اور دوزخ کو گمراہوں کے لیے آشکار و ظاہر کریں گے۔

اور یہ خدا کا مومن بندوں پر انتہائی لطف و کرم ہے، جس سے بالاتر کا تصور نہیں ہو سکتا۔

"غیر بعید" کی تعبیر بھی تاکید کے عنوان سے ہے۔ [1]

بہر حال آیت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ مسئلہ قیامت میں واقع ہوگا۔ اگرچہ تعبیر فعل ماضی (ازلفت) کے ساتھ ہوئی ہے، کیونکہ وہ یقینی حوادث جو مستقبل میں واقع ہوں، بہت سی تعبیروں میں فعل ماضی کی صورت میں بیان ہوتے ہیں، لیکن بعض نے اس کا واقعات ماضی کے ساتھ معنی کیا ہے، اور یہ کہا ہے کہ جنت کا پرہیزگاروں کے نزدیک ہونا دُنیا میں حاصل ہو چکا ہے، کیونکہ جنت کے اور ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ اِدھر وہ دُنیا سے جائیں گے اور اُدھر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

لیکن قبل و بعد کی آیات کی طرف توجہ کرتے ہُوئے جو قیامت کے منظر کی گفتگو کر رہی ہیں، یہ معنی بعید نظر آتا ہے اور مناسب وہی پہلی تفسیر ہے۔

ۛ ۛ ۛ

اس کے بعد بہشتیوں کے اوصاف کی تفصیل بتاتا ہے: "یہ وہ جنت ہے، جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، اور یہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو خدا کے حکم کی اطاعت کی طرف لوٹتے ہیں، اور اس کے عہد و پیمان اور احکام کی حفاظت کرتے ہیں" (ھٰذا ما توعدون لکل اواب حفیظ)۔

یہاں ان کے اوصاف میں سے دو اوصاف کی طرف اشارہ ہُوا ہے،

" اواب " اور " حفیظ "

" اواب " " اوب " (بروزن ذوب) کے مادہ سے بازگشت کے معنی میں ہے، جو ممکن ہے چھوٹے بڑے گناہوں

---

[1] " غیر بعید " ممکن ہے کہ " ظرف " ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ " حال " ہو، یا صفت ہو محذوف مصدر کی اور تقدیر میں " ازلافاً غیر بعید " ہو۔

سے توبہ کے معنی میں ہو یا اس کی اطاعت کی طرف بازگشت کے معنی میں ہو، اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہُوئے کہ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے: یہ نشاندہی کرتا ہے کہ بہشتی ایسے پرہیزگار لوگ ہیں کہ جو عالم بھی انھیں خدا کی اطاعت سے دُور کرتا ہو، وہ اس کی طرف فوراً متوجہ ہو جاتے ہیں اور اس کی اطاعت کی طرف لوٹ آتے ہیں، اور اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں سے توبہ کرتے ہیں تاکہ نفسِ مطمئنہ کے مقام تک پہنچ جائیں۔

"حفیظ" محافظ اور نگران کے معنی میں ہے، کیا اس سے مراد خدا کے عہد و پیمان کی حفاظت ہے، جو اس نے انسانوں سے لیا ہے۔ کہ اس کی اطاعت کریں اور شیطان کی عبادت نہ کریں (یٰس۔ ۶۰) یا خدا کے قوانین اور حدودِ الٰہی کی حفاظت؟ یا گناہوں کو چھوڑنا اور انھیں توبہ کے لیے یاد رکھنا اور ان کی تلافی کرنا؟ یا یہ سب امور؟۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہُوئے کہ یہ حکم مطلق صُورت میں ذکر ہُوا ہے۔ آخری تفسیر جو جامعیت رکھتی ہے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

ٌ ٌ ٌ

ان اوصاف کو جاری رکھتے ہُوئے۔ جو حقیقت میں گذشتہ اوصاف کی تفسیر و توضیح ہیں۔ بعد والی آیت میں ان کے دو اور اوصاف کی طرف اشارہ کرتا ہے اور فرماتا ہے: "وہی شخص جو تنہائی میں خدائے رحمٰن سے ڈرے اور توبہ کرنے والے دل کے ساتھ اس کے حضور میں حاضر ہو" (من خشی الرحمٰن بالغیب وجاء بقلب منیب)۔

پوشیدہ طور پر خدا سے ڈرنے کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ وہ اس کے باوجود کہ ہرگز خدا کو آنکھ سے نہیں دیکھتے، اس کے آثار میں غور کر کے اور استدلال کے طریقے سے اس پر ایمان لاتے ہیں، ایسا ایمان جو کامل مسئولیت کے احساس سے توام ہے۔

یہ احتمال بھی موجود ہے، کہ لوگوں کی آنکھ سے پنہاں مراد ہو، وہ نہ صرف لوگوں کے سامنے بلکہ تنہائی اور خلوت میں بھی کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔

یہ خوف اور "خشیت" اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ ان کا دل "منیب" ہو، ہمیشہ کے لیے خدا کی طرف متوجہ ہو جائے اور اس کی اطاعت میں آگے بڑھے، اور ہر لغزش و گناہ سے توبہ کرے، اور اس حالت کو آخر عمر تک برقرار رکھے، اور اسی حالت میں عرصۂ محشر میں وارد ہو،

اس کے بعد مزید کہتا ہے، : جن لوگوں میں یہ چار صفات پائی جاتی ہیں، جب بہشت ان کے نزدیک ہو جائے گی تو "خدا کے فرشتے احترام و اکرام کے عنوان سے ان سے کہیں گے، سلامتی کے ساتھ جنت میں وارد ہو جاؤ" (ادخلوھا بسلام)۔

ہر قسم کی بُرائی، دُکھ درد، آفت وبا، سزا و عذاب سے مکمل جسمانی و روحانی سلامتی،

اس کے بعد ان کے اطمینانِ قلب کے لیے مزید کہتا ہے، : "آج جاودانی اور ہمیشگی کا دن ہے، نعمتوں کی ہمیشگی، اور بہشت کی اپنی تمام نعمتوں کے ساتھ ہمیشگی" (ذالک یوم الخلود)۔

ان دو نعمتوں (سلامتی کی بشارت اور ہمیشہ ہمیشہ بہشت میں رہنے کی بشارت) کے بعد خداوند منان انہیں دو بشارتیں اور دیتا ہے جو مجموعی طور پر چار بشارتیں ہو جاتی ہیں، ان چار اوصاف کی طرح جو ان میں پائے جاتے تھے، فرماتا ہے، "وہ جو کچھ بھی چاہیں گے بہشت میں ان کے لیے موجود ہے" (لھم ما یشاءون فیھا)۔

اور اس کے علاوہ "دوسری نعمتیں بھی ہمارے پاس موجود ہیں جو کبھی ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ کہ وہ ان کی تمنا کریں"۔ (ولدینا مزید)۔

اس سے زیادہ بہتر، عمدہ تر اور دل پسند تعبیر کا تصور بھی نہیں ہوتا، پہلے کہا ہے، بہشتی لوگ جو کچھ چاہیں (اس جملہ کے معنی کی وسعت کے ساتھ) انواع و اقسام کی نعمتیں بغیر کسی استثنا کے ان کے اختیار میں ہوں گی، اور ان کے علاوہ بھی ایسی نعمتیں اور مواہب ہیں جو ہرگز کسی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ لیکن خداوند رحمٰن و رحیم، جس نے بہشتی پرہیزگاروں کو، اپنے خاص الطاف سے نوازا ہے، انھیں ان نعمتوں سے بھی بہرہ ور کرے گا اور اس طرح سے جنت کی نعمتیں اتنی حد سے زیادہ وسیع پہلو پیدا کر لیں گی، جن کی توصیف بیان سے باہر ہے۔

ضمنی طور پر اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ خدائی اجر و پاداش اور مومنین کے اعمال کے درمیان کوئی موازنہ نہیں ہے، بلکہ وہ اس سے کہیں زیادہ اور بہت ہی برتر و بالا تر ہے۔ اور اس مرحلہ میں ہم ہر جگہ اس کے فضل و کرم کے روبرو ہیں، کیا اس کی سزا ہیں اور کیا اس کے عدل سامنے۔

❊ ❊ ❊

بہشت و دوزخ، اور بہشتیوں اور دوزخیوں کے صفات اور ان کے درجات و مراتب کے بارے میں گفتگو کو ختم کرنے کے بعد اس بحث سے کامل طور پر نتیجہ نکالنے کے لیے مجرموں کی طرف توجہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کتنی بہت سی قومیں ایسی ہیں جن کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیا ہے، وہ قومیں جو ان سے زیادہ قوی اور طاقتور تھیں انہوں نے کئی ملک فتح کیے تھے اور کئی شہروں پر مسلط ہوئے تھے، لیکن وہ کفر و ظلم و ستم اور گناہ کی وجہ سے نابود ہو گئیں" (وکم اھلکنا قبلھم من قرن ھم اشد منھم بطشا فنقبوا فی البلاد)۔

کیا اس قسم کے افراد کے لیے موت اور عذاب الٰہی سے فرار کی کوئی راہ ہے؟ (ھل من محیص)۔

"قرن" اور "اقتران" اصل میں دو چیزوں یا کئی چیزوں کے ایک دوسرے سے نزدیک ہونے کے معنی میں ہے، اور اس جماعت کو جو ایک ہی زمانہ میں زندگی بسر کرتے ہیں "قرن" کہا جاتا ہے، اس کے بعد یہ لفظ زمانہ کے ایک حصہ پر بولا جانے لگا جسے کبھی تو تیس سال اور کبھی سو سال کہا ہے۔

اس بنا پر کئی "قرنوں" کو ہلاک کرنے کا معنی کئی گذشتہ اقوام کو ہلاک کرنا ہے۔

"بطش" کسی چیز کو قوت و قدرت کے ساتھ پکڑنے کے معنی میں ہے، اور کبھی جنگ جدال کے معنی میں بھی آتا ہے۔

"نقبوا" "نقب" کے مادہ سے اس سوراخ کے معنی میں ہے جو دیوار یا چمڑے میں کرتے ہیں، لیکن "ثقب" صرف اس سوراخ کو کہتے ہیں جو لکڑی میں کرتے ہیں۔

یہ لفظ" جب کسی فعل کی صورت میں استعمال ہو، تو یہ حرکت اور اصلاح کے مطابق راستہ کھولنے اور پیش روی کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اور کشور کشائی اور مختلف علاقوں میں نفوذ کے معنی میں بھی آیا ہے۔

" منقبت" بھی اسی مادہ سے ہے، اور یہ لفظ ان برجستہ اشخاص کے افعال و صفات پر ۔۔ اس نفوذ و تاثیر کی بناء پر جو وہ لوگوں میں رکھتے ہیں، یا راستے کو ترقی کے لیے کھولتے ہیں۔ بولا جاتا ہے۔

" نقیب" اس شخص کو کہتے ہیں، جو کسی جمیعت کے بارے میں بحث و تحقیق کرتا ہے اور ان کے اوضاع و احوال سے باخبر ہوتا ہے اور ان کے اندر نفوذ پیدا کرتا ہے۔

" محیص" " حیص" (بروزن حیف) کے مادہ سے کسی چیز سے انحراف اور عدول کرنے کے معنی میں ہے، اور اسی مناسبت سے مشکلات سے فرار کرنے اور میدان جنگ میں شکست کھا جانے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

بہرحال یہ آیت پیغمبرؐ کے زمانے کے ہٹ دھرم کفار کو تنبیہ کر رہی ہے ۔ وہ گزشتہ لوگوں کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں، اور ان کے آثار کو تاریخ کے صفحات میں اور پڑنے زمین پر دیکھیں، غور کریں کہ خدا نے اس سے پہلے کی سرکش اقوام کے ساتھ کیا کیا؟ وہ قومیں جو ان سے زیادہ کثرت میں تھیں اور زیادہ طاقتور تھیں، اور پھر وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچیں۔

یہ معنی بارہا قرآن مجید میں آیا ہے، منجملہ سورۂ زخرف کی آیہ ۸ میں بیان ہوا ہے: " فاهلكنا اشد منهم بطشا"

" ہم نے ان اقوام کو جو ان سے زیادہ طاقتور تھیں ہلاک کر دیا"

بعض مفسرین زیر بحث آیت کو قوم " ثمود" کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، جو حجاز کے شمال میں " حجر" کی کوہستانی سرزمین میں زندگی بسر کرتی تھی وہ پہاڑوں کو کاٹ کر ان میں پرشکوہ گھر اور قصر و محلات بناتی تھی، لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے اور انہیں بھی اور ان کے علاوہ دوسری اقوام کو بھی شامل ہے۔

" هل من محيص" (کیا بھاگنے کی کوئی راہ ہے؟) کا جملہ ممکن ہے گزشتہ اقوام کی زبانی ہو، جو عذاب کے چنگل میں گرفتاری کے وقت اس مطلب کا ایک دوسرے سے سوال کرتے تھے، یا پروردگار کی طرف سے پیغمبرؐ کے زمانے کے ہٹ دھرم کفار کے بارے میں ہو، یعنی کیا اس دردناک سرنوشت سے جو گزشتہ سرکش اقوام کے سامنے آئی فرار کر سکتے ہیں؟

آخری زیر بحث آیت میں زیادہ تاکید کے لیے مزید کہتا ہے:

" یقیناً گزشتہ لوگوں کی سرنوشت میں، اس شخص کے لیے۔ جو عقل رکھتا ہے، یا کان لگا کر سنتا ہے اور حاضر (دماغ) ہے تذکر اور ایک نصیحت ہے" (ان فی ذالك لذكرٰى لمن كان له قلب او القى السمع وهو شهيد)۔

یہاں بھی اور قرآن کی دوسری آیات میں بھی جو درک مسائل کے بارے میں بحث کرتی ہیں، " قلب" سے مراد وہی " عقل" و شعور و ادراک ہے، لغت کی کتابوں میں بھی " قلب" کا ایک معنی " عقل" ہی بتایا گیا ہے۔ " راغب" نے " مفردات" میں زیر بحث آیت میں " قلب" کی علم و فہم سے تفسیر کی ہے، " لسان العرب" میں بھی یہی بیان ہوا ہے کہ بعض اوقات " قلب" عقل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے [1]

---

[1] لسان العرب مادۂ قلب۔

ایک حدیث میں امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے بھی اسی آیت کی تفسیر میں آیا ہے کہ "قلب" سے مراد عقل ہے[1]
اصل میں اس لفظ "قلب" کی جڑ بنیاد، بدلنے اور ایک حالت سے دوسری حالت میں آنے کے معنی میں ہے، اور اصطلاح کے مطابق قلبؑ انقلاب ہے، اور چونکہ انسان کی فکر و عقل ہمیشہ دگرگونی کی حالت میں ہے، اس لیے اس کو "قلب" کہا گیا ہے، اور اسی بنا پر قرآنی آیات میں دل کے سکینہ و آرام یا اطمینان قلب پر تکیہ ہوا ہے، هو الذی انزل السکینة فی قلوب المؤمنین: "وہ وہی ہے کہ جس نے مومنین کے دل میں سکینہ و آرام نازل کیا۔ (فتح۔۴)" الا بذکر الله تطمئن القلوب "آگاہ رہو کہ خدا کی یاد دلوں کے اطمینان کا باعث ہے" (رعد۔۲۸) ہاں! اس بے قرار موجود کو صرف یادِ خدا سے قرار و سکون حاصل ہوتا ہے۔

"القی السمع" (کان کو ڈالے) کان دھرنے، اور انتہائی انہماک اور توجہ سے سننے سے کنایہ ہے، اس تعبیر کے مشابہ جیسے ہم فارسی میں بولتے ہیں "گوش ما نزد تو است" (ہمارا کان تمہارے پاس ہے، یعنی ہم تیری باتوں کو اچھی طرح سے سن رہے ہیں۔
"وشہید" یہاں اس شخص کے معنی میں ہے جو حضورِ قلب رکھتا ہو، اور اصطلاح کے مطابق اس کا دل مجلس میں ہے اور وہ دقت کے ساتھ مطالب کو سمجھتا ہے۔

اور اسی طرح سے آیت مجموعی طور پر اس طرح معنی دیتی ہے:
دو گروہ ان مواعظ سے پند و نصیحت حاصل کر سکتے ہیں۔ پہلا گروہ وہ ہے جو عقل و ہوش رکھتا ہے، اور خود مستقل طور پر مسائل کا تحلیل و تجزیہ کر سکتا ہے، دوسرا گروہ وہ ہے جو اس حد میں تو نہیں ہیں، لیکن وہ علماء اور دانشمندوں کے لیے اچھے سامعین بن سکتے ہیں، اور حضورِ قلب کے ساتھ ان کی باتوں کو سنتے ہیں، اور حقائق کو ان کے ارشاد و رہنمائی کے طریق سے معلوم کرتے ہیں۔
اس گفتگو کی شبیہ سورۂ ملک کی آیہ ۱۰ میں بھی آئی ہے جس میں دوزخیوں کے قول کو اس طرح نقل کرتا ہے، لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر، اگر ہم سننے والے کان یا کافی عقل و ادراک رکھتے ہوتے تو ہرگز دوزخیوں کی صف میں قرار نہ پاتے" کیونکہ راہِ حق کی نشانیاں واضح و آشکار ہیں، لہٰذا وہ لوگ جو خود اہل تحقیق ہیں اس کو اچھی طرح حاصل کر لیتے ہیں اور جو اس قسم کے نہیں ہیں، وہ عادل اور ہمدرد علماء کی رہنمائی کے ذریعے اپنی راہ معلوم کر سکتے ہیں، اسی بنا پر ضروری ہے کہ یا تو انسان کے پاس کافی مقدار میں علم و عقل ہو، یا سننے والے کان رکھتا ہو۔[2]

---

[1] اصول کافی جلد ۱ کتاب العقل والجہل حدیث ۱۱۔
[2] توجہ رکھیں کہ دونوں آیات میں یہ دو مطالب "او" کے لفظ کے ساتھ ایک دوسرے پر عطف ہوا ہے جو نشاندہی کرتا ہے کہ کم از کم ان دونوں میں سے ایک ہونا چاہیے

۳۸۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ○

۳۹۔ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ○

۴۰۔ وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ○

ترجمہ

۳۸۔ ہم نے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے کو چھ دن (چھ دوروں) میں پیدا کیا ہے۔ اور ان کے پیدا کرنے میں ہمیں کسی قسم کی تکان اور کمزوری نہیں ہوئی۔

۳۹۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر صبر و شکیبائی اختیار کر، اور طلوع آفتاب سے پہلے، اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اپنے پروردگار کی تسبیح و حمد بجالا۔

۴۰۔ اور رات کے ایک حصہ میں اس کی تسبیح کر اور سجدوں کے بعد۔

تفسیر

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے

گزشتہ آیات کو بیان کرنے اور مختلف دلائل کے بعد جو قیامت کے بارے میں ان میں بیان ہوئی ہیں، ان آیات میں امکان معاد کے دلائل میں سے ایک دلیل کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کے بعد پیغمبرؐ کو صبر و شکیبائی اور پروردگار کی تسبیح و حمد کا حکم دیتا ہے۔ تاکہ مخالفین کی کارشکنیوں کو اس طریقے سے انھیں برداشت کرتے ہوئے بے کار کردے۔

پہلے فرماتا ہے: "ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کو چھ دن (چھ دوروں) میں پیدا کیا ہے، اور ان کے پیدا کرنے میں ہمیں کسی قسم کی تھکان اور کمزوری نہیں ہوئی (ولقد خلقنا السماوات والارض وما بینھما فی ستة ایام وما مسّنا من لغوب)

"لغوب" تعب اور خستگی کے معنی میں ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ جس کی قدرت محدود ہو اگر وہ کسی ایسے کام کو انجام دینا چاہے، جو اس کی توانائی سے زیادہ ہو تو وہ تھک کر چور ہو جائے گا، لیکن اس ہستی کے بارے میں جس کی قدرت غیر محدود اور اس کی توانائی غیر متناہی ہو یہ امور کوئی مفہوم نہیں رکھتے، اس بنا پر وہ ذات جو قادر ہے کہ کسی قسم کے تعب و رنج کے بغیر ان باعظمت آسمانوں اور زمین کو اور ان سب ستاروں، سیاروں کروں اور کہکشاؤں کو ایجاد کرے، وہ اس بات کی بھی قدرت رکھتا ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کردے اور زندگی کا لباس اس کے بدن پر پہنا دے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی ایک شان نزول نقل کی ہے کہ: یہودی یہ خیال کرتے تھے کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو چھ "دن" (ہفتہ کے چھ دن) میں پیدا کیا ہے، اس کے بعد ہفتہ کے دن اس نے آرام کیا، اور اپنا ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر رکھا، اور اسی بنا پر وہ اس طرح سے بیٹھنے کو غیر مطلوب شمار کرتے ہیں، اور اسے خدا کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں، تو اوپر والی آیت نازل ہوئی[1] اور اس قسم کی بےمعنی خرافات کو ختم کردیا۔

لیکن یہ شان نزول اس بات سے مانع نہیں ہے، کہ آیت امکان معاد کے مسئلہ کا تعاقب کرے، جبکہ اس کے ساتھ ساتھ پروردگار کی توحید، علم اور قدرت پر بھی ایک دلیل ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو ان تمام عجائبات اور غرائب کے ساتھ اور لاکھوں کروڑوں زندہ موجودات، اور عجیب و غریب اسرار اور اس کے مخصوص نظاموں کو پیدا کیا ہے، کہ جن کے ایک ہی گوشہ میں غور و فکر کرنا اس توانا پیدا کرنے والے کی طرف جس کے دست قدرت نے اس عظیم گردش کرنے والے کو حرکت دی ہے، اور ہر جگہ نور حیات و زندگی کو پھیلایا ہے، ہماری رہنمائی کرسکتا ہے۔

آسمانوں اور زمین کی "چھ دن" میں خلقت کا موضوع بارہا آیات قرآنی میں آیا ہے[2]

کلمہ "یوم" جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کرچکے ہیں، عربی زبان میں اس کا متبادل "روز" فارسی زبان میں، یا باقی زبانوں میں بہت سے مواقع پر دوران کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، نہ کہ چوبیس گھنٹوں کے معنی میں، یا بارہ گھنٹوں کے معنی میں، مثلاً ہم کہتے ہیں: ایک دن لوگ پیغمبر اسلامؐ کے سایہ میں زندگی بسر کرتے تھے، اور دوسرے دن بنی امیہ اور بنی عباس کے جبار بادشاہ ان پر مسلط ہو گئے

واضح رہے کہ "روز" ان تعبیروں میں "دور" کے معنی میں ہے، چاہے وہ ایک سال ہو یا سو سال، یا ہزاروں لاکھوں سال، مثلاً: کہتے ہیں ایک دن کرۂ زمین آگ کا ایک ٹکڑا تھا، دوسرے دن وہ سرد ہوئی، اور زندگی کے لیے آمادہ، تو یہ تمام تعبیریں

---

[1] تفسیر "در المنثور" جلد ۶ ص ۱۱۰۔

[2] مثلاً سورۂ اعراف ۵۴ سورۂ یونس ۳ سورۂ ہود ۷، سورۂ سجدہ ۴، سورۂ حدید ۴، سورۂ فرقان ۵۹۔

ادوار کی طرف اشارہ ہیں۔

اس بنا پر اوپر والی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے آسمانوں زمین اور ان دونوں کی تمام موجودات کو چھ ادوار میں پیدا کیا۔

اس گفتگو کی تفصیل و تشریح ہم جلد ۴ ص ۱۲۹ سورۂ اعراف کی آیہ ۵۴ کے ذیل میں کر چکے ہیں۔

اس بنا پر اس سوال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ سورج اور کرۂ زمین کی خلقت سے پہلے تو شب و روز تھے ہی نہیں تاکہ خدا نے عالم کو چھ دن میں پیدا کیا ہو۔

معاد کے مختلف دلائل اور قیامت کے مختلف مناظر کی تصویر کشی کرنے کے بعد، چونکہ ایک گروہ حق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا اور باطل پر اڑے ہوئے ہٹ دھرمی کرتا رہتا ہے لہٰذا پیغمبرؐ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے، "جو کچھ وہ کہتے ہیں۔ ان پر صبر کرو اور شکیبائی سے کام لو" (فاصبر علی ما یقولون)۔

کیونکہ صرف صبر و شکیبائی کی قوت سے ہی ان مشکلات پر کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور دشمن کی سازشوں کو درہم و برہم کیا جا سکتا ہے، اور حق کی راہ میں ان کی ناروا نسبتوں کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ صبر و استقامت مدد و نصرت کی محتاج ہے، اور بہترین مدد و نصرت، خدا کی یاد، اور جہاں کو پیدا کرنے والے کے علم و قدرت کے مبدأ سے ارتباط پیدا کرتا ہے۔ اس حکم کے بعد مزید کہتا ہے:

"اور آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے اپنے پروردگار کی تسبیح و حمد بجا لا" (وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل الغروب)۔

اسی طرح "رات کے ایک حصہ میں اس کی تسبیح کر اور سجدوں کے بعد بھی" (ومن الليل فسبحه وادبار السجود)۔

یہ دوامی یاد اور مسلسل تسبیح، بارش کے حیات بخش قطروں کی طرح تیرے دل و جان کی سرزمین پر پڑنی چاہیئے یہ اُسے سیراب کرتی ہے، تجھے ہمیشہ نشاط و حیات بخشتی ہے، اور ہٹ دھرم دشمنوں کے مقابلہ میں استقامت کی دعوت دیتی ہے۔

اس بارے میں کہ خدا کی ان چار مواقع پر (طلوع آفتاب سے پہلے، اس کے غروب سے پہلے، رات کے وقت اور سجدوں کے بعد) تسبیح کرنے سے کیا مراد ہے؟ مفسرین کے درمیان بہت زیادہ اختلاف ہے۔

بعض کا نظریہ تو یہ ہے کہ یہ تعبیریں روزانہ کی پنجگانہ نمازوں کی طرف اشارہ ہے اور بعض کے نزدیک پُرفضیلت نوافل کی طرف اشارہ ہے اس طرح سے کہ "قبل طلوع الشمس" نماز صبح کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس کا آخری وقت طلوع آفتاب ہے۔

اور "قبل الغروب" (غروب آفتاب سے پہلے) نماز ظہر و عصر کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ان دونوں کا آخری وقت غروب آفتاب ہے۔

"ومن الليل" (رات میں سے) نماز مغرب و عشاء کو بیان کرتا ہے "وادبار السجود" (سجدوں کے بعد) غرب

کے نوافل کی طرف اشارہ ہے، جو مغرب کے بعد بجالائے جاتے ہیں۔

• ابن عباس نے اس تفسیر کو قبول کیا ہے، اس قید کے ساتھ کہ "ادبار السجود" کو تمام نوافل نمازوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جو فرائض کے بعد انجام دیئے جاتے ہیں، لیکن چونکہ روزانہ کی نوافل میں ہمارے نظریہ کے مطابق صرف مغرب وعشار کے نوافل ہیں جو ان نمازوں کے بعد انجام پاتے ہیں، لہٰذا یہ تعمیم صحیح نہیں ہے۔

بعض دوسروں نے "قبل طلوع الشمس" کو نماز صبح کی طرف اور "قبل الغروب" کو نماز عصر کی طرف اور "من اللیل فسبحہ" کو مغرب وعشار کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور اس طرح سے بغیر کسی واضح وجہ کے نماز ظہر کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ اور یہ چیز اس تفسیر کے ضعف کی دلیل ہے۔

ایک روایت میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ جب آپؑ سے آیہ "وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب" کے بارے میں لوگوں نے سوال کیا، تو آپؑ نے فرمایا:

تقول حین تصبح وحین تمسی عشر مرات لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد، یحیی ویمیت، وھو علی کل شیء قدیر:

"ہر صبح وشام دس مرتبہ یہ ذکر کہے لا الٰہ الا اللّٰہ ...... [1]

یہ تفسیر پہلی تفسیر کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتی، اور ممکن ہے کہ یہ دونوں ہی آیت کے معنی میں جمع ہوں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس معنی کی نظیر تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۳۰ میں بھی آئی ہے۔ جہاں فرماتا ہے: وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبھا ومن اٰناء اللیل فسبح واطراف النھار لعلک ترضٰی۔"

"طلوع آفتاب سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے، اور اسی طرح رات کے دوران میں، اور دن کے اطراف میں پروردگار کی تسبیح کر تاکہ تو راضی وخوشنود ہو جائے۔"

لعلک ترضٰی کا جملہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے، کہ یہ عبادات اور تسبیحات فکر ونظر کے سکون اور دل کی مسرت میں اہم اثر رکھتی ہیں اور اس نت نئے قسم کے حوادثات کے مقابلہ میں قوت وتوانائی بخشتی ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ سورۂ طور کی آیہ ۴۹ میں اس طرح آیا ہے، ومن اللیل فسبحہ وادبار النجوم:

"رات کے کچھ حصہ میں خدا کی تسبیح کر اور ستاروں کے پشت پھیرنے کے وقت۔ [2]

---

[1] "مجمع البیان" زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] توجہ کرنا چاہیئے کہ یہاں "ادبار" (بروزن اقبال) پشت کرنے کے معنی میں ہے، اور زیر بحث آیات میں "ادبار" بروزن (ابزار) "دبر" کی جمع ہے جو پشت کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر "ادبار السجود" کا معنی سجدوں کے بعد ہے، اور "ادبار النجوم" کا معنی ستاروں کا پشت پھیرنے کا وقت ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ علیؑ نے فرمایا: "ادبار السجود" وہ دو رکعت نافلہ ہے جو تم مغرب کے بعد پڑھتے ہو اور توجہ ہے کہ مغرب کے نافلہ چار رکعت ہیں، جن میں سے یہاں دو رکعت کی طرف اشارہ ہوا ہے؛ اور "ادبار النجوم" دو رکعت نافلہ صبح میں، جو نماز صبح سے پہلے اور ستاروں کے غروب ہونے کے وقت بجالاتے ہیں۔[1]

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ "ادبار السجود" سے وہی نماز وتر ہے جو آخر شب میں انجام دی جاتی ہے۔[2]

بہرحال پہلی تفسیر سب سے مناسب نظر آتی ہے، اگرچہ مفہوم تسبیح کی وسعت اور کشادگی میں بہت سی دوسری تفسیریں جن کی طرف روایات میں اشارہ ہوا ہے، شامل ہو جاتی ہیں؛

نکتہ

صبر و شکیبائی ہر کامیابی کا راز ہے:

یہ پہلا موقع نہیں ہے، جہاں قرآن مجید مشکلات اور ہٹ دھرم اور دشمن افراد کے مقابلہ میں صبر و شکیبائی کی تلقین کرتا ہے قرآن مجید عظیم پیغمبر اسلامؐ کو بھی اور عام مومنین کو بھی بار بار یہ اہم مسئلہ دل نشین کراتا ہے، اور بکثرت تجربات بھی اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ غلبہ و کامیابی انہی افراد کے لیے ہے، جو صبر و استقامت کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام صادقؑ نے اپنے دوستوں میں سے ایک سے (جو شاید اس زمانہ کے سخت حالات میں بے تاب ہو جاتا تھا) فرمایا: علیك بالصبر فی جمیع امورك: "تجھ پر لازم ہے کہ تمام کاموں میں صبر و شکیبائی رکھے:

اس کے بعد مزید فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور ان کو صبر و تحمل اور مدارات کا حکم دیا، اور انہوں نے صبر کیا یہاں تک کہ لوگوں نے ان کی طرف بہت سی ناروا نسبتیں بھی دیں۔ اور جب آپ کا سینہ تنگ ہو گیا تو خدا نے ان پر یہ آیت نازل کی: ولقد نعلم انك یضیق صدرك بما یقولون فسبح بحمد ربك وكن من الساجدین: "ہم جانتے ہیں کہ تو ان کی باتوں سے بے چین ہو جاتا ہے، اور تیرا سینہ تنگ ہو جاتا ہے۔

پس تو اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجالا اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جا" (حجر - ۹۷، ۹۸)

پھر بھی انھوں نے آپ کی تکذیب ہی کی اور ہر طرف سے تہمت کے تیر آپ کی طرف پھینکے، اور اس بنا پر آپ محزون و مغموم ہوئے۔ خدا نے ان کی دل داری اور تسلی کے لیے یہ آیت نازل فرمائی:- قد نعلم انه لیحزنك الذی یقولون فانهم لایكذبونك ولكن الظالمین بأیات الله یجحدون ولقد كذبت رسل من قبلك فصبروا علی ما كذبوا اوذوا حتی اتاهم نصرنا، "ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتیں

---

[1] مجمع البیان زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] گذشتہ مدرک۔

تجھے اندوہگین کرتی ہیں۔ لیکن یہ لوگ (صرف) تیری تکذیب نہیں کرتے بلکہ یہ ستمگر آیات خدا کی تکذیب کرتے ہیں۔ انھوں نے تجھ سے پہلے بھی خدا کے رسولوں کی تکذیب کی تھی، اور انھوں نے تکذیبوں اور آزاروں کے مقابلہ میں صبر کیا، یہاں تک کہ ہماری نصرت ان کی مدد کے لیے آن پہنچی۔ (انعام۔ ۳۳، ۳۴)

اس کے بعد امامؑ مزید فرماتے ہیں: پیغمبرؐ نے اپنے آپ کو صبر و شکیبائی کے لیے آمادہ و تیار کر لیا، لیکن اس موقع پر ان لوگوں نے معاملہ کو حد سے زیادہ کر دیا، اور انھوں نے خدا کا نام لے کر اس کی ساحت قدس کی نسبت تکذیب کی، تو پیغمبرؐ نے فرمایا میں نے اپنے لیے اور اپنے گھر والوں اور اپنی حیثیت کے لیے نا ملائم باتوں پر تو صبر کر لیا۔ لیکن میں اپنے پروردگار کو بُرا بھلا کہنے پر صبر نہیں کر سکتا، اس موقع پر خداوند عزوجل نے اس (زیر بحث آیت) کو نازل فرمایا: ولقد خلقنا السماوات والارض وما بینھما ...... (ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ چھ دوروں میں پیدا کیا ہے (اور عالم کی خلقت میں ہم نے جلدی اور عجلت سے کام نہیں لیا) اور ہمیں کوئی دکھ اور رنج نہیں پہنچا۔ اس بنا پر تم بھی عجلت نہ کرو اور ان کی باتوں کے سامنے صبر کرو، یہ وہ مقام تھا کہ پیغمبرؐ نے صبر و شکیبائی کو تمام حالات میں پیش نظر رکھا، (یہاں تک کہ دشمنوں پر کامیاب ہو گئے) [1]

---

[1] "اصول کافی" (بمطابق نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۱۸)۔

۴۱۔ وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ ۝

۴۲۔ يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوجِ ۝

۴۳۔ إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ ۝

۴۴۔ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۚ ذَٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ ۝

۴۵۔ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ ۖ وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِجَبَّارٍ ۖ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ ۝

ترجمہ

۴۱۔ کان دھر کے سُن اور اس دِن کا منتظر رہ جب ایک ندا کرنے والا قریب کے مکان سے ندا دے گا۔

۴۲۔ وہ دن جس میں سب لوگ قیامت کے صیحہ (چیخ) کو حق کے ساتھ سُنیں گے، وہ دن خروج کا دن ہے۔

۴۳۔ ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔

۴۴۔ وہ دن جب زمین ان کے اُوپر سے پھٹ جائے گی، اور (وہ قبروں سے) تیزی کے ساتھ باہر نکلیں گے، اور یہ جمع کرنا ہمارے لیے آسان ہے۔

۴۵۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں ہم اُس سے اچھی طرح آگاہ ہیں، اور تم ان کو مجبور کرنے پر مامور نہیں ہو پس اس بنا پر

تم تو قرآن کے ذریعہ ان لوگوں کو جو میرے عذاب سے ڈرتے ہیں، نصیحت کرتے رہو۔

تفسیر

قیامت کے صیحہ (چیخ) کے ساتھ ہی سب زندہ ہو جائیں گے

یہ آیات جو سورۂ "ق" کی آخری آیات ہیں اس سورہ کی باقی آیات کی طرح مسئلہ معاد و قیامت کو ہی بیان کرتی ہیں، اور پھر اس کے ایک اور گوشہ کو پیش کرتی ہیں، اور وہ مسئلہ "نفخ صور" اور مردوں کے قبروں سے اٹھنے کا ہے۔

فرماتا ہے: "کان دھر کے سن اور اس دن کا منتظر رہ جس دن ایک ندا کرنے والا نزدیک کے مکان سے ندا کرے گا" (واستمع یوم ینادِ المناد من مکان قریب)۔

"وہ دن جس میں قیامت کے صیحہ (چیخ) کو حق کے ساتھ سنیں گے، وہ دن خروج کا دن ہے۔" (یوم یسمعون الصیحة بالحق ذالک یوم الخروج)۔

"استمع" (کان دھر کے سن) میں مخاطب اگرچہ پیغمبرؐ کی ذات ہے لیکن مسلمہ طور پر اس سے مراد تمام انسان ہیں۔

"کان دھرنے سے مراد، یا تو انتظار کرنا ہے، کیونکہ جو لوگ کسی حادثہ کا انتظار کرتے ہیں۔ جو ایک وحشتناک حادثہ سے شروع ہو گا وہ ہمیشہ کان کھڑے رکھتے ہیں، اور منتظر رہتے ہیں، یا خدا کی اس گفتگو پر کان دھرنا مراد ہے، اور معنی اس طرح ہوگا:

"اس گفتگو کو سن جو تیرا پروردگار قیامت کے صیحہ (چیخ) کے بارے میں کر رہا ہے۔[1]

لیکن یہ ندا دینے والا کون ہوگا؟ ممکن ہے کہ خدا کی ذات پاک ہو جو یہ ندا دے گی، لیکن زیادہ قوی احتمال یہی ہے کہ وہ اسرافیل ہوگا، جو "صور" پھونکے گا، اور قرآن کی آیات میں نام کے ساتھ تو نہیں۔ لیکن دوسری تعبیروں کے ساتھ اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

"مکان قریب" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ صدا اس طرح فضا میں پھیل جائے گی، کہ گویا ہر ایک کے کان

---

[1] پہلی تفسیر کے مطابق "یوم" "استمع" کا مفعول ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق "استمع" کا مفعول محذوف ہے اور تقدیر میں: "استمع حدیث ربک" ہوگا۔ باقی رہا "یوم" کا منصوب ہونا اس صورت میں اس فعل کی وجہ سے ہے جو یوم الخروج سے سمجھا جاتا ہے، اور معنی کے اعتبار سے اس طرح ہے: یخرجون یوم ینادِ المناد۔

کی خبر میں ہے اور سب کے سب اس کو قریب سے سنیں گے، موجودہ زمانہ میں ہم مختلف وسائل سے کہنے والوں کی باتوں کو جو دنیا کے کہیں دُور دراز مقام پر کر رہا ہوتا ہے، قریب سے سُن سکتے ہیں، گویا وہ بالکل ہمارے قریب ہی بیٹھا ہوا ہے اور ہم سے بات کر رہا ہے، لیکن اس دن سب لوگ ان وسائل کی احتیاج کے بغیر منادیِ حق کی آواز کو، جو قیامت کی صدا بلند کر رہا ہوگا اپنے قریب سے سنیں گے۔ [1]

بہرحال یہ صیحہ، وہ پہلا صیحہ نہیں ہے جو اس جہان کے ختم کرنے کے لیے ہوگا، بلکہ یہ دوسرا صیحہ ہے، یعنی وہی قیام و حشر کا صیحہ، اور حقیقت میں دوسری آیت پہلی آیت کی توضیح و تفسیر ہے، کہتا ہے:

وہ دن جس میں صیحہ کو حق کے ساتھ سنیں گے، قبروں سے نکلنے اور زمین کی مٹی سے باہر آنے کا دن ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اور اس غرض سے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اس عظیم دادگاہ اور عدالت میں حاکم کون ہے ہم مزید کہتا ہے: "ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں، اور سب لوگ ہماری ہی طرف لوٹ کر آئیں گے" (انا نحن نحي ونميت والينا المصير)۔

احیاء سے مراد وہی دُنیا میں پہلی مرتبہ زندہ کرنا ہے، اور مارنے سے مراد عمر کے آخر میں مرنا ہے، اور "الینا المصیر" کا جملہ قیامت میں زندہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

درحقیقت آیت اس نکتہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جس طرح پہلی موت و حیات ہمارے ہاتھ میں ہے، اسی طرح پھر دوبارہ زندگی کی طرف لوٹانا، اور قیام قیامت بھی ہمارے ہی ہاتھ میں ہے، اور ہماری ہی طرف ہے۔

اس کے بعد مزید وضاحت کے لیے فرماتا ہے: "ان کی بازگشت ہماری طرف اس دن ہوگی جب زمین ان کے اوپر سے شگافتہ ہو جائے گی اور وہ زندہ ہو جائیں گے اور سرعت کے ساتھ نکل کھڑے ہوں گے" (یوم تشقق الارض عنهم سراعًا)۔ [2]

---

[1] مفسرین کی ایک جماعت نے یہ احتمال دیا ہے کہ "مکان قریب" "صخرہ بیت المقدس" ہے (وہی مخصوص پتھر جو بیت المقدس میں ہے، جس سے آسمان کی طرف پیغمبر کا معراج شروع ہوا تھا) منادی اس کے پاس کھڑا ہو جائے گا اور پکارے گا: ايتها العظام البالية ! والاوصال المنقطعة، واللحوم المتمزقة، قومي لفصل القضاء، وما اعد الله لكم من الجزاء:

اے بوسیدہ ہڈیو! اور اے کٹی ہوئی رگو! اور اے بکھرے ہوئے گوشت، فیصلہ اور جزاء کے لیے جو تمہارے لیے مقرر ہو چکی ہوئی ہے، اٹھو کھڑے ہو۔

لیکن اس احتمال پر کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے۔

[2] "سراع" جمع ہے "سریع" کی، جیسا کہ "کرام" جمع ہے "کریم" کی اور یہاں حال ہے، یخرجون کے فاعل کا جو محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا "یخرجون سراعًا" بعض سراع کو مصدر سمجھتے ہیں جو حال کی جگہ واقع ہوا ہے۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "قیامت میں لوگوں کا یہ حشر اور جمع کرنا ہمارے لیے سہل اور آسان ہے" (ذالک حشر علینا یسیر)۔

"حشر" جمع کرنے اور ہر طرف سے اکٹھا کرنے کے معنی میں ہے۔

یہ واضح ہے کہ وہ خدا جو آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، پیدا کرنے والا ہے، اس کے لیے مردوں کا حشر و نشر تو ایک سادہ اور آسان کام ہے۔ اصولی طور پر مشکل و آسان تو اس کے لیے ہوتا ہے، جس کی قدرت محدود ہو، وہ ذات جس کی قدرت غیر محدود ہے، تمام چیزیں اس کے لیے یکساں اور آسان ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں یہ آیا ہے: پہلا شخص جو زندہ ہوگا، اور قبر سے باہر نکل کر میدانِ محشر میں وارد ہوگا وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں گے اور علی علیہ السلام ان کے ہمراہ ہوں گے۔[1]

٭ ٭ ٭ ٭

آخری زیرِ بحث آیت میں جو اس سورہ کی بھی آخری آیت ہے، باری تعالیٰ اپنے پیغمبر کو ان کے سخت اور ہٹ دھرم مخالفین کے مقابلہ میں ایک بار پھر تسلی اور دلداری دے رہا ہے، اور فرماتا ہے: "جو کچھ وہ کہتے ہیں، ہم اس سے بخوبی آگاہ ہیں" (نحن اعلم بما یقولون)۔

اور تم انہیں ایمان کے لیے مجبور کرنے پر مامور نہیں ہوئے ہو، جو تم قہر اور جبر کے ساتھ انہیں اسلام کی طرف کھینچو" (وما انت علیھم بجبار)۔

تمہاری ذمہ داری تو صرف ابلاغِ رسالت، حق کی طرف دعوت اور بشارت و انذار ہے" جب ایسا ہے تو ان لوگوں کو جو میرے عذاب و عقاب سے ڈرتے ہیں، قرآن کے ذریعہ میری یاد دلاؤ اور پند و نصیحت کرو" (فذکر بالقراٰن من یخاف وعید)۔[2]

تفسیر قرطبی میں آیا ہے کہ "ابن عباس" کہتے ہیں: کچھ لوگوں نے عرض کیا، اے رسولِ خدا ہمیں انذار کیجئے اور ڈرایئے تو اوپر والی آیت نازل ہوئی۔ اور کہا: فذکر بالقراٰن من یخاف وعید۔[3]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن مومن افراد کو خوف دلانے اور بیدار کرنے کے لیے کافی ہے، اس کا ہر صفحہ قیامت کی یاد دھانی کراتا ہے، اور اس کی مختلف آیات، گذشتہ لوگوں کی سرنوشت کو واضح کرتی ہیں اور بہشت کی نعمتوں، دوزخ کے عذابوں کا بیان اور ان حوادث کی توصیفیں، جو قیامت کے قریب اور دادگاہ عدلِ الٰہی میں واقع ہوں گے، سب کے

---

[1] کتاب خصال، مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۱۱۹۔

[2] توجہ رکھیں کہ "وعید" اصل میں "وعیدی" تھا "یاء" حذف ہوگئی ہے، اور کسرہ جو اس پر دلیل ہے باقی رہ گیا ہے۔ اور "وہ" "یخاف" کا مفعول ہے۔

[3] "قرطبی" جلد ۹ ص ۱۸۰۔

سب بہترین پند و نصیحت کی صورت میں موجود ہیں۔

واقعاً اس منظر کی یاد آوری کہ زمینیں پھٹ جائیں گی، اور مٹی میں جان پڑ جائے گی، مُردے لباس حیات پہن لیں گے اور حرکت میں آجائیں گے، قبروں سے باہر نکل کھڑے ہوں گے، درحالیکہ وحشت و اضطراب سب کو سرتاپا گھیرے ہوتے ہوگا اور انھیں درگاہ عدل الٰہی کی طرف ہانک کر لے جایا جائے گا، یہ ایک لرزہ خیز منظر ہوگا۔

خصوصاً جبکہ زمانے کے گذرنے کے ساتھ ساتھ مختلف انسانوں کی قبریں ایک قبر بن چکی ہوگی۔ اور بہت سے افراد کو اس نے اپنے اندر ہیگڑے رکھی ہوگی جن میں سے بعض صالح اور بعض غیر صالح ہوں گے، اور بعض مومن اور بعض کافر ہوں گے، اور بقولِ شاعر:

رب قبر قد صار قبرًا مرارًا ضاحک من تزاحم الاضداد

ودفین علی بقایا دفین فی طویل الاجال والامداد

کتنی بہت سی قبریں ایسی ہیں جو بار بار قبریں بنی ہیں ایسی قبریں جو تزاحم اضداد سے ہنستی ہیں۔

اور کتنے بہت سے ایسے افراد ہیں جو دوسرے انسانوں کے بقیہ حصوں میں دفن ہوئے ہیں، طول زمان اور قرون واعصار میں۔

پروردگارا! ہمیں ایسے لوگوں میں سے قرار دے جو تیری "وعید" سے ڈرتے ہیں، اور تیرے قرآن سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

خداوندا! اس دن جب وحشت واضطراب نے سب کو گھیرا ہوا ہوگا، ہمیں اپنی رحمت سے سکون عنایت فرما۔

بار الٰہا! زندگی کے دن تو جتنے بھی ہوں بڑی تیزی سے گزر جائیں گے۔ لیکن جو ہمیشہ ہمیشہ رہے گا وہ تیرا آخرت کا گھر ہے، ہمیں حسن عاقبت اور آخرت میں نجات مرحمت فرما۔ آمین یارب العالمین

سورۂ "قٓ" کا اختتام
جمعرات ۱۰ محرم الحرام ۱۴۰۶ھ

۱۱ رمضان المبارک بروز اتوار صبح پونے پانچ بجے بر مکان حقیر بلاک ۱۱ کوی جمشیدی محل سلطان محمد شریف قم المقدسہ ایران

احقر
صفدر حسین نجفی

سورۂ ذاریات

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا

اور

اس کی ۶۰ آیات ہیں

شروع ۱۷ محرم الحرام ۱۴۰۶ھ

سورۂ ذاریات
کے
مطالب

اس سورہ میں بحث کا محور پہلے درجہ میں معاد و قیامت اور مومنین اور کفار کی جزا و سزا سے مربوط مسائل ہیں، لیکن اس لحاظ سے سورۂ "ق" کی طرح نہیں ہے، بلکہ اس سورہ میں بحث کے لیے دوسرے عنوانات بھی نظر آتے ہیں۔

کلی طور پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس سورہ کے مباحث ذیل کے پانچ محوروں کے گرد گردش کرتے ہیں۔

۱۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، اس کے ایک حصہ میں معاد و قیامت اور اس کے متعلقات کے مباحث بیان ہوئے ہیں۔

۲۔ اس سورہ کے دوسرے حصہ میں مسئلہ توحید اور نظام آفرینش میں خدا کی آیات اور نشانیوں کا بیان ہوا ہے، جو طبعی طور سے معاد کے مباحث کی تکمیل کرتا ہے۔

۳۔ تیسرا حصہ ان فرشتوں کی داستان کے بارے میں ہے۔ جو ابراہیمؑ کے مہمان ہوئے تھے۔

۴۔ اس سورہ کی دوسری آیات موسیٰؑ و قوم عاد و قوم ثمود اور قوم نوح کے داستانوں سے متعلق مختصر اشارے ہیں، اور ان کے ذریعہ دوسرے کفار اور مجرموں کو خبردار کرتا ہے۔

۵۔ اور آخر میں اس سورہ کا ایک اور حصہ متعصب اور ہٹ دھرم اقوام کے گذشتہ انبیاء سے مبارزہ کرنے کو بیان کرتا ہے اور پیغمبر اسلام کو جو سخت ترین مخالفین کے مقابلہ میں قرار پائے تھے۔ تسلی دیتا ہے، اور استقامت کی دعوت۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"من قرأ سورة الذاريات في يومه او ليلته اصلح الله له معيشته واتاه برزق واسع ونورله قبره بسراج يزهر الى يوم القيامة"

"جو شخص دن یا رات کے وقت سورۂ ذاریات کو پڑھے گا خدا اس کی زندگی کے حالات اور معیشت

کی اصلاح کرے گا. اس کو وسیع روزی دے گا، اور اس کی قبر کو ایک ایسے چراغ سے روشن کرے گا جو قیامت کے دن تک چمکتا رہے گا۔[1]

ہم بارہا بیان کر چکے ہیں، کہ ان عظیم اجروں کو حاصل کرنے کے لیے صرف زبان کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد ایسی تلاوت ہے، جو فکر و نظر میں تحریک پیدا کرے۔ اور انسان کو عمل پر ابھارے۔

ضمنی طور پر اس سورہ کی نامگذاری "ذاریات" کے ساتھ اس سورہ کی پہلی آیت کی مناسبت سے ہے۔

---

[1] مجمع البیان، آغاز سورہ ذاریات ۔۔ ثواب الاعمال، مطابق نقل تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۲۰۔

سورۂ ذاریات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ وَالذّٰرِيٰتِ ذَرۡوًا ○

۲۔ فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا ○

۳۔ فَالۡجٰرِيٰتِ يُسۡرًا ○

۴۔ فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا ○

۵۔ اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ ○

۶۔ وَّاِنَّ الدِّيۡنَ لَوَاقِعٌ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ ان ہواؤں کی قسم جو بادلوں کو چلاتی ہیں (اور گرد و غبار اور نباتات کے بیجوں کو حرکت میں لاتی ہیں۔

۲۔ اور پھر ان بادلوں کی قسم جو (بارش کا) بار سنگین اپنے ساتھ اٹھاتے ہیں۔

۳۔ پھر قسم ہے ان کشتیوں کی جو آسانی کے ساتھ چلتی ہیں۔

۴۔ اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو کاموں کو تقسیم کرتے ہیں۔

۵۔ (ہاں ! ان سب کی قسم) جو کچھ تجھے وعدہ دیا گیا ہے وہ یقیناً سچ ہے۔

۶۔ اور بلاشک و شبہ اعمال کی جزا واقع ہو کر رہے گی۔

تفسیر

طوفانوں اور بارش لانے والے بادلوں کی قسم

سورہ "والصافات" کے بعد یہ دوسری سورت ہے جو بار بار کی قسموں کے ساتھ شروع ہوتی ہے، پُرمعنی اور فکر انگیز قسمیں، بیدار کرنے والی اور آگاہی بخش قسمیں۔

قرآن کی بہت سی دوسری سورتیں، جن سے ہم انشاء اللہ آئندہ کے مباحث میں گفتگو کریں گے، اسی قسم کی ہیں! اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ قسمیں غالباً مسئلہ معاد و قیامت کے بیان کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہیں، چند موقعوں کے سوا جو مسئلہ توحید اور دوسری باتوں کے ساتھ مربوط ہیں، اور یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان قسموں کا مضمون قیامت کے مطالب کے ساتھ ایک خاص ربط رکھتا ہے، اور ایک خاص عمدگی اور زیبائی کے ساتھ قرآن اس اہم بحث کا مختلف طریقوں سے جواب دے رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآنی قسمیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے، اس آسمانی کتاب کے اعجاز کی صورتوں، اور قرآن کے زیباترین اور روشن ترین حصوں میں سے ایک ہے، جن میں سے ہر ایک کی تشریح و تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

اس سورہ کے آغاز میں خدا نے پانچ مختلف موضوعات کی قسم کا ذکر کیا ہے، جن میں سے چار تو ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، اور ایک حصہ علیحدہ صورت میں آیا ہے۔

پہلے فرماتا ہے "قسم ہے ان ہواؤں کی جو بادلوں کو فضا میں چلاتی ہیں اور گرد و غبار اور گیاہ اور پھولوں کے بیج روئے زمین میں ہر جگہ بکھیرتی ہیں" (والذاریات ذروًا)۔[1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "قسم ہے ان بادلوں کی جو بارش کا سنگین بوجھ اپنے ساتھ اٹھائے پھرتے ہیں۔" (فالحاملات وقرًا)۔[2]

---

[1] "ذاریات" جمع ہے "ذاریہ" کی، ایسی ہواؤں کے معنی میں جو چیزوں کو اٹھاتی ہیں۔

[2] "وقر" (بروزن فکر) بھاری بوجھ کے معنی میں ہے۔ نیز کانوں کے بھاری ہونے کے معنی میں آیا ہے۔ "وقار" بھی سنگینی، حرکات اور سکون و بردباری کے معنی میں ہے۔

"اور قسم ہے ان کشتیوں کی جو عظیم دریاؤں اور سمندروں کی سطح پر آسانی کے ساتھ چلتی ہیں" (فالجاریات یسرًا)۔ [1]

"اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو کاموں کو تقسیم کرتے ہیں" (فالمقسمات امرًا)۔

ایک حدیث میں جسے بہت سے مفسرین نے اسی آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے یہ آیا ہے کہ "ابن الکوا" [2] نے ایک دن علی علیہ السلام سے، جبکہ آپؑ منبر پر خطبہ دے رہے تھے، سوال کیا، "الذاریات ذروًا" سے کیا مراد ہے؟ آپؑ نے فرمایا: ہوائیں!

اس نے عرض کیا، "فالحاملات وقرًا" فرمایا بادل!

اس نے عرض کیا: "فالجاریات یسرًا" فرمایا، کشتیاں!

اس نے عرض کیا: "فالمقسمات امرًا" فرمایا: فرشتے مراد ہیں!

اس کے باوجود دوسری تفسیریں بھی ہیں، جو اس تفسیر کے ساتھ قابلِ جمع ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ "جاریاتِ یسرًا" سے مراد وہ نہریں اور دریا ہیں جو بارشوں کے ذریعہ جاری ہوتے ہیں اور "فالمقسمات امرًا" سے مراد وہ رزق ہیں جو فرشتوں کے ذریعہ کھیتی باڑی کے طریق سے تقسیم ہوتے ہیں۔

اس طرح سے ہواؤں کے بارے میں پھر بادلوں کے بارے میں اور اس کے بعد دریاؤں اور نہروں کے بارے میں، اور آخر میں نباتات کے اگانے کے سلسلے میں گفتگو ہوئی ہے، جو مسئلہ معاد کے ساتھ جو اس کے بعد آیا ہے، قریبی مناسبت رکھتی ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ امکانِ معاد کی ایک دلیل مردہ زمینوں کو بارش کے ذریعہ زندہ کرنے کا مسئلہ ہے جو قرآن میں بارہا مختلف عبارتوں میں ذکر ہوا ہے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ ممکن ہے یہ چاروں اوصاف سب کے سب ہواؤں کے اوصاف ہوں، وہ ہوائیں جو بادلوں کو پیدا کرتی ہیں۔ اور وہ ہوائیں جو انھیں اپنے دوش پر اٹھائے پھرتی ہیں اور وہ ہوائیں جو انھیں ہر طرف چلاتی ہیں اور وہ ہوائیں جو بارش کے قطروں کو ہر طرف بکھیرتی ہیں۔ [3]

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ان آیات کی تعبیریں جامع اور کلی ہیں، لہٰذا وہ ان تمام معانی کو اپنے اندر

---

[1] "جاریات" "جاریہ" کی جمع ہے جو کشتی کے معنی میں ہے، جاری پانی کی نہروں کے معنی میں بھی آیا ہے۔ "فیھا عین جاریۃ" (غاشیہ - ۱۲) اور اسی طرح سورج کے معنی میں، آسمان میں اس کی حرکت کی بنا پر، اور نوجوان لڑکی کو بھی "جاریۃ" کہا جاتا ہے کیونکہ جوانی کی خوشی اس کے تمام وجود میں جاری ہوتی ہے۔

[2] اس کا نام عبداللہ تھا، جو امیرالمومنین علیؑ کے زمانہ میں رہتا تھا اور آپ کے سخت ترین دشمنوں میں سے تھا، خود کو ان کا دوست کہتا تھا اور کارشکنی کرتا تھا۔

[3] "تفسیر فخر رازی" جلد ۲۸ صفحہ ۱۹۰۔

جگہ دے سکتی ہیں۔ لیکن عمدہ وہی پہلی تفسیر ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر فرشتے مراد ہوں، تو فرشتے کن امور کو تقسیم کرتے ہیں؟

اس کے لیے ہمارا جواب یہ ہے کہ تقسیم کار ممکن ہے کہ اس عالم کے کل امور کی تدبیر سے مربوط ہو، کیونکہ فرشتگان الٰہی کے کچھ گروہ خدا کے فرمان سے اس کے امور کی تدبیر کو اپنے ذمہ لیے ہوئے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تقسیم ارزاق، یا زمین کے مختلف منطقوں میں بارش کے قطرات کی تقسیم سے مربوط ہو۔ [1]

ان چار قسموں کو بیان کرنے کے بعد جو سب کی سب اُس مطلب کی اہمیت کو بیان کرتی ہیں، جو اُن کے بعد آرہا ہے، فرماتا ہے: "جو کچھ تمہیں وعدہ دیا گیا ہے، وہ یقیناً سچ ہے" (انما توعدون لصادق)۔ [2]

دوبارہ تاکید کے عنوان سے مزید کہتا ہے: "اس میں شک نہیں کہ اعمال کی جزاء واقع ہو کر رہے گی" (وان الدین لواقع)۔

"دین" یہاں جزاء کے معنی میں ہے، جیسا کہ "مالک یوم الدین" میں آیا ہے، اور اصولاً قیامت کا ایک نام "یوم الدین" روزِ جزاء ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے، کہ واقع ہونے والے وعدوں سے مراد، یہاں قیامت وحساب و جزاء وسزا وبہشت و دوزخ سے مربوط وعدے، اور معاد سے مربوط تمام امور ہیں، اس بناء پر پہلا جملہ قیامت کے تمام وعدوں کو شامل ہے، اور دوسرا جملہ مسئلہ جزاء پر ایک تاکید ہے۔

بعد کی چند آیات میں بھی "یوم الدین" کے بارے میں گفتگو آئی ہے۔ اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے وہ قسمیں جو اس سورہ کے آغاز میں آئی ہیں، وہ ان قسموں کے نتائج کے ساتھ ایک واضح و روشن تعلق اور مناسبت رکھتی ہیں، کیونکہ بادلوں کا چلنا، بارش کا برسنا، اور اس کے نتیجہ میں مردہ زمینوں کا زندہ ہونا خود قیامت و معاد کے منظر کی اس دنیا میں نشاندہی کرتا ہے۔

بعض مفسرین نے "ما توعدون" کی یہاں ایک زیادہ وسیع مفہوم کے ساتھ تفسیر کی ہے، جو خدا کے تمام وعدوں، قیامت و دنیا و تقسیم ارزاق اور اس جہان میں اور دوسرے جہان میں مجرموں کی سزا کے ساتھ مربوط ہیں اور مومنین صالح کی کامیابی کو شامل ہیں، اسی سورہ کی آیت ۲۲ جو کہتی ہے: "وفی السماء رزقکم وما توعدون" (تمہارا رزق اور جو کچھ تم سے وعدہ کیا گیا ہے آسمانوں میں ہے) ممکن ہے اسی معنی کی تائید ہو، اور چونکہ آیت کا لفظ مطلق ہے۔ لہٰذا یہ عمومیت بعید نہیں ہے۔

بہر حال خدا کے سب وعدے سچے ہیں، کیونکہ "وعدہ کی مخالفت" یا تو "جہالت" کے سبب سے ہوتی ہے، یا "عجز" سے، وہ جہالت جو وعدہ کرنے والے کی فکر اور سوچ کو بدل کر رکھ دیتی ہے، اور وہ عجز جو اُسے وعدہ کی وفا سے روک دیتا ہے، لیکن خدا "عالم" اور "قادر" ہے، لہٰذا اس کے وعدے تخلف ناپذیر ہیں، یعنی پکے ہیں۔

---

[1] اس نکتہ کی توجہ بھی ضرور ہے کہ "والذاریات" میں "واؤ" قسم کا واؤ ہے، اور "فا" بعد والے جملہ میں فاء عاطفہ ہے، جو یہاں قسم کا مفہوم رکھتی ہے لیکن اس کے باوجود ان چار قسموں میں ایک قسم کے ربط کو بیان کرتی ہے۔

[2] توجہ رکھنی چاہیئے کہ "انما" میں "ما" موصولہ ہے "ان" کا اسم ہے اور "صادق" اس کی خبر ہے۔

۷۔ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۙ
۸۔ اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۙ
۹۔ یُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۭ
۱۰۔ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۙ
۱۱۔ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ۙ
۱۲۔ یَسْئَلُوْنَ اَیَّانَ یَوْمُ الدِّیْنِ ۭ
۱۳۔ یَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ یُفْتَنُوْنَ ۝
۱۴۔ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝

ترجمہ

۷۔ قسم ہے آسمان کی جو خوبصورت شکنوں والا ہے۔
۸۔ یقیناً تم مختلف اور طرح طرح کی باتوں میں لگے ہوئے ہو۔
۹۔ وہی لوگ اس (روزِ جزا) پر ایمان لانے سے منحرف ہوتے ہیں جو حق کو قبول کرنے سے روگردانی کرتے ہیں۔
۱۰۔ قتل ہو جائیں جھوٹے (اور موت انھیں آلے)
۱۱۔ وہی جو جہالت اور غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔
۱۲۔ اور ہمیشہ سوال کرتے ہیں کہ جزا کا دن کب ہوگا؟

۱۳۔ (ہاں!) وہ وہی دن ہے، جس میں انھیں آگ میں جلائیں گے۔

۱۴۔ اپنا عذاب چکھو، یہ وہی چیز ہے، جس کے لیے تم جلدی کیا کرتے تھے۔

تفسیر

قسم ہے آسمان کی اور اس کی زیبا شکنوں کی

یہ آیات بھی گزشتہ آیات کی طرح قسم کے ساتھ شروع ہو رہی ہیں، اور قیامت کے بارے میں کافروں کے اختلافات اور دوسرے مختلف مسائل منجملہ ان کے پیغبر اسلامؐ کی شخصیت اور مسئلہ توحید کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے، "قسم ہے آسمان کی جو خوبصورت شکنوں والا ہے" (والسماء ذات الحبك)۔

"حبك" بروزن کتب، جمع حباک (بروزن کتاب) کے لغت میں بہت سے معنی بتائے گئے ہیں، منجملہ ان کے راستے، بل، اور شکن ہے جو بیابان کی ریت پر ہواؤں کی وجہ سے یا پانی کی سطح پر یا آسمان کے بادلوں پر پیدا ہوتے ہیں۔

"مجعد" (گھنگھریالے) بالوں کو بھی "حبك" کہا جاتا ہے۔

بعض اوقات مفسرین نے "حبک" کی زیبائی اور زینت میں بھی تفسیر کی ہے۔

اور اسی طرح موزوں و مرتب شکل وصورت کے معنی میں بھی۔

اور اس کا اصلی ریشہ اور جڑ "حبک" (بروزن کیک) ہے جو باندھنے اور محکم کرنے کے معنی میں ہے۔

ایسا نظر آتا ہے کہ یہ سب معانی ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں اور وہ ایسے خوبصورت بل اور شکن ہیں، جو موجوں کے درمیان، آسمان کے بادلوں، بیابان کے ریت کے ٹیلوں اور سر کے بالوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

اب رہی اس معنی کی آسمانوں پر تطبیق تو یہ یا تو فلکی صورتوں اور عام ستاروں کی مختلف شکلوں کی وجہ سے ہے۔ (ثابت ستاروں کا وہ مجموعہ جو ایک خاص شکل بنا لیتا ہے صورت فلکی کہلاتا ہے)

یا آسمانی بادلوں میں جو پرکشش موجیں اور لہریں پیدا ہو جاتی ہیں ان کی وجہ سے ہے، جو بعض اوقات اس قدر خوبصورت اور زیبا ہوتی ہیں کہ مدتوں تک انسان کی آنکھ کو اپنی طرف متوجہ کیے رہتی ہیں۔

یا کہکشاؤں کا وہ عظیم انبوہ ہے جو مجعد اور گھنگریالے بالوں کی طرح پیچ و خم کھاتی ہوئیں آسمان پر ظاہر ہوتی ہیں خاص طور سے وہ عمدہ عکس، جو ماہرین نے دوربینوں کے ذریعہ ان کہکشاؤں کے لیے دیکھے ہیں۔ کامل طور سے مجعد اور گھنگریالے

اور پیچیدہ بالوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

اس معنی کی بنا پر قرآن آسمان اور ان عظیم کہکشاؤں کی جن پر اس زمانہ میں علم و دانش کی تیز آنکھ ابھی تک نہیں پڑی تھی قسم کھایا ہے۔[1]

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، کہ یہ معانی ایک دوسرے سے کوئی منافات نہیں رکھتے، ممکن ہے کہ وہ سب ہی اس قسم میں جمع ہوں، سورۂ مؤمنون کی آیت ۱۷ میں بھی یہ آیا ہے۔ ولقد خلقنا فوقکم سبع طرائق، "ہم نے تمہارے اوپر سات راستے خلق کیے ہیں" جو آسمانوں کے تنوع اور ان کی کثرت اور کرّوں اور کہکشاؤں اور مختلف عوالم کی طرف اشارہ ہے۔[2]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ "حبک" کے ریشہ اصلی کا آسمانوں کے استحکام اور کرّوں کے ایک دوسرے کے ساتھ مضبوط پیوند سے جیسا کہ نظامِ شمسی کا سورج کے ساتھ تعلق ہے، اشارہ ہو سکتا ہے۔

بعد والی آیت جوابِ قسم، یعنی وہ مطلب جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے، کو پیش کرتے ہوئے مزید کہتی ہے: "تم سب کے سب مختلف اور تم قسم کی گفتگو میں پڑے ہوئے ہو" (انکم لفی قول مختلف)۔

تم ہمیشہ ایک دوسرے کی متضاد اور نقیض باتیں کرتے ہو، اور یہی تناقض تمہاری باتوں کے بے بنیاد ہونے کی دلیل ہے۔

معاد و قیامت کے بارے میں کبھی تو یہ کہتے ہو کہ: ہم اصلاً یہ بات باور نہیں کرتے کہ بوسیدہ ہڈیاں زندہ ہو جائیں۔

اور کبھی یہ کہتے ہو کہ ہمیں اس بارے میں شک و تردد ہے۔

اور کبھی اور بڑھ کر کہتے ہو کہ ہمارے آباؤ اجداد اور بڑوں کو لے آؤ تاکہ وہ گواہی دیں کہ موت کے بعد قیامت اور معاد ہے تو پھر ہم قبول کریں گے۔

اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں کبھی تو یہ کہتے ہو کہ وہ دیوانہ ہے، کبھی یہ کہتے ہو کہ وہ شاعر ہے، کبھی اُسے جادوگر بتاتے ہو اور کبھی یہ کہتے ہو کہ اس کا کوئی معلم و استاد ہے جو ان باتوں کی اُسے تعلیم دیتا ہے۔

اسی طرح قرآن کے بارے میں کبھی تو اُسے "اساطیر الاولین" (گذشتہ لوگوں کے افسانے اور خرافات) کا نام دیتے ہو، کبھی اُسے شعر کہتے ہو اور کبھی جادو، اور کبھی جھوٹ۔

قسم ہے آسمان کے شکنوں کی، کہ تمہاری باتیں تناقض اور پیچ و خم سے پُر ہیں اگر تم کوئی اصل بنیاد رکھتے ہوتے، تو کم از کم ایک مطلب پر تو ٹھہرتے، اور ہر روز کسی نئے مطلب کے پیچھے نہ جاتے۔

یہ تعبیر حقیقت میں مخالفین کے دعووں کے بطلان پر ایک استدلال ہے، جو وہ توحید، معاد، پیغمبر اور قرآن کے

---

[1] "لسان العرب" اور "مفردات راغب" میں مادہ "حبک" کی طرف رجوع کریں۔

[2] اس آیت کی تفسیر میں مشروح شرح تفسیر نمونہ جلد ۸ سورۂ مؤمنون آیت ۱۷ کے ذیل میں آچکی ہے۔

بارے میں کرتے ہیں۔

(اگرچہ ان آیات کے قرینہ سے جو بعد میں آئیں گی، ان آیات کا اصلی محور مسئلہ معاد پر ہے)۔

اور ہم جانتے ہیں کہ جھوٹے دعویداروں کے جھوٹ کا پول کھولتے ہیں۔ چاہے قضائی مسائل میں ہو یا دوسرے مسائل میں۔ ان کی ایک دوسری کے خلاف باتوں سے استناد ہوتا ہے، قرآن بھی ٹھیک اسی مطلب پر تکیہ کرتا ہے۔

بعد والی آیت میں حق سے اس انحراف کی علت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "قیامت پر ایمان سے وہی لوگ منحرف ہوتے ہیں جو حق کے دلائل کو قبول کرنے اور منطق کے سامنے سرتسلیم خم کرنے سے روگردانی کرتے ہیں" ورنہ موت کے بعد کی زندگی کے دلائل واضح و آشکار ہیں۔ (یؤفک عنہ من افک)۔

توجہ رکھنی چاہیئے کہ آیت کی تعبیر کلی اور سربستہ ہے، جس کا لفظی ترجمہ اس طرح ہے: "لوٹائے جائیں گے اس سے وہ جس سے وہ لوٹائے گئے ہیں۔

"کیونکہ "افک" اصل میں منحرف کرنے اور کسی چیز سے پھیرنے کے معنی میں ہے، اسی لیے "جھوٹ" کو جو انحرافی پہلو رکھتا ہے، "افک" کہا جاتا ہے، جیسا کہ مختلف ہواؤں کو "مؤتفکات" کہا جاتا ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گذشتہ آیات میں قیامت کے بارے میں گفتگو تھی، لہٰذا ظاہر ہے کہ اصلی مقصود اسی عقیدہ سے انحراف ہے، اور چونکہ گذشتہ آیت میں گفتگو کافروں کی ایسی باتوں کے متعلق تھی جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں، لہٰذا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہاں مراد وہ لوگ ہیں جو واضح منطق اور دلیل سے منحرف ہو جاتے ہیں۔

اس بنا پر مجموع آیت اس طرح معنی دیتی ہے: وہی لوگ قیامت پر ایمان رکھنے سے منحرف ہوں گے، جو دلیل عقل کی راہ اور حق طلبی کی منطق سے منحرف ہو گئے ہیں۔

البتہ کوئی مانع نہیں ہے کہ مراد ہر قسم کے حق سے انحراف ہو، چاہے وہ قرآن سے انحراف ہو یا توحید و نبوت پیغمبر و معاد سے ہو، (اور ان ہی میں سے آئمہ معصومینؑ کی ولایت کا مسئلہ ہے، جو بعض روایات میں وارد ہوا ہے) لیکن بہرحال مسئلہ قیامت جو اصل موضوع ہے، یقینی طور پر اس میں شامل ہے۔

بعد والی آیت میں جھوٹ بولنے والوں اور اُسے بیان کرنے والوں کو شدت کے ساتھ مذمت اور تہدید کرتے ہوئے کہتا ہے، "قتل کیے جائیں جھوٹ بولنے والے اور ان کے لیے موت ہو (مُردہ باد)" (قتل الخراصون)۔

"خراص" مادہ "خرص" (بروزن درس) سے اصل میں ہر اس بات کے معنی میں ہے، جو گمان تخمینہ اور اندازے کی بنا پر کہی جائے (اٹکل پچو) اور چونکہ اس قسم کی باتیں جھوٹ ہوتی ہیں لہٰذا یہ لفظ جھوٹ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اس طرح سے "خراصون" وہ لوگ ہیں جو بے بنیاد اور بے سروپا باتیں کرتے ہیں، اور یہاں بعد والی آیات کے قرینہ سے وہ لوگ مراد ہیں، جو قیامت کے بارے میں بے بنیاد اور منطق سے دور باتوں کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں۔

لیکن بہرصورت یہ جملہ ان پر نفرین کی صورت میں ہے۔ ایسی نفرین جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ ایسی موجودات

ہیں، جو موت اور نابودی کے لائق ہیں، اور وہ اس طرح ہیں جن کا عدم ان کے وجود سے بہتر ہے۔
بعض نے "قتل" کی یہاں لعن و طرد اور رحمت خدا سے محرومیت کے ساتھ تفسیر کی ہے۔
اور یہاں سے اس حکم کلی کو بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اصولی طور پر وہ فیصلے جن کا واضح مدرک موجود نہ ہو اور اندازے و تخمین اور بے بنیاد گمانوں پر قائم ہوں، ایسے کام ہیں، جو گمراہ کرنے والے اور نفرین و عذاب کے مستحق ہیں۔

اس کے بعد ان اٹکل پچو باتیں کرنے والے جھوٹے لوگوں کا تعارف کراتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ ایسے لوگ ہیں جو جہالت، غفلت اور بے خبری میں ڈوبے ہوئے ہیں" (الذین ھم فی غمرۃ ساھون)۔
"غمرۃ" اصل میں اس زیادہ پانی کے معنی میں ہے، جو کسی جگہ کو ڈھانپ لے، اس کے بعد عمیق اور گہری جہالت و نادانی پر جو کسی کو ڈھانپ لے، اطلاق ہوا ہے۔
"ساھون" "سھو" کے مادہ سے ہر قسم کی غفلت کے معنی میں ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ جہالت کا پہلا مرتبہ "سہو و اشتباہ" ہے، اس کے بعد "غفلت" اور پھر "غمرہ" ہوتا ہے۔
اس بنا پر وہ سہو کے مرحلہ سے شروع کرتے ہیں، اس کے بعد غفلت و بے خبری تک پہنچتے ہیں، اور اس راہ کو جاری رکھتے ہوئے مکمل طور پر "جہالت" میں ڈوب جاتے ہیں، اور ان دونوں تعبیروں۔ سہو و غمرہ۔ کے درمیان جمع کرنا ممکن ہے اوپر والی آیت میں اس حرکت کے آغاز و انجام کی طرف اشارہ ہو۔
اس طرح کہ "خراصون" سے مراد وہ لوگ ہیں، جو اپنی جہالت و نادانی میں غرق ہیں اور حق سے فرار کرنے کے لیے ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ، اور بے بنیاد باتیں بناتے رہتے ہیں۔

اور اسی لیے ہمیشہ سوال کرتے ہیں کہ روز جزا کس وقت ہوگا اور قیامت کب آئے گی" (یسئلون ایان یوم الدین)۔
یسئلون کی تعبیر فعل مضارع کی صورت میں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ہمیشہ یہی سوال کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ اصولی طور پر ضروری ہے کہ قیامت کے برپا ہونے کا وقت مخفی اور پوشیدہ ہے، تاکہ ہر شخص ہر زمانہ میں اس کے واقع ہونے کا احتمال دے اور قیامت پر ایمان کا تربیتی اثر جو ہمیشہ کی آمادگی اور خود سازی ہے، وہ حاصل ہو۔
یہ گفتگو اس کے مانند ہے کہ بیمار ڈاکٹر سے بار بار سوال کرے کہ میری عمر کا اختتام کب ہوگا؟ تو ہر شخص اس سوال کو بے بنیاد سمجھے گا اور کہے گا کہ اہم بات تو یہ ہے کہ تو یہ جانے کہ موت حق ہے تاکہ تو اپنا علاج کرے تاکہ کہیں "جلدی آنے والی موت" میں گرفتار نہ ہو جائے۔
لیکن ان کا تو ٹھٹھا کرنے اور بہانہ جوئی کے سوا اور کوئی مقصد نہیں تھا، وہ واقعی طور پر قیامت کے برپا ہونے کی تاریخ معلوم کرنا نہیں چاہتے تھے۔

لیکن اس کے باوجود قرآن انہیں چبھتا ہوا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے "قیامت اس دن ہوگی جب انہیں آگ پر جلایا جائے گا" (یوم ھم علی النار یفتنون)۔

اور انہیں کہا جائے گا: "اپنے عذاب کو چکھو، یہ وہی چیز تو ہے، جس کے لیے تم جلدی کیا کرتے تھے" (ذوقوا فتنتکم ھذا الذی کنتم بہ تستعجلون)۔

• "فتنہ" اصل میں سونے کو کٹھالی میں رکھنے کے معنی میں ہے، تاکہ اچھا اور خالص سونا کھوٹے اور ناخالص سے پہچانا جائے، اور اسی مناسبت سے ہر قسم کی آزمائش اور امتحان کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور "انسان کے آگ میں داخل ہونے" کے معنی میں بھی آیا ہے، اور کبھی بلا و عذاب اور پریشانی کے معنی میں بھی آیا ہے، جیسا کہ زیر بحث آیت میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

۱۵۔ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۙ

۱۶۔ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ۭ

۱۷۔ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ

۱۸۔ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ

۱۹۔ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ

ترجمہ

۱۵۔ پرہیزگار جنت کے باغوں اور چشموں کے درمیان ہوں گے۔

۱۶۔ اور جو کچھ ان کے پروردگار نے انھیں مرحمت فرمایا ہے، اُسے حاصل کریں گے، کیونکہ وہ اس سے پہلے (دارِ دنیا میں) نیکوکاروں میں سے تھے۔

۱۷۔ وہ رات کے کچھ ہی حصّہ میں سوتے تھے۔

۱۸۔ اور سحر کے وقتوں میں استغفار کیا کرتے تھے۔

۱۹۔ اور ان کے مالوں میں سائل و محروم کے لیے ایک حق تھا۔

تفسیر

نیکوکار سحر خیزوں کا اجر

گذشتہ آیات کے بعد، جن میں جاہل جھوٹ بولنے والوں، اور قیامت و معاد کے منکرین اور ان کے عذاب

کے بارے میں گفتگو تھی، زیر بحث آیات میں پرہیزگار مومنین اور ان کے اوصاف اور اجر و پاداش کی بات ہو رہی ہے تاکہ ایک دوسرے کا موازنہ کر کے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی روش ہے ۔۔۔ حقائق اور زیادہ واضح و روشن ہو جائیں۔

فرماتا ہے، "پرہیزگار جنت کے باغات اور چشموں کے درمیان ہوں گے" (ان المتقین فی جنات و عیون)۔

یہ ٹھیک ہے کہ باغ میں قدرتی طور پر پانی کی نہریں ہوتی ہیں، لیکن اس کا لطف اور عمدگی اس بات میں ہے کہ چشمے خود باغ کے اندر سے پھوٹیں اور درختوں کو ہمیشہ سیراب کرتے رہیں، یہ وہ امتیاز اور خصوصیت ہے جو جنت کے باغات میں پائی جاتی ہے نہ صرف ایک ہی قسم کا چشمہ بلکہ اس میں انواع و اقسام کے چشمے موجود ہیں، [1]

اس کے بعد جنت کی دوسری نعمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اجمالی اور سربستہ صورت میں کہتا ہے، "ان کے پروردگار نے جو کچھ انہیں مرحمت فرمایا ہے، وہ اسے حاصل کرتے ہیں" (اٰخذین ما اٰتاھم ربھم)۔

یعنی وہ انتہائی رغبت اور شوق اور کمال رضا کے ساتھ اور خوشی خوشی خدا کی ان نعمتوں کو قبول کریں گے۔

اور آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے، کہ یہ عظیم اجر اور جزا بلاوجہ نہیں ہیں، "وہ اس سے پہلے دار دنیا میں نیکوکاروں میں سے تھے" (انھم کانوا قبل ذالک محسنین)۔ [2]

احسان اور نیکوکاری جو یہاں آئی ہے، ایک وسیع معنی رکھتی ہے جو خدا کی اطاعت کو بھی شامل ہے اور خلق خدا سے انواع و اقسام کی نیکیوں کو بھی۔

بعد والی آیات ان کے نیکوکار ہونے کی کیفیت کو واضح کرتے ہوئے، ان کے اوصاف میں سے تین اوصاف کو بیان کرتی ہیں۔

پہلی یہ کہ "وہ راتوں کے تھوڑے حصہ میں سوتے تھے" (کانوا قلیلاً من اللیل ما یھجعون)۔

"یھجعون" "ھجوع" کے مادہ سے رات کو سونے کے معنی میں ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ رات کے اکثر حصہ میں بیدار رہتے ہیں اور تھوڑا حصہ سوتے تھے۔ اور اصطلاح کے مطابق ہمیشہ شب زندہ دار تھے۔

---

[1] لفظ "فی" کا "جنات" کے بارے میں مفہوم واضح ہے۔ کیونکہ پرہیزگار جنت کے اندر ہیں، لیکن "عیون" (چشموں) کے بارے میں اس معنی میں نہیں ہے، کہ وہ چشموں کے اندر ہوں گے بلکہ وہ بہتے ہوئے چشموں کے درمیان میں ہوں گے۔

[2] "قبل ذالک" سے مراد۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ قیامت اور بہشت میں وارد ہونے سے پہلے ہے۔ یعنی عالم دنیا میں، لیکن بعض نے اسے شریعت کے آنے سے پہلے کے معنی میں لیا ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ وہ "مستقلات عقلیہ" پر وحی کے نازل ہونے سے پہلے ہی عمل کیا کرتے تھے، لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

لیکن چونکہ یہ حکم پرہیزگاروں اور محسنین کے لیے ایک عمومی حکم کی صورت میں بعید نظر آتا ہے، لہٰذا یہ تفسیر مناسب نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے لیے کم اتفاق ہوتا تھا کہ وہ ساری رات سوئیں، دوسرے لفظوں میں "لیل" (رات) جنس اور عموم کی صورت میں مدنظر ہے۔

اس بناء پر وہ ہر رات کے ایک حصہ میں بیدار رہتے تھے اور عبادت و نماز شب میں مشغول رہتے تھے، اور ایسی راتیں جن میں وہ ساری رات سوئے رہے ہوں، اور رات کی عبادت کلی طور پر ان سے فوت ہو گئی ہو، بہت کم تھیں۔

یہ تفسیر ایک حدیث میں امام صادقؑ سے بھی نقل ہوئی ہے۔ [۱]

اس آیت کے لیے دوسری تفسیریں بھی ذکر کی گئی ہیں، لیکن چونکہ وہ بعید نظر آتی تھیں۔ لہٰذا ان کو بیان نہیں کیا گیا۔ [۲]

ان کی دوسری صفت کو اس طرح بیان کرتا ہے، "وہ ہمیشہ سحر کے اوقات میں استغفار کرتے ہیں" (وبالاسحار ھو یستغفرون)۔

آخر شب میں جب غافلوں کی آنکھیں نیند میں ہوتی ہیں اور ماحول ہر لحاظ سے پرسکون ہوتا ہے۔ مادی زندگی کا شور و غل خاموش ہوتا ہے اور وہ عوامل جو انسان کی فکر کو اپنی طرف مشغول رکھتے ہیں، سب خاموش ہیں۔ یہ لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوتے ہیں۔ اور اس کے حضور میں راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ اپنے گناہوں سے استغفار کرتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں استغفار سے مراد وہی "نماز شب" ہے، اس بناء پر کہ "نماز وتر کا قنوت" استغفار پر مشتمل ہے۔

"اسحار" "سحر" (بروزن بشر) کی جمع ہے، اصل میں "پوشیدہ اور پنہاں" ہونے کے معنی میں ہے، اور چونکہ رات کی آخری گھڑیوں میں ایک خاص قسم کی پوشیدگی ہر چیز پر چھائی ہوتی ہے، لہٰذا اس کا نام سحر رکھا گیا ہے۔

لفظ "سحر" (بروزن شعر) بھی ایسی ہی چیز کو کہا جاتا ہے جو حقائق کے چہرے کو ڈھانپ دے، یا جس کے اسرار دوسروں سے پوشیدہ ہیں۔

---

[۱] مرحوم "طبرسی" نے "مجمع البیان" میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے (جلد ۹ ص ۱۵۵) تفسیر صافی میں بھی یہ حدیث کافی سے اس صورت میں نقل ہوئی ہے۔ کانوا اقل اللیالی یفوتھم لا یقومون فیھا، (بہت کم راتیں ان سے فوت ہوتی تھیں جن میں وہ عبادت کے لیے نہ اٹھتے ہوں۔ (تفسیر صافی زیر بحث آیت کے ذیل میں)۔

[۲] "ما یھجعون" میں "ما"، ممکن ہے زائدہ ہو اور تاکید کے لیے ہو، یا موصولہ ہو، یا مصدریہ ہو، (جیسا کہ تفسیر فخر رازی اور المیزان میں آیا ہے) اگرچہ بعض نے صرف زائدہ اور مصدریہ کہا ہے (جیسا کہ قرطبی اور روح البیان میں آیا ہے) لیکن یہ جو بعض نے احتمال دیا ہے کہ "نافیہ" ہے تو یہ بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

تفسیر "درمنثور" میں ایک روایت میں آیا ہے کہ پیغمبر گرامی اسلامؐ نے فرمایا:

"ان اٰخر اللیل فی التھجد احب الی من اولہ، لان اللّٰہ یقول و بالاسحار ھم یستغفرون،"

"آخری رات تہجد (نماز شب) کے لیے میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے۔ اس کے اول سے کیونکہ خدا فرماتا ہے: پرہیزگار سحر کے وقتوں میں استغفار کرتے ہیں" [1]

ایک دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہوا ہے:

"کانوا یستغفرون اللّٰہ فی الوتر سبعین مرۃ فی السحر:"

"بہشتی نیکوکار سحر کے وقت نماز وتر میں ستر مرتبہ خدا سے طلب مغفرت کرتے ہیں۔" [2]

اس کے بعد بہشتی پرہیزگاروں کی تیسری صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "ان کے اموال میں سائل و محروم کے لیے ایک حق ہے" (وفی اموالھم حق للسائل والمحروم)۔

"حق" کی تعبیر یہاں یا تو اس بنا پر ہے کہ خدا نے ان پر لازم قرار دیا ہے (مثلاً زکوٰۃ خمس اور سارے واجب شرعی حقوق) یا انھوں نے خود سے اپنے اوپر لازم قرار دے لیا ہے، اور عہد کیا ہے تو اس صورت میں حقوق واجب کے علاوہ کو بھی شامل ہوگا۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت صرف دوسری قسم کے لیے ہے، اور حقوق واجب کو شامل نہیں ہے، کیونکہ حقوق واجب تو سب لوگوں کے اموال میں ہوتے ہیں، چاہے وہ پرہیزگار ہوں، یا دوسرے، یہاں تک کہ کفار بھی، اس بنا پر جب وہ یہ کہتا ہے کہ، ان کے اموال میں اس قسم کا حق ہے، یعنی واجبات کے علاوہ وہ اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے اموال میں سے راہ خدا میں سائلوں اور محروموں پر خرچ کریں، لیکن کہا جاسکتا ہے کہ نیکوکاروں کا دوسروں سے فرق یہ ہے کہ نیکوکار ان حقوق کو ادا کرتے ہیں، جبکہ دوسرے اس کے پابند نہیں ہیں۔

یہ تفسیر بھی بیان کی گئی ہے کہ "سائل" کی تعبیر حقوق واجب کے بارے میں ہے، کیونکہ وہ سوال اور مطالبہ کرنے کا حق رکھتے ہیں، اور "محروم" کی تعبیر مستحب حقوق میں ہے جن میں مطالبہ کا حق نہیں ہے۔

"فاضل مقداد" "کنز العرفان" میں تصریح کرتے ہیں کہ "حق معلوم" سے مراد وہ حق ہے جو وہ خود اپنے مال میں قرار دیتے ہیں، اور خود کو اس کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ [3]

اسی معنی کی نظیر سورۂ معارج کی آیۂ ۲۴، ۲۵ میں بھی آئی ہے فرماتا ہے: والذین فی اموالھم حق معلوم

---

[1] درالمنثور جلد ۶ صفحہ ۱۱۳۔

[2] "مجمع البیان" زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[3] "کنز العرفان" جلد ۱ صفحہ ۲۲۶۔

السائل والمحروم۔

اوراس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ وجوب زکوٰۃ کا حکم مدینہ میں نازل ہوا، اوراس سورہ کی تمام آیات مکی ہیں، آخری نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

ان روایات سے بھی جو منابع اہل بیتؑ سے پہنچی ہیں اس بات کی تاکید ہوتی ہے کہ "حق معلوم" سے مراد زکوٰۃ واجب کے علاوہ کوئی چیز ہے۔

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

"لكن الله عزوجل فرض في اموال الاغنياء حقوقاً غير الزكاة، فقال عزوجل: والذين في اموالهم حق معلوم للسائل، فالحق المعلوم غير الزكاة، وهو شيء يفرضه الرجل على نفسه في ماله ...... ان شاء في كل يوم وان شاء في كل جمعة وان شاء في كل شهر......"

"لیکن خدانے دولت مندوں کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ کچھ حقوق قرار دیئے ہیں، منجملہ ان کے فرمایا ہے، ان کے اموال میں سائل ومحروم کے لیے حق معلوم ہے، اس بنا پر "حق معلوم" زکوٰۃ کے علاوہ ہے اور وہ ایسی چیز ہے جو انسان خود اپنی ذات پر لازم کرتا ہے کہ وہ اپنے مال میں سے دے ...... چاہے تو روزانہ دے یا ہر جمعہ کو دے یا ماہانہ دے......"[1]

اس سلسلہ میں دوسری متعدد احادیث مختلف تعبیروں کے ساتھ امام علی بن الحسینؑ، امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے نقل ہوئی ہیں۔[2]

اوراس طرح سے آیت کی تفسیر واضح وروشن ہے۔

اس بارے میں کہ "سائل" اور "محروم" میں کیا فرق ہے؟ ایک گروہ نے تو یہ کہا ہے: "سائل" وہ شخص ہے جو لوگوں سے مدد کا تقاضا کرے، لیکن "محروم" وہ آبرومند شخص ہے جو معاش کے لیے اپنی انتہائی جد وجہد اور کوشش کرتا ہے، لیکن اس کا ہاتھ کہیں نہیں پہنچتا اور اس کا کسب وکار اور زندگی پیچیدہ ہوگئی ہے، اوراس کے باوجود اپنی غیرت کی حفاظت کرتا ہے، اور کسی سے مدد نہیں مانگتا،

یہ وہی شخص ہے جسے "محارف" سے تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ محارف کی تفسیر میں کتب لغت اور روایات اسلامی میں یہ بیان کیا گیا ہے۔

"وہ ایک ایسا آدمی ہے، جو جس قدر بھی کوشش کرتا ہے اس کی کوئی درآمد نہیں ہوتی، گویا زندگی کے راستے اس

---

[1] "وسائل الشیعہ" جلد ۶ ص ۲۸ ابواب ما تجب فیہ الزکاۃ باب ۷، حدیث ۲۔

[2] وہی مدرک۔

کے سامنے بند ہو گئے ہیں "

بہرحال یہ تعبیر اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ ہرگز اس انتظار میں نہ بیٹھے رہو کہ حاجت مند تمہارے پاس آئیں، اور مدد کی درخواست کریں۔ بلکہ تم پر لازم ہے کہ تم جستجو کرو، اور ساکرو مند محروم افراد کو جو قرآن کے قول کے مطابق (بقرہ ۔ ۲۷۳) یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف،

بے خبر لوگ پاک دامنی کی وجہ سے انہیں غنی اور مالدار خیال کرتے ہیں" پیدا کرو، اور ان کی مدد کرو، ان کی مشکلات کی گرہ کھولو اور ان کی عزت و آبرو کی حفاظت کرو، اور یہ ایسا اہم حکم ہے، جو محروم مسلمانوں کی شخصیت و حیثیت کی حفاظت کے لیے بہت اہم ہے۔

یقیناً ان لوگوں کو (اسی سورۂ بقرہ کی آیت میں قرآن کے قول کے مطابق) ان کے چہروں سے پہچانا جاسکتا ہے۔ تعرفھم بسیماھم۔

ہاں! اگرچہ وہ خاموش ہیں، لیکن آگاہ افراد کے لیے ان کے چہرے کی گہرائی میں ان کی اندرونی جانکاہ تکلیفات کی نشانیاں واضح و آشکار ہیں، اور "ان کے چہرے کا رنگ ان کے اندرونی بھید کی خبر دیتا ہے۔"

چند نکات

۱۔ "خدا" اور "خلق خدا" کی طرف توجہ

ان آیات میں "متقین" اور "محسنین" کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ حقیقت میں ان کا دو حصوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے، خالق کی طرف توجہ وہ بھی ایسے لمحات میں جو ہر لحاظ سے اس کے ساتھ راز و نیاز اور حضور قلب کے لیے فراہم ہیں اور فکری مشغولیت کے عوامل، اور ذہنی مصروفیات کم سے کم ہوتے ہیں، یعنی رات کے آخری حصوں میں۔

اور دوسرے حاجت مندوں کی حاجات کی طرف توجہ، چاہے وہ اپنی حاجت کو ظاہر کریں یا پوشیدہ رکھیں۔

یہی وہ مطلب ہے جس کے لیے قرآن کی آیات میں بارہا نصیحت و وصیت کی گئی ہے۔ اور وہ آیات جو نماز و زکوٰۃ کو یکے بعد دیگرے بیان کرتی ہیں اور ان دونوں پر تکیہ کرتی ہیں، ان میں بھی اسی مسئلہ کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ "نماز" خالق کے ساتھ تعلق کا، نمایاں ترین مظہر ہے، اور زکوٰۃ مخلوقِ خدا کے ساتھ تعلق کی واضح ترین راہ ہے۔

۲۔ شب خیز کہ عاشقاں بہ شب راز کنند!

رات کو اٹھ کیونکہ عشاق رات کے وقت راز و نیاز کرتے ہیں!

باوجودیکہ نمازِ شب نوافل اور مستحب نمازوں میں سے ہے، لیکن قرآن مجید میں بارہا اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

اور یہ اس کی حد سے زیادہ اہمیت کی نشانی ہے، یہاں تک کہ قرآن اُسے "مقام محمود" تک پہنچنے کا وسیلہ (سورۂ اسراء - ۷۹) اور روشنی چشم کا سبب (جیسا کہ سورۂ الم سجدہ کی آیہ، امیں آیا ہے) شمار کرتا ہے۔

اسلامی روایات میں بھی اس شبانہ رازو نیاز اور سحر گاہانہ بیداری پر حد سے زیادہ تکیہ ہوا ہے۔

ایک جگہ پیغمبر اکرمؐ اسے گناہوں کا کفارہ شمار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یا علی ثلاث کفارات، منها التهجد باللیل والناس نیام"

"تین چیزیں گناہوں کا کفارہ ہیں ان میں سے ایک رات کو تہجد پڑھنا ہے۔ جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہوں۔"[1]

ایک دوسری حدیث میں رسولِ خدا سے منقول ہے:

"اشراف امتی حملة القران واصحاب اللیل"

"میری اُمت میں زیادہ شریف حاملین قرآن اور رات کے وقت عبادت کرنے والے ہیں۔"[2]

ایک اور حدیث میں بھی آنحضرتؐ کی علیؑ کے وصایا میں آیا ہے کہ آپ نے چار مرتبہ تکرار فرمایا ہے:

"علیك بصلٰوة اللیل"

"نماز تہجد کو ہرگز ترک نہ کرنا"[3]

اور امام صادقؑ سے زیر بحث آیت (کانوا قلیلاً من اللیل ما یهجعون) کی تفسیر میں اس طرح نقل ہوا ہے:

"کانوا اقل اللیالی تفوتهم لا یقومون فیها"

"بہت کم راتیں ایسی گزرتی ہیں کہ وہ بیدار نہ ہوں اور عبادت نہ کریں۔"[4]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:

"الرکعتان فی جوف اللیل احب الی من الدنیا وما فیها"

"دو رکعت نماز جو رات کی تاریکی میں پڑھی جائے میرے نزدیک دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے بہتر ہے"[5]

نیز ایک حدیث میں منقول ہے کہ امام صادقؑ نے (اپنے ایک صحابی) "سلیمان دیلمی" سے فرمایا:

"لا تدع قیام اللیل فان المغبون من حرم قیام اللیل"

---

[1] "وسائل الشیعہ" جلد ۵ ص ۲۶۷۔

[2] "وسائل الشیعہ" جلد ۵ ص ۲۶۹۔

[3] "وسائل الشیعہ" جلد ۵ ص ۲۶۸۔

[4] "وسائل الشیعہ" جلد ۵ ص ۲۷۹۔

[5] "بحار الانوار" جلد ۸۷ ص ۱۴۸۔

"عبادت کے لیے قیام شب کو فراموش نہ کرو، وہ شخص خسارے میں ہے جو رات کے قیام سے محروم ہے۔"[1]

البتہ اس سلسلے میں بہت زیادہ روایات ہیں اور ان میں حد سے زیادہ عمدہ تعبیریں نظر آتی ہیں، خاص طور سے نماز شب گناہوں کی بخشش، فکر و نظر کی بیداری، دل کی روشنی، جلب رزق فراواں روزی اور تندرستی کے لیے ایک مؤثر ذریعہ کے طور پر متعارف ہوئی ہے اگر ان روایات کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جاتی ہے۔[2]

اس سلسلہ میں تفسیر نمونہ کی جلد ۶ صفحہ ۱۵۳ (سورۂ اسراء کی آیہ ۷۹ کے ذیل میں) اور جلد ۹ صفحہ ۵۱۶ (سورۂ الم سجدہ کی آیت ۱۶ کے ذیل میں) اور دوسرے مباحث بھی ہم نے پیش کئے ہیں۔

۳۔ سائل و محروم کا حق

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ ہمیشہ نیکوکاروں کے اموال میں سائل و محروم کے لیے حق ہے یہ تعبیر اس بات کی اچھی طرح سے نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو حاجت مندوں اور محروم افراد کے لیے دیندار سمجھتے ہیں اور انہیں حق دار اور طلب گار جانتے ہیں، ایسا حق جسے ہر حالت میں ادا ہونا چاہیئے اور اس کے ادا کرنے میں کسی قسم کا کوئی احسان نہیں ہے ٹھیک دوسرے طلب گاروں کی طلب کے مانند۔

اور جیسا ہم بیان کر چکے ہیں، کہ مختلف قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ تعبیر زکوٰۃ واجب ہے اور اس قسم کے امور سے مربوط نہیں ہے، بلکہ مستحب قسم کے انفاقات سے مربوط ہے، جنہیں پرہیزگار اپنے اوپر دین اور قرض سمجھتے ہیں۔[3]

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۸۷ صفحہ ۱۴۰

[2] ان روایات سے آگاہی کے لیے "وسائل الشیعہ" کی جلد ۵ اور "مستدرک الوسائل" کی جلد اول اور "بحار الانوار" کی جلد ۸۷ کی طرف رجوع کریں۔

[3] ان آیات کا مکہ میں نازل ہونا اور اس حکم کا خصوصیت کے ساتھ صرف نیکوکاروں کے بارے میں ورود، اور ائمہ اہل بیتؑ کی روایات ایسے قرائن ہیں جو ان آیات کی زکوٰۃ کے علاوہ دوسری چیزوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

۲۰۔ وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ○

۲۱۔ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ○

۲۲۔ وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ○

۲۳۔ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ ○

ترجمہ

۲۰۔ اور زمین میں طالبانِ حق کے لیے نشانیاں ہیں۔

۲۱۔ اور خود تمہارے وجود کے اندر (بھی آیات ہیں) کیا تم دیکھتے نہیں؟!

۲۲۔ تمہارا روزی آسمان میں ہے، اور وہ جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔

۲۳۔ قسم ہے آسمان و زمین کے پروردگار کی کہ یہ مطلب حق ہے، جیسا کہ تم گفتگو کرتے ہو۔

تفسیر

خدا کی نشانیاں تمہارے وجود کے اندر ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں؟

گزشتہ آیات کے بعد، جن میں معاد اور دوزخیوں اور جنتیوں کے صفات کے بارے میں بیان ہوا تھا، زیر بحث آیات میں ان نشانیوں کے بارے میں جو زمین اور خود انسان کے وجود کے اندر ہیں گفتگو ہو رہی ہے، تاکہ ایک طرف تو مسئلہ توحید، خدا کی معرفت، اور اس کی صفات کی پہچان سے جو تمام خیرات کی طرف مبدأ حرکت ہے، وہ آشنا ہوں اور دوسری طرف مسئلہ معاد اور موت کے بعد کی زندگی پر اس کی قدرت کا انہیں پتہ چلے۔ کیونکہ جو روئے زمین میں ان تمام عجائبات میں حیات کا خالق ہے، وہ تجدید حیات پر بھی قادر ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "زمین میں ان لوگوں کے لیے جو اہلِ حق ہیں اور حق کے طلب گار ہیں، اہم نشانیاں ہیں" (وفی الارض

ایات للموقنین)۔

واقعاً اس کرۂ خاکی میں خدا کے غیر محدود علم و حکمت اور حق و قدرت کی بے پایاں نشانیاں اس قدر فراواں ہیں کہ کسی بھی انسان کی عمر ان سب کو پہچاننے کے لیے کافی نہیں ہے۔

زمین کا حجم، اس کا سورج سے فاصلہ، اس کی اپنے گرد حرکت اور اس کی سورج کے گرد حرکت، اور وہ قوت جاذبہ و دافعہ جو اس حجم اور اس حرکت سے وجود میں آتی ہے، اور کامل طور سے ایک دوسرے کے برابر اور یکساں ہے، اور پھر ان سب کی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی تاکہ سطح زمین پر حیات اور زندگی کے لیے ماحول فراہم کرے، یہ سب چیزیں خدا کی عظیم آیات میں سے ہیں

درحالیکہ اگر ان حرکات و روابط اور خصوصیات میں سے کوئی ایک چیز بھی کم سے کم تغییر پیدا کرے تو سطح زمین پر حیات و زندگی کے حالات درہم برہم ہو جائیں۔

وہ مواد جن سے زمین بنی ہے اور مختلف منابع جو سطح زمین اور زیر زمین حیات و زندگی کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں ان میں سے ہر ایک اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

پہاڑ اور صحرا، دریا اور جنگل، دریا اور چشمے جن میں سے ہر ایک حیات کو جاری رکھنے اور اس کے حالات کو ہم آہنگ کرنے کے لیے ایک نقش مؤثر رکھتے ہیں، دوسری نشانیاں ہیں۔

لاکھوں قسم کی نباتات و حشرات و حیوانات (جی ہاں لاکھوں قسم کے) ہر ایک اپنے خصوصیات اور عجائبات کے ساتھ جو زمین شناسی نباتات شناسی اور حیوان شناسی کی کتابوں کے مطالعہ کے وقت انسان کو حیرت میں ڈبو دیتی ہے اور دوسری نشانیاں ہیں۔

اس کرۂ خاکی کے گوشہ و کنار میں ایسے ایسے عمدہ اسرار ہیں کہ شاید بہت ہی کم افراد ان کی طرف توجہ کرتے ہیں، لیکن ماہرین کی محققانہ نظروں نے ان سے پردہ اٹھا دیا ہے، اور آفریدگار کی عظمت کو واضح و آشکار کر دیا ہے۔

ہم یہاں اگر دنیا کے ایک مشہور ماہرین کی باتوں کے ایک گوشہ کی طرف، جس نے اس سلسلے میں کافی مطالعہ کیا ہے، ذرا توجہ دیں تو نامناسب نہ ہوگا۔

"کرسی موریسین" کہتا ہے، "عوامل طبیعی کی تنظیم میں انتہائی دقت اور باریک بینی سے کام لیا گیا ہے، مثلاً اگر کرۂ زمین کا خارجی قشر، اس سے کہ جو اب ہے، دس حصہ زیادہ ضخیم ہوتا، تو آکسیجن۔ یعنی زندگی کا اصل مادہ۔ وجود میں نہ آتا، یا اگر سمندروں کی گہرائی موجودہ گہرائی سے کچھ حصہ زیادہ ہوتی تو اس وقت زمین کا سارا آکسیجن اور کاربن جذب ہو جاتا، اور پھر سطح زمین پر نباتی یا حیوانی زندگی کا کسی قسم کا امکان باقی نہ رہتا۔

ایک دوسری جگہ قشر ہوائی کے بارے میں، جو اطراف زمین کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے، کہتا ہے: اگر اطراف زمین کی ہوا موجودہ حالت سے تھوڑی سی پتلی اور رقیق ہوتی، تو وہ شہاب ثاقب جو ہر روز لاکھوں کی تعداد میں زمین کی طرف جذب ہوتے ہیں، اور زمین سے باہر کی اسی فضا میں (قشر ہوا سے ٹکرانے کی وجہ سے) نابود ہو جاتے ہیں، ہمیشہ سطح زمین تک پہنچتے اور اس کے ہر گوشہ کو نقصان پہنچاتے۔

اور یا اگر شہابوں کی حرکت کی سرعت جتنی ہے اس سے کم تر ہوتی (تو ہرگز ہوا کے ساتھ ٹکرانے سے نہ پھٹتے) وہ سب کے سب سطح زمین پر آگرتے، اور ان کی تباہ کاری کا نتیجہ معلوم تھا۔

ایک اور دوسری جگہ کہتا ہے: "اطراف زمین کی ہوا میں صرف اکیس فی صد آکسیجن ہے...... اگر ہوا میں موجودہ آکسیجن کی مقدار اکیس فی صد کی بجائے پچاس فی صد ہوتی، تو اس عالم کے تمام جلنے والے مواد جل کر خاکستر ہو جاتے اور اگر کوئی چنگاری جنگل کے کسی درخت تک پہنچ جاتی تو تمام جنگل مکمل طور پر راکھ ہو جاتے"۔

زمین پر محیط ہوا کی موٹائی اس قدر ہے کہ سورج کی شعاعوں کو اتنی مقدار میں زمین کی طرف عبور کرنے دیتی ہے کہ جتنی مقدار نباتات کی رشد اور نشو ونما کے لیے ضروری ہے اور تمام مضر جراثیم کو فضا میں ہی معدوم کر دیتی ہے، اور مفید وٹامنوں کو ایجاد کرتی ہے۔

یا مختلف بخارات کا وجود جو طویل زمانوں کے عرصہ میں زمین کی گہرائیوں سے باہر نکلا ہے، اور ہوا میں پھیل گیا ہے۔ اور ان میں زیادہ تر ہی زہریلی گیسیں، لیکن اس کے باوجود زمین کے محیط ہوا میں آلودگی پیدا نہیں ہوتی، اور ہمیشہ سے اسی یکساں حالت میں جو حیات انسانی کو جاری رکھنے کے لیے مناسب ہے، باقی ہے۔

وہ عظیم دستگاہ جو اس عجیب توازن کو ایجاد کرتی ہے اور یکسانیت کی حفاظت کرتی ہے، وہی بڑے بڑے دریا اور سمندر ہیں، جن کے وجود کے فیض سے، مواد حیاتی و غذائی، بارش و اعتدال ہوا و نباتات اور آخر میں خود انسان، زندگی حاصل کرتے ہیں، جو شخص حقیقت کا ادراک رکھتا ہے اُسے چاہیئے کہ سمندر کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کرے (اور سمندروں کے پیدا کرنے والے) اور اس کی نعمتوں کا شکر گزار ہو۔[1]

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "خود تمہارے وجود میں بھی خدا کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں" (وفی انفسکم)۔ "کیا تم آنکھیں نہیں کھولتے، اور حق کی ان تمام آیات اور ظاہر نشانیوں کو نہیں دیکھتے"!! (افلا تبصرون)۔

بلاشک انسان عالم ہستی کا ایک مجموعہ ہے، اور جو کچھ عالم کبیر میں ہے وہ سب کچھ اس عالم صغیر میں بھی موجود ہے۔ بلکہ اس میں ایسے عجائبات ہیں جو دنیا میں کسی جگہ بھی نہیں ہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ انسان اس ہوش و عقل و علم کے ہوتے ہوئے، اور اس تمام خلاقیت و ابتکارات اور عجیب غریب صنائع کے باوجود، پہلے دن ایک چھوٹے سے بے قدر و قیمت نطفہ کی صورت میں تھا، لیکن جونہی کہ وہ عالم رحم میں قرار پاتا ہے تو عجیب سرعت کے ساتھ تکامل و ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے، روز بروز شکل تبدیل کرتا ہے۔ اور لمحہ بہ لمحہ دگرگوں ہوتا ہے، اور وہ نطفۂ ناچیز مختصری مدت میں انسانِ کامل میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

ایک خلیہ جو اس کے اجزاء بدن کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے، تہ بہ تہ اور عجیب و غریب ساخت رکھتا ہے، اور

---

[1] "راز آفرینش انسان"، تالیف "کرسی موریسن" ترجمہ محمد سعیدی، از ص ۳۳ تا ص ۳۶۔

ماہرین کے قول کے مطابق ایک صنعتی شہر کے برابر تشکیلات اس میں موجود ہیں۔

علم الحیات کا ایک ماہر کہتا ہے: " یہ عظیم شہر، ہزارہا عجیب وغریب عمدہ دروازوں، ہزارہا کارخانوں، سٹوروں، آب رسانی کے جال، فیصلہ کا مرکز اس کی فراواں تاسیسات، عمارتوں بہت سے رابطوں اور دوسرے حیاتی کاموں کے ساتھ، وہ بھی ایک چھوٹے سے خلیے ہیں، پیچیدہ ترین اور عجیب ترین شہروں میں سے ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ ایسی عمارتیں بنائیں، جو وہی اعمال انجام دیں — اور ہم ہرگز اس بات پر قادر نہیں ہیں — تو ہمیں دسیوں ہزار ایکڑ زمین کو تاسیسات، مختلف عمارتوں اور پیچیدہ آلات والی مشینوں کے نیچے سے جانا پڑے گا، تاکہ وہ اس قسم کے پروگرام کو انجام دینے کے لیے آمادہ ہوں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ دستگاہ آفرینش نے ان سب کو "پندرہ میلیونیم ملی میٹر" کے برابر رقبہ میں قرار دیا ہے۔[1]

وہ کارخانے جو انسان کے بدن میں ہیں۔ مثلاً دل، گردے، پھیپھڑے، اور خاص طور سے دسیوں ہزار کلومیٹر کی موٹی اور پتلی رگیں، یہاں تک کہ وہ بال جیسی باریک رگیں جو آنکھ سے نظر نہیں آتیں اور وہ پانی، غذا اور ہوا پہنچانے کا کام انجام دیتی ہیں، (دس ملیون میلیارد) بدن انسانی کے خلیے ہیں، اور مختلف حواس، جیسے بینائی، شنوائی اور دوسرے حواس میں سے ہر ایک اس کی عظیم آیات میں سے ہر ایک آیت ہے۔

اور سب سے زیادہ "حیات وزندگی" کا معما ہے، جس کے اسرار اس طرح سے غیر شناختہ بچے ہوئے ہیں اور انسان کی روح وعقل کی عمارت ہے، جس کے ادراک سے تمام انسانوں کی عقلیں عاجز ہیں اور یہ وہ منزل ہے کہ انسان بے اختیار خدا کی تسبیح اور حمد وثنا کے لیے بول اٹھتا ہے۔ اور اس کی بارگاہ عظمت میں سر تعظیم جھکا دیتا ہے، اور ان اشعار کے ساتھ ترنم کرتا ہے:

فیک یا اعجوبة الکون غدا الفکر کلیلا

انت حیرت ذوی اللب وبلبلت العقولا

کلما اقدم فکری فیک شبرًا فرمیلا

ناکصًا یخبط فی عمیاء لا یهدی سبیلا

" اے عالم ہستی کے اعجوبہ (اے خدائے بزرگ) تجھ میں فکر خستہ ودرماندہ ہوکر رہ گئی ہے"

" تو نے صاحبان فکر ودماغ کو حیران کردیا ہے اور عقلوں کو مضطرب بنا دیا ہے"

" جس وقت میری فکر تجھ سے ایک بالشت قریب ہوتی ہے، تو ایک میل فرار کر جاتی ہے"

" ہاں وہ پیچھے کی طرف پلٹ جاتی ہے اور تاریکیوں میں غرق ہو جاتی ہے، اور اسے کوئی راستہ نظر نہیں آتا ہے"

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر گرامی اسلام نے فرمایا:

" من عرف نفسه فقد عرف ربه"

" جو شخص اپنے آپ کو پہچان لے گا وہ اپنے خدا کو پہچان لے گا"[2]

---

[1] "سفری بہ اعماق وجود انسانی" (بخش سلولہا)

[2] سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۶۰۳ مادہ نفس۔

ہاں! "خود شناسی" تمام مراحل میں "خدا شناسی" کی راہ ہے۔

"افلا تبصرون" (کیا تم نہیں دیکھتے) کی تعبیر ایک لطیف تعبیر ہے، یعنی یہ آیاتِ الٰہی تمہارے گرداگرد، تمہاری جان کے اندر، تمہارے سارے پیکر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر تم تھوڑی سی آنکھ کھولو تو انھیں دیکھ لوگے اور تمہاری رُوح اس کی عظمت کے ادراک سے سیراب ہو جائے گی۔

تیسری زیر بحث آیت میں عظمتِ پروردگار کی نشانیوں کے تیسرے حصے، اور معاد پر اس کی قدرت کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "تمہاری روزی آسمان میں ہے اور اس چیز کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے" (وفی السماء رزقکم وما توعدون)۔

اگرچہ بعض اسلامی روایات میں "رزق" کی اس آیت میں بارش کے حیات بخش قطرات سے تفسیر ہوئی ہے، جو زمین میں ہر خیر و برکت کا منبع ہے، اور سورۂ جاثیہ کی آیہ ۵ بھی اس کے موافق ہے،:

وما انزل اللہ من السماء من رزق فاحیا بہ الارض بعد موتھا:

"جو کچھ خدا نے آسمان سے رزق نازل کیا ہے تو اس کے ذریعہ مردہ زمینوں کو زندہ فرمایا ہے۔ لیکن یہ معنی ہو سکتا ہے کہ آیت کے واضح مصادیق میں سے ایک ہو، جبکہ مفہوم رزق کی وسعت بارش کو بھی شامل ہے، اور سُورج کی روشنی کو بھی جو آسمان سے ہماری طرف آتی ہے اور اس کا نقش و اثر پوری زندگی میں حد سے زیادہ محسوس ہوتا ہے، اور اس طرح ہوا کو بھی جو تمام زندہ موجودات کے لیے سبب حیات ہے، رزق میں شامل سمجھیے۔

یہ سب اس صورت میں ہے کہ ہم "سماء" کی اسی ظاہری آسمان کے ساتھ تفسیر کریں، لیکن بعض مفسرین نے "سماء" کو عالم الغیب، ماورا طبیعت اور لوح محفوظ کے معنی میں لیا ہے، کہ انسانوں کے ارزاق کی تقدیر وہاں سے ہوتی ہے۔

البتہ دونوں معانی میں جمع ممکن ہے، اگرچہ پہلی تفسیر زیادہ واضح اور روشن نظر آتی ہے۔

باقی رہا "ما توعدون" (جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے) کا جملہ تو ہو سکتا ہے کہ یہ مسئلہ رزق اور اس سلسلے میں وعدۂ الٰہی پر ایک تاکید ہو، یا بہشت موعود کے معنی میں ہو، کیونکہ "والنجم" کی آیہ ۱۵ میں یہ آیا ہے کہ: عندھا جنۃ المأوٰی: "بہشت موعود سدرۃ المنتھٰی کے پاس آسمانوں میں ہے" اور یا ہر قسم کی خیر و برکت یا اس عذاب کی طرف اشارہ ہے، جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ اور یا ان تمام مفاہیم کی طرف ناظر ہے، کیونکہ "ما توعدون" کے جملہ کا مفہوم وسیع اور کشادہ ہے۔

بہرحال ان تینوں آیات میں ایک لطیف ترتیب پائی جاتی ہے: پہلی آیت کرۂ زمین میں انسان کے عوامل وجود کے بارے میں گفتگو کرتی ہے، اور دوسری آیت خود انسان کے وجود کے بارے میں، اور تیسری آیت اس کے دوام و بقاء کے عوامل کے بارے میں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ، وہ چیز، جو انسان کی بصیرت میں مانع ہے، اور اس کو اسرارِ آفرینش کے مطالعہ، یعنی اسرار زمین اور خود اس کے وجود کے عجائب سے آگاہ ہونے سے باز رکھتی ہے، وہ روزی کی حرص ہے، خدا آیت کے آخر میں اطمینان دلاتا ہے کہ اس کی روزی کی ضمانت دی جا چکی ہے، تاکہ وہ راحت و آرام کے ساتھ عالمِ ہستی کے عجائبات میں غور و

شکر کرسکے، اور "افسلا تبصرون" کا جملہ اس کے حق میں پورا ہو۔

لہٰذا اس مطلب کی تاکید کے لیے آخری زیرِ بحث آیت میں قسم کھاتے ہوئے کہتا ہے "آسمان و زمین کے خدا کی قسم یہ مطلب حق ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے تم بات کرتے ہو" (فورب السماء والارض انہ لحق مثل ما انکم تنطقون)۔

معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ خدا اپنی عظمت و قدرت کے باوجود، بہت شک کرنے والوں، دیر سے یقین کرنے والوں ضعیف النفس اور حریص بندوں کو اطمینان دلانے کے لیے قسم کھا رہا ہے، کہ رزق و روزی اور قیامت کے ثواب و عقاب کے وعدوں کے بارے میں جو وعدہ تم سے کیا گیا ہے، وہ سب حق ہے، اور اس میں شک و شبہ کی کوئی بات نہیں ہے۔[1]

"مثل ما انکم تنطقون" (جس طرح تم بات کرتے ہو) کی تعبیر ایک لطیف اور جچی تلی تعبیر ہے۔ ایک محسوس ترین چیز کے بارے میں کیونکہ بعض اوقات انسان کے دیکھنے اور سننے میں تو خطا اور غلطی واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن بات کرنے میں اس قسم کی کوئی خطا اور غلطی نہیں ہوتی کہ انسان یہ احساس کرے کہ اس نے بات کی ہے، حالانکہ اس نے بات نہ کی ہو، لہٰذا قرآن کہتا ہے؛ جس قدر تمہارا بات کرنا تمہارے لیے ایک محسوس حقیقت ہے اور واقعیت رکھتا ہے، رزق اور خدائی وعدے بھی اسی طرح ہیں۔

اس سے قطع نظر، بات کرنے کا مسئلہ، خود پروردگار کی ایک عظیم ترین روزی اور نعمتوں میں سے ہے، کیونکہ انسان کے سوا کسی بھی زندہ موجود کو یہ نعمت نہیں ملی، اور انسانوں کی اجتماعی زندگی، تعلیم و تربیت، علوم و دانش کے انتقال، اور زندگی کے مشکلات کے حل کے بارے میں بات کرنے کا اثر و نفوذ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

چند نکات

۱۔ اصمعی کی لرزا دینے والی داستان

"زمخشری" تفسیر کشاف میں اصمعی[2] سے نقل کرتا ہے کہ میں بصرہ کی مسجد سے باہر آیا تو اچانک میری نگاہ ایک بیابانی عرب پر پڑی جو اپنی سواری پر سوار تھا، وہ میرے سامنے آیا تو مجھ سے پوچھا: تم کس قبیلہ سے ہو؟ میں نے کہا "بنی اصمع" سے اس نے کہا: کہاں سے آرہے ہو؟ میں نے کہا وہاں سے جہاں خداوند رحمٰن کا کلام پڑھتے ہیں، اس نے کہا میرے لیے بھی پڑھو۔!

---

[1] "انہ" کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ اس میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض نے اسے "رزق" کی طرف، بعض "ما توعدون" کی طرف اور بعض اس کو پیغمبر اور قرآن کی طرف راجع قرار دیتے ہیں لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

[2] اس کا نام "عبدالملک ابن قریب" تھا ہارون الرشید کے زمانہ میں ہوا ہے، اس کو حافظہ عجیب و غریب اور اس کے معلومات تاریخ و ادب اور اشعار عرب سے بہت زیادہ تھے اور اس نے ۲۱۶ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ (الکنیٰ والالقاب ج ۲ ص ۲۷)

میں نے اس کے لیے سورۂ "الذاریات" کی کچھ آیات پڑھیں، یہاں تک کہ میں آیہ "وفی السماء رزقکم" تک پہنچا، اس نے کہا: بس کافی ہے، وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور وہ اونٹ جو اس کے ساتھ تھا اُسے نحر کر ڈالا، اور اس کا گوشت، ان ضرورت مندوں میں جو آجا رہے تھے، تقسیم کر دیا۔ اس نے اپنی تلوار اور کمان بھی توڑ ڈالی اور ایک طرف پھینک دی اور پشت پھیر کر چلتا بنا، یہ واقعہ گزر گیا۔

جس وقت میں ہارون الرشید کے ساتھ خانہ خدا کی زیارت کے لیے گیا تو میں طواف میں مشغول ہو گیا، اچانک میں نے دیکھا کہ کوئی آہستہ آواز کے ساتھ مجھے پکار رہا ہے، میں نے نگاہ کی تو دیکھا کہ وہی مرد عرب ہے، لاغر اور کمزور ہو چکا ہے، اس کے چہرہ کا رنگ زرد پڑ گیا ہے، (صاف ظاہر تھا کہ آتش عشق کا اس پر غلبہ ہو گیا ہے جس نے اس کو بے قرار کر دیا ہے) اس نے مجھ پر سلام کیا، اور دوبارہ مجھ سے خواہش کی کہ اسی سورۂ "ذاریات" کو اس کے لیے پڑھوں جب میں اس آیت پر پہنچا، تو اس نے چلا کر کہا، ہم نے اپنے خدا کے وعدہ کو اچھی طرح پا لیا ہے، اس کے بعد اس نے کہا کیا اس کے بعد بھی کوئی آیت ہے تو میں نے بعد والی آیت کو پڑھا: فورب السماء والارض انہ لحق، تو اس نے دوبارہ چیخ مار کر کہا:

"یاسبحان اللہ من ذا الذی اغضب الجلیل حتی حلف یصدقوہ بقولہ حتی الجئوہ الی الیمین ؟!"

"یہ کتنی عجیب بات ہے، کون تھا وہ جس نے خداوند جلیل کو غضبناک کیا، اور اُسے اس طرح قسم کھانی پڑی کیا انھوں نے اس کی باتوں پر یقین نہیں کیا، کہ وہ قسم کھانے کے لیے ناچار ہوا" ؟! اس نے اس جملہ کو تین مرتبہ دہرایا، اور زمین پر گر پڑا، اور اس کی رُوح آسمان کی طرف پرواز کر گئی۔[1]

⁂ ⁂ ⁂

۲۔ بہشت کہاں ہے؟

جیسا کہ ہم آیات کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ بعض نے "وما توعدون" کے جملہ کی بہشت کے ساتھ تفسیر کی ہے انھوں نے یہ کہا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بہشت آسمانوں میں ہے، لیکن ان کی یہ بات اس چیز سے جو سورۂ آل عمران کی آیہ ۱۳۳ میں آئی ہے، جو کہتی ہے کہ "بہشت آسمانوں اور زمین کی وسعت کے برابر ہے۔ سازگار نظر نہیں آتی۔

اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، یہ تفسیر جملہ "ماتوعدون" کے لیے مُسلّم نہیں ہے، بلکہ ممکن ہے کہ یہ وعدہ رزق یا آسمانی عذابوں کی طرف اشارہ ہو۔

اور اگر سورۂ نجم کی آیہ ۱۵ میں یہ آیا ہے کہ "جنة المأوٰی" آسمانوں میں "سدرة المنتہٰی" کے پاس ہے، تو یہ اس معنیٰ پر دلیل نہیں ہوگی، کیونکہ "جنة المأوٰی" بہشت کے باغات کا ایک حصہ ہے نہ کہ تمام بہشت (غور کیجیے گا)

---

[1] تفسیر کشاف، جلد ۴ صہ ۴۰۰۔

۳۔ حق تعالیٰ کی نشانیوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے آمادگی ضروری ہے

جس وقت قرآن کی آیات، عالم ہستی میں خدا کی نشانیوں اور اسرار آفرینش کے متعلق گفتگو کرتی ہیں، تو کبھی فرماتا ہے "یہ ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو کان دھر کے سنتے ہیں" (لقوم یسمعون) (یونس۔ ۶۷)

کبھی کہتا ہے، "ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں" (لقوم یتفکرون) (رعد۔ ۳)

کبھی فرماتا ہے، "ان لوگوں کے لیے جو تعقل کرتے ہیں" (لقوم یعقلون) (رعد۔ ۴)

کبھی کہتا ہے، ان لوگوں کے لیے جو بہت زیادہ صبر کرنے والے اور بہت زیادہ شکر گزار ہیں۔ (لکل صبار شکور) (ابراھیم۔ ۵)

کبھی کہتا ہے: "ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں" (لقوم یؤمنون) (نحل۔ ۷۹)

کبھی کہتا ہے "صاحبان دماغ کے لیے نشانیاں ہیں" (لآیات لاولی النھی) (طٰہٰ۔ ۵۴)

کبھی فرماتا ہے: "جو ہوش ہی سرشار ہیں" (لآیات للمتوسمین) (حجر۔ ۷۵)

اور بالآخر کبھی یہ کہتا ہے: صاحبان علم کے لیے نشانیاں ہیں (لآیات للعالمین) (روم۔ ۲۲)

زیر بحث آیات میں کہتا ہے، "کیا تم دیکھتے نہیں؟ کہ خدا کی آیتیں، زمین میں اور تمہارے وجود کے اندر، ان لوگوں کے لیے جو چشم بینا رکھتے ہیں، واضح و آشکار ہیں۔

یہ سب تعبیریں اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ بے شما آیات اور بہت سی نشانیوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے جو اس کے وجود پاک کے لیے، سارے عالم آفرینش میں موجود ہیں۔ ایک آمادہ زمین کی ضرورت ہے، ایک بینا آنکھ، ایک سننے والا کان ایک بیدار فکر اور ایک با ہوش دل، اور ایک ایسی روح جو حقائق کی پیاسی اور اُسے قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو، ضروری ہے، ورنہ ممکن ہے کہ انسان سالہا سال ان آیات کے درمیان زندگی بسر کرتا رہے لیکن جانوروں کی طرح اصطبل اور گھاس کے علاوہ کسی چیز کو نہ پہچانے۔

۴۔ رزق حق ہے

منجملہ ان امور کے جن پر ایک دقیق نظام حاکم ہے، یہی روزی کا مسئلہ ہے، جس کی طرف زیرِ بحث آیت میں واضح اشارے ہوئے ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ زندگی کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھانے کے لیے تلاش و کوشش شرط ہے، اور کاہلی و سستی محرومیت اور درماندگی کا سبب بنتی ہے، لیکن یہ گمان کر لینا بھی اشتباہ اور غلط ہے کہ حرص و طمع اور نامناسب کاموں سے انسان کی روزی میں اضافہ ہوتا ہے، اور عفت و متانت اور خود داری سے روزی کم ہو جائے گی۔

اسلامی احادیث میں اس سلسلے میں عمدہ تعبیریں نظر آتی ہیں۔ ایک حدیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے،

ان الرزق لا یجرہ حرص حریص ، ولا یصرفہ کرہ کارہ :

" روزی خدا کی طرف سے مقدر شدہ ہے ، حریص کا حرص اُسے جلب نہیں کرتا ، اور نہ ہی لوگوں کی ناپسندیدگی اُسے روکتی ہے " [1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے کہ آپؑ نے اس شخص کے جواب میں جس نے موعظہ کا تقاضا کیا تھا فرمایا :

" وان کان الرزق مقسوماً فالحرص لماذا ؟ ..... "

" جب رزق تقسیم شدہ ہے تو پھر حرص ولالچ کس بناپر ... " ؟ [2]

ان بیانات کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کوئی کوشش ہی نہ کی جائے ، بلکہ حریص اور لالچی لوگوں کو ، رزق کے مقدر ہونے کی وجہ سے ان کے حرص سے روکا گیا ہے ۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ احادیث اسلامی میں جلب رزق یا اس کے موانع کے عنوان سے بہت سے امور بیان کیے گئے ہیں ۔ جن میں سے ہر ایک اپنی نوعیت میں کار آمد ہے ۔

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے ۔

والذی بعث جدی بالحق نبیاً ان اللہ تبارک و تعالٰی یرزق العبد علی قدر المروۃ ، وان المعونۃ تنزل علی قدر شدۃ البلاء :

" اس ذات کی قسم جس نے میرے جد کو حق کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا ہے کہ خداوند تعالٰی انسان کو اس کی مروت و شخصیت کے مطابق روزی دیتا ہے ، اور پروردگار کی کمک اور مدد شدت بلا اور حادثہ کی مناسبت سے ہوتی ہے ۔ [3]

ایک اور دوسری حدیث میں انہی حضرت سے منقول ہے :

کف الاذی وقلۃ الصخب یزیدان فی الرزق :

" لوگوں کو تکلیف و آزار پہنچانے سے رُکنا اور شور شرابہ اور جھگڑے کو ختم کرنے سے ، روزی میں اضافہ ہوتا ہے " [4]

پیغمبر اسلامؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

" التوحید نصف الدین واستنزال الرزق بالصدقۃ :

" توحید نصف دین ہے اور روزی کو راہِ خدا میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے نازل کرو " [5]

اس طرح کچھ اور امور جیسے گھر کے اطراف کو صاف ستھرا رکھنا اور برتنوں کو دھونا روزی کی زیادتی کے اسباب میں سے بیان کیے گئے ہیں ۔

---

[1] و [2] " نور الثقلین " جلد ۵ ص ۱۳۱

[3] نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۲۵ (حدیث ۳۱)

[4] و [5] وہی مدرک جلد ۵ ص ۱۳۱ (حدیث ۳۵ ، ۳۷)

۲۴۔ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ○

۲۵۔ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ○

۲۶۔ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ○

۲۷۔ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ○

۲۸۔ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ○

۲۹۔ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ○

۳۰۔ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ○

ترجمہ

۲۴۔ کیا تمھارے پاس ابراہیم کے محترم مہمانوں کی خبر آئی ہے؟

۲۵۔ جس وقت وہ ان کے پاس پہنچے تو کہا، تجھ پر سلام! اس نے کہا، تم پر بھی سلام، تمھیں پہچانا نہیں!

۲۶۔ اس کے بعد چپکے سے اپنے گھر والوں کی طرف گیا، اور ایک موٹا تازہ بچھڑا (اور بھنا ہوا ان کے لیے) لایا۔

۲۷۔ اور اس کو ان کے پاس رکھ دیا (لیکن تعجب سے دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھ غذا کی طرف نہیں بڑھاتے) کہا! کیا تم کھانا نہیں کھاتے؟

۲۸۔ اور اس کام سے وحشت محسوس کی، انہوں نے کہا: ڈرو نہیں (ہم تو تیرے پروردگار کے رسول ہیں) اور اُسے ایک عالم و دانا بیٹے کے تولد کی بشارت دی۔

۲۹۔ اسی اثناء میں اس کی بیوی آگے بڑھی درحالیکہ (خوشی اور تعجب سے) چلّا رہی تھی، اور اپنے مُنہ پر ہاتھ مارا اور کہا (کیا میرے بیٹا ہوگا حالانکہ میں) ایک بانجھ بڑھیا ہوں۔

۳۰۔ انھوں نے کہا تیرے پروردگار نے اسی طرح کہا ہے اور وہ حکیم و دانا ہے۔

تفسیر

ابراہیمؑ کے مہمان

ان آیات سے آگے گزشتہ مطالب کی تاکید و تائید کے لیے، گزشتہ انبیاء اور گزشتہ اقوام کی سرگزشت کا ایک گوشہ پیش کیا جارہا ہے اور اس کا پہلا حصہ ان فرشتوں کی سرگزشت ہے، جو قوم لُوط کو عذاب کرنے کے لیے آدمیوں کی شکل میں ابراہیمؑ پر ظاہر ہُوئے اور ایک بیٹے کے تولد کی بشارت دی، جبکہ ابراہیمؑ بھی بڑھاپے کے سن کو پہنچے ہُوئے تھے اور ان کی بیوی بھی سن رسیدہ اور بانجھ تھی۔

اس باعزت بیٹے کا اس سن و سال میں بوڑھے ماں باپ کو عطا کرنا، ایک طرف تو، اس چیز کے لیے، جو ہر قسم کی روزیوں کے مقدر ہونے کے سلسلہ میں گزشتہ آیات میں آئی تھی، ایک تاکید ہے۔

اور دوسری طرف حق تعالیٰ کی قدرت و توانائی پر ایک دلیل اور خدا شناسی کی آیات میں سے ایک آیت ہے، جسے کے بارے میں گذشتہ آیات میں بحث ہوئی ہے۔

اور تیسری طرف صاحب ایمان اقوام کے لیے جو حمایت حق کے مشمول ہیں، ایک بشارت ہے، جیسا کہ بعد والی آیات جو قوم لُوط کے ہولناک عذاب کی بات کرتی ہیں۔ بے ایمان مجرموں کے لیے ایک تہدید اور تنبیہ ہے۔

پہلے رُوئے سخن پیغمبرؐ کی طرف کرتے ہُوئے فرماتا ہے: "کیا ابراہیم کے محترم مہمانوں کی خبر تجھ تک پہنچی ہے" (ھل اتاك حديث ضيف ابراهيم المكرمين)[1]

---

[1] ضیف وصفی معنی رکھتا ہے اور مفرد و جمع دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ لہٰذا "مکرمین" کے ساتھ جو جمع ہے (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

"مکرمین" (اکرام کئے گئے) کی تعبیر یا تو اس بنا پر ہے کہ یہ فرشتے حق تعالیٰ کے مامور تھے اور سورۂ انبیاء کی آیہ ۲۶ میں بھی فرشتوں کے بارے میں یہ آیا ہے: بل عباد مکرمون: "وہ مکرم و محترم بندے ہیں" یا ان احترامات کی وجہ سے ہے جو ابراہیم ان کے لیے بجالائے: اور یا دونوں جہات سے۔

اس کے بعد ان کے حالات کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے: "جس وقت وہ ابراہیمؑ پر وارد ہوئے اور کہا: تجھ پر سلام! تو اس نے کہا: تم پر بھی سلام ہو، تمھیں پہچانتا نہیں" (اذ دخلوا علیہ فقالوا سلاما قال سلام قوم منکرون)۔[1]

بعض نے کہا ہے کہ ابراہیمؑ نے ان کے ناشناختہ ہونے کی بات اپنے دل میں کی نہ کہ آشکارا صورت میں (کیونکہ یہ بات مہمان کے مسئلہ احترام کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔)

لیکن یہ بات معمول کے مطابق ہے، کہ بعض اوقات میزبان مہمان کے احترام کے باوجود کہتا ہے، معلوم نہیں میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے؟ اور میں آپ کو اچھی طرح پہچانتا نہیں ہوں۔ اس بنا پر بظاہر آیہ کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے، کہ ابراہیم نے یہ بات ان کے سامنے ہی کی ہو، اگرچہ پہلا احتمال بھی بعید نظر نہیں آتا، خاص طور سے جبکہ مہمانوں کی طرف سے اپنے تعارف کے سلسلے میں یہاں کوئی جواب بھی نظر نہیں آتا، اور اگر ابراہیم نے اس قسم کی کوئی بات آشکارا کی تھی، تو مسلّماً وہ اس کا جواب دیتے۔

بہرحال ابراہیمؑ جیسے مہمان نواز اور سخی نے اپنے مہمانوں کی پذیرائی کے لیے فوراً کام شروع کر دیا: "پوشیدہ طور پر اپنے گھر والوں کی طرف گئے اور ایک موٹا تازہ بُھنا ہوا بچھڑا ان کے لیے لے آئے" (فراغ الیٰ اھلہ فجاء بعجل سمین)۔

"راغ" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے "روغ" (بروزن شوق) ایک پوشیدہ منصوبے کے ساتھ چلنے کے معنی میں ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اس کی توصیف جمع کی ہے، اور یہ جو بعض نے کہا ہے کہ وہ مصدر ہے اور اس کا تثنیہ اور جمع نہیں ہے۔ ٹھیک نظر نہیں آتا، لیکن "کشاف" میں "زمخشری" کے قول کے مطابق چونکہ اصل میں وہ مصدر تھا، جب اس نے اپنے آپ میں وصفی معنی لے لیا تو مفرد و جمع دونوں میں استعمال ہونے لگا۔

[1] "سلاماً" ایک فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے، اور تقدیر میں اس طرح ہے، "فسلم علیکم سلاماً" اور "سلام" مبتداء ہے، اور اس کی خبر محذوف ہے اور اصل میں "علیکم سلام" یا "سلام علیکم" تھا، گویا ابراہیم چاہتے تھے کہ ان کے سلام سے بالاتر سلام اور تحیت کہیں، کیونکہ جملہ اسمیہ "اثبات و دوام پر دلالت کرتا ہے (تفسیر کشاف ج ۴ صفحہ ۴۰۱)

ابراہیمؑ نے ایسا کیوں کیا؟ کیونکہ ممکن تھا، کہ اگر مہمان متوجہ ہو جائیں، تو اس قسم کی پُر خرچ میزبانی سے منع کر دیں۔

لیکن ابراہیمؑ نے معدودے چند مہمانوں کے لیے، جو بعض کے قول کے مطابق تین افراد اور زیادہ سے زیادہ بارہ افراد تھے[1] اتنا فراواں اور بافراغت کھانا کیوں تیار کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ عام طور پر سخی افراد ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی مہمان آجائے تو وہ صرف مہمانوں کے اندازے کے مطابق کھانا تیار نہیں کرتے، بلکہ وہ اتنی غذا تیار کرتے ہیں کہ مہمانوں کے علاوہ وہ تمام لوگ جو ان کے لیے کام کرتے ہیں اس میں شریک ہو جائیں، یہاں تک کہ وہ ہمسایوں قرابت داروں اور دوسرے گرد و پیش کے لوگوں کو بھی نظر میں رکھتے ہیں۔ اس بنا پر ہرگز اس قسم کی اضافی غذا اسراف اور فضول خرچی میں شمار نہیں ہوتی، اور یہ چیز موجودہ زمانہ میں بہت سے قبیلوں اور ان لوگوں میں جو سابقہ طور طریقوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں، نظر آتی ہے۔

"عجل" (بروزن طفل) بچھڑے کے معنی میں ہے، (اور یہ جو بعض نے کہا ہے کہ گوسفند کے معنی میں ہے وہ متون لغت کے مطابق نہیں ہے) یہ لفظ اصل میں "عجلہ" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ جانور اس سن و سال میں عجولانہ حرکات کرتا ہے اور جب بڑا ہو جاتا ہے تو انھیں کلی طور پر چھوڑ دیتا ہے۔

"سمین" موٹے تازے کے معنی میں ہے اور اس قسم کے بچھڑے کا انتخاب مہمانوں کے احترام اور آس پاس کے اشخاص کے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے تھا۔

سورۂ ہود کی آیت ۶۹ میں آیا ہے کہ یہ بچھڑا بھنا ہوا تھا، (بعجل حنیذ) اگرچہ زیر بحث آیت اس بارے میں کوئی بات نہیں کرتی، لیکن اس کے منافی بھی نہیں ہے۔

"ابراہیمؑ خود یہ کھانا مہمانوں کے لیے لے کر آئے، اور ان کے نزدیک رکھ دیا" (فقربہ الیھم)۔

لیکن انتہائی تعجب کے ساتھ مشاہدہ کیا کہ وہ کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے تو ابراہیمؑ نے کہا: کیا تم کھانا نہیں کھاتے؟ (قال الا تأکلون)۔

ابراہیمؑ خیال کرتے تھے کہ وہ جنس بشر میں سے ہیں، "جب انھوں نے دیکھا کہ وہ کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے تو دل میں وحشت محسوس کی" (فاوجس منھم خیفۃ)۔

کیونکہ اس زمانہ میں۔ اور اس زمانہ میں بھی بہت سی اقوام ہیں جو سنتی اخلاق کے پابند ہیں۔ جب کوئی کسی کے دسترخوان پر کھانا کھا لیتا تھا تو پھر اس کو تکلیف و آزار نہیں پہنچاتا تھا، اور کوئی خیانت نہیں کرتا تھا، اور جہاں نمک کھاتے ہیں وہاں نمک دان کو نہیں توڑتے (نمک حرامی نہیں کرتے)، لہٰذا اگر مہمان غذا کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاتا، تو یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ وہ کسی خطرناک کام کے لیے آیا ہے، یہ ضرب المثل بھی عربوں میں مشہور ہے کہ وہ کہتے ہیں: "من لم یأکل طعامک لم یحفظ ذمامک"۔

---

[1] اقتباس از "روح البیان" اور حاشیہ تفسیر صافی "زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

* جو شخص تیرا کھانا نہیں کھاتا وہ تیرے عہد و پیمان کی وفا نہیں کرے گا۔

"ایجاس" "وجس" (بروزن مکث) کے مادہ سے اصل میں مخفی آواز کے معنی میں ہے، اسی بنا پر "ایجاس" پنہانی اور اندرونی احساس کے معنی میں آیا ہے، گویا انسان اپنے اندر سے آواز سنتا ہے اور جب "خیفة" کے ہمراہ ہو تو احساس خوف کے معنی میں ہے۔

یہاں پر مہمانوں نے۔ جیسا کہ سورۂ ہود آیت ۷۰ میں آیا ہے۔ "اس سے کہا کہ ڈرو نہیں" اور اس کو تسلی دی، (قالوا لا تخف)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "انھوں نے اُسے ایک دانا اور عالم بیٹے کی بشارت دی" (و بشروه بغلام علیم)۔

واضح ہے کہ بیٹا تولد کے وقت تو "عالم" نہیں ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ اس میں استعداد ہو کہ وہ آئندہ عالم اور عظیم دانشمند بنے اور یہاں یہی مراد ہے۔

اس بارے میں کہ یہ بیٹا "اسمٰعیل تھا" یا "اسحٰق"؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، اگرچہ مشہور یہی ہے کہ وہ حضرت اسحٰق تھے۔

لیکن یہ احتمال کہ اسماعیل تھا، سورۂ ہود کی آیہ ۱۷ کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو کہتی ہے: فبشرنا ھا باسحٰق، درست نظر نہیں آتا اس بنا پر کوئی شک نہیں ہے کہ وہ عورت جس کے بارے میں بعد کی آیات میں گفتگو آئی ہے، وہ ابراہیم کی بیوی سارہ ہے اور یہ بیٹا "اسحٰق" ہے۔

"اس وقت ابراہیم کی بیوی آگے آئی، درحالیکہ وہ خوشی اور تعجب سے بلند آواز میں بول رہی تھی۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ مارا اور کہا: کیا میرے فرزند ہوگا؟ حالانکہ میں ایک بانجھ بڑھیا ہوں" (فاقبلت امراته فی صرة فصکت وجھھا وقالت عجوز عقیم)۔

سورۂ ہود کی آیت ۷۲ میں بھی یہ آیا ہے: قالت یا ویلتیٰ ءالد وانا عجوز وھٰذا بعلی شیخا، اس نے کہا: وائے ہو مجھ پر کیا میں اب بچہ جنوں گی، جب کہ میں بانجھ بڑھیا ہوں، اور یہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہے، یہ تو واقعاً ایک عجیب چیز ہے۔

اس بنا پر اس کا چیخنا تعجب اور خوشی کی وجہ سے چیخنا تھا۔ (یعنی بلند آواز میں اظہار مسرت و حیرت)

لفظ "صرة" "صر" (بروزن شر) کے مادہ سے دراصل باندھنے اور وابستگی کے معنی میں ہے، اور شدت سے چیخنے اور اسی طرح پے در پے جمعیت پر بھی بولا جاتا ہے، چونکہ اس میں شدت اور ایک دوسرے سے پیوستگی ہوتی ہے، شدید اور سرد ہواؤں کو بھی "صرصر" کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ انسانوں کو لپیٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اور "صرورة" اس عورت یا مرد کو کہتے ہیں۔ جس نے ابھی تک حج نہ کیا ہو، یا شادی کرنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو، کیونکہ ان میں ایک قسم کی بستگی اور امتناع ہے اور زیر بحث آیت میں اسی شدت کے ساتھ چلّانے کے معنی میں ہے۔

"صکت" "صک" (بروزن شک) کے مادہ سے شدت سے مارنے یا چہرے پر مارنے کے معنی میں ہے، اور یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ ابراہیم کی بیوی نے جس وقت بیٹے کے تولد کی بشارت سنی — تو جیسا کہ عورتیں

کی عادت ہے۔ شدت تعجب اور شرم و حیا سے اپنے ہاتھ اپنے منہ پر مارے۔

بعض مفسرین کے قول کے مطابق اور اسی طرح تورات کے سفر تکوین کے مطابق، ابراہیم کی بیوی نوّے سال یا اس سے زیادہ عمر کی تھی، اور خود ابراہیم تقریباً سو سال یا اس سے زیادہ تھے۔

لیکن قرآن بعد والی آیت میں، فرشتوں کے جواب کو، جو انھوں نے اُسے دیا۔ نقل کرتا ہے: "انھوں نے کہا کہ تیرے پروردگار نے اسی طرح کہا ہے، اور وہ حکیم و دانا ہے" (قالوا کذالک قال ربک انه هو الحکیم العلیم)۔

اگرچہ تو بڑھیا ہے اور تیرا شوہر بھی اس طرح ہے، لیکن جب تیرے پروردگار کا فرمان صادر ہو اور اس کا ارادہ کسی چیز سے متعلق ہو جائے تو بلاشک و شبہ وہ پورا ہو جاتا ہے۔

یہاں تک کہ اسی جہان جیسا ایک اور عظیم جہان امر "کن" (ہو جا) کے ساتھ پیدا کر دینا اس کے لیے سہل اور آسان ہے۔

"حکیم" اور "علیم" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ تو اپنے بڑھاپے اور بانجھ ہونے اور اپنے شوہر کے کہن سال ہونے کی خبر دے، خدا ان سب باتوں کو جانتا ہے اور اگر ابھی تک اس نے تمھیں بیٹا نہیں دیا اور اب آخر عمر میں مرحمت کر رہا ہے تو اس میں بھی حکمت ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ سورۂ ہود کی آیہ ۷۳، میں یہ آیا ہے کہ فرشتوں نے اس سے کہا: اتعجبین من امر الله رحمة الله وبرکاته علیکم اهل البیت انه حمید مجید: "کیا تو خدا کے حکم پر تعجب کر رہی ہے، یہ خدا کی رحمت اور اس کی برکات تمھارے گھرانے پر ہیں اور وہ حمید و مجید ہے۔"

ان دونوں تعبیروں کا فرق اس بنا پر ہے، کہ فرشتوں نے یہ سب باتیں سارہ سے کہی تھیں، فرق یہ ہے کہ سورۂ ہود میں اس کے ایک حصہ کی طرف اور یہاں دوسرے حصہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ وہاں خدا کی رحمت اور برکات کی گفتگو ہے اور وہ حمید و مجید ہونے کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ (وہ ذات جس کی نعمتوں کے مقابلہ میں اس کی حمد و تمجید کرتے ہیں۔

لیکن یہاں ان دونوں میاں بیوی کے بچہ جننے کے لیے عدم آمادگی کی نسبت خدا کی آگاہی، اور اس خاتون کے ظاہری اسباب کی بنا پر عقیم ہونے کے سلسلہ میں گفتگو ہے، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ کہا جائے۔ خدا ان سب چیزوں سے آگاہ ہے، اور اگر یہ سوال ہو کہ جوانی میں یہ نعمت انھیں کیوں نہیں دی؟ تو کہا جائے گا: اس میں کوئی حکمت ہوگی، کیونکہ وہ حکیم ہے۔

ایک نکتہ

پیغمبروں کی سخاوت

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض خشک قسم کے افراد سخاوت اور بلند نظری کا اسراف اور فضول خرچی سے اشتباہ کرتے ہیں اور خسیس ہونے اور تنگ نظری کو زہد و پارسائی کے مسئلہ سے وابستہ کر دیتے ہیں۔

قرآن اُوپر والی آیات اور سورۂ ہود کی آیات میں اس حقیقت کو کھول کر بیان کر رہا ہے کہ مہمان کی پذیرائی کھلے دل سے اور معقول طریقے سے کرنا ہرگز مخالف شریعت نہیں ہے، بلکہ اس بنا پر کہ ایک پیغمبر نے یہ کام کیا ہے، لہٰذا یہ اس کے پسندیدہ ہونے کی دلیل ہے، لیکن وہ ایسی پذیرائی ہو جس کی شعاع دوسروں کو بھی بہرہ ور کرے، جیسا کہ شریف اور سخی افراد کی رسم ہے۔

خدا نے کبھی بھی زندگی کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کو حرام نہیں کیا، اور اموال حلال اپنے پاس رکھنا، جیسا کہ ابراہیم کے پاس تھے، جن سے دوسرے لوگ بھی فائدہ اٹھاتے تھے، اُسے کبھی عیب شمار نہیں کیا۔

ابراہیم اتنا بہت سارا مال ہونے کے باوجود کبھی بھی یادِ خدا سے غافل نہیں ہوئے، اور کبھی اس سے خواہ مخواہ کی دلبستگی نہ رکھی اور کسی زمانہ میں بھی اس کے منافع کو اپنے تک منحصر نہیں رکھا۔

قرآن سورۂ اعراف کی آیہ ۳۲ میں کہتا ہے: قل من حرم زينة الله التي اخرج لعباده والطيبات من الرزق قل هي للذين امنوا في الحيوة الدنيا خالصة يوم القيامة كذالك نفصل الأيات لقوم يعلمون، کہہ دے خدا کی زینتوں کو جو اس نے بندوں کے لیے خلق کی ہیں، اور پاکیزہ روزیوں کو کس نے حرام کیا ہے؟ کہہ دے: یہ دنیا کی زندگی میں انہیں لوگوں کے لیے تو ہیں جو ایمان لائے ہیں (اگرچہ دوسرے لوگ بھی ان کے ساتھ شریک ہیں لیکن) قیامت میں تو یہ خالصتاً مؤمنین کے لیے ہی ہوں گی، ہم اسی طرح سے اپنی آیات کی ایسے لوگوں کے لیے جو آگاہ ہیں، تشریح و تفصیل کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہم تفصیلی بحث جلد ۶ سورۂ اعراف کی آیہ ۳۲ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

۳۱۔ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ○
۳۲۔ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ○
۳۳۔ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ○
۳۴۔ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ○
۳۵۔ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○
۳۶۔ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○
۳۷۔ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ○

ترجمہ

۳۱۔ (ابراہیم نے) کہا: اے خدا کے فرشتو! پھر تم کس لیے بھیجے گئے ہو؟

۳۲۔ انھوں نے کہا: ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

۳۳۔ تاکہ ان پر "مٹی کے پتھروں" کی بارش کریں۔

۳۴۔ ایسے پتھر جن پر، تیرے پروردگار کی طرف سے، اسراف کرنے والوں کے لیے نشان لگے ہوئے ہیں۔

۳۵۔ ہم نے ان تمام مومنین کو جو (قوم لوط) کے ان شہروں میں زندگی بسر کرتے تھے، (عذاب کے نازل ہونے سے پہلے) باہر نکال لیا۔

۳۶۔ اور ہم نے اس میں ایک گھرانے کے سوا کوئی باایمان گھرانا پایا ہی نہیں۔

۳۷۔ اور ہم نے ان (بلا دیدہ شہروں) میں، ایسے لوگوں کے لیے، جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں، ایک واضح نشانی چھوڑی ہے۔

تفسیر

قوم لوط کے بلا دیدہ شہر ایک آیت اور عبرت ہیں

فرشتوں کے ابراہیم کے پاس آنے، اور انہیں اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت دینے کے واقعہ کے بعد، اس گفتگو کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے، جو "ابراہیم" اور "فرشتوں" کے درمیان قوم "لوط" کے سلسلہ میں ہوئی۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ: ابراہیم شام کی طرف جلاوطن ہونے کے بعد لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دینے اور ہر قسم کے شرک و بت پرستی کے خلاف مبارزہ کرنے میں مصروف تھے، حضرت "لوط" جو ایک عظیم پیغمبر تھے، ان ہی کے زمانہ میں ہوئے ہیں اور احتمال یہ ہے کہ آپ ہی کی طرف سے مامور ہوئے تھے، کہ گمراہوں کو تبلیغ و ہدایت کرنے کے لیے شام کے ایک علاقہ (یعنی سدوم کے شہروں کی طرف) سفر کریں۔ وہ ایک ایسی گناہگار قوم کے درمیان آئے جو شرک اور بہت سے گناہوں میں آلودہ تھی، اور سب سے قبیح گناہ اغلام اور لواطت تھی، آخر کار فرشتوں کا ایک گروہ، اس قوم کی ہلاکت پر مامور ہوا، لیکن وہ پہلے ابراہیمؑ کے پاس آئے۔

ابراہیم مہمانوں کی وضع قطع سے سمجھ گئے کہ یہ کسی اہم کام کے لیے جا رہے ہیں؛ اور صرف بیٹے کی ولادت کی بشارت کے لیے نہیں آئے، کیونکہ اس قسم کی بشارت کے لیے تو ایک ہی شخص کافی تھا، یا اس عجلت کی وجہ سے جو وہ چلنے کے لیے کر رہے تھے، اس سے محسوس کیا کہ کوئی اہم ڈیوٹی رکھتے ہیں۔

لہٰذا پہلی آیت میں کہتا ہے: "اے خدا کے بھیجے ہوئے فرشتو! تم کونسے اہم کام کے لیے مامور ہوئے ہو"؟ (قال فما خطبکم ایھا المرسلون)۔[1]

فرشتوں نے اپنی ڈیوٹی بیان کی، اور ابراہیم سے کہا ہم ایک مجرم اور تباہ کار قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں" (قالوا انا ارسلنا الی قوم مجرمین)۔

---

[1] توجہ رکھنی چاہیئے کہ "خطب" ہر قسم کے کام کو نہیں کہتے، بلکہ یہ اہم کاموں کے معنی میں ہے، جبکہ شغل، امر، فعل اور اس قسم کے الفاظ ایک عام مفہوم رکھتے ہیں۔

ایسی قوم جو عقیدہ کے فساد اور خرابی کے علاوہ انواع و اقسام کی آلودگیوں، اور مختلف گناہوں میں جو قبیح اور شرمناک ہیں۔ گرفتار رہی۔ [1]

اس کے بعد انھوں نے مزید کہا: "ہم اس بات کے لیے مامور ہوئے ہیں کہ ان پر "سنگ۔ گل" کی بارش کریں، اور انہیں اس کے ذریعہ تہ و بالا کرکے ہلاک کردیں" (لنرسل علیهم حجارة من طین)۔

"حجارة من طین" (مٹی کے پتھر) کی تعبیر، وہی چیز ہے، جسے سورۂ ہود کی آیہ ۸۲ میں، اس کی بجائے "سجیل" کہا ہے، اور "سجیل" اصل میں ایک فارسی لفظ ہے، جو "سنگ" و "گل" سے لیا گیا ہے، اور عربی زبان میں "سجیل" کی صورت اختیار کرلی ہے، تو اس بنا پر یہ ایک ایسی چیز ہے جو نہ پتھر کی طرح سخت ہے اور نہ مٹی کی طرح نرم اور مجموعی طور پر شاید اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ اس مجرم قوم کو نابود کرنے کے لیے آسمان سے بڑے بڑے پتھروں کے نازل کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی، بلکہ چھوٹے چھوٹے ریت کے ذرات کی بارش جو زیادہ محکم نہیں تھے، بارش کے قطرات کی مانند ان پر برسے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "یہ پتھر تیرے پروردگار کی طرف سے اسراف کرنے والوں کے لیے نشان لگائے ہوئے تھے" (مسومة عند ربك للمسرفین)۔

"مسومة" اس چیز کو کہتے ہیں، جس پر کوئی علامت اور نشانی ہو، اور اس بارے میں کہ وہ کس طرح کے نشاندار تھے مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے تو یہ کہا ہے کہ، ان کی ایک مخصوص شکل تھی جو اس بات کی نشاندہی کرتی تھی کہ یہ عام پتھر نہیں ہیں، بلکہ عذاب کا ذریعہ ہیں۔

اور ایک جماعت نے یہ کہا ہے: ہر ایک پر ایک علیحدہ نشانی تھی اور ایک معین فرد اور ایک خاص نقطہ کے لیے نشانہ بنایا گیا تھا تاکہ لوگ جان لیں کہ خدا کے عذاب ایسے حساب شدہ ہوتے ہیں کہ یہ تک معلوم ہے، کہ کون سا مجرم شخص کس پتھر کے ساتھ ہلاک ہوگا!

"مسرفین" کی تعبیر ان کے گناہوں کی کثرت کی طرف اشارہ ہے، اس طرح سے کہ وہ حد سے گزر گئے تھے اور حیاء و شرم کا پردہ چاک کر چکے تھے، اگر کوئی شخص قوم لوط کے حالات اور ان کے گناہوں کے اقسام میں غور کرے

---

[1] قابل توجہ بات یہ ہے کہ سورۂ ہود میں اس واقعہ کو ذکر کرتے وقت کہتا ہے: "انا ارسلنا الی قوم لوط"، "ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں" یہ تعبیر کا یہ فرق جو زیر بحث آیات اور سورۂ ہود کی آیات کے درمیان ہے اس بنا پر ہے کہ ان میں سے ہر ایک واقعہ کے ایک حصہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں، دوسرے لفظوں میں یہ تمام مسائل واقع ہوئے ہیں، البتہ ان میں سے بعض زیر بحث آیات کے ضمن میں آئے ہیں اور بعض دوسرے، دوسری سورتوں میں ہیں۔

تو وہ دیکھے گا کہ ان کے بارے میں یہ تعبیر بہت ہی پُرمعنی ہے۔[1]

ہر انسان ممکن ہے کبھی کبھی کسی گناہ سے آلودہ ہو جائے، لیکن اگر وہ جلدی بیدار ہو جائے اور اس کی تلافی اور اصلاح کرے۔ تو زیادہ مشکل نہیں ہے۔ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب کام اسراف کی حد تک پہنچ جائے۔

یہ تعبیر اس کے ساتھ ہی ایک اور مطلب کو بھی واضح کرتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ یہ آسمانی پتھر قوم لوط کے لیے نشان لگائے گئے بلکہ یہ تمام اسراف کرنے والے گنہگاروں کے انتظار میں ہیں۔

⁂

قرآن نے یہاں پروردگار کے ان فرشتوں کے بعد کے واقعہ کو۔ کہ وہ لوط کے پاس آئے، اور مہمانوں کے عنوان سے وارد ہوئے، اور وہ بے شرم قوم، اس خیال سے کہ وہ نوع بشر کے خوبصورت جوان ہیں، ان کی طرف آئی۔ لیکن بہت جلد ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اور ان سب کی آنکھیں اندھی ہوگئیں —— چھوڑ دیا ہے، اور خدا کی گفتگو کے آخری حصہ کو بیان کرتا ہے۔[2]

فرماتا ہے، "ہم نے ان تمام مؤمنین کو جو قوم لوط کے شہروں میں رہتے تھے۔ بلا کے نازل ہونے سے پہلے ہی نکال دیا" (فاخرجنا من كان فيها من المؤمنين)۔

لیکن ان تمام علاقوں میں ہمیں ایک گھرانے کے سوا اور کوئی صاحب ایمان نہ ملا"! (فما وجدنا فيها غير بيت من المسلمين)۔

ہاں! ہم ہرگز خشک و تر کو ملا کر نہیں جلاتے، اور ہماری عدالت اجازت نہیں دیتی کہ مومن کو کافر کی سزا میں گرفتار کریں یہاں تک کہ اگر لکھو کھا بے ایمان اور مجرم لوگوں میں ایک فرد بھی با ایمان اور پاک ہو تو ہم اسے بھی نجات دیتے ہیں۔

یہ وہی مطلب ہے جو سورۂ حجر کی آیت ۵۹، ۶۰ میں اس صورت میں آیا ہے، "الا آل لوط انا لمنجوهم اجمعين الا امرأته قدرنا انها لمن الغابرين" "مگر لوط کا خاندان کہ ہم ان سب کو نجات دیں گے سوائے اس کی بیوی کے جس کے لیے ہم نے یہ مقدر کر دیا تھا کہ وہ شہر میں رہے اور ہلاک ہو جائے۔

---

[1] تفسیر نمونہ کی جلد ۹ ص ۱۸۳ کی طرف رجوع کریں (سورۂ ہود کی آیت ۸۱ کے ذیل میں)۔

[2] یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ یہ ماجرا سورۂ ہود کی آیات میں نقل ہوا ہے، لیکن اس کی تعبیریں اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں، کہ ابراہیم سے ان فرشتوں کی ملاقات قوم لوط کے عذاب سے پہلے تھی، جب کہ زیر بحث آیات میں کچھ تعبیریں یہ بتاتی ہیں کہ یہ ملاقات بعد میں ہوئی، اس مسئلہ کے حل کا راستہ یہ ہے کہ "مسومة عند ربك للمسرفين" تک فرشتوں کی گفتگو ہے۔ اور بعد کی تین آیات جو اوپر ذکر ہو چکی ہیں، خدا کا کلام ہے، اور اس کے مخاطب پیغمبر اسلام اور مسلمان ہوں، اور وہ اسے ایک واقعہ کے عنوان سے جو گزشتہ زمانہ میں صورت پذیر ہوا بیان کر رہا ہے۔

(غور کیجئے)

اور سورۂ ہود کی آیت ۸۱ میں آیا ہے: "فاسر باهلك بقطع من الليل ولا يلتفت منكم احد الا امرأتك انه مصيبها ما اصابهم" "رات کے وقت اپنے گھر والوں کے ساتھ روانہ ہو جا، اور تم میں سے کوئی بھی اپنے پیچھے کی طرف مڑ کر نہ دیکھے، سوائے تیری بیوی کے کہ وہ بھی اسی عذاب میں جس میں وہ گرفتار ہوں گے، گرفتار ہوگی۔

اور سورۂ عنکبوت کی آیت ۳۲ میں یہی واقعہ اس صورت میں بیان کیا گیا ہے:

قال ان فيها لوطا قالوا نحن اعلم بمن فيها لننجينه واهله الا امرأته كانت من الغابرين۔ "ابراہیم نے کہا: اس شہر اور آبادی میں تم جسے نابود کرنے کا (تم اے فرشتو!) ارادہ رکھتے ہو، لوط بھی رہتا ہے، انہوں نے کہا: ہم ان لوگوں سے جو اس میں ہیں بخوبی آگاہ ہیں، ہم اس کو اور اس کے گھر والوں کو تو نجات عطا کریں گے، مگر اس کی بیوی شہر کے لوگوں کے درمیان ہی رہ جائے گی:

پھر یہی موضوع سورۂ اعراف کی آیت ۸۳ میں اس طرح بیان ہوا ہے: فانجيناه واهله الا امرأته كانت من الغابرين: "ہم نے اسے اور اس کے گھر والوں کو نجات بخشی، مگر اس کی بیوی جو شہر میں رہ جانے والوں میں سے تھی (اور انہی کے انجام کو پہنچی)"

جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں قوم لوط کے ماجرے کا یہ حصہ قرآن کی ان پانچ سورتوں میں مختلف عبارتوں میں بیان ہوا ہے۔ جو سب کے سب ایک ہی حقیقت کو بیان کرتے ہیں، لیکن چونکہ ایک حادثہ کو مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے، اور ہر نگاہ میں اس کے کسی ایک پہلو کو مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اس لیے قرآن مجید میں بھی تاریخی حوادث عام طور پر اسی طرح پیش ہوئے ہیں، اور دہرائے گئے ہیں، اور اوپر والی آیات کی مختلف تعبیریں بھی اسی معنی کی گواہ ہیں، علاوہ ازیں چونکہ قرآن ایک تربیتی اور انسان سازی کی کتاب ہے، اور مقام تربیت گاہ میں ضروری ہے کہ ایک اہم مسئلہ پر بار بار تامل کیا جائے تاکہ پڑھنے والوں کے ذہن میں گہرا اثر چھوڑے، البتہ ضروری ہے کہ یہ تکرار عمدہ، دلنشین اور گوناں گوں تعبیروں کے ساتھ صورت پذیر ہو، تاکہ دل کو ملال حاصل نہ ہو اور فصیح و بلیغ ہو، (ابراہیم کے مہمانوں کے واقعہ اور ابراہیم کی ان سے گفتگو، اور پھر قوم لوط کے دردناک اور عبرت انگیز انجام، کی مزید وضاحت کے لیے، تفسیر نمونہ جلد ۶ ص ۲۱۲ سے آگے اور جلد ۹ ص ۱۸۳ اور جلد ۱۱ ص ۱۰۲ اور جلد ۱۶ ص ۲۴۳ سورۂ اعراف، ہود، حجر اور عنکبوت کی آیات کے ذیل میں رجوع فرمائیں)

بہرحال خداوند عالم نے اس آلودہ قوم کو زمین کے ایک سخت اور ویران کرنے والے زلزلہ سے تہ و بالا کر دیا، اس کے بعد آسمانی پتھروں کی بارش برسائی اور ان کا نام و نشان مٹا دیا۔ یہاں تک کہ ان کے پلید بدن بھی آسمانی گرد و غبار اور پتھروں کے نیچے دفن ہو گئے، تاکہ وہ آئندہ آنے والوں، اور تمام بے ایمان مجرم اور آلودہ افراد کے لیے، ایک عبرت ہوں۔

اسی لیے آخری زیر بحث آیت میں مزید کہتا ہے: "ہم نے ان لوگوں کے لیے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں، اس سرزمین میں ایک واضح نشانی رکھ چھوڑی ہے" (وتركنا فيها اية للذين يخافون العذاب الاليم)۔

یہ تعبیر اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ان آیات اور خدا کی نشانیوں سے وہی لوگ پند و نصیحت حاصل کرتے ہیں، جن میں قبول کرنے کے لیے آمادگی ہو۔ اور جو مسؤلیت اور ذمہ داری کا احساس کریں۔

ایک نکتہ

قوم لوط کے شہر کہاں تھے؟

یہ بات مسلمہ ہے کہ ابراہیم عراق اور سرزمین بابل سے ہجرت کرنے کے بعد شامات کی طرف گئے، کہتے ہیں کہ لوط بھی ان کے ساتھ تھے۔ لیکن کچھ مدت کے بعد (توحید کی طرف دعوت دینے اور فتنہ و فساد سے مبارزہ کے لیے) شہر "سدوم" کی طرف گئے۔

"سدوم" قوم لوط کے ایک شہر اور آبادی کا نام تھا جو شامات (ملک اردن میں) بحر المیت کے قریب واقع تھا جو آباد اور درختوں اور سبزہ زار سے بھرا تھا۔ لیکن اس بدکار و بے غیرت قوم پر عذاب الٰہی کے نازل ہونے کے بعد، ان کے شہر مسمار اور تہ و بالا ہو گئے چنانچہ انہیں "مدائن مؤتفکات" (تہ و بالا ہونے والے شہر) کہتے ہیں۔

بعض کا نظریہ، یہ ہے کہ ان شہروں کے ویرانے زیر آب آگئے ہیں، اور ان کا دعوٰی ہے کہ انہوں نے بحر المیت کے ایک گوشہ میں کچھ ستون اور دوسرے آثار۔ جو ان شہروں کے خرابوں پر دلالت کرتے ہیں دیکھتے ہیں۔

اور یہ جو بعض اسلامی تفاسیر میں آیا ہے کہ "وترکنا فیھا اٰیۃ" کے جملے سے مراد وہی گندے پانی ہیں جنہوں نے ان شہروں کی جگہ کو ڈبو دیا ہے۔ ممکن ہے کہ اسی معنی کی طرف اشارہ ہو کہ شدید زلزلوں اور زمین کے شگافتہ ہونے کے بعد بحر المیت سے ایک راستہ اس سرزمین بلا دیدہ کی طرف کھل گیا ہو اور یہ سب شہر زیر آب آ گئے ہوں۔

جب کہ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ قوم لوط کے شہر زیر آب نہیں آئے اور اب بھی بحر المیت کے قریب ایک علاقہ ہے جو سیاہ پتھروں کے نیچے ڈھکا ہوا ہے، احتمال ہے کہ قوم لوط کے شہروں کی یہی جگہ ہے۔

اور یہ بھی کہا ہے کہ ابراہیم کا مرکز شہر "حبرون" میں تھا، جو شہر "سدوم" سے چنداں دور فاصلہ پر نہیں تھا، اور جس وقت زلزلہ یا صاعقہ کے زیر اثر ان کے شہروں کو آگ لگی تو اس وقت ابراہیم حبرون کے قریب کھڑے ہوئے تھے، اور شہر سے جو دھواں اٹھ رہا تھا اُسے اپنی آنکھ سے دیکھ رہے تھے [1]

اس گفتگو کے مجموعہ سے ان شہروں کے قریباً قریباً حدود واضح ہو گئے، اگرچہ ان کے جزئیات ابھی تک پردہ ابہام میں ہیں۔

---

[1] اقتباس از کتاب "قاموس مقدس" "دائرۃ المعارف دھخدا" اور "المنجد" حصہ اعلام۔

۳۸۔ وَفِي مُوسَىٰ إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ○

۳۹۔ فَتَوَلَّىٰ بِرُكْنِهِ وَقَالَ سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ○

۴۰۔ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيمٌ ○

۴۱۔ وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ ○

۴۲۔ مَا تَذَرُ مِن شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيمِ ○

۴۳۔ وَفِي ثَمُودَ إِذْ قِيلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ ○

۴۴۔ فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ وَهُمْ يَنظُرُونَ ○

۴۵۔ فَمَا اسْتَطَاعُوا مِن قِيَامٍ وَمَا كَانُوا مُنتَصِرِينَ ○

۴۶۔ وَقَوْمَ نُوحٍ مِّن قَبْلُ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ○

ترجمہ

۳۸۔ موسیٰ (کی زندگی) میں بھی ایک نشانی اور درس عبرت تھا جب ہم نے اسے واضح و آشکار دلیل کے ساتھ فرعون کی طرف بھیجا۔

۳۹۔ لیکن اس نے اپنے تمام وجود کے ساتھ اس سے منہ پھیر لیا اور کہا: یہ آدمی یا تو جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔

۴۰۔ ہم نے اسے بھی اور اس کے لشکروں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا اور انہیں دریا میں پھینک دیا درآنحالیکہ وہ قابل ملامت تھا۔

۴۱۔ اسی طرح عاد کی سرگذشت میں بھی ایک آیت ہے جب کہ ایک تند و تیز آندھی، بارش کے بغیر ان کے اوپر بھیجی۔

۴۲۔ وہ جس چیز کے اوپر سے گذرتی تھی اسے چھوڑتی نہیں تھی، یہاں تک کہ اسے بوسیدہ ہڈیوں کی طرح کر دے۔

۴۳۔ قوم ثمود کی سرگذشت میں بھی ایک عبرت ہے، جب کہ ان سے یہ کہا گیا: تھوڑی سی دیر کے لئے تم بھی فائدہ اٹھا لو، (اور اس کے بعد عذاب کے منتظر رہو)

۴۴۔ انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی، تو انہیں صاعقہ نے پکڑ لیا، حالانکہ وہ (حیرانگی کے ساتھ) دیکھ رہے تھے (مگر ان میں دفاع کی کوئی قدرت نہیں تھی)

۴۵۔ وہ اس طرح سے زمین پر گرے کہ ان میں اٹھنے کی طاقت ہی نہ رہی اور نہ ہی کسی سے مدد طلب کر سکے۔

۴۶۔ اسی طرح ہم نے ان سے پہلے قوم نوح کو ہلاک کیا تھا۔ کیونکہ وہ فاسق قوم تھی۔

تفسیر

گذشتہ لوگوں کی تاریخ میں یہ سب عبرت کے درس ہیں

قرآن ان آیات میں، قوم لوط کی داستان اور اس دردناک انجام کو، جو انہوں نے قبیح اور شرمناک گناہوں کی وجہ سے پایا تھا، بیان کرنے کے بعد، گذشتہ اقوام میں سے چند قوموں کی سرگذشت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "موسیٰ اور اس کی زندگی کی تاریخ میں بھی ایک نشانی اور درس عبرت تھا، جب ہم نے اسے فرعون کی طرف واضح اور روشن دلیل کے ساتھ بھیجا" (وفی موسیٰ اذ ارسلناہ الیٰ فرعون بسلطان مبین)۔

"سلطان" اس چیز کو کہتے ہیں جو تسلط کا سبب بنے، اور یہاں معجزہ یا عقلی قوی دلیل و منطق ہے، یا دونوں ہیں، کہ موسیٰ نے فرعون کے مقابلہ میں ان سے فائدہ اٹھایا۔

سلطان مبین کی تعبیر قرآن کی مختلف آیات میں بہت زیادہ استعمال ہوئی ہے، اور عام طور پر واضح و آشکار منطقی دلیل کے معنی میں ہے۔

لیکن فرعون نے نہ تو موسیٰؑ کے عظیم معجزات کے سامنے سر تسلیم خم کیا، جو ان کے خدا سے ارتباط کے گواہ تھے۔ اور نہ ہی ان کے منطقی دلائل کے آگے سر تعظیم جھکایا، بلکہ اس غرور و تکبر کی وجہ سے جو وہ رکھتا تھا "اپنے پورے وجود کے ساتھ اس سے پھر گیا اور کہا: یہ شخص یا تو جادوگر ہے یا دیوانہ ہے" (فتولّٰی برکنہ و قال ساحر او مجنون)۔

"رکن" اصل میں ستون اور پایۂ اصلی اور ہر چیز کے اہم حصہ کے معنی میں ہے۔ اور یہاں ممکن ہے بدن کے تمام ارکان کی طرف اشارہ ہو، یعنی فرعون نے مکمل طور پر اور اپنے تمام ارکان بدن کے ساتھ موسیٰ کی طرف پشت کی۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے، کہ یہاں اس کا لشکر مراد ہے، یعنی اس نے اپنے ارکانِ لشکر پر تکیہ کیا، اور پیام حق سے روگردانی اختیار کی۔

یا یہ کہ اس نے خود بھی فرمان خدا سے منہ پھیرا، اور اپنے ارکانِ حکومت اور لشکر کو بھی منحرف کیا[1]

قابل توجہ بات یہ ہے، کہ جھوٹے جبار اور سرکش لوگ ان تہمتوں اور جھوٹی نسبتوں میں، جو وہ عظیم پیغمبروں کی طرف دیتے تھے، ایک عجیب حیرانی، تناقض، اور پریشان گوئی میں گرفتار تھے، کبھی انہیں ساحر و جادوگر کہتے اور کبھی مجنون و دیوانہ، حالانکہ ساحر و جادوگر ایک ہوشیار آدمی ہونا چاہیئے، جو باریک کام کرنے، اور نفسیاتی مسائل اور مختلف چیزوں کے خواص سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حیرت انگیز کام کرے، اور لوگوں کو غفلت میں رکھے، جب کہ مجنون اس کا نقطۂ مقابل ہے۔

لیکن قرآن فرعون جبار اور اس کے ساتھیوں کے انجام کے بارے میں اس طرح خبر دیتا ہے، "ہم نے اُسے اور اس کے لشکر کو اپنی گرفت میں لے لیا، اور اسے دریا میں پھینک دیا، کیونکہ وہ ایسے اعمال کا مرتکب ہوا تھا جو سرزنش اور ملامت کے قابل تھے" (فاخذناہ وجنودہ فنبذناھم فی الیم وھو ملیم)[2]

"یم" جیسا کہ لغت اور کتب حدیث سے معلوم ہوتا ہے، "سمندر" کے معنی میں ہے، اور نیل جیسے عظیم دریاؤں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے[3]

"نبذناھم" (ہم نے ان کو پھینک دیا) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ نہ صرف خدائی عذاب نے اس قوم کو محو کر دیا، بلکہ ان کی وہ تاریخ جو باقی رہ گئی ہے۔ ان کے لیے باعث ننگ و نام ہے اور ان کے شرم آور اعمال

---

[1] توجہ کرنا چاہیے کہ "برکنہ" میں "باء" پہلی تفسیر کے مطابق "باء مصاحبہ" ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق "باء سببیت" ہے اور تیسری تفسیر کے مطابق "باء تعدیہ" ہے۔

[2] "ملیم" اسم فاعل ہے باب "افعال" سے، مادہ لوم سے سرزنش کے معنی میں ہے۔ اور ایسے موقعوں میں اس شخص کے معنی میں ہے جو ملامت کا مرتکب ہوا ہو، جیسا کہ "مغرب" اس شخص کے معنی میں ہے جو عجیب و غریب کام انجام دیتا ہے۔

[3] اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے جلد چھ ص ۔۔۔۔ سورۂ اعراف کی آیت ۱۳۶ کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔

کی بھی محافظ ہے، اور اس نے انسان کے ظلم و جرم اور کبر و غرور سے اس طرح سے پردہ اٹھایا ہے کہ ہمیشہ کے لیے قابل مذمت بن گئے ہیں۔

اس کے بعد ایک دوسری قوم یعنی "عاد" کی اجمالی سرنوشت پیش کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے:

"قوم عاد کی سرگزشت میں بھی ایک آیت و عبرت ہے، جبکہ ہم نے ان پر ایک عقیم اور بغیر بارش کا طوفان بھیجا" (وفی عاد اذ ارسلنا علیھم الریح العقیم)۔

ہواؤں کا عقیم اور بانجھ ہونا اس وقت ہوتا ہے، جب کہ وہ بارش برسانے والے بادل اپنے ساتھ لے کر نہ چلیں، گیاہ و نباتات میں اپنے عمدہ اثرات نہ چھوڑیں، اور ان میں کوئی فائدہ اور برکت نہ ہو، اور ہلاکت و نابودی کے سوا کوئی چیز ہمراہ نہ لائیں۔

اس کے بعد اس سخت آندھی کی خصوصیت، جو قوم عاد پر مسلط ہوئی تھی، بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے، "وہ جس چیز کے پاس سے گزرتی تھی اس کو نابود کئے بغیر نہ چھوڑتی تھی، اور خشک کٹی پھٹی گھاس یا بوسیدہ ہڈیوں کی صورت میں لے آتی تھی" (ما تذر من شیء اتت علیہ الا جعلتہ کالرمیم)۔

"رمیم" "رمۃ" (بروزن منۃ) کے مادہ سے بوسیدہ ہڈیوں کے معنی میں ہے۔ اور "رمہ" (بروزن قبہ) بوسیدہ رسی کو کہا جاتا ہے" اور "رم" (بروزن جن" ان چھوٹے چھوٹے اجزاء کو کہا جاتا ہے جو لکڑی یا گھاس میں سے زمین پر گر پڑتے ہیں[1] "رم" اور "ترمیم" پرانی اور بوسیدہ اشیاء کی اصلاح کے معنی میں آتا ہے[2]

یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ قوم عاد کی تیز آندھی ایک عام تیز آندھی نہیں تھی، بلکہ انہیں تباہ کرنے اور کوٹنے چھیننے کے علاوہ اور اصطلاح کے مطابق۔ فزیکل دباؤ سے، جلانے اور زہریلا بنانے کی خاصیت رکھتی تھی، جو طرح طرح کی اشیاء کو بوسیدہ اور کہنہ بنا دیتی تھی۔

ہاں! خدا کی قدرت ایسی ہے، جو "نسیم" کی ایک حرکت سریع کے ذریعہ طاقتور اور مشہور و معروف اقوام کو اس طرح سے درہم برہم کر دیتی ہے، کہ صرف ان کے بوسیدہ جسم ہی باقی رہ جاتے ہیں، یہ طاقتور اور ثروتمند قوم عاد کی سرنوشت کی طرف جو سرزمین احقاف (عمان اور حضر موت کے درمیان کا علاقہ) میں رہتے تھے — ایک مختصر سا اشارہ تھا۔

اس کے بعد قوم "ثمود" کی نوبت آتی ہے۔ اور ان کے بارے میں فرماتا ہے، "قوم ثمود میں بھی ایک آیت اور عبرت ہے جبکہ ان سے کہا گیا: تم زندگی کی تھوڑی سی مدت کے لیے فائدہ اٹھالو۔ (اور پھر عذاب الٰہی کے منتظر رہو) (وفی ثمود اذ قیل لھم تمتعوا حتی حین)۔

"حتی حین" سے مراد وہی مہلت کے تین دن ہیں جن کی طرف سورۂ ہود کی آیت ۶۵ میں اشارہ ہوا ہے:

---

[1] مفردات راغب (مادہ۔ رم)۔

[2] "لسان العرب" و مفردات (مادہ رم)۔

فعقروھا فقال تمتعوا فی دارکم ثلاثة ایام ذالک وعد غیر مکذوب؛

"انہوں نے اس اونٹنی کی جو بطور اعجاز آئی تھی، کونچیں کاٹ دیں، اور ان کے پیغمبر صالح نے ان سے کہا، بس تین دن اپنے گھروں میں مزے اڑالو، اور اس کے بعد عذاب الٰہی کے منتظر رہو، یہ نہ ٹلنے والی وعدہ ہے"

باوجود اس کے کہ خدا ان کے پیغمبر صالح کے ذریعہ انہیں بارہا انذار فرما چکا تھا، لیکن پھر بھی مزید اتمام حجت کے لیے انہیں تین دن کی مہلت اور دی گئی، تاکہ وہ اپنے تاریک ماضی کی تلافی کرلیں، اور گناہ کا زنگ توبہ کے پانی کے ساتھ دل وجان سے دھولیں، بلکہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق ان تین دنوں میں انکے بدن کی جلد میں کچھ تبدیلیاں ظاہر ہوئیں پہلے زرد ہوئیں پھر سرخ، ہوئیں اور بعد میں سیاہ ہوگئیں، تاکہ اس مشرک سرکش قوم کے لیے تنبیہیں ہوں، لیکن افسوس ان امور میں سے کوئی چیز بھی فائدہ مند نہ ہوئی۔ اور وہ غرور کی سواری سے نیچے نہ اترے۔

ہاں! "انہوں نے اپنے پروردگار کے فرمان سے سرتابی کی، اور صاعقہ نے انہیں ناگہانی طور پر آگھیرا جب کہ وہ حیرانی کے ساتھ دیکھ رہے تھے، اور ان میں اپنا دفاع کرنے کی کوئی قدرت نہ تھی" (فعتوا عن امر ربھم فاخذتھم الصاعقة وھم ینظرون)۔

"عتوا" "عتو" (بروزن غلو) کے مادہ سے، اطاعت سے روگردانی کرنے کے معنی میں ہے، ظاہر ہے کہ یہ جملہ ان تمام روگردانیوں کی طرف اشارہ ہے، جو وہ صالح کی دعوت کے سارے عرصہ میں کرتے رہے، مثلاً بت پرستی، ظلم وستم اور صالح کی اونٹنی کی کونچوں کا کاٹنا جو ان کا ایک معجزہ تھا، نہ کہ صرف وہ روگردانیاں جو ان تین دنوں میں انہوں نے انجام دیں، اور بارگاہ خدا میں توبہ وانابہ کے بجائے غفلت اور غرور میں ڈوبے رہے۔

اس بات کی شاہد سورۂ اعراف کی آیت ۷۷ ہے جو یہ کہتی ہے: فعقروا الناقة وعتوا عن امر ربھم وقالوا یا صالح ائتنا بما تعدنا ان کنت من المرسلین؛

پھر انہوں نے ناقہ کی کونچیں کاٹ دیں، اور پروردگار کے فرمان سے سرپیچی کی اور کہا: اے صالح اگر تو خدا کا بھیجا ہوا ہے، تو جس چیز کی تو ہمیں دھمکی دے رہا ہے وہ لے آ۔

"صاعقہ" اور "صاقعہ" دونوں قریب المعنی ہیں، اصل میں شدید آواز کے ساتھ نیچے گرانے کے معنی میں ہے، اس فرق کیساتھ کہ "صاعقہ" آسمانی اجسام میں کہا جاتا ہے اور "صاقعہ" زمینی اجسام میں، اور بعض اہل لغت کے قول کے مطابق "صاعقہ" کبھی "موت" کے معنی میں، کبھی "عذاب" کے معنی میں، اور کبھی "آگ" کے معنی میں آتا ہے، یہ لفظ عام طور پر اس شدید آواز پر بولا جاتا ہے، جو آسمان سے برق بار آگ کے ساتھ بلند ہوتی ہے، کہا جاتا ہے کہ اس میں (موت وعذاب اور آگ) تینوں ہی معنی جمع ہیں۔

ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ جس وقت وہ بادل جن میں مثبت بجلی ہوتی ہے، ایسی زمین کے نزدیک ہو جائیں، جو منفی بجلی کی حامل ہے، تو ان دونوں کے درمیان سے بجلی کا ایک عظیم شعلہ نکلتا ہے، جس کے ساتھ ایک وحشتناک آواز اور جلانے والی آگ ہوتی ہے۔ اور وہ اس کے واقع ہونے کے مقام کو لرزا کر رکھ دیتی ہے۔

قرآن مجید میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹ میں اس معنی کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کیونکہ بادل وبارش اور رعد

وبرق کی گفتگو کرنے کے بعد مزید کہتا ہے:

یجعلون اصابعھم فی اٰذانھم من الصواعق حذر الموت:

منافقین ان راستہ چلنے والے لوگوں کے مانند ہیں جو اندھیری رات میں ــــ جس میں رعد کڑک رہی ہو اور بجلی چمک رہی ہو ــــ بیابان سے گذرتے ہیں، اور مرنے کے خوف سے (اور اس لیے کہ صاعقہ آواز کو نہ سنیں) اپنے کان میں انگلی رکھ لیتے ہیں۔

انجام کار آخری جملہ جو اس سرکش قوم کے بارے میں فرماتا ہے یہ ہے کہ "وہ اس طرح سے زمین پر گر پڑے کہ ان میں کھڑے ہونے کی بھی قدرت نہ تھی، اور نہ ہی کسی سے مدد طلب کر سکتے تھے" (فما استطاعوا من قیام وما کانوا منتصرین)۔

ہاں! صاعقہ نے انہیں اس طرح غفلت میں پکڑ کر زمین پر دے ٹپکا کہ نہ تو ان میں کھڑے ہونے کی طاقت تھی نہ اپنا دفاع کرنے کی قدرت اور نہ ہی نالہ و فریاد اور مدد طلب کرنے کی قوت، اور انہوں نے اسی حالت میں جان دے دی اور ان کی سرگذشت دوسروں کے لیے ایک درس عبرت بن گئی۔

ہاں! قوم ثمود جو عرب کے معروف قبیلوں میں سے تھی، اور سرزمین "حجر" میں (جو حجاز کے شمال میں ایک علاقہ ہے) امکانات و وسائل، فراواں ثروت، طولانی عمر، اور محکم عمارتوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، فرمان خدا سے روگردانی، سرکشی، طغیان، شرک اور ظلم و ستم کی بنا پر نابود ہو گئے اور ان کے آثار دوسروں کے لیے ایک درس گویا منہ بولتا سبق بن گئے۔

آخری زیر بحث آیت میں پانچویں قوم یعنی قوم نوح کی طرف ایک مختصر سا اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے "اور ہم نے قوم نوح کو ان سے پہلے ہلاک کیا تھا کیونکہ وہ ایک فاسق قوم تھی" (وقوم نوح من قبل انھم کانوا قوماً فاسقین)[1]

"فاسق" اس شخص کو کہتے ہیں جو خدا کے فرمان کی حدود سے باہر قدم نکالے اور کفر و ظلم یا دوسرے تمام گناہوں میں آلودہ ہو۔

"من قبل" (ان سے پہلے) کی تعبیر، شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قوم فرعون، لوط، عاد و ثمود نے قوم نوح کی افسوسناک سرگذشت ــــ جو اُن سے پہلے تھی ــــ سن رکھی تھی، لیکن افسوس کہ اس نے انہیں بیدار نہ کیا بلکہ خود اس سے مشابہ سرنوشت میں گرفتار ہو گئے۔

---

[1] اس جملہ میں ایک محذوف ہے اور "کشاف" میں "زمخشری" کے قول کے مطابق تقدیر میں اس طرح ہے "واھلکنا قوم نوح" اگرچہ پہلی آیات میں "اھلکنا" نہیں تھا، لیکن ان کے مضمون سے اس کا اچھی طرح سے استفادہ ہوتا ہے۔

چند نکات

۱۔ عذاب الٰہی کی مختلف صورتیں

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیات اور گزشتہ آیات میں گزشتہ اقوام میں سے پانچ قوموں کی سرگزشت کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ (قوم لوط، فرعون، عاد، ثمود اور قوم نوح) جن میں سے پہلی چار قوموں کے عذاب کا بیان تو ہوا ہے، لیکن قوم نوح کے عذاب کی طرف اشارہ نہیں ہوا اور جس وقت ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی چار اقوام میں سے ہر ایک کو چار مشہور عناصر میں سے کسی ایک کے ساتھ سزا ملی ہے، قوم "لوط" زلزلہ اور آسمانی پتھروں سے تباہ ہوئی یعنی "مٹی" کے ساتھ، قوم فرعون "پانی" کے ساتھ، قوم عاد تیز آندھی اور ہوا کے ساتھ، اور قوم "ثمود" "صاعقہ اور آگ" کے ساتھ۔

یہ ٹھیک ہے کہ موجودہ زمانہ میں یہ چاروں چیزیں ایک "عنصر" یعنی جسم بسیط کے عنوان سے نہیں پہچانی جاتیں (کیونکہ ہر ایک دوسرے اجسام کے ساتھ مرکب ہے) لیکن اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ چاروں اہم ارکان انسانوں کی زندگی کو برقرار رکھتے ہیں، اگر ان میں سے کوئی ایک بھی انسان کی زندگی سے کلی طور پر حذف ہو جائے تو زندگی کا برقرار رہنا ناممکن ہو جائے گا، چہ جائیکہ یہ سب کے سب۔

ہاں! خدا نے ان اقوام کی موت اور نابودی ایسی چیز میں قرار دی، جو ان کی زندگی کا عامل اصلی تھی، جس کے بغیر وہ اپنی زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتے تھے، اور یہ ایک عجیب قدرت نمائی ہے۔ اب اگر قوم نوح کے عذاب کے عامل کو بیان نہیں کیا تو شاید وہ اسی بنا پر ہے کہ ان کا عذاب بھی قوم فرعون کی طرح پانی سے تھا، اور یہاں اس کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ تولید کرنے والی اور بانجھ ہوائیں

اوپر والی آیات میں بیان ہوا ہے کہ خدا نے قوم عاد کو تیز اور بانجھ ہوا کے ذریعہ سزا دی، اور سورۂ "حجر" کی آیہ ۲۲ میں یہ آیا ہے:

وارسلنا الریاح لواقح فانزلنا من السماء ماء

"ہم نے ہواؤں کو تلقیح اور بارور کرنے کے لیے بھیجا، اور آسمان سے پانی نازل کیا۔"

اگرچہ یہ آیت زیادہ تر بادلوں کی تلقیح اور بارش کے نزول کے لیے ایک دوسرے سے ملنے کی طرف ناظر ہے۔ لیکن یہ کلی طور پر انسانوں کی زندگی میں ہواؤں کے نقش واثر کو واضح کرتی ہے۔ ہاں! ان کا کام بارور کرنا ہے بادلوں کو بارور کرنا گیاہ و نباتات کو بارور کرنا، یہاں تک کہ مختلف جانوروں کے اجناس و انواع کو "بارور ہونے" کے لیے آمادہ کرنے کے لیے بھی مؤثر ہے۔

لیکن یہی ہوا جب عذاب کے فرمان کی حامل ہو، تو وہ حیات و زندگی پیدا کرنے کی بجائے، موت اور نابودی کا عامل

بن جاتی ہے۔ اور سورۂ قمر آیت ۲۰ میں ۔ قرآن کے قول کے مطابق —— جس میں قوم عاد کے بارے میں گفتگو ہے یہ کہا ہے : تنزع الناس کانھم اعجاز نخل منقعر ،" انہیں (جو قد آور سخت و مضبوط جسم رکھتے تھے) وہ زمین سے اکھاڑ پھینکتی تھی اور سر کے بل زمین پر پٹک دیتی تھی اس طرح سے کہ ان کے سر تن سے جدا ہو جاتے تھے، جیسے کہ کسی کھجور کا درخت ہے جو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہو۔

۴۷۔ وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ○

۴۸۔ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ○

۴۹۔ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○

۵۰۔ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ

۵۱۔ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ

ترجمہ

۴۷۔ ہم نے آسمان کو قدرت کے ساتھ بنایا ہے، اور ہمیشہ اس کو وسعت دیتے رہتے ہیں۔

۴۸۔ اور ہم ہی نے زمین کو پھیلایا ہے، اور ہم کیا ہی اچھے پھیلانے والے ہیں۔

۴۹۔ اور ہم نے ہر ہر چیز کے جوڑے جوڑے خلق کئے ہیں تاکہ شاید تم متذکر ہوں۔

۵۰۔ پس تم خدا ہی کی طرف دوڑو، کیونکہ میں اس کی طرف سے تمہارے لئے ایک واضح ڈرانے والا ہوں۔

۵۱۔ اور خدا کے ساتھ دوسرا معبود قرار نہ دو بے شک میں اسس کی طرف سے ایک آشکار ڈرانے والا ہوں۔

تفسیر

ہم ہمیشہ آسمانوں کو وسعت دیتے رہتے ہیں

یہ آیات ایک مرتبہ پھر عالم آفرینش میں آیات خدا کی عظمت کے مسئلہ کو پیش کرتی ہیں، اور حقیقت میں ان مباحث کو ــــ جو اسی سورہ کی آیت ۲۰ و ۲۱ میں، زمین اور انسانی وجود میں اس کی نشانیوں کے بارے میں، گذر چکی ہیں ــــ تکمیل کرتی ہیں، اور ضمنی طور پر مسئلہ معاد اور موت کے بعد کی زندگی پر خدا کی قدرت کی ایک دلیل ہے پہلے فرماتا ہے،: "ہم نے آسمان کو قدرت کے ساتھ بنایا، اور ہم ہمیشہ اُسے وسعت دیتے رہتے ہیں": (والسماء بنینا ھا باید و انا لموسعون)۔

"اور ہم نے زمین کو بچھایا، اور ہم کیا ہی اچھا بچھانے والے ہیں" (والارض فرشنا ھا فنعم الماھدون)

"اید" (بروزن صید) قدرت و قوت کے معنی میں ہے، اور قرآن مجید کی آیات میں بارہا اس معنی میں آیا ہے، اور یہاں آسمانوں کی خلقت کے بارے میں خدائے عظیم کی قدرت کاملہ کی طرف اشارہ ہے۔

اس عظیم قدرت کی نشانیاں آسمانوں کی عظمت میں بھی اور اس خاص نظام میں بھی، جو ان میں کارفرما ہے، اچھی طرح سے واضح ہے۔[1]

اس بارے میں کہ "انا لموسعون" (ہم ہمیشہ وسعت دیتے رہتے ہیں) سے یہاں کیا مراد ہے؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے اسے بندوں پر بارش کے نزول کے ذریعہ خدا کی جانب سے وسعت رزق کے معنی میں سمجھا ہے، اور بعض اسے ہر لحاظ سے وسعت رزق کے معنی میں سمجھتے ہیں، اور بعض نے اس کی، خدا کے غنی

---

[1] یہاں ان چند اشتباہات کا ذکر جو بعض مفسرین یا غیر مفسرین کو ہوئے ضروری ہے۔

۱۔ بعض مفسرین نے "اید" کی دو معانی میں تفسیر کی ہے، "قدرت" و "نعمت" جب کہ لغت کے لحاظ سے "اید" "قدرت" کے معنی میں ہے، لیکن "ید" جس کی جمع "ایدی" اور جمع الجمع "ایادی" جمع ہے، وہ قدرت و نعمت دونوں معنی میں آیا ہے، (ہم نے بھی سورۂ ص کی آیت ۱۷ کی تفسیر میں طبرسی کی مجمع البیان کی پیروی کرتے ہوئے "اید" کے یہ دو معانی ذکر کئے ہیں جس کی اب اصلاح کر رہے ہیں)۔

۲۔ المعجم المفہرس (محمد فواد عبد الباقی) میں زیر بحث آیت "اید" کے مادہ (یاء و تاء کے ساتھ) ذکر ہوا ہے اور اس کو "اید" کے مادہ سے الگ کیا ہے یہ اشتباہ ظاہراً بعض قرآنوں کے رسم الخط سے پیدا ہوا ہے، ورنہ سب مفسرین نے جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ زیر بحث آیت میں بھی "اید" قدرت کے معنی میں ہے۔

اور بے نیاز ہونے کے معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے، کیونکہ اس کے خزانے اس قدر وسیع ہیں کہ مخلوقات کو رزق عطا کرنے سے کبھی بھی ختم نہیں ہوتے، اور نہ ان میں کوئی کمی ہوتی ہے۔

لیکن اس سے پہلے جملہ میں آسمانوں کی خلقت کے مسئلہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے، اور ماہرین کے آخری انکشافات کو مدنظر رکھتے ہوئے ـــــ جو انہوں نے جہان اور عالم ہستی کے پھیلاؤ اور وسعت کے سلسلے میں کئے ہیں، اور حسی مشاہدات کے طریقہ سے بھی جس کی تائید ہوتی ہے ـــــ آیت کا ایک اور زیادہ لطیف معنی حاصل کیا جاسکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ خدا نے آسمانوں کو پیدا کیا اور ہمیشہ انہیں وسعت دیتا رہتا ہے۔

موجودہ علم یہ بتاتا ہے، نہ صرف کرہ زمین آسمانی مادوں کو جذب کرتے کرتے بتدریج موٹی اور وزنی ہوتی جارہی ہے بلکہ آسمان بھی وسیع، اور پھیلتے جارہے ہیں، یعنی وہ ستارے جو ایک کہکشاں میں ہیں، بڑی تیزی کے ساتھ کہکشاں کے مرکز سے دور ہوتے جارہے ہیں، یہاں تک کہ بہت سے موقعوں پر اس پھیلاؤ کی سرعت کا اندازہ بھی لگایا ہے۔

کتاب "مرزہای نجوم" "تالیف فرد ھول" میں یہ بیان کیا گیا ہے، کردوں کے پھیلنے کی زیادہ سے زیادہ سرعت کا اب تک جو اندازہ لگایا گیا ہے وہ تقریباً ۶۶ ہزار کلومیٹر فی سیکنڈ ہے؛ زیادہ دوری پر واقع کہکشائیں ہماری نگاہ کے آگے اتنی کم نور ہیں کہ کافی روشنی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی سرعت کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ آسمان سے جو تصویریں حاصل کی گئی ہیں، وہ اس اہم انکشاف کی واضح طور پر نشاندہی کرتی ہیں، کہ، ان کہکشاؤں کا فاصلہ نزدیک کی کہکشاؤں کی نسبت بہت سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔

مؤلف مذکور نے اس کے بعد "ابر سنبلہ" و "اکلیل" اور "شجاع" وغیرہ نام کی کہکشاؤں کی سرعت کی تحقیق پیش کی ہے، اور حساب لگانے کے بعد اس سلسلہ میں بہت سی حیران کن اور عجیب و غریب سرعتوں کو بیان کیا ہے[1]

اس سلسلہ میں چند باتیں آقائے "جان الدر" کی بھی سن لیں وہ کہتا ہے، ستاروں سے جو موجیں نکلتی ہیں، وہ جدید ترین اور دقیق ترین اندازوں کے مطابق ایک عجیب اور حیرت انگیز حقیقت کے رخ سے پردہ اٹھاتی ہیں، یعنی اس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ستاروں کا وہ مجموعہ جس سے مل کر یہ جہان بنا ہے، ہمیشہ زیادہ سرعت اور تیزی کے ساتھ ایک مرکز سے دور ہوتا جارہا ہے۔ اور ان کا فاصلہ اس مرکز سے جتنا دور ہوتا جاتا ہے اتنا ہی ان کی رفتار کی تیزی بڑھتی جارہی ہے، اس کی مثال یوں ہے کہ ایک وقت یہ سب ستارے اس مرکز میں جمع تھے۔ اور اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہو گئے، اور بڑے ستاروں کا مجموعہ ان سے الگ ہو کر تیزی اور سرعت کے ساتھ ہر طرف کو روانہ ہو گیا۔

ماہرین نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ جہان ایک نقطۂ آغاز کا حامل تھا[2]

---

[1] "مرزہای نجوم" ترجمہ "رضا اقصی" ص ۲۳۸ تا ۲۴۴۔

[2] "آغاز و انجام جہان" صفحات ۴، ۔ ۔ ، (تلخیص کے ساتھ)

"ژرژگاموف" کتاب "آفرینش جہان" میں اس بارے میں اس طرح لکھتا ہے: عالم کی فضا جو اربوں کہکشاؤں سے مل کر بنی ہے ایک ایسی حالت میں ہے جو تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ جہان حالت سکون میں نہیں ہے، بلکہ اس کا پھیلتے جانا ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

اس بات کی حقیقت کو معلوم کرنے، اور اس تک پہنچنے سے، کہ ہمارا جہان مسلسل پھیل رہا ہے، اور حالت انبساط میں ہے، جہان شناسی کے معموں کے خزانوں کی اصلی کلید معلوم ہو جاتی ہے کیونکہ اگر اس وقت جہان حالت انبساط میں ہو تو یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ کسی وقت میں بہت شدید حالت انقباض میں تھا۔[1]

صرف مذکورہ ماہرین ہی نے اس حقیقت کا اعتراف نہیں کیا، بلکہ دوسرے افراد نے بھی اس معنی کو اپنی تحریروں میں نقل کیا ہے۔ جن کے کلمات کے نقل کرنے سے عبارت طویل ہو جائے گی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "انا لموسعون" (ہم وسعت دینے والے ہیں) کی تعبیر جملہ اسمیہ اور اسم فاعل کے جملہ سے استفادہ کرتے ہوئے، اس موضوع کے ہمیشہ ہمیشہ ہوتے رہنے کی دلیل ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ ہمیشہ سے تھی اور اسی طرح جاری رہے گی۔ اور یہ ٹھیک وہی چیز ہے، جس تک موجودہ زمانے میں پہنچے ہیں کہ تمام کرات آسمانی اور کہکشائیں ابتداء میں ایک ہی مرکز میں جمع تھیں (ایک خاص وزن کے ساتھ جو حد سے زیادہ بوجھل تھا) اس کے بعد ایک انتہائی وحشتناک اور عظیم انفجار واقع ہوا (یعنی یہ مرکز پھٹ پڑا) اور اس کے ساتھ ہی اس جہان کے اجزاء ایک دوسرے سے جدا ہو کر بکھر گئے۔ اور انہوں نے کرات کی صورت اختیار کر لی، اور وہ بڑی سرعت کے ساتھ پیچھے ہٹتے اور پھیلتے جا رہے ہیں۔

لیکن زمین کی خلقت کے بارے میں "ماھدون" کی تعبیر ایک لطیف تعبیر ہے، جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے، کہ خدا نے انسانوں کی زندگی کے لیے تمام آرام و آسائش کے وسائل اور ذرائع کے ساتھ (ایک گہوارے کے طور پر) آمادہ اور تیار کیا ہے، کیونکہ "ماھد"، "مھد" کے مادہ سے گہوارہ کے معنی میں ہے۔ یا ہر اس جگہ کے معنی میں ہے جسے راحت و آرام کے لیے آمادہ اور تیار کرتے ہیں۔ اس قسم کی جگہ راحت و آرام، اطمینان، محفوظ اور گرم و نرم ہونی چاہیئے اور یہ تمام چیزیں کرہ زمین میں حاصل ہیں۔

فرمان الٰہی سے ایک طرف تو پتھر نرم اور مٹی میں تبدیل ہو گئے اور دوسری طرف سے پہاڑوں کی سختی اور زمین کی سخت جلد نے اسے مد و جزر کے دباؤ سے بچایا، اور تیسری طرف سے وہ قشر ہوائی جس نے اُسے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، سورج کی روشنی کو حسب ضرورت پہنچنے دیتا ہے اور ایک عظیم لحاف کی طرح اس کو وسیع بستر پر ڈالتا ہے اور آسمانی پتھروں کے حملہ کے مقابلہ میں، جنہیں وہ قلمرو زمین میں داخل ہوتے ہی آگ لگا کر خاکستر کر دیتا ہے، ایک مضبوط اور قوی ڈھال بھی ہے۔

اور اس طرح انسان کی پذیرائی اور مہمانی کے لیے خدا کی طرف سے (جو اس کرہ خاکی میں خدا کا مہمان ہے) آرام و

---

[1] "آغاز و انجام جہان" صفحات ۴ ، ۰ ، ۰ ، تلخیص کے ساتھ)۔

آسائش کے تمام اسباب فراہم ہوئے ہیں۔

آسمانوں اور زمین کی خلقت کے بعد آسمان اور زمین کے مختلف موجودات اور انواع و اقسام کے نباتات و حیوانات کی نوبت آتی ہے اور اس سلسلے میں بعد والی آیت میں فرماتا ہے : "ہم نے ہر چیز کے جوڑے جوڑے پیدا کئے ہیں، تاکہ تم غور کرو و سمجھو" (ومن کل شیء خلقنا زوجین لعلکم تذکرون)۔

بہت سے مفسرین نے یہاں "زوج" کو مختلف اصناف کے معنی میں سمجھا ہے، اور اوپر والی آیت کو اس جہان کے موجودات کے مختلف اصناف کی طرف اشارہ لیا ہے۔ جو "زوج" "زوج" کی صورت میں آئے ہیں، مثلاً "رات اور دن" "نور اور ظلمت" "دریا اور صحرا" "سورج اور چاند" "نر اور مادہ" وغیرہ۔

لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بھی مشابہ آیات کے ذیل میں بیان کیا ہے اس قسم کی آیات میں ایک زیادہ دقیق معنی کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر لفظ "زوج" نر و مادہ کی دو جنسوں کو کہتے ہیں چاہے وہ عالم حیوانات میں ہو یا عالم نباتات میں، اور اگر ہم اسے تھوڑی سی وسعت اور دیں، تو یہ معنی تمام مثبت و منفی قوتی کو شامل ہوگا۔

اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، کہ قرآن اوپر والی آیت میں کہتا ہے،، (من کل شیء) تمام موجودات میں سے، نہ صرف موجودات زندہ بلکہ ممکن ہے کہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو، کہ مثبت و منفی ذرات سے بنی ہوئی تمام اشیاء عالم، اور آج کے علمی نکتہ نظر سے یہ بات مسلم ہے کہ "ایٹم" مختلف اجزاء سے مل کر بنے ہیں منجملہ ان کے وہ اجزاء جو منفی برقی بار کے حامل ہیں اور انہیں "الکٹرون" کہا جاتا ہے اور وہ اجزاء جو مثبت برقی بار کے حامل ہوتے ہیں جو "پروٹون" کہلاتے ہیں۔

اس بنا پر "شیء" کی حتمی طور پر حیوان یا نبات کے معنی میں تفسیر کرنا لازمی اور ضروری نہیں ہے، اور نہ ہی زوج کو جنس یا صنف کے معنی میں سمجھنا۔ (اس سلسلہ میں ہم دوسری توضیحات جلد ۸ تفسیر نمونہ سورۂ شعراء کی آیت، کے ذیل میں اور جلد ۵ ص ۶۲۱ اور جلد ۱۰ ص ۲۴۴ میں بیان کر چکے ہیں) توجہ رکھنا چاہیے کہ اس کے باوجود دونوں تفاسیر قابل جمع ہیں۔

ضمنی طور پر "لعلکم تذکرون" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ تمام اشیاء جہان میں زوجیت و کثرت اور دوگانگی، انسان کو اس مطلب سے آگاہ کرتی ہے، کہ جہان کا خالق واحد و یگانہ ہے کیونکہ دوگانگی مخلوقات کی خصوصیات میں سے ہے۔

ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ الرضاؑ سے بھی اس معنی کی طرف اشارہ ملتا ہے، جہاں آپؑ فرماتے ہیں :

"بمضادته بين الاشياء عرف ان لا ضد له، بمقارنته بين الاشياء عرف ان لا قرين له ضاد النور بالظلمة واليبس بالبلل، والخشن باللين، والصرد بالحرور، مؤلفا بين متعادياتها، مفرقا بين متدانياتها، دالة بتفريقها على مفرقها، و بتاليفها على مؤلفها، و ذالك قوله ومن كل شيء خلقنا زوجين لعلكم تذكرون"

"اس نے دنیا جہان کی چیزوں کو ایک دوسرے کی ضد پیدا کیا ہے۔ تاکہ واضح ہو جائے کہ اس کے لیے کوئی ضد نہیں ہے، اور انہیں ایک دوسرے کا قرین قرار دیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس کا کوئی قرین نہیں ہے، نور کو ظلمت کی ضد، خشکی کو تری کی ضد، سختی کو نرمی کی ضد اور سردی کو گرمی کی ضد قرار دیا، اس کے باوجود ان اشیاء کو جو ایک دوسرے کی ضد ہیں جمع کر دیا، تاکہ یہ جدائی جدا کرنے والے پر دلیل ہو اور یہ پیوستگی ملانے والے پر دلیل ہو، اور یہ ہے معنی (و من کل شیء خلقنا زوجین لعلکم تذکرون)"[1]

بعد والی آیت میں گزشتہ توحیدی مباحث سے نتیجہ نکالتے ہوئے مزید کہتا ہے، "اس بنا پر تم خدا کی طرف دوڑو کیونکہ میں اس کی طرف سے تمہارے لیے واضح طور پر ڈرانے والا ہوں" (ففروا الی اللہ انی لکم منہ نذیر مبین)۔

یہاں "فرار" کی تعبیر ایک عمدہ اور لطیف تعبیر ہے۔ عام طور پر فرار ایسی جگہ کہا جاتا ہے جہاں انسان ایک طرف سے کسی موجود یا وحشتناک حادثہ سے روبرو ہو گیا ہو، اور دوسری طرف سے کسی جگہ کوئی پناہ گاہ رکھتا ہو، لہٰذا پوری تیزی کے ساتھ جاتے حادثہ سے دور ہو جاتا ہے اور امن و امان کے نقطہ کی طرف رخ کرتا ہے۔ تم بھی شرک و بت پرستی سے، جو ایک وحشتناک عقیدہ ہے گریز کرو، اور توحید خالص کی طرف جو واقعی امن و امان کا علاقہ ہے تیزی سے رخ کرو۔

عذاب خدا سے گریز کرو اس کی رحمت کی طرف جاؤ۔

اس کی نافرمانیوں اور عصیاں سے فرار کرو اور توبہ و انابہ سے توسل اختیار کرو۔

خلاصہ یہ کہ قباحتوں، برائیوں، بے ایمانی، جہالت کی تاریکی اور عذاب جاودانی سے بھاگو اور رحمت حق کی آغوش اور جاودانی سعادت میں داخل ہو جاؤ۔

پھر مزید تاکید کے لیے وحدت پرستی کے مسئلہ پر تکیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"خدا کے ساتھ دوسرا معبود قرار نہ دو، کہ میں تمہارے لیے اس کی طرف سے واضح ڈرانے والا ہوں" (ولا تجعلوا مع اللہ الٰہاً اٰخر انی لکم منہ نذیر مبین)۔

یہ احتمال بھی ہے کہ گزشتہ آیت اصل ایمان باللہ کی طرف دعوت کرتی ہو، اور یہ آیت اس کی ذات پاک کی یگانگت کی طرف دعوت ہو، لہٰذا "انی لکم منہ نذیر مبین" ایک موقع پر ایمان باللہ کے ترک کرنے پر ڈرانے کے عنوان سے ہو، اور دوسرے موقع پر شرک اور دوئی کے مقابلہ میں انذار ہو، تو اس طرح سے ہر ایک الگ

---

[1] "توحید صدوق" مطابق نقل "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۱۲۰۔

الگ مطلب کی طرف اشارہ ہو۔

بعض روایات میں جو امام صادقؑ سے نقل ہوئی ہیں "خدا کی طرف فرار" سے مراد حج اور اس کے گھر کی زیارت ہے[1] یہ بات ظاہر ہے کہ اس سے مراد، خدا کی طرف فرار کے ایک واضح مصادیق میں سے ہوتا ہے، کیونکہ حج انسان کو حقیقت توحید، اور توبہ وانابہ سے آشنا کرتا ہے، اور الطاف خداوندی کی پناہ میں جگہ دیتا ہے۔

---

[1] اس سلسلہ میں امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے چند احادیث تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۳۰ و ۱۳۱ پر نقل ہوئی ہیں۔

۵۲۔ كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝

۵۳۔ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝

۵۴۔ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ۝

۵۵۔ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ

۵۲۔ اسی طرح ہے کہ کوئی پیغمبر ان سے پہلے کسی قوم کی طرف نہیں بھیجا مگر یہ کہ انہوں نے کہا وہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔

۵۳۔ کیا وہ ایک دوسرے کو اس بات کی وصیت کرتے تھے (کہ عموماً اس قسم کی تہمتیں لگائیں) نہیں! بلکہ وہ ایک سرکش اور طوفان اٹھانے والی قوم تھی۔

۵۴۔ اب جب کہ ایسا ہے تو ان سے منہ پھیر لے، اور تو ہرگز لائق ملامت نہیں ہے۔

۵۵۔ اور ہمیشہ نصیحت کرتا رہ کیونکہ نصیحت مؤمنین کے لیے فائدہ مند ہے۔

تفسیر

نصیحت کر کیونکہ نصیحت و تذکر فائدہ مند ہے

اسی سورہ کی آیت ۳۹ میں یہ آیا ہے کہ فرعون نے، موسیٰ کی طرف سے خداوند یکتا اور ظلم و بیدادگری کے ترک کرنے

کی دعوت کے مقابلہ میں، موسیٰ کو متہم کیا کہ وہ "ساحر" یا "مجنون" ہے، یہ نسبت مشرکین کی طرف سے پیغمبر اسلام کو بھی دی جاتی تھی، یہ بات ابتدائی دور کے تھوڑے سے مومنین کے لیے بہت گراں تھی، اور پیغمبر کی روح کو آزردہ کرتی تھی، زیر بحث آیات میں پیغمبر اور مومنین کی دلداری کے لیے کہتا ہے: صرف تو ہی نہیں ہے جوان زہر آلود تہمت کے تیروں کا هدف قرار پایا ہے، "اسی طرح ہے کہ ان سے پہلے کی کسی قوم کی طرف کوئی پیغمبر نہیں بھیجا گیا، مگر یہ کہ انہوں نے کہا، وہ جادوگر یا دیوانہ ہے، (کذالك ما اتی الذین من قبلهم من رسول الا قالوا ساحر او مجنون)[1]

وہ انہیں اس لیے "ساحر" کہتے تھے، کیونکہ ان کے پاس ان کے عینی معجزات کا کوئی منطقی جواب نہیں تھا، اور "مجنون" کہہ کر اس لیے خطاب کرتے تھے کیونکہ وہ محیط اور ماحول کے ساتھ ہم رنگ نہیں تھے، اور مادی امتیازات کے مقابلہ میں سر تسلیم خم نہیں کرتے تھے۔

اس بنا پر تم پریشان نہ ہو اور غم و اندوہ نہ کرو اور اپنی استقامت و پائیداری اور صبر و شکیبائی میں اضافہ کرو، کیونکہ اس قسم کی بے بنیاد باتیں اور نسبتیں ہمیشہ مردان حق کے مقابلہ میں کہی جاتی رہی ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "کیا یہ کافر اور عناد رکھنے والی اقوام ایک دوسرے کو وصیت کیا کرتی تھیں" کہ تمام انبیاء پر یہ تہمتیں لگائیں؟ (اتواصوا بہ)۔

اس طرح سے ہم آہنگی کے ساتھ اور ایک ہی طرز پر عمل کرتے ہیں جیسا کہ انہوں نے ماوراء تاریخ میں کوئی مجلس تشکیل دی ہو، اور مشورہ کے لیے بیٹھے ہوں، اور ایک دوسرے کو وصیت و نصیحت کرتے رہے ہوں، کہ انبیاء کو عموماً سحر و جنون کے ساتھ متہم کرتے رہنا، تاکہ عوام میں ان کے اعتبار کا نفوذ کم ہو جائے۔

اور شاید ان میں سے ہر ایک جب اس دنیا سے جانا چاہتا تھا۔ تو اپنی اولاد اور دوستوں سے یہ بات کہتے تھے اور وصیت کرتے تھے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "بلکہ وہ ایک سرکش اور طوفان اٹھانے والی قوم ہے" (بل هم قوم طاغون)[2]

یہ سرکشی اور شرانگیزی کا ہی اثر ہے کہ مردان حق کو میدان سے نکالنے کے لیے ہر قسم کے جھوٹ اور تہمت سے توسل ہوتے تھے، اور چونکہ انبیاء معجزات اور نئے احکام کے ساتھ قوموں کے درمیان آتے تھے، تو وہ ان کے لیے بہترین لیبل یہ سمجھتے تھے کہ انہیں "جادو اور جنون" سے متہم کریں۔ اس بنا بر ان کے "وحدت عمل" کا عامل سرکشی و شرانگیزی کی وہی مشترکہ روح تھی۔

پھر دوبارہ تسلی خاطر اور زیادہ سے زیادہ دلداری کے لیے پیغمبر سے فرماتا ہے: "اب جب کہ یہ طاغی و سرکش قوم حق بات سننے کے لیے تیار نہیں ہے، تو ان سے منہ پھیر لے" (فتول عنهم)۔

---

[1] "کذالك" ایک محذوف مبتداء کی خبر ہے، اور تقدیر میں (الامر کذالك) (معاملہ یوں ہی ہے) ہے۔

[2] اوپر والی آیت میں "بل" اضرابیہ ہے۔

اور تو مطمئن رہ کہ تو نے اپنے وظیفہ اور ذمہ داری کو کامل طور سے انجام دے دیا ہے، اور تو "ہرگز سرزنش اور ملامت کے لائق نہیں ہے" (فما انت بملوم)۔

اگر وہ حق کو قبول نہ کریں تو غم نہ کھاؤ، کیونکہ شائستہ اور صلاحیت رکھنے والے دل اس کو قبول کریں گے۔

یہ جملہ حقیقت میں دوسری آیات کی یاد دلاتا ہے۔ اور اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبر اس قدر دلسوز تھے، کہ بعض اوقات ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے سخت تکلیف میں مبتلا ہو جائیں، جیسا کہ سورۂ کہف کی آیت ۶ میں آیا ہے:-

فلعلك باخع نفسك علی اٰثارھم ان لم یؤمنوا بھذا الحدیث اسفًا

"گویا تو چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو ان کے اعمال پر غم و اندوہ کی بنا پر ہلاک کر دے، کیونکہ وہ اس قرآن پر ایمان نہیں لائے ہیں"۔

یقیناً ایک سچے رہبر کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

مفسرین کا بیان ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو پیغمبر اور مومنین اندوہگین ہوئے اور خیال کیا کہ مشرکین کے مقابلہ میں یہ آخری بات ہے، اور وحی آسمانی قطع ہو گئی ہے، اور جلدی ہی عذاب الٰہی نازل ہو گا، لیکن زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ بعد والی آیت نازل ہوئی۔ اور پیغمبر کو حکم دیا: "تم ہمیشہ پند و نصیحت کرتے رہو، کیونکہ پند و نصیحت سے مومنین کو فائدہ پہنچتا ہے" (وذکر فان الذکریٰ تنفع المؤمنین)۔

یہ وہ منزل تھی کہ سب نے اطمینان و سکون کا سانس لیا۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آمادہ و تیار دل گوشہ و کنار میں تیری باتوں کے انتظار میں ہیں، اگر ایک گروہ حق کے مقابلہ میں مخالفت کے لیے کھڑا ہے تو دوسرا گروہ دل و جان سے اس کا مشتاق ہے اور تیری دل نشین گفتگو ان کے نفوس میں اپنی تاثیر چھوڑتی ہے۔

ایک نکتہ

حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ دلوں کی ضرورت ہے

کسی کسان کو نظر میں رکھو جو بیج بکھیرنے میں مشغول ہے، ممکن ہے وہ ان بیجوں کے ایک حصہ کو پتھر پر ڈال دے یقینی طور پر وہ کبھی بھی بار آور نہیں ہو گا۔

دوسرے حصہ کو مٹی کی ان باریک تہوں پر گراتا ہے جنہوں نے سخت پتھروں کو ڈھانپ رکھا ہے، یہاں بیج کونپل تو نکالے گا۔ لیکن چونکہ اس کی جڑوں کے لیے کافی جگہ نہیں ہے تو وہ بہت جلد خشک ہو جائے گا اور ختم ہو جائے گا۔

ایک دوسرے حصہ کو ایسی مٹی کے اوپر ڈالتا ہے جو زیادہ گہری ہے، لیکن اس بیج کے درمیان مٹی میں فضول قسم کی گھاس بھی رکاوٹ کرنے والی موجود ہے، تو یہ بیج نمو بھی کرے گا، جڑیں بھی پکڑے گا، لیکن بہت جلد کانٹے

اور فضول گھاس اس سے لپٹ جائیں گے اور اس کا گلا دبا دیں گے۔

ان تمام بیجوں میں سے زیادہ خوش نصیب بیج وہ ہے جو گہری مٹی کے درمیان بغیر کسی مزاحمت و رکاوٹ کے قرار پائے۔ پھر زیادہ دیر نہیں لگتی کہ وہ کونپل نکالتا ہے شاخیں اور پتے نکالتا ہے اور تناور ہو کر پھلتا پھولتا ہے۔

وہ حق کی باتیں جو انبیاء، اور خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں اور ان کے معصوم جانشینوں کے دہن مبارک سے نکلتی ہیں انہیں بیجوں کی طرح ہیں، وہ دل جو سخت پتھر کے مانند ہے وہ انہیں ہرگز قبول نہیں کرتے، اور وہ دل جن میں کمزور سی اور تھوڑی سی بھی نرمی ہے وہ وقتی طور پر اسے قبول کر لیتے ہیں اس کے بعد اسے باہر نکال پھینکتے ہیں، اور وہ دل جو قبول کرنے کے لیے آمادہ و تیار تو ہیں، لیکن ہوا و ہوس اور صفات رذیلہ اور شہوات کے کانٹے ان میں اُگے ہوتے ہیں، وہ ان کے اثر کو ختم کر دیتے ہیں۔

صرف وہی دل ان عظیم پیشواؤں کی باتوں کو قبول کرتے ہیں۔ اور ان کی پرورش کر کے انہیں بارور کرتے ہیں، جو حق جوئی اور حق طلبی کی روح کے حامل ہیں اور وہ ان صفات سے بھی خالی ہیں۔ اور وہ مؤمنین کے دل ہیں، ہاں! (و ذکر فان الذکرٰی تنفع المؤمنین)۔ پند و نصیحت کرتے رہو کیونکہ یہ مومنین کو فائدہ دیتی ہے۔

۵۶۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○

۵۷۔ مَاۤ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ○

۵۸۔ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ○

ترجمہ

۵۶۔ میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں (اور اس طرح سے تکامل وارتقار حاصل کریں اور مجھ سے نزدیک ہوں)۔

۵۷۔ میں ہرگز ان سے یہ نہیں چاہتا کہ وہ مجھے روزی دیں، اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں۔

۵۸۔ خدا ہی روزی دینے والا اور صاحبِ قوت وقدرت ہے۔

تفسیر

قرآن کی نظر میں انسان کی خلقت کا مقصد

اہم ترین سوالات میں سے وہ سوال جو ہر شخص اپنے آپ سے کرتا ہے یہ ہے کہ، "ہم کس لیے پیدا کیے گئے ہیں" اور انسان کی خلقت اور اس جہان میں آنے کا مقصد کیا ہے"؟

اوپر والی آیات، اس اہم اور ہمیشہ کے سوال کا مختصر اور پرمعنی تعبیروں کے ساتھ جواب دے رہی ہیں، اور اس بحث کی، جو گزشتہ آیات میں سے آخری آیت میں مومنین کی یاد آوری کے سلسلہ میں بیان ہوئی تھی، تکمیل کر رہی ہیں، کیونکہ یہ ایک اہم ترین اصول ہے کہ جس کی پیغمبر کو پیروی کرنی چاہیئے، ضمنی طور پر خدا کی طرف فرار کا مطلب بھی جو گزشتہ آیات میں بیان ہوا تھا واضح ہو جاتا ہے۔

فرماتا ہے، "میں نے جن وانس کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں" (وما خلقت الجن

والانس الا لیعبدون)۔

میری ان سے کوئی حاجت نہیں ہے۔" اور میں ہرگز ان سے یہ نہیں چاہتا کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں" (ما ارید منھم من رزق و ما ارید ان یطعمون)۔

"خدا ہی ہے جو کل بندوں کو روزی دیتا ہے اور وہ صاحب قدرت و قوت ہے" (ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین)۔

یہ چند آیات جو انتہائی مختصر اور جامع ہیں، اس حقیقت سے پردہ اٹھا رہی ہیں، کہ جس سے آگاہی کے تمام خواہاں ہیں، اور ہمیں ایک عظیم مقصد سے روشناس کرا رہی ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ: بلاشک و شبہ ہر دانش مند اور عاقل جو کام بھی انجام دیتا ہے، کوئی نہ کوئی مقصد اس کے پیش نظر ہوتا ہے، اور چونکہ خدا سب سے زیادہ عالم اور حکیم ہے، بلکہ کسی شخص کے ساتھ اس کا قیاس کیا ہی نہیں جا سکتا، یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس نے انسان کو کیوں پیدا کیا ہے؟ کیا کوئی کمی تھی جو انسان کی خلقت سے پوری ہو جاتی؟

یا اسے کوئی حاجت اور ضرورت تھی جسے پورا کرنے کے لیے اس نے ہمیں پیدا کیا ہے؟

حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اس کا وجود ہر جہت سے کامل اور انتہائی لامتناہی ہے اور وہ غنی بالذات ہے۔

پس پہلے مقدمہ کے مطابق تو ہمیں یہ قبول کرنا پڑے گا کہ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد تھا، اور دوسرے مقدمہ کے مطابق ہمیں یہ قبول کرنا پڑے گا کہ انسان کی پیدائش سے اس کا کوئی ایسا مقصد نہیں تھا جو اس کی پاک ذات کے لیے ہو۔

نتیجتاً اس مقصد کو اس کی ذات سے باہر تلاش کرنا پڑے گا، ایسا مقصد جو خود مخلوقات کی طرف لوٹتا ہے اور انہیں کے کمال کا سبب ہے۔

اور دوسری طرف قرآن کی آیات میں انسان کی پیدائش کے مقصد کے بارے میں مختلف تعبیریں بیان کی گئی ہیں۔

ایک جگہ بیان ہوا ہے: الذی خلق الموت والحیٰوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً "وہی ہے کہ جس نے موت اور زندگی کو خلق کیا تاکہ وہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے"۔ (ملک - ۲) یہاں انسانوں کی آزمائش اور امتحان کا مسئلہ "حسن عمل" کے لحاظ سے ایک ہدف اور مقصد کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

ایک دوسری آیت میں آیا ہے: اللہ الذی خلق سبع سماوات و من الارض مثلھن یتنزل الامر بینھن لتعلموا ان اللہ علی کل شیء قدیر و ان اللہ قد احاط بکل شیء علماً: "خدا وہ ہے جس نے سات آسمان اور اتنی ہی زمینیں خلق فرمائی ہیں اس کا فرمان ان کے درمیان نازل ہوتا ہے، تاکہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، اور اس کا علم تمام موجودات پر احاطہ رکھتا ہے"۔ (طلاق - ۱۲)۔

یہاں "خدا کی قدرت اور علم سے علم و آگاہی" آسمانوں اور زمین (اور جو کچھ ان کے درمیان ہے) کی خلقت کے لیے ایک ہدف اور مقصد کے عنوان سے بیان ہوئے ہیں۔

ایک دوسری آیت میں بیان ہوا ہے ، ولو شاء ربك لجعل الناس امة واحدة ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربك ولذالك خلقهم ، "اگر تیرا پروردگار چاہتا تو تمام لوگوں کو (بغیر کسی اختلاف کے) امت واحدہ قرار دے دیتا ، لیکن وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے ، سوائے ان کے جن پر تیرا پروردگار رحم کرے ، اور اسی "رحمت" کے لیے انہیں پیدا کیا ہے"۔ (ھود - ۱۱۸ و ۱۱۹)۔

اس آیت کے مطابق رحمت الٰہی انسان کی خلقت کا اصلی ہدف ہے ،

لیکن زیر بحث آیات صرف عبودیت اور بندگی کے مسئلہ پر تکیہ کرتی ہیں ، اور پوری صراحت کے ساتھ اس کو جن وانس کی خلقت کے اصلی ھدف اور مقصد کے عنوان سے تعارف کراتی ہیں۔

ان آیات اور ان سے مشابہ آیات میں تھوڑا سا تامل اور غور وفکر یہ نشاندہی کر دیتا ہے کہ ان کے درمیان کسی قسم کا تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔ فی الحقیقت ان میں سے بعض ھدف اور مقصد تو مقدمہ کے طور پر بیان ہوئے ہیں بعض وسطی اور بعض آخری ، اور بعض ان کا نتیجہ ہیں۔

اصلی ھدف وہی "عبودیت" ہے ، جس کی طرف زیر بحث آیات میں اشارہ ہوا ہے ، اور مسئلہ "علم ودانش" اور "امتحان وآزمائش" ایسے اھداف ومقاصد ہیں جو عبودیت کی منزلیں طے کرتے ہوئے راستہ میں آتے ہیں۔ اور رحمت خداوندی اس عبودیت کا نتیجہ ہے۔

اس طرح سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہم سب پروردگار کی عبادت کے لیے پیدا کئے گئے ہیں ، لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ "عبادت" کی حقیقت کیا ہے ؟

کیا صرف رکوع وسجود ، قیام وقعود اور نماز وروزہ جیسے مراسم کا انجام دینا مراد ہے ، یا ان کے علاوہ کوئی اور حقیقت ہے؟ اگرچہ رسمی عبادات بھی سب کی سب اہمیت کی حامل ہیں۔

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے "عبد" و "عبودیت" کے الفاظ پر غور کرنا ہوگا ، اور ان کی تحلیل وتجزیہ کرنا پڑے گا۔

"عبد" لغت کے لحاظ سے اس انسان کو کہتے ہیں جو سرتاپا اپنے مولا اور آقا ومالک سے تعلق رکھتا ہے ، اس کا ارادہ اس کے ارادہ کے تابع ، اور اس کی خواہش اس کی خواہش اور مرضی کے تابع ہے یہ اس کے مقابلہ میں کسی چیز کا مالک نہیں ہے۔ اور اس کی اطاعت میں کسی قسم کی کوتاہی اور سستی نہیں کرتا۔

دوسرے لفظوں میں "عبودیت" جیسا کہ متون لغت میں آیا ہے۔ معبود کے سامنے آخری درجہ کے خضوع کا اظہار ہے اور اسی بنا پر صرف وہی ذات معبود ہو سکتی ہے جس نے انتہائی انعام واکرام کیا ہو ، اور وہ خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے ،

اس بنا پر "عبودیت" ، ایک انسان کے ارتقاء وتکامل کی انتہائی معراج اور خدا سے اس کا قرب ہے۔

"عبودیت اس کی ذات پاک کے آگے انتہائی تسلیم ہے عبودیت ، بلا قید وشرط اطاعت اور تمام مراحل میں فرمانبرداری کرنا ہے"۔

اور آخر میں عبودیت کامل یہ ہے کہ انسان سوائے معبود حقیقی یعنی کمال مطلق کے کسی کا بھی تصور اور خیال نہ کرے، اس کی راہ کے علاوہ اور کسی راہ پر قدم نہ اٹھائے، اس کے سوا ہر چیز کو بھول جائے یہاں تک کہ خود اپنے آپ کو بھی۔

اور خلقت بشر کا ہدف اصلی یہی ہے، جس تک پہنچنے کے لیے خدا نے آزمائش کا میدان فراہم کیا ہے، اور انسان کو علم و آگاہی عطا فرمائی ہے۔ اور اس کا اصلی اور ذاتی و حقیقی نتیجہ بھی اس کی "رحمت" کے سمندر میں خود کو سمونا ہے۔

چند نکات

۱۔ خدا غنی مطلق ہے

"ما ارید منھم من رزق وما ارید ان یطعمون" کا جملہ حقیقت میں پروردگار کی ہر شخص اور ہر چیز سے بے نیازی کی طرف اشارہ ہے۔ اور اگر اس نے اپنے بندوں کو اپنی عبودیت کی دعوت دی ہے، تو یہ اس لیے نہیں ہے کہ وہ اس سے کوئی فائدہ حاصل کرے، بلکہ وہ تو انسانوں کے درمیان مسئلہ عبودیت کے برعکس، یہ چاہتا ہے کہ ان پر "سخاوت اور بخشش" کرے، کیونکہ لوگ غلاموں کو اس لیے انتخاب کرتے تھے تاکہ وہ ان کے لیے آمدنی کے حصول اور رزق و روزی کے لیے کام کریں، یا گھر کا کام کاج کریں، اور کھلانے اور پذیرائی کرنے میں مشغول رہیں، اور دونوں حالتوں میں اس کا فائدہ مالکوں کو ہی ہوتا ہے، اور یہ چیز انسان کی نیاز اور احتیاج سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب چیزیں خدا کے بارے میں بے معنی ہیں، کیونکہ نہ صرف یہ کہ وہ سب سے بے نیاز ہے، بلکہ سب کی نیاز اور حاجت کو اپنے لطف و کرم سے پورا کرتا ہے، اور سب کا رزاق وہی ہے

۲۔ وہ صاحب "قوت" اور "متین" ہے۔

"متین" "متن" کے مادہ سے اصل میں اس قوی پٹھے کے معنی میں ہے، جو پیٹھ کے مہروں کے ستون کے دونوں طرف ہوتا ہے۔ اور انسان کی پشت کو مضبوط بناتا ہے، اور اسے بھاری دباؤ کو برداشت کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے، اور اسی مناسبت سے کامل قدرت و قوت کے معنی میں آیا ہے، اس بنا پر "ذوالقوۃ" کے لفظ کے بعد اس کا بیان تاکید کے عنوان سے ہے، کیونکہ "ذوالقوۃ" پروردگار کی اصل قوت کی طرف اشارہ کرتا ہے، اور "متین" اس کے کمال قدرت کی طرف، اور جس وقت وہ "رزاق" کے لفظ کے ہمراہ ہو کہ وہ بھی ایک مبالغہ کا صیغہ ہے تو اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ خدا بندوں کو روزی دینے کے سلسلے میں انتہائی قدرت و طاقت اور تسلط رکھتا ہے، چاہے وہ اس وسیع جہان کے جس کونے میں ہوں۔ سمندروں کی گہرائیوں میں ہوں، دروں کے درمیان ہوں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہوں، پتھروں کے اندر ہوں، اور آسمانی کروں کے جس مقام میں ہوں، ان کی ضرورت کے مطابق روزی انہیں پہنچاتا ہے۔ اور سب کے سب اسی کے خوانِ احسان پر جمع ہیں پس اگر انہیں پیدا کیا ہے تو کسی ضرورت و حاجت کی بنا پر نہیں، بلکہ ایک لطف خاص اور فیض پہنچانے کی بنا پر۔

۳۔ جنوں کا ذکر پہلے کیوں؟

باوجود اس کے کہ قرآنی آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ انسان گروہ جن سے افضل و برتر ہیں، لیکن اس کے باوجود اوپر والی آیت میں ان کا نام مقدم رکھا ہے۔ ظاہراً یہ اس بنا پر ہے کہ ان کی خلقت انسان کی خلقت سے پہلے ہوئی تھی،

جیسا کہ سورۂ حجر کی آیت ۲۷ میں بیان ہوا ہے: والجان خلقناه من قبل من نار السموم، اور ہم نے جن کو پہلے (انسان کی خلقت سے پہلے) جلانے والی آگ سے پیدا کیا تھا؟

۴۔ فلسفہ کی نظر سے خلقت کا فلسفہ

ہم بیان کر چکے ہیں کہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے یہ سوال اپنے آپ سے یا دوسروں سے نہ کیا ہوگا، کہ ہماری خلقت کا ہدف اور مقصد کیا ہے؟ کچھ لوگ پیدا ہوتے ہیں، پھر اس جہان سے رخصت ہو جاتے ہیں، اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتے ہیں، اس آمد و رفت کا مقصد کیا ہے؟

واقعاً اگر ہم انسان اس کرۂ خاکی پر زندگی نہ گزارتے، تو اس عالم میں کون سی خرابی آجاتی؟ اور کیا مشکل پڑ جاتی؟ کیا ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ ہم کیوں آتے ہیں، اور کیوں چلے جاتے ہیں؟ اور اگر ہم اس چیز سے آگاہ ہونا چاہیں تو کیا ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں، اور اس سوال کے پیچھے بہت سے دوسرے سوالات فکر انسانی کا احاطہ کر لیتے ہیں۔

یہ سوال اگر مادہ پرستوں کی طرف سے پیش ہو تو ظاہراً اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ کیونکہ مادہ اور طبیعت اصلاً کوئی عقل و شعور نہیں رکھتے، کہ ان کا کوئی ہدف ہو۔ اور اسی بنا پر انہوں نے اپنے آپ کو اس لحاظ سے آسودہ کر لیا ہے، اور انہوں نے یہ عقیدہ اپنا لیا ہے کہ خلقت بے مقصد اور فضول ہے! اور کتنی قابل مذمت اور تکلیف دہ بات ہے یہ کہ انسان اپنی زندگی کے جزئیات کے لیے چاہے وہ تحصیل علم ہو یا کسب کار کے لیے یا بیماری و صحت ہو یا ورزش کے لیے، تو دقیق مقاصد و اہداف اور منظم پروگرام نظر میں رکھتا ہے۔ لیکن مجموعہ زندگی کو فضول، بے ہدف اور بے مقصد سمجھتا ہے؟

اس کے لیے تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ ان میں سے ایک گروہ جب ان مسائل میں غور و فکر کرتا ہے تو اس فضول اور بے مقصد زندگی سے سیر ہو جاتا ہے، اور خودکشی پر تیار ہو جاتا ہے۔

لیکن یہی سوال جب ایک خدا پرست اپنے آپ سے کرتا ہے تو وہ کسی قسم کی الجھن اور تنگی سے دوچار نہیں ہوتا کیونکہ ایک طرف تو وہ یہ جانتا ہے کہ اس جہان کا خالق حکیم ہے، حتمی و یقینی طور پر اس کی خلقت میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہے چاہے ہم اس حکمت سے بے خبر ہوں، اور دوسری طرف اپنے اعضاء کے ایک ایک جزء پر نظر ڈالتا ہے، تو اسے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی مقصد اور فلسفہ نظر آتا ہے، نہ صرف دل و دماغ اور عروق و اعصاب جیسے اعضاء کے لیے، بلکہ ناخنوں، پلکوں، انگلیوں کی لکیروں، ہتھیلیوں اور پاؤں کے تلوے کے نشیب میں سے ہر ایک کے لیے کوئی نہ کوئی فلسفہ ہے، جو موجودہ زمانے میں سب کے سب معلوم کر لیے گئے ہیں۔

کس قدر کوتاہ فہمی کی بات ہے کہ ہم ان سب کے لیے تو ہدف اور مقصد کے قائل ہوں، لیکن مجموعی زندگی کو بے مقصد سمجھیں۔

یہ کیسی سادہ لوحی کا فیصلہ ہے کہ ہم شہر کی ہر ہر منزل و مکان کے لیے تو فلسفہ کے قائل ہوں، لیکن مجموعہ شہر کے لیے کسی فلسفہ کے قائل نہ ہوں؟

کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی انجینئر ایک عظیم عمارت تعمیر کرے، اور کمرے، صحن، کھڑکیاں، دروازے، حوض، باغیچے اور آتشیں

توہر ایک حساب وکتاب اور خاص مقصد کے لیے بنائے، لیکن اس نے اس عظیم عمارت کے مجموعہ کو بغیر کسی مقصد کے بنادیا ہو۔

یہی باتیں ہیں جو ایک خدا پرست مومن انسان کو اطمینان دلاتی ہیں، کہ اس کی خلقت ایک ہی عظیم مقصد رکھتی ہے، لہٰذا اس کو کوشش کرنی چاہیئے، اور عقل وعلم کی قوت سے اسے اصل حقیقت معلوم کرنا چاہیئے۔

تعجب کی بات ہے کہ خلقت کو فضول جاننے والے، اور اس کے بے مقصد ہونے کے طرفدار، علوم طبیعی کے جس سلسلہ میں بھی داخل ہوتے ہیں، تو مختلف انکشافات کی تفسیر کے لیے کسی نہ کسی مقصد اور ھدف کی تلاش میں لگے رہتے ہیں، اور جب تک اس کا ھدف اور مقصد دریافت نہ کرلیں چین سے نہیں بیٹھتے، یہاں تک کہ وہ ایک چھوٹی سی طبیعی گلٹی (غدود) کو، جو بدن کے کسی کونہ میں واقع ہوتی ہے، بیکار سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور ممکن ہے کہ اس کے وجود کا فلسفہ معلوم کرنے کے لیے سالہا سال مطالعہ اور آزمائش کرتے رہیں، لیکن جب وہ انسان کی اصل آفرینش وخلقت پر پہنچتے ہیں تو صراحت کے ساتھ کہتے ہیں، کہ اس کا کوئی ھدف اور مقصد نہیں ہے۔

کتنا حیرت انگیز اور تعجب خیز تناقض ہے؟

بہرحال ایک طرف خدا کی حکمت پر ایمان، اور دوسری طرف انسان کے وجود کے اعضاء کا معنی خیز ہونا، اس بات پر ہمارا ایمان پختہ کر دیتا ہے، کہ انسان کی آفرینش وخلقت میں ایک عظیم مقصد ہے۔

اب ہمیں اس ھدف اور مقصد کو تلاش کرنا چاہیئے اور حتی المقدور اسے معلوم کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے، اور اس راہ میں قدم اٹھانا چاہیئے۔

چند مقدمات کی طرف توجہ ایسے چراغ اور روشنی ڈالنے والی چیزیں مہیا کرسکتی ہے جو اس تاریک راستہ کو ہمارے لیے روشن کردے گی۔

(۱) ہم اپنے کاموں میں کوئی نہ کوئی ھدف رکھتے ہیں، اور یہ ھدف عام طور پر ہماری کسی کمی یا حاجتوں کو دفع کرنا ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر ہم کسی دوسرے کی خدمت کرتے ہیں، یا کسی مصیبت میں گرفتار شخص کی دست گیری کرتے ہیں، اور اسے مصیبت سے نجات دلاتے ہیں، یہاں تک کہ کوئی ایثار وقربانی بھی کرتے ہیں تو یہ بھی ہماری کسی معنوی کمی کو دُور کرتا ہے اور ہماری مقدس حاجات وضروریات کو پورا کرتا ہے۔

اور چونکہ ہم صفات وافعال خدا کے بارے میں اکثر اپنے پر قیاس کرنے اور موازنہ کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں، لہٰذا ہوسکتا ہے کہ کبھی یہ تصور کرلیا جائے کہ خدا میں وہ کونسی کمی تھی جو ہماری خلقت سے دور ہوتی تھی؟ اور یا اگر ہم اوپر والی آیات میں یہ پڑھتے ہیں کہ انسان کی خلقت کا ھدف عبادت ہے، تو ہم کہتے ہیں، اسے ہماری عبادت کی کیا حاجت اور ضرورت ہے۔

حالانکہ یہ طرز فکر خالق ومخلوق اور واجب وممکن کی صفات میں قیاس اور موازنہ کی پیداوار ہے۔

اس بنا پر کہ ہمارا وجود محدود ہے ہم اپنی کمیوں اور نقائص کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہمارے سب اعمال اسی سلسلہ میں ہوتے ہیں، لیکن ایک غیر محدود موجود کے بارے میں یہ معنی امکان پذیر نہیں ہے لہٰذا اس کے افعال کے

ھدف کو ہمیں اس کے وجود کے علاوہ دوسرے موجودات میں تلاش کرنا چاہیئے۔

وہ تو ایک فیض بخش چشمہ ہے۔ اور ایک نعمت آفرین مبدء ہے، جو موجودات کو اپنی حمایت کے سائے میں لے لیتا ہے اور ان کی پرورش کرکے نقص سے کمال کی طرف لے جاتا ہے، اور ہماری عبودیت و بندگی کا حقیقی و واقعی ھدف یہی ہے، اور ہماری عبادات اور بندگیوں کا فلسفہ بھی یہی ہے، جو سب کی سب ہمارے تکامل وارتقاء کے درجات ہیں۔

اس طرح ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہماری آفرینش وخلقت کا ھدف و مقصد ہماری ہستی کی پیش رفت اور تکامل وارتقاء ہے۔

بنیادی طور پر اصل آفرینش وخلقت ہی تکامل کی طرف ایک عظیم قدم ہے یعنی کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا اور نیست سے ہست کرنا اور صفر سے عدد کے مرحلہ میں لانا۔

اس عظیم تکاملی قدم کے بعد تکامل وارتقاء کے دوسرے مراحل شروع ہوتے ہیں، اور تمام دینی اور خدائی پروگرام اسی طریقہ سے وقوع میں آتے ہیں۔

(۲) یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے۔ کہ اگر خلقت کا ھدف و مقصد بندوں پر سخاوت و بخشش کرنا ہے۔ اور اس میں پیدا کرنے والے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور یہ سخاوت انسانوں کے ارتقاء کے طریقہ سے ہے، تو پھر اس جواد و کریم خدا نے ابتدا سے ہی بندوں کو کامل پیدا کیوں نہ کیا؟ تاکہ سب ہی اس کے جوار قرب میں جگہ حاصل کرتے، اور اس کی پاک ذات کی قربت کے برکات سے بہرہ ور ہوتے۔

اس سوال کا جواب واضح ہے، انسان کا تکامل وارتقاء، کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جس کو "جبر" کے ساتھ پیدا کیا جاسکے۔ بلکہ ایک ایسا طولانی اور دور و دراز راستہ ہے جسے انسانوں کو خود اپنے پاؤں سے چل کر ہی طے کرنا چاہیئے، اور تصمیم وارادہ اور اختیاری افعال کے ساتھ اس کی بنیاد ڈالنی چاہیئے۔

اگر کسی شخص سے ایک ہسپتال بنانے کے لیے بہت زیادہ رقم، زبردستی، جبری طور سے، نوک نیزہ کے زور پر، وصول کرلی جائے۔ تو کیا اس کے لیے اس عمل کا کوئی اثر اخلاقی و روحانی ارتقاء پر مرتب ہوگا؟ یقیناً نہیں، لیکن اگر وہ اپنے ارادہ اور خوشی سے ایک آنہ یا دس پیسے کے ساتھ بھی اس مقدس ھدف اور مقصد کے لیے مدد کرے تو اس نے اسی نسبت سے اخلاقی کمال کی راہ طے کرلی ہے۔

اس گفتگو سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں، کہ خدا کے لیے لازم ہے کہ وہ اوامر و نواہی اور تربیتی پروگراموں کے ساتھ جو قوت عقل کے وسیلہ سے اور اس کے پیغمبروں کے ذریعہ پہنچائے جاتے ہیں —— اس راہ کو ہمارے لیے واضح و روشن کردے۔ اور ہم اپنے ارادہ اور اختیار کے ساتھ اس راستے کو طے کریں۔

(۳) پھر یہاں ایک دوسرا سوال سامنے آتا ہے کہ جس وقت بعض لوگ اوپر والی توضیحات کو سنتے ہیں تو وہ یہ کہتے ہیں، بہت خوب، مانا کہ خلقت کا ھدف اور مقصد تو تکامل انسانی ہے، یا دوسرے لفظوں میں پروردگار کا قرب، اور ایک ناقص وجود کی ایک لا متناہی کامل وجود کی طرف حرکت ہے، لیکن اس تکامل وارتقاء کا بذات خود ھدف کیا ہے؟

اس سوال کا جواب بھی اس جملہ کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے کہ تکامل وارتقاء ہی اصلی ھدف اور آخری مقصد ہے، یا دوسرے

لفظوں میں "غایۃ الغایات" ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ: اگر ہم کسی طالب علم سے یہ سوال کریں کہ تم سبق کیوں پڑھتے ہو؟ تو وہ کہے گا، تاکہ میں یونیورسٹی تک پہنچ سکوں۔

اگر ہم پھر سوال کریں کہ تم یونیورسٹی کیوں جانا چاہتے ہو؟ تو وہ جواب دے گا: اس لیے کہ مثلاً ڈاکٹر یا ایک لائق انجینیئر بنوں۔

ہم اس سے پھر پوچھتے ہیں کہ تم ڈاکٹری اور انجینیئری کا علم کیوں حاصل کرنا چاہتے ہو؟ تو وہ جواب دے گا: اس لیے کہ کچھ اچھے کام سرانجام دوں اور اچھی آمدنی پیدا کروں۔

ہم پھر کہتے ہیں: تم اچھی آمدنی کس لیے چاہتے ہو؟ تو وہ جواب دے گا: اس لیے کہ آبرومندانہ اور خوشحال زندگی بسر کرسکوں۔

آخر میں ہم پوچھتے ہیں کہ تم خوشحال اور آبرومندانہ زندگی کس لیے چاہتے ہو؟

اس مقام پر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی گفتگو کا لب ولہجہ بدل جاتا ہے، اور کہتا ہے: بس میں چاہتا ہوں کہ خوشحال اور آبرومندانہ زندگی بسر کروں، یعنی پھر اسی پہلے جواب کو دہرا دیتا ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے آخری جواب، اور اصطلاح کے مطابق "غایۃ الغایات" تک پہنچ گیا ہے جس کے بعد کوئی اور جواب نہیں ہے۔ اور وہی اس کا آخری ھدف اور مقصد ہے، یہ بات تو مادی زندگی کے مسائل میں سے ہے۔

معنوی زندگی میں بھی مطلب اسی طرح کا ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ انبیاء کا آنا، آسمانی کتابوں کا نازل ہونا، اور اوامر ونواہی کی ذمہ داریاں اور سارے تربیتی پروگرام کس لیے ہیں؟ تو ہم کہتے ہیں: انسانی تکامل وارتقاء اور قرب خدا کے لیے۔

اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ تکامل وارتقاء اور قرب پروردگار کس مقصد کے لیے ہے، تو ہم جواب دیں گے کہ قرب پروردگار کے لیے: یعنی یہ اصلی اور آخری مقصد ہے۔ اور دوسرے لفظوں میں ہم ہر چیز تو تکامل اور قرب خدا کے لیے چاہتے ہیں، لیکن قرب خدا کو خود اسی کے لیے چاہتے ہیں (یعنی قرب پروردگار کے لیے)

(۴) یہاں پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے، خداوند فرماتا ہے: کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف وخلقت الخلق لکی اعرف" میں ایک مخفی خزانہ تھا میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا، تاکہ میں پہچانا جاؤں"

تم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے یہ حدیث کیا مناسبت رکھتی ہے۔

ہم جواب میں کہتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ یہ حدیث ایک خبر واحد ہے، اور اعتقادی مسائل میں خبر واحد کام نہیں دیتی، حدیث کا مفہوم یہ ہے، مخلوق کے لیے خدا کی پہچان ان کے تکامل کا ذریعہ ہے، یعنی میں نے یہ چاہا کہ میری رحمت کا فیض ہر جگہ کو گھیر لے، پس اسی بنا پر میں نے مخلوق کو پیدا کیا، اور ان کی سیر کمالی کے لیے اپنی معرفت کے راہ ورسم اسے سکھائے، کیونکہ میری معرفت وشناخت ہی ان کے تکامل کی رمز ہے۔

ہاں! بندوں کو چاہیے کہ وہ خداوند تعالیٰ کی ذات کو ۔ جو تمام کمالات کا منبع ہے ۔۔۔ پہچانیں، اپنے آپ کو اس کے کمالات کے مطابق ڈھالیں، اور اس کا سایہ اپنے وجود پر ڈالیں (اس کے رنگ میں خود کو رنگ لیں) تاکہ ان صفات کمال و جمال کا نور ان کے وجود میں ہو، کیونکہ تکامل و ارتقا اور قرب خدا، اس کے اخلاق کو اپنائے بغیر ممکن نہیں ہے، اور اس کے اخلاق کو اپنانا اس کی معرفت و شناخت کی فرع ہے، (غور کیجئے)

(۵) جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہم آخری نتیجہ سے قریب ہوتے جارہے ہیں، اور کہتے ہیں کہ خدا کی عبادت اور عبودیت یعنی اس کی مشیت کی راہ میں قدم اٹھانا، اور روح اور جان کو اس کے سپرد کر دینا، اور اس کے عشق کو اپنے دل میں جگہ دینا، اور اپنے آپ کو اس کے اخلاق سے آراستہ کرنا۔

اور اگر اوپر والی آیات میں عبادت کو خلقت کا آخری ھدف اور مقصد بیان کیا گیا ہے۔ تو اس کا مفہوم یہی ہے کہ اس کو دوسرے لفظوں میں "تکامل انسانی" کے عنوان سے یاد کیا جائے۔

ہاں! انسان کامل ہی خدا کا سچا بندہ ہے۔

۵۔ انسان کی خلقت کے فلسفہ کے سلسلہ میں اسلامی روایات پر ایک نظر

ہم نے اوپر دو طریقوں سے انسان کی خلقت کے ھدف کا تعاقب کیا ہے۔ ایک آیات قرآنی کی تفسیر کے طریقے سے اور دوسرے فلسفہ کے طریقہ سے اور دونوں نے ہمیں ایک ہی نقطہ تک پہنچایا ہے۔

اب تیسری راہ سے، یعنی اسلامی روایات کے طریقہ سے، اس نصیب ساز مسئلہ کو بیان کرنے کی باری ہے۔

ذیل کی روایات میں غور و فکر، جو ان روایات کا حصہ ہے۔ اس مسئلہ میں ایک زیادہ عمیق اور گہری بصیرت عطا کرتا ہے ایک حدیث میں امام موسیٰ بن جعفرؑ سے آیا ہے کہ آنحضرت سے لوگوں نے سوال کیا کہ پیغمبر کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے:

اعملوا فکل میسر لما خلق لہ

"جہاں تک ہو سکے عمل کرو کیونکہ تمام انسان جس مقصد کے لیے خلق کیے گئے ہیں اس کے لیے آمادگی رکھتے ہیں؟"

امامؑ نے فرمایا:

ان اللہ عز و جل خلق الجن والانس لیعبدوہ ولم یخلقھم لیعصوہ وذٰلک قولہ عز و جل وما خلقت الجن والانس الّا لیعبدون فیسر کلا لما خلق لہ، فویل لمن استحب العمی علی الھدی

"خداوند تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت اور اطاعت کریں، اس لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ اس کی نافرمانی کریں، اور یہ وہی چیز ہے کہ جو فرماتا ہے: "وما خلقت الجن والانس الّا لیعبدون" اور چونکہ انہیں اطاعت کے لیے پیدا

کیا ہے، لہٰذا اس مقصد تک پہنچنے کے لیے ان کے لیے راستہ کو آسان اور ہموار کر دیا ہے پس وائے ہے اس شخص کے لیے جو آنکھ بند کر کے اندھے پن کو ہدایت پر ترجیح دے۔[1]

یہ حدیث اس حقیقت کی طرف ایک پر معنی اشارہ ہے کہ چونکہ خدا نے انسانوں کو تکامل وارتقاء کے مقصد کے لیے پیدا کیا ہے، لہٰذا اس نے تکوین وتشریع کے لحاظ سے اس کے وسائل وذرائع فراہم کئے ہیں اور اس کے اختیار میں دے دیئے ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ امام حسینؑ اپنے اصحاب کے سامنے آئے اور اس طرح فرمایا:

ان اللہ عز وجل ما خلق العباد الا لیعرفوہ، فاذا عرفوہ عبدوہ، فاذا عبدوہ استغنوا بعبادتہ عن عبادۃ من سواہ۔

"خدائے عزوجل نے بندوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ اس کو پہچانیں، جب اس کو پہچان لیں تو اس کی عبادت کریں، اور جب وہ اس کی عبادت کریں گے تو اس کے غیر کی عبادت و بندگی سے بے نیاز ہو جائیں گے۔"[2]

۶۔ ایک سوال کا جواب

یہاں ایک اور سوال جو سامنے آتا ہے یہ ہے کہ اگر خدا نے بندوں کو عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ تو پھر ایک گروہ کفر کی راہ کیوں اختیار کر لیتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کا ارادہ اس کے حدف کے خلاف ہو؟

جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں، انہوں نے ارادۂ تکوینی اور ارادۂ تشریعی میں اشتباہ کیا ہے، اور انہیں ایک دوسرے میں خلط ملط کر دیا ہے کیونکہ حدفِ عبادت جبری نہیں تھا بلکہ یہ عبادت وبندگی ارادہ واختیار کے ساتھ تھی، اور ایسے حالات میں حدف حالات کو آمادہ کرنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ میں نے یہ مسجد نماز پڑھنے کے لیے بنائی ہے، تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے اسے اس کام کے لیے آمادہ کیا ہے۔ نہ یہ کہ میں لوگوں کو جبراً نماز پڑھواؤں گا، اسی طرح دوسرے موقعوں میں جیسے تحصیل علم کے لیے مدرسہ بنانا، اور علاج کے لیے ہسپتال بنانا، اور مطالعہ کے لیے کتاب خانہ بنانا۔

اس طرح سے خدا نے انسان کو اطاعت وبندگی کے لیے آمادہ کیا ہے۔ اور ہر قسم کے وسائل وذرائع جیسے عقل اور دوسرے عواطف اور قوی اندرونی طور سے۔ اور پیغمبر، آسمانی کتابیں اور تشریعی پروگرام باہر سے اس کے لیے فراہم کئے ہیں۔

مسلمہ طور سے یہ بات مومن وکافر دونوں کے لیے یکساں ہے، اگرچہ مومن نے اپنے وسائل وذرائع سے فائدہ اٹھایا ہے، اور کافر نے یہ فائدہ نہیں اٹھایا۔

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے، کہ جس وقت آپ سے "و ما خلقت الجن والانس

---

[1] توحید صدوق (مطابق نقل المیزان ج ۱۸، ص ۴۲۲)۔

[2] "علل الشرائع" صدوق (مطابق نقل مدرک اول)۔

الا لیعبدون) والی آیت کی تفسیر کے متعلق سوال ہوا تو آپؑ نے فرمایا :

خلقھم للعبادۃ : "انہیں عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ راوی کہتا ہے میں نے سوال کیا :

خاصۃ ام عامۃ ؟ "کیا اس سے کوئی خاص گروہ مراد ہے یا سب لوگ" ؟

امامؑ نے فرمایا :

عامۃ : سب لوگ"۔[1]

ایک دوسری حدیث میں اسی امامؑ سے منقول ہوا ہے کہ جب آپؑ سے اس آیت کے بارے میں سوال ہوا، تو آپؑ نے فرمایا :

"خلقھم لیأمرھم بالعبادۃ

انہیں اس لیے خلق کیا ہے تاکہ انہیں عبادت کا حکم دے"۔[2]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مقصد بندگی اور عبادت پر مجبور کرنا نہیں تھا، بلکہ اس کے لیے حالات کو سازگار بنانا تھا اور یہ بات سب لوگوں کے حق میں صادق آتی ہے۔[3]

---

[1] بحار الانوار جلد ۵ ص ۳۱۴ حدیث ۷۔

[2] وہی مدرک حدیث ۵۔

[3] جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ الانس اور الجن میں الف ولام استغراق کے لیے ہے اور اس میں تمام افراد شامل ہیں نہ کہ جنس کے لیے اس طور پر کہ صرف ایک ہی گروہ شامل ہو، جیسا کہ بعض تفاسیر میں آیا ہے۔

۵۹۔ فَاِنَّ لِلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ذَنُوۡبًا مِّثۡلَ ذَنُوۡبِ اَصۡحٰبِہِمۡ فَلَا یَسۡتَعۡجِلُوۡنِ ○

۶۰۔ فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ یَّوۡمِہِمُ الَّذِیۡ یُوۡعَدُوۡنَ ○ ع

ترجمہ

۵۹۔ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ہے، ایسے ہی ایک عظیم عذاب کا حصہ ہے، جیسا کہ ان کے ساتھیوں کے حصہ میں آیا تھا، (جنہوں نے گزشتہ اقوام سے ظلم کیا تھا) اس بنا پر جلدی نہ کریں۔

۶۰۔ وائے ہے ان لوگوں کے لیے جو کافر ہو گئے اس دن سے جس کا انہیں وعدہ دیا گیا ہے۔

تفسیر

یہ بھی عذاب الٰہی میں حصہ دار ہیں

زیر بحث دو آیات جو سورۂ ذاریات کی آخری آیات ہیں، درحقیقت اس سورہ کی مختلف آیات سے ایک قسم کا نتیجہ پیش کرتی ہیں، جیسا کہ وہ آیات جو گزشتہ اقوام جیسے قوم فرعون، قوم لوط، عاد و ثمود کی سرنوشت کے سلسلہ میں گفتگو کرتی ہیں، اسی طرح وہ گزشتہ آیات جو ہدف آفرینش اور مقصد خلقت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔

فرماتا ہے: اب جبکہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہ مشرک و گنہگار قوم آفرینش کے اصلی ہدف سے منحرف ہو چکی ہے تو انہیں جان لینا چاہیے کہ ان کے لیے بھی عذاب الٰہی کا ایک عظیم حصہ ہے، ایسا ہی حصہ جیسا کہ گزشتہ اقوام میں سے ان کے ساتھی رکھتے تھے (فان للذین ظلموا ذنوبًا مثل ذنوب اصحابهم)۔

"اس بنا پر جلدی نہ کریں، اور بار بار یہ مطالبہ نہ کریں کہ اگر عذاب الٰہی حق ہے تو پھر وہ ہماری طرف کیوں نہیں

آتا"؟ (فلا یستعجلون)[1]

اس گروہ کے بارے میں ظلم کی تعبیر اس بنا پر ہے کیونکہ "شرک" اور کفر عظیم ترین ظلم ہے، ظلم کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے لائق جگہ میں نہ رکھا جائے، اور مسلمہ طور سے بت کو خدا کی جگہ قرار دینا ظلم کا اہم ترین مصداق شمار ہوتا ہے، اور اسی بنا پر وہ بھی اسی سلوک کے مستحق ہیں، جس کی گزشتہ مشرک اقوام مستحق تھیں۔

"ذنوب" (بروزن قبول) اصل میں اس گھوڑے کے معنی میں ہے، جس کی دم لمبی ہو، اسی طرح وہ بڑے ڈول جو دنبالہ رکھتے ہوں۔

گزشتہ زمانے میں حیوانات کے ذریعہ کنوئیں سے پانی نکالنے کے لیے بڑے بڑے ڈول مہیا کئے جاتے تھے، جن کے ایک دنبالہ ہوتا تھا، اور ڈول کے دہانے کے علاوہ، اس کے دنبالہ کے ساتھ ایک رسی بھی متصل ہوتی تھی، جس سے اس بڑے ڈول کو خالی کرنے کے لیئے استفادہ کیا کرتے تھے۔

اور چونکہ بعض اوقات چند گروہوں کے درمیان پانی تقسیم کرنے کے لیے ان ڈولوں سے کام لیا جاتا تھا، اور ہر ایک کو ایک یا چند ڈول دیتے تھے، لہٰذا یہ لفظ حصہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے زیر بحث آیت میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ البتہ یہاں بڑے حصہ کی طرف اشارہ ہے۔[2]

کیا اس آیت میں دنیا کے عذاب کی دھمکی مراد ہے یا آخرت کے عذاب کی؟ مفسرین کے ایک گروہ نے دوسرے معنی کو قبول کیا ہے، جب کہ بعض نے پہلے معنی کا احتمال دیا ہے۔

ہمارے نظریہ کے مطابق قرائن عذاب دنیا کی گواہی دیتے ہیں، کیونکہ اولاً وہ عجلت جو بعض کفار رکھتے تھے زیادہ تر اسی لیے تھی، کہ وہ پیغمبر سے کہا کرتے تھے: اگر تو سچ کہتا ہے تو پھر ہم پر عذاب الٰہی کیوں نازل نہیں ہوتا اور یہ مسلمہ طور سے عذاب دنیا کی طرف اشارہ ہے۔[3]

دوسرے یہ کہ "مثل ذنوب اصحابھم" کی تعبیر ظاہراً ایسی اقوام کی سرگزشت کی طرف اشارہ ہے، جن کا اسی سورہ میں ذکر آیا ہے، مثلاً قوم لوط و قوم فرعون و عاد و ثمود، جن میں سے ہر ایک دنیا کے کسی نوع کے عذاب میں گرفتار ہوئی ہے اور تباہ و برباد ہوئی ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر یہ آیت عذاب دنیا کے ساتھ مربوط ہے، تو پھر یہ خدائی وعدہ ان کے بارے

---

[1] توجہ کرنا چاہیے کہ "یستعجلون" کی نون مکسور ہے، حالانکہ جمع کی نون کو مفتوح ہونا چاہیے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل میں "یستعجلونی" (مجھ سے جلدی نہ کریں) تھا۔

[2] ایک عرب شاعر کہتا ہے: لنا ذنوب و لکم ذنوب ؛ فان ابیتم فلنا القلیب
ہمارے لیے بڑا ڈول ہے اور تمہارے لیے بھی بڑا ڈول ہے۔ اور اگر تم قبول نہیں کرتے تو تمام کنواں ہمارا ہے۔

[3] سورۂ انعام کی آیت ۵۷، ۵۸ اور سورۂ نمل کی آیت ۷۲ اور اسی قسم کی دوسری آیات کی طرف رجوع کریں۔
البتہ یہ تعبیرات قرآنی آیات میں بعض اوقات قیامت کے بارے میں بھی استعمال ہوئی ہیں۔

میں کیوں پورا نہ ہوا۔؟

اس سوال کے دو جواب ہیں :

۱۔ یہ وعدہ ان میں سے بہت سوں کے لیے، مثلاً ابوجہل اور ایک اور جماعت کے بارے میں جنگ بدر وغیرہ میں پورا ہوگیا۔

۲۔ ان سب کے لیے اس عذاب کا نزول خدا کی طرف بازگشت نہ کرنے اور شرک سے توبہ نہ کرنے کے ساتھ مشروط تھا، لیکن جب ان میں سے اکثر فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوگئے تو یہ شرط دور ہوگئی اور عذاب الٰہی برطرف ہوگیا۔

اور آخری آیت میں دنیا کے عذاب کی تہدید کی، آخرت کے عذاب کی تہدید کے ساتھ تکمیل کرتے ہوئے کہتا ہے :
"ان لوگوں پر وائے ہے جو کافر ہوگئے، اُس دن سے جس کا ان سے وعدہ دیا گیا ہے" (فویل للذین کفروا من یومھم الذی یوعدون)۔

جس طرح سے یہ سورہ مسئلہ معاد و قیامت کے ساتھ شروع ہوا تھا، اسی مسئلہ پر تاکید کے ساتھ ختم ہو رہا ہے۔[1]

"ویل" لغتِ عرب میں ان موقعوں پر بولا جاتا ہے جہاں ایک فرد یا کئی افراد ہلاکت میں جا پڑیں، اور یہ عذاب و بدبختی کا معنی دیتا ہے، اور بعض کے قول کے مطابق عذاب سے بھی زیادہ شدید مفہوم رکھتا ہے۔

"ویل" و "ویس" و "ویح" کے الفاظ لغت عرب میں ان موقعوں پر استعمال ہوتے ہیں، جہاں ایک شخص دوسرے کی حالت پر افسوس کرے، البتہ "ویل" بُرے اور قبیح کاموں کے موقعوں پر بولا جاتا ہے اور "ویس" حقیر سمجھنے کے موقعوں پر اور "ویح" رحم کھانے کے مقام پر۔

ایک جماعت کا کہنا ہے کہ "ویل" دوزخ میں ایک کنواں یا درہ ہے، لیکن یہ کہنے والوں کی مراد یہ نہیں ہے کہ لغت میں اس معنی میں آیا ہے، بلکہ حقیقت میں ایک قسم کے مصداق کا بیان ہے۔

یہ تعبیر قرآن مجید میں بہت سے موقعوں پر، جیسے کفار، مشرکین، دروغ گوئی کرنے والوں، تکذیب کرنے والوں، گنہگاروں کم فروشی کرنے والوں اور بے خبر نماز گذاروں کے بارے میں استعمال ہوئی ہے، لیکن اس کا زیادہ تر استعمال قرآن مجید میں تکذیب کرنے والوں کے لیے ہوا ہے، منجملہ ان کے سورۂ مرسلات میں اس جملہ کا دس مرتبہ تکرار ہوا ہے، ویل یومئذ للمکذبین "قیامت کے دن ان لوگوں کے لیے وائے ہے جنہوں نے پیغمبروں اور آیات الٰہی کی تکذیب کی"۔

خداوندا! ہمیں اس عظیم دن کے عذاب اور وحشتناک رسوائی سے اپنے لطف و کرم کی پناہ میں رکھ۔

بارالٰہا! ہمیں قبول کرنے کے لیے آمادہ ہونے، اور اپنی عبودیت اور بندگی کے افتخار کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگارا! ہمیں ان اقوام کی دردناک سرنوشت میں جنہوں نے تیرے پیغمبروں اور آیات کی تکذیب کی ہے یا

---

[1] بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ ممکن ہے یہ آیت بھی عذاب دنیا کی طرف اشارہ ہو، حالانکہ اس قسم کی تعبیر قرآن مجید میں عام طور پر قیامت کے لیے ہوتی ہے۔

اشاریہ

تفسیر نمونہ ـــــــــ جلد ۱۲

ترتیب و تزئین ------ سید شکیل حسین موسوی

------ سید محمد حسین زیدی الباهروی

مضامین:

اصول وعقائد

اسمائے باری تعالیٰ

توحید

عدل

نبوت

قیامت

جنّت

جہنّم

معجزہ

فرشتگان

احکام

جہاد

عمرة القضاء

تسبیح

نماز

ذکر

اخلاقیات

اخلاق حسنہ

اخلاقِ رذیلہ

اقوامِ سابقہ (بنی اسرائیل)

اصحاب الایکہ

اصحاب الرس

اقرع

حضرت اُمِ سلمہؓ (اُمّ المومنین)

بلالؓ

ثابتؓ بن قیس (صحابی و خطیب)

جالینوس

حضرت امام جعفر صادقؑ (امام ششم)

حضرت امام علیؑ بن الحسینؑ (امام چہارم)

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرت امام محمد باقرؑ (امام پنجم)

حضرت امام محمد تقیؑ (امام نہم)

مروان بن حکم

حضرت موسیٰ علیہ السلام

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ (امام ہفتم)

نضر بن حارث

حضرت نوح علیہ السلام

ولید بن عقبہ

ولید بن مغیرہ

حضرت ہود علیہ السلام

علماء و دانشور

کتب آسمانی

انجیل

تورات

قرآن

سورۂ دخان

سورۂ جاثیہ

سورۂ احقاف

سورۂ ذاریات

مضامین:

ثواب تلاوت:

کتب تفسیر و تاریخ و سیر

لغات قرآن

(ا)

متفرق موضوعات

آسمانوں اور زمین کا خالق مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے

ہم نے آسمان و زمین کو چھ دن (ادوار) میں بنایا، طلوع و غروب سے پہلے، رات کے ایک حصّہ میں اور سجدوں کے بعد اس کی تسبیح کرو۔ ۵۴۰ تا ۵۴۴

ابراہیمؑ کے مہمان

ابراہیمؑ کے مہمانوں کی خبر پہنچو، بھنا ہوا گوشت لائے مگر نہ کھایا، بیٹے کی بشارت، بڑھیا بانجھ بیوی کا اظہار تعجب، تیرے رب نے اسی طرح کہا ہے۔ ۵۸۲ تا ۵۸۶

ادب افضل ترین سرمایہ ہے

رسُول اللہ کا سفیر ہے، اس کا ادب اللہ کا ادب ہے، اونچی آواز سے بولنا بے ادبی ہے، گزشتہ سے توبہ کرو، اللہ غفور و رحیم ہے۔ ۴۲۰ تا ۴۲۶

استہزاء، بدگمانی، غیبت وغیرہ ممنوع ہیں

مذاق اڑانے اور استہزاء کے واقعات، غیبت کی مثال اور ممانعت۔ ۴۵۸ تا ۴۶۳

اسلام اور ایمان کا فرق

زبان پر شہادتین جاری کرنے والا داخلِ اسلام ہے، ایمان باطنی امر ہے، اس کی جگہ انسان کا دل ہے۔ ۴۸۲ تا ۴۸۴

باغیوں سے جنگ کی شرائط

بنی اسرائیل کی آزمائش

بہشتی انسان کی صفات

بے جا و رسوا کن صلح

بیعت اور اس کی خصوصیات

بیعتِ رضوان والوں سے اللہ کی خوشنودی

پرہیزگار اور نعماتِ جنّت

پہلی موت کیا ہے ؟

پیچھے رہ جانے والوں کا عذر

پیچھے رہ جانے والوں کا اب ساتھ چلنے پر اصرار

پیغمبرانِ اولوالعزم کی طرح صبر کرو

پیغمبرانِ اولوالعزم کون ہیں؟

پیغمبرؐ کا سچا خواب

پیغمبرؐ کی بارگاہ کے آداب

پیغمبرؐ کی بیعت اللہ کی بیعت ہے

پیغمبرؐ کی سخاوت

تجسس نہ کرو

تم اللہ کی مدد کرو گے وہ تمہاری مدد کرے گا

تم نے روگردانی کی تو تم سے بہتر لوگ تمہاری جگہ آجائیں گے

تمہاری چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی فرشتے لکھتے ہیں

اجازت نامه

منجانب انصاریان پبلیکیشنز (قم) ایران

جناب آقای امین دام عزۃ العالی

باسلام و تحیات و خوشحالی از اینکه با کارهای خوب شما بیشتر اطلاع پیدا کردیم. از خداوند تبارک و تعالی توفیق و سعادت و سلامتی برای جنابعالی و دیپر دوستان آن مرکز محترم، مسئلت می نمایم. چاپ کتابهای خوب انتشارات مصباح القرآن که لطف فرمودید انشاء الله در آینده که مشکلاتمان حل شده اقدام می کنیم. دعای خیر شما لازم است.

در مورد کتابهای انتشارات انصاریان هر کدام را که مؤسسه شما می خواهد در پاکستان به چاپ و توزیع آن اقدام کند بلامانع است (چاپ شده یا چاپ نشده) و اگر فایلهای بعضی از آنها که موجود است بخواهید تا آنها را نیز تقدیم می نماییم. فقط سفارش حقیر این است که بعضی از این کتابها، تصحیح و ویرایش و نظر ثانی لازم دارد و اگر این کارها انجام شود ثوابی مضاعف خواهد داشت و بعد نمونه هایی از کارهای انجام شده را برای ما بفرستید برای چاپ کتابهای مصباح القرآن هر وقت لازم شد درخواست فایلهای آنها را از شما خواهیم نمود

با تشکر و ملتمس دعا

انتشارات انصاریان